تفسیر مظہری

جلد ششم

سورۂ ہود سے سورۂ نحل تک

پارہ ۱۲ تا پارہ ۱۴

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتیؒ

تشریحی ترجمہ مع ضروری اضافات

مولانا سید عبدالدائم الجلالی

رفیق ندوۃ المصنفین

ناشر

دارالاشاعت

اردو بازار کراچی ۱ —— فون ۲۱۳۷۶۸

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی

طباعت : ۱۹۹۹ء شکیل پریس کراچی۔

ضخامت : صفحات در ۶ جلد

﴿......ملنے کے پتے......﴾

بیت القرآن اردو بازار کراچی

بیت العلوم 26-نابھہ روڈ لاہور

کشمیر بک ڈپو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد

کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی

یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی

ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔انارکلی لاہور

مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور

مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان

مکتبہ رحمانیہ ۱۸۔اردو بازار لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

فہرستِ عنوانات

تفسیر مظہری (اُردو)

جلد ششم

"سُورۂ ھود"

سورۂ یوسف

سورۂ رعد ۱۴۷

اے اللہ!

تیرے سوا کوئی سچا معبود نہیں، ہم تیری ثنا کرتے ہیں ہر عیب سے تیرے پاک ہونے کا اقرار کرتے ہیں، تیری مدد کے خواستگار ہیں، تجھ سے گناہوں کی معافی کے طلبگار ہیں، تیرے شکر گذار ہیں، تجھ سے دنیا اور آخرت کی بھلائی کی درخواست کرتے ہیں ہم کو اپنے ان نیک بندوں میں شامل کر دے جن کو (قیامت کے دن) نہ کوئی خوف ہو گا نہ غم ہم شہادت دیتے ہیں کہ تو ہی ہمارا مالک ہے، آسمان و زمین کا مالک ہے اور زمین و آسمان کے اندر اور اوپر جو مخلوق ہے اس کا مالک ہے بلاشبہ ہر چیز تیرے قابو میں ہے، ہم دعاء رحمت کو سلامتی کرتے ہیں اپنے آقا اور مولےٰ محمد ﷺ کے لیے جو تیرے رسول ﷺ اور حبیب تھے اور ساری مخلوق کے سردار تھے اور آپ ﷺ کی آل واصحاب کے لیے بھی اور ان لوگوں کے لیے بھی جو آل واصحاب کے نقشِ قدم پر چلنے والے ہوں روز قیامت تک۔ اے ارحم الراحمین اپنی رحمت سے ہماری دعا قبول فرما۔

سورۂ ھود

اس سورت کی ۱۲۳ آیات ہیں سوائے آیت اقم الصلوٰۃ طرفی النھار الخ کے باقی پوری سورت مکی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الٓرٰ قف كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍۙ ﴿۱﴾

الٓرٰ یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں دلائل سے محکم کی گئی ہیں پھر (اس کے ساتھ ساتھ) صاف صاف بیان بھی کی گئی ہیں، یہ ایک حکیم باخبر کی طرف سے ہے۔

اُحْكِمَتْ یعنی اس کی آیات موتیوں کی طرح پروئی ہوئی ہیں ان کی ساخت پرداخت مضبوط ہے نہ اس کے الفاظ میں کوئی نقص ہے نہ معنی میں کوئی عیب۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کی آیات غیر منسوخ ہیں یہ مطلب اس وقت صحیح ہو گا جب آیات کتاب سے صرف اس سورت کی آیات مراد ہوں کیونکہ اس سورت کی کوئی آیت منسوخ نہیں (باقی قرآن میں بعض آیات منسوخ ہیں) یا مضبوط کرنے سے مراد ہے دلائل اور براہین سے پختہ کی ہوئی یا اُحْكِمَتْ کا مطلب ہے پُر حکمت بنائی ہوئی یعنی علمی اور عملی حکمتیں اس کے اندر بھری ہوئی ہیں حکم ضمہ کے ساتھ حکیم ہو گیا فُصِّلَتْ یعنی جس طرح ہار کے درمیان جگہ جگہ دُرِیکدانہ پروئے جاتے ہیں اسی طرح اس کی آیات الگ کر دی گئی ہیں، کہیں اعتقادیات، کہیں عملی احکام، کہیں مواعظ، کہیں واقعات کی اطلاع یا فصل کر دینے سے مراد ہے الگ الگ سورتیں مقرر کر دینا یا تھوڑا تھوڑا (حسبِ ضرورت دنیا میں) بھیجنا مراد ہے یا یہ مطلب ہے کہ جن امور کی (اصلاحِ بشری کے لیے) ضرورت تھی ان کو بطور خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔

مِنْ لَّدُنْ اس کا تعلق وصفی یا کتاب سے ہے یا دوسری خبر ہے یا اُحْكِمَتْ سے تعلق ہے یا فُصِّلَتْ سے مطلب یہ ہے کہ اللہ ظاہر اور باطن سے واقف اور باخبر ہے اسی کی طرف سے ان آیات کا یا کتاب کا نزول ہے اور اسی نے اس کی آیات کو محکم بنایا ہے۔

اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭاِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝۲ کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو میں اس کی طرف سے (ایمان نہ لانے والوں کو عذاب سے) ڈرانے والا اور (ایمان دار نیکو کاروں کو نجات و ثواب کی) خوش خبری دینے والا ہوں۔

یعنی شرک کے عذاب سے ڈرانے والا اور توحید کے ثواب کی بشارت دینے والا ہوں۔

وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ اور یہ بھی کہ تم (کفر و معصیت کی) اپنے رب سے معافی مانگو اور اس کی طرف (ایمان و اطاعت کے ساتھ) لوٹو،

یعنی پچھلے گناہوں کی اپنے رب سے معافی چاہو اور آئندہ طاعت کے ساتھ اس کے طرف رجوع کرو۔ فراء نے کہا ثم اس جگہ (ترتیب اور تراخی کے لئے نہیں ہے بلکہ) واؤ کے معنی میں ہے (یعنی مطلق عطف کے لیے ہے) اور استغفار کے معنی ہیں توبہ کرنا (معطوف اور معطوف علیہ میں اس جگہ مغایرت نہیں ہے) یعنی ایک کا معنی دوسرے کے معنی کو لازم ہے (مطلب یہ کہ دونوں میں اتحاد التزامی ہے اگرچہ ذاتی افتراق ہے)۔

يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وہ تم کو اچھی (خوشگوار پُر امن، فراخ حال) زندگی عطا فرمائے گا، مرتے دم تک۔

گناہوں سے مصائب اور بلائیں آتی ہیں، اللہ نے فرمایا ہے مَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ جو مصیبت تم پر آتی ہے اپنے کرتوت کی وجہ سے آتی ہے اور اللہ بہت سے جرائم سے تو درگذر فرما دیتا ہے (پھر بھی بعض گناہوں کی پاداش میں تم پر مصائب آہی جاتے ہیں) بعض علماء کا قول ہے متاع حسن سے مراد ہی قسمت خداوندی پر راضی رہنا اور تقدیر الٰہی پر صبر کرنا۔ چونکہ ہر شخص کی مدتِ زندگی مقرر ہے اور وقتِ موت معین ہے اس لئے اجل مسمی سے مراد ہے وقتِ موت۔

وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ۭ اور وہ ہر فضیلت والے کو اس کی فضیلت کے مطابق جزا عطا فرمائے گا۔

یعنی دینی فضیلت کے مطابق جزا عطا فرمائے گا، دنیا میں توفیق، اطمینان قلب، چین اور اللہ کی یاد کی لذت اور سعادت، آخرت کی خوشخبری اور آخرت میں ثواب کی کثرت اور مراتبِ قرب کی بلندی عطا فرمائے گا۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ۝۳ اور اگر (اللہ کی عبادت اور توحید سے) روگرداں ہو گے تو مجھے تمہارے متعلق ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

بڑے دن سے مراد ہے قیامت کا دن جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہو گی بلکہ وہ (عذاب کا دن) غیر محدود ہو گا (یعنی کافروں کے لیے عذاب غیر مختتم ہو گا اور مؤمنوں کیلئے ثواب لا متناہی)

اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ تمہارے تمام امور کا رجوع اللہ ہی کی طرف ہے۔ (دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)

وَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۴ اور وہ ہی ہر شے پر قدرت رکھتا ہے۔

یعنی دنیا اور آخرت میں ہر جگہ سزا جزا دینا اس کے اختیار میں ہے۔ یہ آیت سابق آیات کی تاکید اور تقریر ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوْا مِنْهُ ۭ یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کر دیتے ہیں اپنے سینوں کو (اور اوپر سے کپڑا لپیٹ لیتے ہیں) تاکہ اپنی باتیں خدا سے چھپا سکیں۔

بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ کچھ لوگ یعنی کچھ مسلمان خلوت میں بھی برہنہ ہونے اور کھلی جگہ میں عورتوں سے صنفی قربت کرنے سے شرماتے تھے ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ اور ابن مردویہ نے بھی بواسطہ محمد بن عباد بن جعفر حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

ابن ابی شیبہ، ابن جریر اور ابن المنذر نے باسناد ابن ابی ملیکہ لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت اَلَآ اِنَّهُمْ يَثْنُوْنَ

صُدُوْرَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ پڑھ کر فرمایا کہ لوگ کپڑوں میں لپٹے لپٹائے رفع ضرورت اور عورتوں سے قربت کرتے تھے کھلی فضا میں برہنہ ہونا ان کو پسند نہ تھا۔

بغوی نے عبداللہ بن شدادؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول بعض منافقون کے حق میں ہوا تھا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جب ان کا گذر ہوتا تھا تو وہ سینہ اور پشت کو حضور ﷺ کی طرف سے موڑ کر سر جھکا کر منہ چھپا کر نکل جاتے تھے۔ تاکہ رسول اللہ ﷺ کی نظر ان پر نہ پڑ جائے، ابن جریر وغیرہ نے بھی، عبداللہ بن شداد بن ہاد کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے۔ مگر یہ روایت قابل پزیرائی نہیں کیونکہ آیت تو مکی ہے اور منافق مدینہ میں (ہجرت کے بعد) پیدا ہوئے (مکہ میں کوئی منافق نہیں تھا) بہرحال اس روایت کے بموجب مِنْهُ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہوگی (اللہ کی طرف راجع نہیں ہوگی)۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت اخنس بن شریق کے متعلق نازل ہوئی یہ شخص بڑا شیریں کلام اور خوش رو تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے سامنے آتا تھا تو وہی بات کہتا تھا جو حضور ﷺ کو پسند ہوتی تھی مگر دل میں اس کے خلاف پوشیدہ رکھتا تھا، اس وقت يَثْنُونَ صُدُوْرَهُمْ سے مراد یہ ہوگی کہ وہ سینوں کے غلاف کے اندر کفر، کینہ اور رسول اللہ ﷺ کی دشمنی چھپائے رکھتے ہیں۔

قتادہ نے کہا وہ سینوں کو ٹیڑھا کرتے اور جھکا لیتے تھے تاکہ اللہ کی کتاب اور اللہ کا ذکر نہ سن پائیں۔

سدی نے کہا یثنون کا لفظ ثَنَيْتُ عِنَانِي کے محاورے سے بنایا گیا ہے (میں نے لگام موڑ لی) یعنی وہ اپنے دلوں سے اعراض کرتے ہیں (دلوں کا رخ موڑ لیتے ہیں) بعض روایات میں (ضعیف قول یہ بھی) آیا ہے کہ بعض لوگ اپنی کوٹھڑی میں گھس کر دروازہ کا پردہ چھوڑ کر سینہ کو جھکا کر اور چادر اپنے بدن پر لپیٹ کر کہتے تھے کہ کیا اللہ اب بھی میرے دل کی بات جان سکتا ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

أَلَا حِيْنَ يَسْتَغْشُوْنَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ خوب سن لو وہ لوگ جب اپنے کپڑے اوڑھ لیتے ہیں یعنی سروں کو کپڑوں سے چھپا لیتے ہیں، تب بھی اللہ ان امور سے واقف ہوتا ہے جن کو وہ (دلوں کے اندر یا کسی اور طریقہ سے) چھپاتے ہیں اور ان باتوں کو بھی جانتا ہے جن کو وہ (زبانوں سے) ظاہر کرتے ہیں۔

إِنَّهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ یقیناً اللہ سینوں یا دلوں کے اندرونی رازوں کو خوب جانتا ہے۔ اور جب اللہ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں تو اپنے رسول اور مؤمنوں کو جن باتوں سے واقف کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے اور آئندہ جس بات سے آگاہ کرنا ہوگا کر دے گا۔



بارھواں پارہ شروع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

پارہ وما من دابۃ (ھود)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا اور نہیں ہے زمین پر کوئی رینگنے والا جانور مگر اللہ ہی کے ذمہ ہے اس کی روزی، کیونکہ اللہ نے اپنی رحمت اور مہربانی سے ہر جاندار کی پرورش کرنا اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔[1]

عَلَى اللّٰهِ (بذمۂ خدا) کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اس امر کی طرف کہ رزق ضرور پہنچے گا، اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہیے اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ علی اللہ میں علی بمعنی من یعنی وہ مقررہ رزق جو علم میں ہے اللہ کی طرف سے بندہ کو ملے گا اللہ اس کا ذمہ دار ہے کسی دوسرے کی طرف سے نہیں مل سکتا۔ مجاہد نے کہا رزق سے مراد وہ رزق ہے جو اللہ کی طرف سے مقرر ہے بعض اوقات اللہ رزق نہیں دیتا اور آدمی بھوکا مر جاتا ہے۔

وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا اور وہ ہر ایک کی (مستقل) قیام گاہ اور (عارضی) قرار گاہ کو جانتا ہے۔

بغوی نے ابن مقسم کا قول نقل کیا ہے اور یہی قول ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی آیا ہے کہ مستقر سے مراد ہے وہ جگہ جہاں رات دن جاندار رہتا اور ادھر ادھر گھوم پھر کر پھر اسی جگہ آکر قرار پکڑتا ہے اور مستودع سے مراد ہے دفن ہونے کی جگہ۔ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک مستقر سے مراد ماں کا پیٹ اور مستودع سے مراد باپ کی پشت ہے۔ سعید بن جبیر، علی بن طلحہ اور عکرمہؒ کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے بعض علماء کے نزدیک مستقر سے مراد جنت یا دوزخ اور مستودع سے مراد قبر ہے کیونکہ حسنت مستقرا جنت کے لیے اور ساءت مستقرا دوزخ کے لیے فرمایا ہے۔

كُلٌّ فِي كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝ ہر ایک یعنی ہر جاندار اور ہر جاندار کا حال اور رزق لکھا ہوا ہے۔ کھلی کتاب یعنی لوح محفوظ یا اعمال لکھنے والے فرشتوں کے کتابچوں میں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ نے مخلوقات کی قسمتیں لکھ دی تھیں، حضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ (اس وقت) اللہ کا تخت پانی پر تھا (رواہ مسلم)

حضرت ابن مسعودؓ کا بیان ہے کہ اللہ کی سچے رسول ﷺ نے ہم سے فرمایا کہ تم میں سے (ہر) ایک کا مادۂ تخلیق ماں کے پیٹ میں چالیس روز بصورتِ نطفہ جمع رہتا ہے، پھر اتنی ہی مدت میں بصورتِ علقہ (بستہ خون یا جونک) ہوتا ہے، پھر اتنی ہی مدت

(۱) دابۃ۔ رینگنے والا جانور دبیب رینگنا۔ عموماً عرف عام میں دابہ چوپایہ کو کہتے ہیں لیکن اس جگہ لغوی معنی مراد ہے یعنی ہر جاندار جو زمین پر چل سکتا ہے خواہ کوئی کیڑا ہو یا چوپایہ یا پرندہ یا آدمی۔

اہل سنت کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ اللہ پر کوئی عمل واجب نہیں، لیکن اللہ اگر اپنی رحمت سے خود کسی بات کا وعدہ فرمالے تو تکمیل وعدہ واجب ہے جیسے نیکوں کا جنت میں داخلہ، مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے رحمت و مہربانی کا لفظ بڑھا کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

میں بوٹی (بے جان لوتھڑا) پھر اللہ ایک فرشتہ کو چار باتیں لکھنے کے لیے مامور فرماتا ہے وہ فرشتہ اس کا عمل، اس کی مدت زندگی (یا وقتِ موت) اور اس کا رزق اور اس کا سعید یا شقی (نیک بخت مؤمن یا بد نصیب کافر) ہونا لکھ دیتا ہے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

حضرت ابو درداءؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ہر بندے کی پانچ باتیں لکھنے سے فارغ ہو چکا ہے۔ مدتِ زندگی، اعمال، مقام موت، آثار، رزق، رواہ احمد۔

گویا اس آیت میں اللہ کا عالمِ کل ہونا اور آئندہ آیت میں اللہ کا قادر مطلق ہونا توحید ثابت کرنے اور مندرجہ بالا وعدہ و وعید کو پختہ کرنے کے لیے بیان کیا گیا ہے (اس آیت سے اللہ کے علم کا ہمہ گیر ہونا اور اگلی آیت وھو الذی سے اللہ کی قدرت کا محیطِ کل ہونا ظاہر کیا جا رہا ہے تاکہ گذشتہ آیت میں جس توحید اور وعدہ و وعید کا ذکر کیا گیا تھا اس کا اثبات اور تقریر ہو جائے)۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ اور وہ اللہ وہی تو ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو مع ان کی تمام موجودات کے چھ روز میں اندازہ کے مطابق پیدا کیا۔ آسمانوں سے مراد ہیں بالائی چیزیں اور زمین سے مراد نشیبی چیزیں، یعنی کائنات بالا و پست۔ آسمانوں کو بصیغۂ جمع اور زمین کو بصیغۂ واحد ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ کائناتِ علویہ میں سے ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات سے جدا ہے اور ہر ایک دوسرے سے اصل کے اعتبار سے مختلف ہے اور کائناتِ سفلیہ کی اصل وذات ایک ہے۔[1]

وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ اور (آسمان و زمین کی پیدائش سے پہلے) اس کا تخت پانی پر تھا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ پانی ہوا کی پشت پر تھا، کعب احبار کا قول ہے کہ اللہ نے ایک یاقوت سبز پیدا کیا اور اس پر نظر جلال ڈالی تو وہ آب لرزاں بن گیا، پھر اللہ نے ہوا کو پیدا کیا اور اس کی پشت پر پانی کو قائم کیا) پھر عرش کو پانی پر قائم کیا۔ ضمرہ نے کہا اللہ کا تخت پانی پر تھا، پھر اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور قلم کو پیدا کیا پھر اس سے وہ تمام چیزیں لکھدیں جو ہونے والی تھیں اور جن کو وہ آئندہ پیدا کرنے والا تھا اور ہر مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہزار برس تک قلم نے اللہ کی تسبیح و تحمید کی تھی۔

حضرت عمران بن حصینؓ کی روایت سے بخاری نے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس سے پہلے کوئی چیز نہ تھی اور اس کا تخت پانی پر تھا۔ پھر اس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور یادداشت (غالباً لوح محفوظ) میں ہر چیز لکھ دی (الحدیث)

عرش کے متعلق جو اخبار و احادیث آئی ہیں ان کا کچھ حصہ سورۂ بقرہ کی آیت الکرسی کی تفسیر کی ذیل میں ہم لکھ چکے ہیں۔

لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے اچھے عمل کرنے والا کون ہے۔

یعنی باوجود عالمِ کل ہونے کے پھر بھی جانچ کرنے والے ممتحن کی طرح تمہارے ساتھ معاملہ کرے تاکہ تمہارا استحقاق ثواب و عذاب ظاہر ہو جائے کیونکہ آسمان و زمین اور ان کی موجودات تمہاری ہستی اور معاش کے اسباب و ذرائع اور اصول ہیں ان سے تمہارے تمام احوال و اعمال وابستہ ہیں انکا تقاضا ہے کہ تم اپنے رب کا شکر ادا کرو پھر یہ ساری کائنات وجودِ صانع کی دلیل اور (توحید صانع کی) خصوصی نشانی ہے اس سے تم معرفتِ الٰہیہ حاصل کر سکتے ہو۔

لِيَبْلُوَكُمْ کا تعلق خَلَقَ سے ہے گویا اس لفظ سے اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ سارے جہان اور موجوداتِ جہان کی تخلیق بجائے خود مقصود نہیں بلکہ تخلیق انسان اور انسانوں میں بھی اہل ایمان کی تخلیق کی تمہید ہے اور مؤمنوں میں سے بھی ان لوگوں کی پیدائش کا تمہیدی مقدمہ ہے جن کے اعمال اچھے ہوں۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ سے مشابہت رکھنے والے

---

[1] (۱) حضرت مفسر کی یہ تشریح فلسفہ مشائیہ کے طبعزاد مسلمہ پر مبنی ہے کہ ہر آسمان کا مادہ دوسرے آسمان کے مادہ سے جدا ہے رہی صورتِ جسمیہ اور نوعیہ وہ تو بہر حال الگ الگ ہی ہے اور تمام عناصر کا مادہ ایک ہے اور صورتِ جسمیہ بھی طبعیت نوعیہ ہے جس کا تحقق تمام عناصر میں برابر ہے۔ البتہ ہر عنصر کی صورت نوعیہ جدا جدا ہے، مگر یہ فلاسفہ کی خرافات ہے اسلامی تصریحات میں کسی جگہ اس کی تائید نہیں ملتی۔ واللہ اعلم۔ (مترجم)

صالحین۔
اَحْسَنُ عَمَلاً میں عمل کا لفظ عقیدہ اور افعالِ اعضاءِ جسمانی دونوں کو شامل ہے۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے کمزور سند سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا کہ اَحْسَنُ عَمَلاً (سے مراد ہے) سب سے اچھی سمجھ والا ممنوعاتِ الٰہیہ سے سب سے زیادہ پرہیز رکھنے والا اور اوامر کی تعمیل میں تیزی کرنے والا۔ بلاشبہ سب سے اچھے اعمال دلوں کے اعمال (عقائد و میلانات) ہیں اور قلبی اعمال میں سے بھی سب سے اچھا عمل اللہ کی محبت اور اس کی یاد میں ڈوب جانا ہے۔

خلاصہ یہ کہ آسمان و زمین کو پیدا کرنے کا مقصدی نقطہ اہل اللہ کا وجود ہے۔ لفظ احسن تعلیم دے رہا ہے اس بات کی کہ علم و عمل کے درجات پر زیادہ سے زیادہ چڑھنا چاہئے۔

وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ⑦ اور اگر آپ ان (مشرکوں) سے کہیں کہ مرنے کے بعد تم کو یقیناً اٹھنا ہوگا تو منکر کہتے ہیں کہ یہ تو کھلے ہوئے جادو کے سوا اور کچھ نہیں۔

هٰذَآ یعنی مرنے کی بعد جی اٹھنا یا قیامت کا قول، یا یہ قرآن جس کے اندر قیامت کے آنے کا ذکر ہے، کھلا ہوا جادو ہے۔ ابن ابی حاتم نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب آیت اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ نازل ہوئی تو کچھ لوگوں نے کہا قیامت تو قریب آچکی (اس ڈر کی وجہ سے) کچھ لوگوں نے برے کام چھوڑ دیئے مگر کچھ ہی مدت بعد پھر بدکرداری میں مبتلا ہوگئے، اس پر آیت اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوئی یہ سن کر کچھ لوگ کہنے لگے لو حکم خدا آہی پہنچا۔ یہ خیال کر کے ڈر کر گناہ چھوڑ دیئے مگر کچھ مدت کی بعد پھر اسی بداعمالی کی طرف لوٹ گئے، تو مندرجہ ذیل آیت نازل ہوئی۔ ابن جریر نے بحوالہ ابن جریج بھی ایسا ہی بیان کیا ہے۔

وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اور اگر کچھ مدت ہم ان سے عذاب کو ملتوی رکھتے ہیں تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ عذاب کو کون چیز روک رہی ہے۔ صاحب قاموس نے لفظ اُمَّةٍ کی معانی میں سے ایک معنی وقت بھی لکھا ہے، بغوی نے اس کا ترجمہ اجل کیا ہے (یعنی میعاد) اصل میں امۃ جماعت کو کہتے ہیں یعنی ایک جماعت کے ختم ہونے اور دوسری جماعت کے پیدا ہونے تک، بیضاوی نے امۃ کا ترجمہ اوقات کا مجموعہ کیا ہے اور معدودۃ کا ترجمہ قلیل۔

ع ۱ ۸ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑧ یاد رکھو جس روز (مقررہ وقت پر) عذاب ان پر آپڑے گا تو پھر کسی کے ٹالے نہ ٹلے گا اور جس (عذاب) کا مذاق بناتے تھے وہ ان کو آگھیرے گا۔

یعنی وہ عذاب جو اللہ کے علم میں مقرر ہے جیسے جنگِ بدر کا عذاب ان پر جس دن آجائے تو پھر اس کو نہیں لوٹایا جائے گا اور جس عذاب کا یہ مذاق بنایا کرتے تھے اور بطور استہزاء کہتے تھے کہ آیا کیوں نہیں، آنے سے کون مانع ہے فوراً آجائے وہ عذاب ان کو ہر طرف سے گھیرے گا (پھر بچاؤ کا ہر راستہ بند ہو جائے گا) چونکہ آئندہ عذاب کا آنا یقینی تھا اس لیے ماضی کا صیغہ استعمال کیا گویا وہ آچکا اس میں تحقق وقوع کے لیے قوت کے ساتھ تہدید بھی ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ⑨ اور اگر ہم انسانوں کو (بلا استحقاق) اپنی طرف سے رحمت یعنی کسی نعمت (امن، صحت، دولت وغیرہ) کا مزہ چکھا دیتے ہیں پھر کچھ مدت کے بعد اس سے اپنی نعمت چھین لیتے ہیں تو وہ بالکل نراس اور ناشکرا ہو جاتا ہے۔

الانسان (میں الف لام جنسی ہے) یعنی عام انسان۔ یئوس بالکل نراس، ناامید، نعمت کے زوال کی بعد چونکہ اس کو صبر

نہیں رہتا اور اللہ پر اس کا اعتماد نہیں ہوتا اور حکم خداوندی پر وہ رضامند نہیں ہوتا، اس لیے قطعاً حصول نعمت سے ناامید ہو جاتا ہے اور سابق اور موجود نعمتوں کو بھی بھول جاتا ہے، پچھلی نعمتوں کی بھی ناشکری کرنے لگتا ہے اور جو نعمتیں بالفعل اس کو حاصل ہوتی ہیں ہستی بقاء ہستی زندگی اور اس کے باقی رکھنے کے اسباب سب کو بھول جاتا ہے بالکل ناسپاس ہو جاتا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ۝۱۰

اور اگر تکلیف پہنچنے کے بعد ہم اس کو راحت کا مزہ چکھا دیتے ہیں (دکھ کے بعد کچھ سکھ دیتے ہیں) تو انسان کہتا ہے اب تو تمام مصیبتیں مجھ سے چلی گئیں (اللہ کی طرف مصائب دور کرنے کی نسبت نہیں کرتا بلکہ تقاضاء نیچر کے زیر اثر مصائب کا خاتمہ سمجھتا ہے) یہ حقیقت ہے کہ وہ بڑا اترانے والا شیخیاں مارنے والا ہو جاتا ہے۔

حصولِ مقصد سے دل میں جو لذت پیدا ہوتی ہے اس کو فرح (یا فرحت) کہتے ہیں فَرِحٌ سے مراد ہے نعمت پر مغرور اترانے والا اَفَخُوْرٌ بڑا شیخی باز جو اپنے کو نعمت کا حقدار قرار دیتے ہوئے لوگوں پر اپنی فوقیت جتاتا ہے اور یہی اکڑ اور غرور اس کو ادائے شکر سے روکتے ہیں۔

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ؕ　　مگر وہ لوگ مستثنیٰ ہیں جنہوں نے (مصائب پر) صبر رکھا اور نیک کام کیے۔

یعنی اہل ایمان اس ضابطہ سے مستثنیٰ ہیں وہ نراس اور ناشکرے نہیں ہوتے بلکہ اللہ کے فضل کے امیدوار رہتے ہیں اور اس کی سابقہ و موجودہ نعمتوں کے شکر گذار ہوتے ہیں نہ اتراتے اور اکڑتے ہیں نہ نعمت پا کر دوسرں پر اپنی بڑائی جتاتے ہیں۔ یہ خصوصیت اہل ایمان کی ہی ہے کہ دکھ میں صبر کرتے اور سکھ میں شکر ادا کرتے ہیں۔

حضرت صہیبؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کی ہر بات اچھی ہے اور یہ خصوصیت صرف مؤمن ہی کی ہے اگر اس کو سکھ ملتا ہے تو شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہو جاتا ہے۔ (راوہ مسلم)

فراء کے نزدیک استثناء منقطع ہے اور اِلَّا کا معنی ہے "لیکن، اس صورت میں اَلْاِنْسَانَ (میں الف لام عہدی ہوگا اور اس) سے مراد ہوگا کافر انسان۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ۝۱۱　　یہ ہی لوگ ہیں جن کے لئے (اللہ کی طرف سے گناہوں کی) مغفرت اور بڑا اجر ہے یعنی اللہ کی خوشنودی اور جنت۔

حضرت عیاض بن حمار اشجعیؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ تواضع کرو کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے، رواہ مسلم۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ　　سو شاید آپ (تنگ ہو کر) ان احکام میں سے چند جو وحی کے ذریعہ سے آپ کے پاس بھیجے جاتے ہیں چھوڑ دینے والے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مشرکوں نے کہا تھا کوئی ایسا قرآن پیش کرو جس میں ہمارے معبودوں کو بُرا نہ کہا گیا ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس قول پر بعض مایوحٰی سے مراد ہوگی وہ وحی جس میں کافروں کے معبودوں کو برا کہا گیا ہو۔

(چونکہ آیت میں لفظ لعلّ آیا ہے جس کا معنی ہے شاید، توقع ہے اور رسول اللہ ﷺ کی شان کے خلاف تھا کہ وہ کافروں کی رعایت سے وہ آیات بیان کرنا ترک کر دیتے جن کے اندر مشرکوں کے بتوں کو برا کہا گیا ہے پھر شاید اور توقع ہے کہنے کا کیا مکان تھا اس لیے) بیضاوی نے (اس شبہ کو دور کرنے کے لیے) لکھا ہے کہ کسی چیز کا سبب، داعی اگر موجود ہو تب بھی اس چیز کا وقوع ضروری نہیں۔ ممکن ہے کہ داعی ہونے کے باوجود کوئی مانع بھی موجود ہو جس کی وجہ سے اس شئی کا وقوع نہ ہو سکے۔ اس جگہ بھی یہی صورت ہے کہ گو ترکِ تبلیغ کی توقع کا سبب موجود ہے، لیکن رسول خیانت سے پاک ہوتا ہے وہ وحی میں خیانت

نہیں کر سکتا اور تبلیغ میں تقیہ رسول کی ذات سے ناممکن ہے، اسی لیے ترکِ تبلیغ کی توقع کا وقوع نہیں ہو سکتا میں کہتا ہوں بیضاوی کی اس تقریر سے یہ شبہ دفع ہو گیا کہ اللہ کی طرف سے کسی چیز کی توقع کا اظہار ہو تو اس چیز کا وقوع لازم ہے (کیونکہ اللہ کے لیے کسی حالت کا انتظار ناممکن اور دلیل عجز ہے اس کے لیے ہر منشاء کا وقوع بالفعل ضروری ہے۔)

وَضَآئِقٌۢ بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ یَّقُوْلُوْا لَوْلَاۤ اُنْزِلَ عَلَیْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ مَلَكٌ اور آپ کا دل اس بات سے تنگ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ (اگر یہ نبی ہیں تو ان پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا، یا ان کے ساتھ کوئی فرشتہ (جو ہم سے بھی کلام کرتا) کیوں نہیں آیا۔

یعنی آپ کو ان کے اس قول سے دلی تنگی ہوتی ہے کہ محمد ﷺ پر کوئی خزانہ کیوں نازل نہیں ہوا کہ بادشاہوں کی طرح لوگوں کو اپنا تابع اور اور فرماں بردار بنانے میں خرچ کرتا یا اس کے ساتھ کوئی (محسوس) فرشتہ کیوں نہیں آیا جو اس کے تصدیق کرتا۔ حاصل یہ کہ ان کے اس قول سے آپ کبیدہ خاطر اور ملول ہوتے ہیں۔ عبداللہ بن امیہ مخزومی نے یہ بات کہی تھی، آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ چونکہ مشرک اللہ کی وحی کی کوئی قدر نہیں کرتے اس لیے آپ شاید وحی کے بعض حصوں کی تبلیغ ترک کر دیں مگر اللہ کے حکم کو ترک کرنے سے آپ کا دل تنگ ہوتا ہے، ترکِ امرِ الٰہی موجبِ دل تنگی ہے اور تعمیل حکم سببِ انشراح صدر اور ترکِ تبلیغ کا باعث یہ ہو کہ یہ لوگ آپ کے قول کی ہنسی اڑاتے ہیں آپ کو یہ اندیشہ ہے کہ یہ استہزاء کریں گے اور اللہ کی بھیجی ہوئی وحی کو رد کر دیں گے اور ان کی اس بات سے آپ کو کبیدگی خاطر ہوتی ہے کہ وہ کہتے ہیں اس پر کوئی خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا اور تصدیق کرنے والا کوئی فرشتہ اس کے ساتھ کیوں نہیں ہوتا۔ اِنَّمَاۤ اَنْتَ نَذِیْرٌ

آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں، آیاتِ عذاب پیش کرنے والے ہیں وہ رد کر دیں نہ مانیں یا سوائے اس قرآن کے کسی دوسرے قرآن کے طلبگار ہوں آپ پر اس کا کوئی جرم عائد نہیں ہوتا پھر کوئی وجہ نہیں کہ آپ ان کے استہزائیہ قول اور رد کر دینے کے خوف سے تبلیغ وحی ترک کر دیں یا ان کے اس قول سے کبیدہ خاطر ہوں۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ وَّكِیْلٌ ﴿۱۲﴾ اور اللہ ہر چیز کا نگراں (اور ذمہ دار) ہے۔ اور ان کو ان کے قول کی سزا ضرور دے گا۔

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ کیا کفار کہتے ہیں کہ محمد ﷺ نے قرآن خود اپنی طرف سے بنایا ہے آپ کہہ دیجئے (اگر یہ بات ہے) تو پھر تم بھی اس جیسی ہی دس سورتیں بنا کر پیش کرو۔

......ایک شبہ......

سورۂ یونس میں آیا ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ۔ ایک سورت اس جیسی پیش کرو۔ مگر غیر مسلم ایک سورت بھی قرآن جیسی نہیں پیش کر سکے اب یہاں دس سورتیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی اس کے کیا معنی۔ جو شخص سائل کو ایک روپیہ دینے سے قاصر رہا ہو اس سے کیا دس روپیہ طلب کیے جا سکتے ہیں کیا اس قسم کا کلام نامناسب بلکہ مہمل نہیں سمجھا جائے گا۔

......ازالہ......

سورۂ ہود کی یہ آیت جس میں دس سورتیں پیش کرنے کی دعوت دی گئی ہے پہلے نازل ہوئی پھر جب دس سورتیں نہیں پیش کی جا سکیں تو سورۂ یونس میں صرف ایک ہی سورت پیش کرنے کا مطالبہ کیا گیا سورۂ یونس کا نزول اس سورت کے بعد ہوا۔

مبرد نے اس جواب کو خلاف واقعہ قرار دیا ہے اور صراحت کی ہے کہ سورۂ یونس ہی پہلے نازل ہوئی پھر شبہ کا جواب کیا ہوگا۔ مبرد نے کہا دونوں سورتوں میں مثلیت کا مفہوم جدا جدا ہے۔ سورۂ یونس میں قرآن جیسی ایک سورت پیش کرنے کی دعوت دی، یعنی غیبی اطلاعات، احکام، وعدۂ ثواب اور وعید عذاب میں گزشتہ آسمانی کتابوں کے طرز پر کوئی ایک سورت بنا لاؤ۔

مگر وہ ایسا نہ کرسکے تو اب اس سورت میں دس سورتیں بنا کر پیش کرنے کی دعوت دی جو صرف بلاغت اور حسنِ طرز میں قرآن جیسی ہوں ــــ میں کہتا ہوں جب وہ لوگ ایسا بھی نہ کرسکے تو پھر سورۂ بقرہ میں فرمایا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ (یعنی ندرتِ اسلوب اور بلاغتِ کلام میں دس سورتیں قرآن جیسی پیش نہیں کرسکتے تو) صرف ایک ہی صورت صرف عبارت کی ساخت کے لحاظ سے اس کی طرح بنالاؤ۔

مُفْتَرَيَاتٍ　(دس سورتیں) خود ساختہ۔ اپنی طرف سے بنائی ہوئی۔

آخر تم لوگ بھی میری طرح خالص عرب اور قادر الکلام ہو بلکہ بڑے مشاق ہو باہم سیکھتے سکھاتے اور کہتے بتاتے ہو۔

وَّادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٣﴾　اور اللہ کو چھوڑ کر (اور جن کو چاہو) اور جن کو بلا سکتے ہو اپنی مدد کے لیے بلالو اگر سچے ہو (تو ایسی کوشش کر دیکھو)

فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ　پھر اگر کفار تم لوگوں کا چیلنج پورا نہ کرسکیں۔

لکم کی ضمیرِ خطاب یا تو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے، تعظیم رسول کے لیے جمع کی ضمیر استعمال کی گئی ہے۔ یا مسلمان مخاطب ہیں کیونکہ مسلمان بھی مشرکوں کو مقابلہ کی دعوت دیتے تھے اور جو حکم رسول اللہ ﷺ کو دیا گیا تھا کہ کافروں کو دعوتِ مقابلہ دو، وہ حکم ضمناً تمام مسلمانوں کو بھی تھا۔ کیونکہ سوائے بعض خاص خاص احکام کے باقی احکام کے مکلّف رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تمام مسلمان بھی ہیں۔ یا مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کرنے سے اس بات پر تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ دعوتِ مقابلہ سے مسلمانوں کے ایمان میں ثبات اور یقین میں مزید استحکام پیدا ہوگا اس لیے اس سے غفلت مسلمانوں کو نہ کرنی چاہیے۔ اسی وجہ سے آگے فرمایا۔

فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ　پس جان لو کہ قرآن اللہ کے علم کے ساتھ اتارا گیا ہے اللہ کے سوا نہ کوئی اس (کی حقیقت) کو جانتا ہے نہ اس کو بنا سکتا ہے۔

وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ　اور یہ بھی جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں ــــ کیونکہ اللہ ہی ایسے امور سے واقف اور ان چیزوں پر قادر ہے جن کا علم وقدرت اس کے سوا کوئی نہیں رکھتا۔ ان کے (باطل) معبود بالکل عاجز ہیں اور اس کلام کی سچائی اس بات ہی سے ثابت ہوتی ہے کہ کوئی ایسا کلام نہیں بنا سکتا۔ اس کلام میں تہدید بھی ہے اور اس امر کی طرف اشارہ بھی کہ اللہ کے عذاب سے مشرکوں کے معبود نہیں بچا سکتے۔

فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ ﴿١٤﴾　پس کیا تم اب بھی مسلمان ہوتے ہو (یا نہیں) یعنی کیا تم اسلام پر ثابت قدم، مستحکم اور مخلص الارادہ رہو گے جب کہ قرآن کا اعجاز تمہارے نزدیک محقق ہو گیا تو کیا اسلام پر جمے رہو گے (یعنی جمے رہو)

یہ بھی ممکن ہے کہ مذکورہ بالا تمام خطابات کے مخاطب مشرک ہوں اور لَّمْ يَسْتَجِيبُوا کی ضمیر فاعلی مَنِ اسْتَطَعْتُم کی طرف راجع ہو، مطلب اس طرح ہوگا کہ جب اے مشرکو! تمہارے مددگاروں نے دعوتِ مقابلہ قبول نہیں کی اور تم جان گئے کہ وہ سب اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز ہیں تو اب تم کو جان لینا چاہیے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اللہ ہی نے اپنی طرف سے اتارا ہے اور تم کو جو توحید کی دعوت دی جارہی ہے وہ سچی ہے پس کیا ایسی قطعی دلیل اور روشن حجت کو دیکھ کر تم اسلام میں داخل ہو جاؤ گے (یا اب بھی اپنی سرکشی پر قائم رہو گے)۔

کلام کا سوالیہ طرز ایک بلیغ اسلوب ہے، طلب فعل اور امر کا، اور تنبیہ ہے اس بات پر کہ اب ہر قسم کا عذر ختم ہو گیا اور تعمیلِ حکم کا موجب ناقابلِ انکار ہے۔

مَن كَانَ يُرِيدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ فِيهَا وَهُمْ فِيهَا لَا يُبْخَسُونَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ إِلَّا النَّارُ　جو شخص (اپنے نیک اعمال سے) محض دنیوی زندگی (کی منفعت) اور اس کی رونق حاصل کرنا چاہتا ہے تو ہم ان کو ان کے اعمال کا دنیا میں ہی پورا پورا بدلہ دیتے ہیں اور ان

کے لیے دنیوی زندگی میں ثواب کی کمی نہیں کی جاتی یہ ایسے لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں بجز دوزخ کے اور کچھ نہیں۔

یعنی جو لوگ اپنے عمل اور نیکی کے عوض محض (دنیوی زندگی کی درازی، صحت، مال واولاد کی کثرت، حسین بیویاں اور نوکر چاکر، خدمت گار حاصل کرنا چاہتے ہیں، ہم دنیا میں ان کو یہ چیزیں ان کے اچھے اعمال کے بدلہ میں پوری پوری دیدیتے ہیں کسی قسم کی حق تلفی اور ادائے عوض میں کمی نہیں کرتے مگر آخرت میں ان کے اچھے عمل کا کوئی اچھا بدلہ نہیں دیا جائے گا۔ وہاں سوائے دوزخ کے ان کو اور کچھ نہیں ملے گا کیونکہ اچھے کاموں کا اچھا بدلہ تو ان کو دنیا میں دے دیا جاتا ہے اور برے کام رہ جاتے ہیں سو ان کا برا بدلہ آخرت میں ملے گا۔

وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا اور انہوں نے دنیا میں جو کچھ اچھا کام کیا تھا وہ آخرت میں سب کا سب ناکارہ ثابت ہوگا۔

یعنی دنیا میں جو انہوں نے نیکیاں کی ہوں گی ان کا ثواب آخرت میں باقی نہیں رہے گا یا یہ مطلب ہے کہ آخرت میں ان کے لیے کوئی ثواب نہ ہوگا، کیونکہ انہوں نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تو نیکیاں کی نہیں تھیں کہ ان کو آخرت میں اجر دینا اللہ کے ذمے ضروری قرار پاجاتا۔

فیہا کی ضمیر اگر آخرت کی طرف لوٹائی جائے تو اس کا تعلق حبط سے ہوگا۔ اور اگر دنیا کی طرف راجع کی جائے تو صنعوا سے تعلق ہوگا۔

وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾ اور جو (نیکیاں دنیا میں) وہ کرتے ہیں وہ حقیقت میں بے کار جائیں گی، کیونکہ جس جذبے کے تحت ان کو ہونا چاہیے تھا وہ جذبہ اور وہ رُخ مفقود تھا۔ بظاہر معلوم ہورہا ہے کہ یہ آیت کافروں کے حق میں ہے۔ بخاری نے ایک طویل حدیث حضرت عمرؓ کی روایت کردہ بیان کی ہے اس میں حضرت عمرؓ کا یہ بیان مذکور ہے میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خدا کی قسم مجھے رسول اللہ ﷺ کے گھر میں سوائے تین کچے چمڑوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ دعا فرمایئے کہ اللہ آپ کی امت کو فراخی عنایت فرمادے۔ اہل فارس اور اہل روم کو تو اللہ نے وسعتِ مالی عطا فرمائی ہے اور باوجود کہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے مگر ان کو دنیا دیدی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت تکیہ لگائے ہوئے تھے یہ سن کر بیٹھ گئے اور فرمایا ابن خطاب کیا تم اس خیال میں ہو (یہ لوگ تو دنیا کے طالب ہیں پس) ان کو دنیوی زندگی میں ان کی لذتیں دے دی گئی ہیں اور مؤمن کا مقصد دنیا اور آخرت دونوں ہیں اور ارادۂ آخرت غالب ہے اس لیے اس کو نیکیوں کا بدلہ دنیا میں بھی دے دیا جاتا ہے اور آخرت میں بھی نیکیوں کا ثواب دیا جائے گا۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ مؤمن پر ظلم نہیں کرتا (اس کی) نیکی کا اجر دنیا میں (بھی) اس کو دیا جاتا ہے اور آخرت میں اس کا ثواب دیا جائے گا رہا کافر کہ اس کی نیکیوں کے عوض دنیا میں اس کو کھانے کو دیا جاتا ہے پھر جب آخرت میں پہنچے گا تو اس کی کوئی نیکی ہی نہ ہوگی جس کی وجہ سے اس کو کوئی بھلائی دی جائے۔ رواہ مسلم واحمد۔

میں کہتا ہوں آیت لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ میں خود قرینہ ہے کہ اس کا نزول کافروں کے حق میں ہوا کیونکہ باجماع علماء اہلِ ایمان کا آخر کار جنت میں جانا ثابت ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ آیت کا نزول ریاکاروں (دکھانے کے لیے نیکی کرنیوالوں) کے حق میں ہوا حضرت ابو سعید بن فضالہ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب قیامت کے دن (یعنی ایسے دن) جس کے آنے میں کوئی شک نہیں، اللہ سب لوگوں کو جمع کرے گا تو ایک منادی ندا دے گا جس نے کوئی عمل اللہ کے لیے کیا ہو مگر اس میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کرلیا ہو تو وہ اپنے عمل کا اجر اسی شریک سے طلب کرے اللہ تو ہر شرک سے بے نیاز ہے۔ رواہ احمد۔

حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کے نیت آخرت کی طلب کی ہوتی ہے اللہ اس کے دل میں (دنیا کی ہر چیز سے) بے نیازی پیدا کردیتا ہے اور اس کی پریشان حالی کو ٹھیک کردیتا ہے اور دنیا ذلیل ہو کر اس کے پاس (دوڑتی) آتی ہے

اور دنیا کی طلب کی نیت ہوتی ہے تو فقر (احتیاج) کو اللہ اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان پیدا کر دیتا ہے (یعنی اس کی سامنے احتیاجات وضروریات غیر محدود طور پر آجاتی ہیں) اور اللہ اس کو پریشان حال کر دیتا ہے اور دنیا اتنی ہی اس کو ملتی ہے جتنی اللہ نے اس کے لیے لکھ دی ہے۔ رواہ الترمذی، یہ حدیث امام احمد اور دارمی نے بوساطت ابان حضرت زید بن ثابتؓ کی روایت سے نقل کی ہے۔

......ایک شبہ......

آیت نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اور حدیث لَا يَاْتِيْهِ مِنْهَا اِلَّا مَا كُتِبَ لَهٗ میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اعمال کا بدلہ پورا پورا دے دیا جاتا ہے اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ لکھ دیا ہے وہی ملتا ہے اس سے زائد نہیں ملتا۔

ازالہ :- دونوں میں کوئی تضاد نہیں، تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ ملنا بھی اللہ نے لکھ دیا ہے پس اعمال کا پورا بدلہ ملے گا یعنی وہی ملے گا جو لکھا ہوا ہے اس سے زائد نہیں ملے گا خواہ دنیا طلب آدمی اَن گنت چیزوں کا طلب گار ہو (ایک حدیث کا مفہوم ہے) اگر آدمی کے پاس دو وادی بھر سونا ہو تب بھی وہ تیسری وادی (زریں) کا طالب ہوتا ہے۔

میں کہتا ہوں اگر آیت کا حکم ریاکاروں کے متعلق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جو اعمال انہوں نے دکھاوٹ کے لیے کئے ہوں گے ان کا بدلہ سوائے دوزخ کے اور کچھ نہ ہوگا۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ　کیا منکرِ قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے جو اس قرآن پر قائم ہو جو اس کے رب کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

بینہ دلیل جو حق اور امرِ صحیح کی راہنمائی کرتی ہے جس کی روشنی میں وہ بت پرستی چھوڑ کر خدا پرستی اختیار کرتا ہے اور دنیا کی (ناجائز) فانی لذتوں کو ترک کر کے آخرت کی دوامی راحت کو پسند کرتا ہے۔

اس جملے کی خبر محذوف ہے اور مَنْ كَانَ مبتدا ہے اور فَمَنْ میں فاء تعقیب کے لیے ہے اور استفہام انکاری ہے۔ صحیح علم کے ...... بعد بھی جو لوگ کافروں اور ریاکاروں کا طریقہ اختیار کرتے ہیں ان کی سزا بھی دوزخ ہے۔ دونوں باہم مشابہ ہیں۔

اصل کلام اس طرح تھا کہ جو شخص خدا کی نازل کردہ دلیل پر قائم ہو، کیا وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو محض دنیا کا طلب گار ہے۔ مَنْ كَانَ سے مخلص مؤمن مراد ہیں۔ بعض علماء کے نزدیک رسول اللہ ﷺ مراد ہیں یعنی حضور ﷺ کی ذات مع متبعین کے۔ کیونکہ لفظ مَنْ عام ہے (خاص ذات مراد لینے کی کوئی وجہ نہیں) پھر آگے آیت اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ میں مَنْ کی طرف جمع کی ضمیر بھی لوٹائی گئی ہے۔

بقول ابو الشیخ ابو العالیہ اور ابراہیم نخعی کے نزدیک مَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ سے رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی مراد ہے۔ ابن مردویہ اور ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ کی طرف بھی اس تفسیر کی نسبت کی ہے ابو النعیم نے لمعرفۃ میں بھی اس قول کو نقل کیا ہے۔ بَيِّنَة سے مراد "قرآن مجید" ہے۔

وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ　اور اس بینہ (قرآن) کی اللہ کی طرف سے ایک شاہد (یعنی جبرئیل یا اللہ کا رسول) تلاوت کرتا ہے۔

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى　اور اس کے (نزول سے) پہلے موسیٰؑ کی کتاب (یعنی توریت اللہ کی طرف سے شاہد ہے جو قرآن کی تصدیق کر رہی ہے) اِمَامًا وَّرَحْمَةً ط وہ (موسیٰؑ کی کتاب) ہے جو تعلیم احکام کے لحاظ سے) امام اور رحمت ہے۔ شاہد سے مراد جبرئیلؑ ہیں، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابو الشیخ، اور ابن مردویہ نے مختلف سندوں سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ میں

"شاہد" سے جبرئیلؑ مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ پر نازل کردہ کتاب کی تلاوت کرتے تھے اور جس طرح قرآن رسول اللہ ﷺ پر انہوں نے تلاوت کیا اسی طرح اس سے پہلے توریت کی تلاوت حضرت موسیٰؑ پر انہوں نے کی تھی۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے علاوہ اس تفصیل کی نسبت علقمہ، ابراہیم، مجاہد، عکرمہ، ضحاکؒ اور اکثر اہل تفسیر کی طرف بھی کی ہے۔

حسن اور قتادہ کے قول پر "شاہد" سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک، یعنی قرآن کی تلاوت کرے گا اللہ کی طرف سے ایک شہادت دینے والا جو محمد رسول اللہ ﷺ تھے اور قرآن کی صداقت کی شہادت حضرت موسیٰؑ کی کتاب بھی دے رہی ہے جو قرآن سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت محمد بن علی بن ابی طالب (یعنی محمد بن حنیفہؓ) کا بیان نقل کیا ہے۔ محمد نے فرمایا میں نے اپنے والد (حضرت علیؓ) سے عرض کیا، لوگوں کا خیال ہے کہ آیت وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ میں شاہد سے مراد آپ ہیں، فرمایا کاش وہ میں ہوتا مگر (ایسا نہیں ہے) وہ شاہد محمد ﷺ کی زبان مبارک تھی، ابوالشیخ نے ابونجیح کی سند سے مجاہد کا بھی یہی قول نقل کیا ہے (کہ "شاہد" سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں) بعض علماء کا قول ہے تبلو (تلاوت سے مشتق نہیں ہے بلکہ) تِلْوٌ سے مشتق ہے اور تلو کا معنی ہے پیروی کرنا پیچھے چلنا اور شاہد سے مراد ہے۔ محافظ فرشتہ۔ اور يَتْلُوْهُ کی مفعولی ضمیر مَنْ كَانَ کی طرف راجع ہے یا بینۃ کی طرف جس کا معنی ہے۔ برہان، دلیل، واضح۔ اور وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى ایک الگ جملہ ہے اس سے نئے کلام کا آغاز کیا گیا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ مَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ رسول اللہ تھے اور شاہد ایک فرشتہ تھا جو آپ ﷺ کی حفاظت پر مامور تھا۔ بعض لوگوں کا یہ بھی قول ہے کہ شاہد سے مراد حضرت علیؓ ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قریش کے ہر آدمی کے متعلق کوئی نہ کوئی آیت ضرور نازل ہوئی ہے کسی نے عرض کیا آپ کے متعلق کیا نازل ہوا؟ فرمایا (آیت) وَيَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ (میرے متعلق نازل ہوئی)

حضرت علیؓ کو شاہد کیوں کہا گیا۔ اس کی توجیہ شاید یہ ہو کہ سب سے پہلے آپ ہی ایمان لائے رسول اللہ ﷺ کی صداقت کی اول ترین شہادت دینے والے آپ ہی ہوئے۔

میرے نزدیک سب سے زیادہ قوی وجہ آپ کو شاہد کہنے کی یہ ہے کہ آپ تمام کمالاتِ ولایت کے مرکزی نکتہ تھے، قطب ولایت تھے، تمام اولیاء بلکہ تمام صحابہ بھی مقام ولایت میں آپ کے پیچھے اور تابع ہیں خلفاء ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ) ضرور آپ سے افضل تھے مگر ان کی فضیلت کی وجہ دوسری ہے جس کی تشریح حضرت مجدد صاحبؒ نے اپنے مکتوبات کے آخر میں کی ہے۔

اس صورت میں آیت کا تشریحی مطلب اس طرح ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ اللہ کی طرف سے ایک قطعی دلیل اور روشن حجت لے کر آئے ہیں جو آپ کی رسالت کو یقینی طور پر ثابت کر رہی ہے یہ روشن دلیل کیا ہے۔ آپ کے معجزات کثیرہ جن میں سے سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور وہ علوم ہیں جو وحی کے ذریعے سے آپ کو حاصل ہوئے پھر آپ کے پیچھے اور آپ کے تابع حضرت علیؓ اور دوسرے اولیاء جو حضرت علیؓ سے مشابہت رکھنے والے ہیں آئے جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت کے شاہد ہیں، اولیاء کی کرامتیں حقیقت میں رسول اللہ کے معجزات ہیں اور اولیاء کے الہامی اور کشفی علوم بھی وہی علوم ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعہ سے حاصل ہوئے تھے، پس اولیاء کی کرامات اور الہامی علوم سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔

ترمذی نے صحیح سند سے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنَا دَارُ الْحِكْمَةِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا میں سچے علوم کا گھر ہوں اور علی اس گھر کا دروازہ ہیں۔ وَاَنَا مَدِيْنَةُ الْعُلُوْمِ وَعَلِيٌّ بَابُهَا اور میں علم کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا دروازہ ہیں۔ فَمَنْ اَرَادَ الْعِلْمَ فَلْيَاْتِ الْبَابَ پس جو علم کا خواستگار ہو اس کو دروازہ پر آنا چاہیے (تاکہ علم کے شہر میں داخل ہو سکے) اس حدیث کو

ابن عدی نے الکامل میں اور عقیلی نے الضعفاء میں اور طبرانی وحاکم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے، نیز ابن عدی اور حاکم نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔ اس حدیث میں حکمت وعلم سے علوم اولیاء کی طرف اشارہ ہے فقہاء کے علوم کی طرف اشارہ نہیں ہے علوم فقہیہ کا مدار تو صرف علیؓ پر نہیں ہے۔ علم فقہ کے متعلق تو رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے میرے صحابی ستاروں کی طرح ہیں جس کی بھی پیروی کرو گے ہدایت یاب ہو جاؤ گے۔

بعض کے نزدیک "شاہد" سے مراد انجیل ہے اور مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰى سے مراد توریت ہے بعض نے کہا بینۃ عقلی برہان ہے اور شاہد قرآن ہے۔ حسین بن فضل نے کہا قرآن کا اسلوب بیان اور اعجاز شاہد ہے مطلب یہ ہے کہ جس کے پاس اپنے مذہب کی کوئی دلیل عقلی اور برہان نقلی نہو اس کی طرح کیا وہ شخص ہو سکتا ہے جس کا قول وعمل دلائل کی بنیاد پر قائم ہے اور اس کی تائید اللہ کی طرف سے نازل شدہ کتاب یعنی قرآن سے بھی ہو رہی ہے اور قرآن سے پہلے حضرت موسیٰؑ کی کتاب بھی برہان نقلی پر (اور قرآن کی تائید میں) شہادت دے رہی ہے۔ اس صورت میں مَنْ كَانَ سے مراد ہوگا سچا مؤمن مخلص۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۚ یہ ہی جماعت اس پر پکا ایمان رکھتی ہے۔

اُولٰئِکَ سے اشارہ مَنْ كَانَ کی طرف ہے کیونکہ بینہ پر قائم رہنے والی مسلمانوں کی جماعت ہے پس مسلمانوں کی جماعت ہی اُولٰئِکَ سے مراد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاہد کی جانب اشارہ ہو بشرطیکہ شاہد سے مراد حضرت علیؓ اور آپ کے پیرو ہوں۔

وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ مِنَ الْاَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهٗ ۚ اور جو شخص دوسرے فرقوں میں سے اس کا انکار کرے گا تو دوزخ اس کے وعدے کی جگہ ہے۔

الاحزاب (گروہ) سے مراد (مسلمانوں کے علاوہ) تمام مذاہب والے ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت (دعوت) میں سے جو کوئی کا فرد مشرک اور یہودی اور عیسائی ایسی حالت میں مرے گا کہ جس (ہدایت) کو مجھے دیکر بھیجا گیا ہے وہ اس پر ایمان نہ لایا ہو گا تو وہ ضرور دوزخیوں میں سے ہو گا۔ (رواہ مسلم)

فَلَا تَكُ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ اِنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۷﴾

سو (اے مخاطب!) تو قرآن کی طرف سے شک میں نہ پڑنا بلا شک وشبہ وہ سچی کتاب ہے تیرے رب کے پاس سے آئی ہے لیکن (باوجود ان دلائل کے) اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔ یعنی فکر کی خرابی اور قوتِ غور کی کمزوری کی وجہ سے اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۭ اور ان لوگوں سے زیادہ ظالم (حق ناشناس) کون ہے جو اللہ پر اپنی طرف سے دروغ بندی کرتے ہیں۔ یعنی کسی کو اس کی اولاد یا شریک قرار دیتے ہیں یا اس کی طرف ان احکام وتعلیم کی نسبت کرتے ہیں جو اس نے نازل نہیں کیے یا ان احکام کا انکار کرتے ہیں جو اس نے نازل کیے ہیں اور کہتے ہیں یہ ہدایات اللہ کی طرف سے نہیں ہیں یا کسی چیز کی تحریم کو اس کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ اس چیز کی تحریم اس کی طرف سے نہیں کی گئی یا کسی چیز کی تحلیل کو اس کی جانب منسوب کرتے ہیں حالانکہ اس چیز کو اس نے حرام کر دیا ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ (قیامت کے دن) ان کو ان کے رب کے سامنے پیش کیا جائے گا .... اور وہ ان سے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ اور گواہ کہیں گے یعنی اعمال لکھنے والے فرشتے کہیں گے۔

ابو الشیخ نے مجاہد کا یہی تفسیری قول نقل کیا ہے۔ لیکن حضرت ابن عباسؓ کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اشہاد سے مراد انبیاء اور پیغمبر ہیں ضحاک کا بھی یہی قول ہے اس تفسیر کی تائید آیت فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا

بِکَ عَلٰی ھٰٓؤُلَآءِ شَھِیْدًا سے ہو رہی ہے (شہید سے مراد بالاتفاق پیغمبر)۔
ابن مبارک نے سعید بن مسیب کا قول نقل کیا ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا کہ ہر پیغمبر کی امت صبح اور شام پیغمبر کے سامنے نہ لائی جاتی ہو پس ان کی خصوصی علامات اور اعمال کو دیکھ کر پیغمبر ان کو پہچان لیں گے اور (قیامت کے دن) شہادت دیں گے۔

قتادہ کے نزدیک ساری مخلوق مراد ہے۔ صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ (قیامت کے دن) اللہ مؤمن کو (اپنے) قریب کر کے اپنا ہاتھ اس کے شانہ پر رکھدے گا اور پوشیدہ طور پر فرمائے گا کیا تو اپنا (فلاں) گناہ جانتا ہے۔ مؤمن عرض کرے گا جی ہاں اے میرے رب، یہاں تک کہ مؤمن کے (سب) گناہوں کا اس سے اقرار کرالے گا اور مؤمن اپنے دل میں خیال کرے گا کہ میں تباہ ہو گیا (اس کے بعد) اللہ فرمائے گا میں نے دنیا میں گناہوں پر پردہ ڈالے رکھا آج میں تیرے وہ گناہ معاف کرتا ہوں پھر نیکیوں کی تحریر اس کو دیدی جائے گی۔ رہے کافر اور منافق ان کو سب مخلوق کے سامنے پکارا جائے گا اور کہا جائے گا۔

ھٰٓؤُلَآءِ الَّذِیْنَ کَذَبُوْا عَلٰی رَبِّھِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۸﴾ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب پر دروغ بندی کی، آگاہ ہو جاؤ اللہ کی لعنت ہے ظالموں پر۔
اللہ پر دروغ بندی ظلم ہے اس ظلم کی پاداش میں جو خوفناک عذاب کافروں اور منافقوں کو گھیرے ہوگا آیت میں اس کی ہیبت ناک تصویر کشی ہے۔

میں کہتا ہوں اشہاد (شہادت دینے والے) صرف وہی نہیں ہوں گے جن کا ذکر (مختلف علماء کے اقوال میں) کیا گیا ہے۔ بلکہ انسان کے جسمانی اعضاء بھی شہادت دیں گے، اللہ نے فرمایا ہے اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓی اَفْوَاھِھِمْ وَتُکَلِّمُنَآ اَیْدِیْھِمْ وَتَشْھَدُ اَرْجُلُھُمْ دوسری آیت میں آیا ہے قَالُوْا لِجُلُوْدِھِمْ لِمَ شَھِدْتُّمْ عَلَیْنَا ایک اور آیت ہے یَوْمَ تَشْھَدُ عَلَیْھِمْ اَلْسِنَتُھُمْ وَاَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ۔
مسلم نے حضرت انسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اللہ نے فرمایا کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا وبالکرام الکَاتِبِیْنَ شَھِیْدًا۔ یعنی منہ پر مہر لگا دی جائے گی اور اعضاء سے کہا جائے گا تم بولو۔
مجملہ دوسرے شاہدوں کے زمانہ اور مقام بھی شہادت دے گا۔ ہم نے سورۂ اِذَا زُلْزِلَتْ کی آیت یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَھَا کی تفصیل کے ذیل میں لکھ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ زمین شہادت دے گی کہ کس بندے اور کس بندی نے اس کی پشت پر کیا کیا، کیا۔
بخاری نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ مؤذن کی آواز جتنی مسافت پر پہنچے گی اور جہاں تک جن وانس اس کو سنیں گے، قیامت کے دن اس کی شہادت دیں گے۔
ابن خزیمہ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ مؤذن کی آواز جو پتھر، ڈھیلا، جن وانس سنے گا مؤذن کیلئے شہادت دے گا۔
ابوداؤد اور ابن خزیمہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ مؤذن کی آواز جہاں تک پہنچے گی (اسی کے مطابق) اس کی مغفرت کی جائے گی اور ہر تر وخشک اس کی شہادت دے گا۔
ابن المبارکؒ نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جو شخص جس مقام کے قریب سجدہ کرے گا وہاں درخت ہو یا پتھر، قیامت کے دن وہ شہادت دے گا، عطاء خراسانی کی روایت سے بھی یہ اثر منقول ہے۔
ابو نعیم نے حضرت معقل بن یسارؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو دن ابن آدم پر آتا ہے اس میں آواز دی جاتی ہے (یعنی دن خود آواز دیتا ہے) اے آدم زاد میں نیا ہوں تو جو کچھ کرے گا کل میں تیرے لئے شہادت دوں گا اس لیے میرے اندر تو نیکی کرنا تاکہ کل کو میں تیرے لیے (اچھی) شہادت دوں۔ میں اگر گذر گیا تو پھر تو مجھے کبھی نہیں دیکھے

گا۔ رات بھی اسی طرح کہتی ہے۔ مسلم نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ مال بڑا سبز اور شیریں ہے اور مسلمان کا اچھا ساتھی ہے اور جو مال قیدی اور یتیم اور (ضرور تمند) مسافر کو دیا جائے گا خود (وہ مال) اس کی گواہی دے گا۔ اور جو شخص بغیر حق کے مال لیتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کھاتا تو ہو اور سیر نہ ہوتا ہو قیامت کے دن یہ مال اس شخص کے خلاف شہادت دے گا۔ ابو نعیم نے طاؤس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن مال اور صاحب مال دونوں کو لایا جائے گا اور دونوں باہم جھگڑا کریں گے (الحدیث)۔

الَّذِیْنَ یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ جو (لوگوں کو) راہ خدا سے روکتے تھے۔ راہ خدا سے مراد ہے اللہ کا دین۔

وَیَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ اور اس میں کجی نکالنے کی تلاش میں رہا کرتے تھے۔ یعنی دین الٰہی کو حق سے پھرا ہوا قرار دیتے تھے، یا یہ مطلب ہے کہ مؤمنوں کو مرتد بنا کر ٹیڑھے راستے پر لے جانے کے خواہشمند تھے۔

وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ⑲ اور وہی آخرت کے بھی منکر تھے۔ یہ جملہ حالیہ ہے ھُمْ کا مکرر ذکر کرنا کافر ہونے کی تاکید کے لیے ہے اور یہ بتانے کے لیے ہے کہ روز آخرت سے انکار ان کی خصوصیت ہے۔

اُولٰٓىِٕكَ لَمْ یَكُوْنُوْا مُعْجِزِیْنَ فِی الْاَرْضِ یہ لوگ (تمام) زمین پر اللہ کو (کہیں بھی) عاجز نہیں کر سکتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ نے معجزین کا ترجمہ کیا ہے" آگے نکل جانے والے"، اور قتادہ نے کیا ہے" بھاگ جانے والے" اور مقاتل نے کیا ہے" چھوٹ جانے والے"۔ مطلب سب کا ایک ہی ہے یعنی یہ لوگ اللہ کو دنیا میں سزا دینے سے روک نہیں سکتے۔

وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِیَآءَ ۘ اور (دنیا میں) اللہ کے عذاب سے ان کو بچانے والا کوئی ان کا حمایتی نہیں، مگر اللہ نے ہی خود ان کے عذاب کو آخرت پر ٹال رکھا ہے تا کہ ان کو عذاب سخت اور لا فانی میں مبتلا کر دے۔ (دنیا کا عذاب کتنا ہی بڑا ہو آخرت کے عذاب کے مقابلے میں کم ہے اور ختم ہو جانیوالا بھی ہے۔ آخرت کا عذاب اس سے بدرجہا شدید اور غیر منقطع ہے)

یُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ ایسے لوگوں کو (اوروں سے) دوگنی سزا ہوگی، بعض علماء نے کہا ہے کہ عذاب کی یہ وجہ ہے کہ یہ دوسروں کو بہکاتے ہیں اور ان کے چیلے ان کی پیروی کرتے ہیں۔

مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا یُبْصِرُوْنَ ⑳ یہ لوگ (گوشِ حق نیوش سے) نہ سن سکتے نہ (چشم بصیرت سے تصویر حق کو) دیکھ سکتے تھے یعنی اللہ نے حق کو سننے کی ان میں استعداد ہی نہیں پیدا کی۔ اس لیے حق کو نہیں سنتے۔ ان کے پاس گوشِ حق نیوش ہی نہیں اور سیدھا راستہ ان کو نہیں دکھائی دیتا، اللہ نے ان کے دلوں میں بصیرت پیدا ہی نہیں کی، اس لیے آیاتِ خداوندی کو دیکھنے سے بے بہرہ ہیں۔

اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے خود اپنا نقصان کیا کہ اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر پتھروں کی پوجا کو اختیار کیا اور جنت دے کر دوزخ مول لی۔

وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ㉑ اور ان کے خود تراشیدہ معبود ان سے غائب اور گم ہو گئے ــــــ یعنی بتوں کی سفارش کرنے کا جو ان کا خیال تھا اور یقین رکھتے تھے کہ بت شفاعت کر کے ان کو بچا لیں گے، ایسا نہ ہو سکے گا۔

لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ㉒ لا محالہ وہ ہی آخرت میں سب سے بڑھ کر نامراد ہوں گے۔ لَاجَرَمَ (کی لفظی ساخت اور معنوی (دلالت) میں علماء کا اختلاف ہے، بعض کے نزدیک لَا زائد ہے، یعنی مشرکوں کے گمان کے موافق ہوگا۔ اس کے بعد جَرَمَ فعل ماضی متعدی ہے اس کے اندر ضمیر فاعل ہے اور اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ مفعول ہے اس وقت جَرَمَ کا معنی ہوگا کَسَبَ یعنی ان کا گمان آخرت میں یہ نتیجہ پیدا کرے گا کہ وہی سب سے خسارے میں رہیں گے یا

جَرَمَ فعل ماضی ہے لازم بمعنی وَجَبَ اور بعد والا جملہ اس کا فاعل ہے یعنی آخرت میں سب سے بڑھ کر نامراد ہونا واجب ہو گیا ہے۔

بعض کے نزدیک لَاجَرَمَ دو لفظوں سے مرکب ہے اور مرکب کا معنی ہے حقا اور بعد والا جملہ فاعل ہے، یعنی ان کا سب سے زیادہ نامراد رہنا حق اور ثابت شدہ ہے یا لَاجَرَمَ کا معنی ہے لامحالہ۔ قاموس میں ہے لَاجَرَمَ اور لَاذَا جَرَمَ اور لَا اَنْ جَرَمَ اور لَا اَنْ ذَا جَرَمَ اور لَاجُرْمَ سب کا معنی ہے کوئی چارہ نہیں کہ، یا یقیناً یا لامحالہ۔ یہ تو لفظ جَرَمَ کی لغوی وضعی تنقیح ہے لیکن استعمال میں کبھی اس کو بجائے قسم کے لے آتے ہیں اور اس وقت جواب میں لَ تاکیدی استعمال کرتے ہیں، جیسے کہتے ہیں لَاجَرَمَ لَاٰتِیَنَّکَ

اَلْاَخْسَرُوْنَ اسم تفضیل کا صیغہ ہے یعنی سب سے زیادہ نامراد اور خسارہ یاب بات یہ ہے کہ دوسروں کی نامرادی تو کفر اور معاصی کی وجہ سے ہوگی، اور یہ خود کافر ہونے کے علاوہ دوسروں کو بھی ایمان سے روکنے والے ہیں اس لیے ان کی نامرادی سب سے زیادہ ہوگی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰی رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾

جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اور (دل سے) اپنے رب کی طرف جھکے وہی جنتی ہوں گے، وہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے۔

حضرت ابن عباسؓ نے اَخْبَتُوْا کا ترجمہ کیا ہے خَافُوْا (ڈرے، اللہ سے خوف کیا) قتادہ نے کہا رجوع کیا، اللہ کی طرف لوٹے، مجاہد نے کہا اطمینان حاصل کر لیا (یعنی ایمان کے بعد مرتبۂ اطمینان پر فائز ہو گئے) قاموس میں ہے اَخْبَتَ فروتنی کی، خشوع کیا خَبِیْثٌ حقیر چیز۔

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ دونوں فریقوں کی مثال (ایسی ہے) دونوں فریقوں سے مراد ہے مؤمنوں کا فریق اور کافروں کا فریق۔

کَالْاَعْمٰی وَالْاَصَمِّ وَالْبَصِیْرِ وَالسَّمِیْعِ ؕ جیسے (ایک) اندھا بہرا ہو اور (دوسرا) بینا شنوا۔ کافروں کے پاس گوشِ حق نیوش نہیں، وہ حق کی بات نہیں سنتے اور راہِ حق نہیں دیکھتے، حق کا راستہ ان کو سجھائی نہیں دیتا، اس لیے وہ اندھے بہرے کی طرح ہیں اور مؤمن پیامِ حق سنتے اور اس کو قبول کرتے ہیں اور راہِ حق اپنی قلبی خداداد روشنی سے دیکھتے ہیں اور اس پر چلتے ہیں اس لیے ان کے حالت بینا اور شنوا کی طرح ہے۔

هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا ؕ کیا یہ دونوں فریق تمثیل میں یا صفت میں یا حالت میں برابر ہیں۔[۱]

اَفَلَا تَذَکَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ کیا اب بھی تم نصیحت اندوز نہیں ہو گے یعنی ان تمثیلات کے بیان اور ان پر غور کرنے کے بعد بھی نصیحت قبول نہیں کرو گے۔ ع

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖۤ ۫ اِنِّیْ لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۲۵﴾ ۙ اور یقیناً ہم نے نوحؑ کو پیغمبر بنا کر ان کی قوم کی طرف بھیجا تھا (اور) نوحؑ نے کہا تھا کہ میں تم کو (اللہ) کے عذاب سے) واضح طور پر ڈرانے والا ہوں۔

مُّبِیْنٌ کا یہ مطلب ہے کہ میں تم کو عذاب اور ثواب کے اسباب سے کھول کر اطلاع دے رہا ہوں۔

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَیْکُمْ عَذَابَ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ﴿۲۶﴾ کھول کر بیان کر رہا ہوں کہ اللہ کی سوا کسی کی پوجا نہ کرو۔ (اگر ایسا نہ کرو گے تو) مجھے دکھ والے دن کے عذاب کا تمہارے متعلق ڈر ہے اَلِیْمٍ بمعنی الم رساں

[۱] مَثَل، مِثَال اور مِثْل کے معنی ہم شبیہ ہم شکل اور نظیر کے بھی ہیں اور صفت کے بھی اور عظیم الشان حالت کے بھی اور نفس کیفیت و حالت کے بھی اس جگہ یا تمثیل مراد ہے یا صفت یا حالت۔ حضرت مفسرؒ کی تشریح میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(دکھ دینے والا) نہ حقیقت میں عذاب کی صفت ہے نہ وقت عذاب کی بلکہ عذاب دینے والا حقیقت میں الم رساں ہوتا ہے عذاب اور زمانِ عذاب کی صفت اس کو مجازاً قرار دیدیا جاتا ہے۔ فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا نوحؑ کی قوم کے کافر سردار بولے ہم تو تم کو اپنی طرح کا آدمی دیکھ رہے ہیں۔ یعنی تم کو ہم پر کوئی ایسی فضیلت نہیں کہ تم واجب الاطاعت نبی ہو جاؤ، گویا ان کی مراد یہ تھی کہ نبی کو بادشاہ یا فرشتہ ہونا چاہئے اور تم نہ فرشتہ ہو اور نہ بادشاہ ہماری طرح معمولی آدمی ہو۔

ملأ (اس کا لغوی ترجمہ ہے" بھرنے والے" مراد سرداران قوم کیونکہ) سرداروں ہی کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں بھر جاتی ہے اور جلسوں میں انہی کی وجہ سے رونق اور شان پیدا ہو جاتی ہے۔

وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ جن لوگوں نے تمہارا اتباع کیا ہے وہ ہم میں نچلے طبقے کے لوگ ہیں اور اتباع بھی کیا ہے تو بغیر سوچے سمجھے کیا ہے۔ رَذْلٌ کی جمع اَرْذَلٌ ہے اور اَرْذَلٌ کی جمع اَرَاذِل جیسے کَلْبٌ کی جمع اکلب اور اکلب کی جمع اکالب۔ ہر نچلے درجے کی چیز کو رذل کہا جاتا ہے۔ عکرمہ نے کہا نچلے طبقے سے مراد تھے جولا ہے، موچی۔ رَأَیَ آنکھوں سے دیکھنا یا دل سے دیکھنا۔ نیز اعتقاد (پختہ خیال) کو رای کہا جاتا ہے۔ (قاموس)

بادی یا بدو (بمعنی ظہور) سے مشتق ہے۔ یعنی بغیر سوچے سطحی ظاہری نظر کے ساتھ۔ یا بَدْء (بمعنی ابتداء) سے ماخوذ ہے یعنی ابتدائی رای، رذیل سمجھنے کی وجہ یا تو یہی تھی کہ انہوں نے بغیر تامل کے حضرت نوحؑ کا اتباع کر لیا تھا یا یہ وجہ تھی کہ وہ غریب تھے، دنیوی مال و جاہ ان کے پاس نہ تھا اور ان کے نزدیک وہی رذیل تھا جو مالدار نہ ہو اور دنیوی عزت وجاہ سے خالی ہو۔

وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا مِن فَضْلٍ اور ہم تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی اپنے اوپر کوئی فضیلت نہیں دیکھتے ___نہ مال میں نہ اور کسی بات میں جس کی وجہ سے تم مستحق نبوت قرار پاسکو۔

بَلْ نَظُنُّكُمْ كَاذِبِينَ ﴿٢٧﴾ بلکہ ہم تم سب کو جھوٹا خیال کرتے ہیں تم کو نبوت کے دعوی میں جھوٹا سمجھتے ہیں اور تمہارے ساتھیوں کو اس دعوے میں کاذب جانتے ہیں کہ ان کو تمہاری سچائی معلوم ہو گئی۔

قَالَ يَا قَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِن كُنتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَآتَانِي رَحْمَةً مِّنْ عِندِهِ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ ﴿٢٨﴾ نوحؑ نے کہا اے میری قوم یہ تو بتلاؤ کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر ہوں (جس سے میری نبوت ثابت ہو رہی ہے) اور اس نے مجھ کو اپنے پاس سے رحمت (نبوت) عطا فرمائی، ہو پھر وہ (دلیل) تم کو نہ سوجھتی ہو تو (میں کیا کروں) کیا ہم اس کو تم پر چمٹا دیں اور تم اس سے نفرت کیے جاؤ۔

بَيِّنَةٍ سے مراد ہے روشن دلیل جو میرے دعوے کی صحت کو ثابت کر رہی ہو۔ رَحْمَةً سے مراد ہے بینة یا ہدایت یا نبوت۔ عُمِّيَتْ تم سے پوشیدہ رکھی جائے تم کو اس کی طرف راہ نہ ملے۔ بَصِيرَةٌ اور مُبْصِرَةٌ دیکھی جانے والی سامنے کی چیز۔ عمیاء اندھی پوشیدہ جہاں تک پہنچنے کا راستہ نہ ملے۔ أَنُلْزِمُكُمُوهَا یعنی تم تو ہدایت چاہتے ہی نہیں برا سمجھتے ہو تو ہم خدا داد بینہ اور رحمت کو تم پر چمٹا دیں گے اور بجز تم سے قبول کرائیں گے ایسا نہیں ہو سکتا قتادہ نے کہا اگر انبیاءؑ میں یہ قدرت ہوتی کہ بجز لوگوں کو مؤمن بنا سکتے تو وہ ایسا بھی کر لیتے مگر ان میں یہ قدرت ہی نہیں تھی۔

وَيَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اور اے قوم والو! میں تم سے تبلیغ کے عوض کسی مال کا تو طالب ہوں نہیں جس کا دینا تم پر بار گزرے اور نہ دو تو مجھ پر بار گزرے۔

إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ (چونکہ اللہ نے اپنی مہربانی سے تبلیغ و ہدایت کا معاوضہ دینے کا وعدہ فرما لیا ہے اس لئے) میرا اجر تو بس اللہ کے ذمے ہے۔

اونچے طبقہ کو نچلے طبقے کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ تھا اس لئے انہوں نے کہا ہم ایمان اس وقت لائیں گے جب تم ان رذیلوں

کو اپنے پاس سے نکال دو گے' اس درخواست کے جواب میں حضرت نوحؑ نے فرمایا۔
وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ مُّلٰقُوۡا رَبِّهِمۡ اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں میں ان کو نکالنے والا نہیں (کیونکہ) یہ لوگ یقیناً اپنے رب سے ملیں گے اور وہاں نکالنے والے سے جھگڑا کریں گے، یا یہ مطلب کہ یہ لوگ رب کے قرب کو پہنچیں گے اور ضرور کامیاب ہو جائیں گے ایسے مقربانِ خداوندی کو میں اپنے پاس سے کیسے نکال سکتا ہوں۔
وَلٰکِنِّیۡۤ اَرٰىکُمۡ قَوۡمًا تَجۡهَلُوۡنَ ﴿۲۹﴾ لیکن واقعی میں تم لوگوں کو دیکھ رہا ہوں کہ جہالت کر رہے ہو۔ یعنی اپنے رب کی پیشی سے ناواقف ہو یا اپنے انجام سے ناواقف ہو یا ان مؤمنوں کے مرتبۂ قرب کو نہیں جانتے یا اس بات سے ناواقف ہو کہ تمہارا ان کو رذیل قرار دینا حماقت ہے یا ان کو نکال دینے کی درخواست نادانی سے کر رہے ہو۔
وَیٰقَوۡمِ مَنۡ یَّنۡصُرُنِیۡ مِنَ اللّٰهِ اِنۡ طَرَدۡتُّهُمۡ ؕ اور اے میری قوم (ایسے مرتبہ والوں کو) جب میں نکال دوں گا تو اللہ سے مجھے کون بچائے گا اور میرے اوپر سے اس کے عذاب کو کون دفع کرے گا۔
اَفَلَا تَذَکَّرُوۡنَ ﴿۳۰﴾ تو کیا اب بھی تم نصیحت پذیر نہ ہو گے۔ اور اتنی بات بھی نہیں سمجھو گے کہ ان کو نکال دینا صحیح نہیں ہے۔
وَلَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰهِ اور میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ اللہ کے دیئے ہوئے رزق کے ذخیرے میرے پاس جمع ہیں یعنی مجھے اس کا دعویٰ نہیں کہ میں تم پر مالی فضیلت رکھتا ہوں اور میرے پاس خدا داد مال کے خزانے ہیں۔
وَلَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں غیب سے واقف ہوں کہ تم کو میری اس بات پر تعجب ہو اور تم مجھے جھوٹا سمجھو یا یہ مطلب ہے کہ میں غیب دان نہیں کہ ان لوگوں کا بغیر غور و تأمل کے محض سطحی طور پر ایمان لانا مجھے معلوم ہو جائے۔
وَلَاۤ اَقُوۡلُ اِنِّیۡ مَلَکٌ اور نہ میں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں کہ تم انکار کر سکو اور تم کو یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ تو ہماری طرح آدمی ہے فرشتہ نہیں ہے۔
وَّلَاۤ اَقُوۡلُ لِلَّذِیۡنَ تَزۡدَرِیۡۤ اَعۡیُنُکُمۡ لَنۡ یُّؤۡتِیَهُمُ اللّٰهُ خَیۡرًا ؕ اور جن لوگوں کو تمہاری آنکھیں حقیر جانتی ہیں میں نہیں کہتا کہ اللہ ان کو بھلائی عطا نہیں فرمائے گا۔
یعنی جن لوگوں کو ان کی مفلسی کی وجہ سے تم حقیر سمجھتے ہو اور ان کو رذیل کہتے ہو چونکہ ظاہری ناداری اور مفلسی کو آنکھوں سے دیکھ کر وہ حقیر جانتے تھے ان کے کمالات اور خصائلِ فاضلہ پر غور نہیں کرتے تھے۔ اس لئے حقیر جاننے کی نسبت آنکھوں کی طرف کلام کو پُرزور بنانے کے لئے کر دی (ورنہ آنکھوں کا کام حقیر جاننا نہیں تحقیر ہو یا اعزاز اس کو جاننا انسان کے دماغ کا کام ہے) بلکہ دنیا میں اللہ نے ان کو ایمان و ہدایت کی جو توفیق عطا فرما دی اور آخرت میں جو بلندئ مرتبہ اور جنت عطا فرمائے گا وہ تمہارے اس دنیوی مال و جاہ سے بہتر ہے (پھر میں کیسے کہہ دوں کہ اللہ ان کو بھلائی نہیں عطا فرمائے گا)
اَللّٰهُ اَعۡلَمُ بِمَا فِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ ۚۖ ان کے دلوں میں (کیسی اللہ کی محبت ہے اور ان کے عقائد و خصائل کتنے صحیح اور اعلیٰ ہیں) جو کچھ بھی ہے اللہ اس سے بخوبی واقف ہے۔
اِنِّیۡۤ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۳۱﴾ ایسی حالت میں (اگر میں ان کو اپنے پاس سے نکال دوں اور کہہ دوں کہ اللہ ان کو کوئی بھلائی عطا نہیں فرمائے گا تو) میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا۔
قَالُوۡا یٰنُوۡحُ قَدۡ جٰدَلۡتَنَا فَاَکۡثَرۡتَ جِدَالَنَا فَاۡتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۳۲﴾
قوم والوں نے کہا نوحؑ جھگڑا تو تم ہم سے بہت کر چکے (یہ باتیں سب بیکار ہیں ان کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا) اب تو وہ عذاب ہم پر لے آؤ جس کی دھمکیاں تم ہم کو دیتے ہو اگر (نبوت کے دعوے میں اور عذاب کی (وعید میں) تم سچے ہو۔
قَالَ اِنَّمَا یَاۡتِیۡکُمۡ بِهِ اللّٰهُ اِنۡ شَآءَ وَمَاۤ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ ﴿۳۳﴾ نوحؑ نے کہا (میرے اختیار میں نہ

عذاب لاناہے نہ تمہاری درخواست فوراً پوری کرنا) اگر اللہ ہی چاہے گا تو تم پر عذاب لے آئے گا اور تم اس کو بے بس بنا دینے والے نہیں (کہ آئے عذاب کو ٹال سکو یا اس سے بھاگ سکو)

وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ

اور اگر اللہ تم کو گمراہ کرنا چاہے اور میں تم کو نصیحت کرنا چاہوں تو میری نصیحت تمہارے لئے کچھ سود مند نہ ہوگی۔

اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ گمراہ کرنے کا تعلق بھی اللہ کی مشیت سے ہے اور مشیتِ الٰہیہ کے خلاف واقع ہونا ناممکن ہے (اگرچہ حکمِ خدا کے خلاف واقع ہونا ممکن ہے بلکہ بکثرت نافرمانیاں کی جاتی ہیں) یا یُغْوِیَکُمْ کے معنی ہیں یُّهْلِكَكُمْ یعنی اللہ اگر تم کو ہلاک کرنا ہی چاہتا ہے تو میری نصیحت تمہارے لئے مفید نہ ہوگی (اور تم ہلاکت سے نہ بچ سکو گے) اس وقت یہ لفظ غَوِیَ الْفَصِیْلُ سے ماخوذ ہوگا (غَوِیَ الْفَصِیْلُ اونٹ کا بچہ ہلاک ہو گیا)

هُوَ رَبُّكُمْ ۔ وہی تمہارا رب ہے یعنی خالق ہے اور جس طرح چاہے تصرف کرنے والا ہے۔

وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۳۴ اور اسی کی طرف تم کو لوٹا کر لے جایا جائے گا، وہی تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمدؐ نے یہ قرآن خود بنا کر اللہ پر دروغ بندی کی ہے (مقاتل) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (اس جملہ کا اور اس کے بعد والے خطابی جملہ کا تعلق بھی حضرت نوحؑ کے قصے سے ہے) کیا نوحؑ کی قوم والے کہتے تھے کہ نوحؑ نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے۔

قُلْ (اے محمدؐ یا اے نوحؑ) آپ کہہ دیجئے۔

اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ اگر میں نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے تو میرے جرم کا وبال مجھ پر پڑے گا۔

اِجْرَامٌ جرم کرنا، گناہ کرنا۔

وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝۳۵ اور میں تمہارے جرم سے پاک ہوں۔ یعنی تم جو کہہ رہے ہو کہ تو نے اللہ پر دروغ بندی کی ہے یہ تم لوگوں کا جرم ہے میں اس سے بیزار ہوں۔

بغوی نے بروایتِ ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ نوحؑ کی قوم والے آپؑ کو اتنا مارتے تھے کہ آپ گر پڑتے تھے اور مردہ سمجھ کر لوگ لبادہ میں لپیٹ کر گھر ڈال جاتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ نوحؑ مر گئے، لیکن دوسرے روز آپ پھر باہر آکر لوگوں کو اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتے تھے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی لاٹھی کے سہارے سے جا رہا تھا اس کا بیٹا ساتھ تھا بیٹے سے اس نے کہا میرے بیٹے اس دیوانے بوڑھے کے دھوکے میں نہ آجانا، بیٹے نے کہا باپ مجھے لاٹھی دیدیجئے، باپ نے لاٹھی دے دی، بیٹے نے لاٹھی لے کر حضرت نوحؑ کے سر پر ماری اور آپ کو سخت زخمی کر دیا اس پر حضرت نوحؑ کے پاس مندرجہ ذیل وحی آئی۔

وَاُوْحِيَ اِلٰى نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ يُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ اور نوحؑ کے پاس وحی بھیجی گئی کہ تمہاری قوم کے جو لوگ ایمان لا چکے (لا چکے) اور کوئی ایمان نہیں لائے گا۔

فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝۳۶ اب جو کچھ (تکذیب اور ایذا کا سلوک) یہ تیرے ساتھ کرتے رہے ہیں اس سے رنجیدہ نہ ہو (عنقریب ان کو ہلاک کر دیا جائے گا)

اللہ نے نوحؑ کو آئندہ کسی کے مؤمن ہونے سے ناامید کر دیا تاکہ آپ لاحاصل تبلیغ کی تکلیف سے محفوظ رہیں اور آئندہ کسی کو سرکشی سے نہ روکیں اور کوئی فکر نہ کریں جب آپؑ کو معلوم ہو گیا کہ اللہ ان کو ہلاک کرنے والا ہے تو دعا کی رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا۔

محمد بن اسحاق نے عبید بن عمیر لیثی کی راویت سے لکھا ہے کہ قومِ نوحؑ والے حضرت نوحؑ کو پکڑ کر پچھاڑ کر اتنا گلا گھونٹتے تھے کہ آپؑ بیہوش ہو جاتے تھے۔ جب آپؑ کو ہوش آتا تو دعا کرتے الٰہی میری قوم کو معاف کر دے وہ نادان ہیں، جب قوم کی

نافرمانی بڑھتی چلی گئی اور قوم کے ہاتھوں سے دُکھ اور اذیت میں اضافہ مسلسل ہوتا رہا تو آپؑ ناامید ہو گئے اور آئندہ نسل کا انتظار کرنے لگے کہ شاید ان کی اگلی نسل ہدایت یاب ہو جائے یونہی نسل در نسل چلتی گئی اور ہر پچھلا اگلے سے زیادہ خبیث ہوتا رہا اور پچھلے لوگ کہنے لگے یہ دیوانہ تو ہمارے باپ دادا کے زمانے سے چلا آتا ہے پاگل ہے وہ اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ آخر حضرت نوحؑ نے اللہ سے اپنا دکھ عرض کیا اور دعا کی رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلاً وَّنَهَاراً اسی کلام کے آخر میں عرض کیا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَی الْاَرْضِ مِنَ الْکَافِرِیْنَ دَیَّارًا اس وقت وحی آئی۔

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا اور بنا کشتی ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق یعنی ہم نے جیسا بنانا تجھے بتایا ہے ویسی بنایا ہمارے حکم کے موافق بنا (اس صورت میں وحی کا معنی ہوگا حکم)

حضرت ابن عباسؓ نے اَعْیُن کا ترجمہ کیا ہے "نظر" اور مقاتل نے اعین سے مراد لی ہے "علم" بعض نے ترجمہ کیا ہے نگرانی، حفاظت۔ آنکھ کو نگرانی اور حفاظت میں دوسرے تمام حواس سے زیادہ دخل ہے اس لئے نگرانی کو اعین (چشم) کے لفظ سے تعبیر کیا۔

وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۳۷﴾ اور ان ظالموں کو (بچانے) کے سلسلہ میں مجھ سے کوئی خطاب (دعا) نہ کرنا کیونکہ بلاشبہ یہ غرق کئے جانے والے ہیں (ان کو ضرور غرق کیا جائے گا) مطلب یہ کہ ان کو ڈبونے کا ازل میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ بغوی نے اس قصّہ کے ذیل میں لکھا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت نوحؑ سے آکر کہا آپ کا رب آپؑ کو کشتی بنانے کا حکم دے رہا ہے۔ نوحؑ نے کہا میں تو نجار (بڑھئی) نہیں ہوں کیسے بناؤں۔ جبرئیلؑ نے کہا آپؑ کا رب فرماتا ہے تو میری آنکھوں کے سامنے ہے کشتی بنا (غلطی نہ ہوگی) نوحؑ بنانے لگے اور ٹھیک ٹھیک بنانے لگے یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپؑ نے کشتی پرندہ کے سینہ کی شکل کی (یعنی سینہ ابھری ہوئی) بنائی۔

وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ اور نوحؑ کشتی بنا رہے تھے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت نوحؑ قوم کی طرف سے غافل ہو کر کشتی بنانے میں مشغول ہو گئے ادھر قوم نوحؑ کی ساری عورتیں بانجھ ہو گئیں اس کے بعد ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ نوحؑ تختے چیرنے اور لوہا لگانے اور کشتی کے لئے ضروری سامان کی تیاری کرنے لگے مثلاً تارکول یا روغنِ قیر (ملنے لگے) لوگ ادھر سے گزرتے اور آپ کو مشغول دیکھ کر کہتے تھے۔

وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَاٌ مِّنْ قَوْمِهٖ سَخِرُوْا مِنْهُ اور جب سردارانِ قوم ادھر سے گزرتے تھے تو نوحؑ سے ٹھٹھا کرتے تھے۔

حضرت نوحؑ خشکی میں کشتی بنا رہے تھے قریب کہیں پانی بھی نہیں تھا اس لئے لوگ ٹھٹول کرتے اور کہتے تھے نوحؑ پہلے تم نبی تھے اب دُرُود گر ہو گئے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ لوگ پوچھتے نوحؑ کیا بنا رہے ہو حضرت نوحؑ جواب دیتے میں ایسا گھر بنا رہا ہوں جو پانی پر چلے گا لوگ آپؑ کی ہنسی بنانے لگتے۔

قَالَ اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ﴿۳۸﴾ نوحؑ نے کہا اگر (آج) تم ہم سے ٹھٹھا کر رہے ہو تو (آئندہ) ہم بھی تم سے ایسا ہی ٹھٹھا کریں گے جیسا تم کر رہے ہو۔ یعنی جس طرح کشتی بنتے دیکھ کر تم ہم سے ٹھٹھا کر رہے ہو آئندہ ہم بھی تم کو طوفان میں ڈوبتے اور دوزخ میں جلتے دیکھ کر ٹھٹھا کریں گے اس کا معنی یا تو یہ ہے کہ جس طرح تم اب ہم کو نادان اور جاہل قرار دیتے ہو، آئندہ ہم بھی تم کو جاہل قرار دیں گے یا یہ مطلب ہے کہ اس وقت تم ہماری ہنسی بنا رہے ہو آئندہ تم کو اپنی اس ٹھٹول بازی کا انجام دیکھنا ہوگا۔

فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اور آئندہ تم کو معلوم ہو جائے گا کس پر رُسوا کن عذاب آئے گا اور اٹل عذاب نازل ہوگا۔ چنانچہ طوفان میں غرق ہونے کا عذاب ان پر آگیا اور سب ڈوب کر عالمِ برزخ میں پہنچ گئے جہاں قیامت تک ان پر عذاب ہوتا رہے گا پھر قیامت میں ان پر عذاب ہوگا اور دوزخ میں

ڈال دیا جائے گا۔

بغوی نے لکھا ہے اہلِ تورات کا خیال ہے کہ اللہ نے نوحؑ کو حکم دیا تھا کہ ساگوان یا سار کی لکڑی کی کشتی بنائیں جس کا سینہ آگے کو نکلا ہوا ہو اور کشتی کے اندر باہر ہر طرف روغنِ قار کا پالش کر دیں، کشتی کی لمبائی اسّی ہاتھ، چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ ہو۔ ہاتھ سے مراد ہے انگلیوں کے پوروں سے مونڈھے تک پورا ہاتھ (یعنی آدھا گز مراد نہیں ہے) اور تین منزلیں بنائیں، نچلی، درمیانی اور بالائی اور بالائی منزل میں دریچے رکھیں۔ حضرت نوحؑ نے حکم کے مطابق کشتی بنائی۔ اسحاق بن بشر اور ابن عساکرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اللہ نے جب نوحؑ کو کشتی بنانے کا حکم دیا تو نوحؑ نے عرض کیا میرے مالک تختے کہاں ہیں اللہ نے فرمایا ساگوان یا سار کا درخت لگاؤ، نوحؑ نے سار کا درخت بویا بیس برس تک وہ درخت پرورش پاتا رہا اس مدت میں نہ حضرت نوحؑ نے تبلیغ کی نہ قوم والوں نے کوئی استہزاء کیا، جب درخت بھرپور ہو گیا تو اللہ کے حکم سے نوحؑ نے اس کو کاٹ کر خشک کیا اور عرض کیا اے میرے رب میں گھر (یعنی کشتی کی شکل) کیسے بناؤں۔ حکم ہوا اس کی تین شکلیں رکھو اگلا سرا تو مرغ کے سر کی طرح ہو اور پچھلا حصہ بھی مرغ کی دم کی طرح اور سینہ پرندے کے سینہ کی طرح (آگے کو نکلا ہو) اور دونوں پہلوؤں پر دریچے ہوں اور لوہے کی کیلوں سے اس کو مضبوط کر دیا گیا ہو۔ اللہ نے جبرئیلؑ کے ذریعہ نوحؑ کو کشتی بنانا سکھا دی۔

ابن عساکر نے سعید بن مسیّب کی وساطت سے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ اور حضرت کعبؓ کا بیان بھی یہی نقل کیا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ نوحؑ نے دو سال میں کشتی تیار کی، کشتی کا طول تین سو ہاتھ اور عرض پچاس ہاتھ اور اوپر کو بلندی تیس ہاتھ تھی۔ کشتی کی ساخت سار کے تختوں کی تھی اور تین درجے تھے، نچلے درجہ میں جنگلی جانور اور درندے اور چوپائے تھے، درمیانی منزل میں گھوڑے، اونٹ (اور پالتو چوپائے) تھے اور بالائی منزل میں حضرت نوحؑ اور آپؑ کے ساتھی اور کھانے پینے کا ضروری سامان تھا۔

ابن مردویہ نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ کشتی کا طول تین سو ہاتھ، عرض پچاس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے جو روایت کی ہے اس میں عرض کا ذکر نہیں ہے عبد بن حمید اور ابن المنذر اور ابوالشیخ نے قتادہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ کشتی کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ اور اونچائی میں لمبائی تین ہاتھ تھی۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے کہ عرض میں اس کا دروازہ تھا۔

ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالے سے بیان کیا کہ کشتی کے تین طبقے تھے، ایک طبقے میں جنگلی جانور، چوپایہ اور درندے تھے دوسرے طبقے میں پرندے تھے۔ شرح خلاصۃ السیرین میں آیا ہے کہ نچلے طبقے میں پرندے، چوپائے اور جنگلی جانور وغیرہ تھے اور درمیانی طبقے میں کھانے پینے کی چیزیں اور کپڑے تھے اور بالائی طبقہ آدمیوں کے لئے تھا۔

شامی نے لکھا ہے کہ کشتی کا طول اسّی ہاتھ تھا اور عرض پچاس ہاتھ اور بلندی اوپر کو تیس ہاتھ اور ہاتھ سے مراد ہے (پنجہ سے مونڈھے تک)

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ کشتی کی لمبائی چھ سو ہاتھ تھی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ایک روایت میں حسن کا قول آیا ہے کہ کشتی کا طول بارہ سو ہاتھ اور عرض چھ سو ہاتھ تھا۔ مشہور اول روایت ہے کہ طول تین سو ہاتھ تھا۔

زید بن اسلم کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ سو برس تک درخت بوتے اور (لکڑی) کاٹتے رہے اور سو برس تک کشتی بناتے رہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ چالیس برس تک درخت بوئے اور چالیس برس تک (ان کی لکڑی کو) خشک کرتے رہے۔ کعب احبار کا قول آیا ہے کہ نوحؑ نے تیس برس میں کشتی بنائی۔ یہ بھی منقول ہے کہ کشتی کی تین منزلیں تھیں، نچلا درجہ چوپایوں اور جنگلی جانوروں کے لئے تھا، درمیانی منزل میں آدمی تھے اور بالائی طبقے میں پرندے، جب جانوروں کا گوبر زیادہ ہو گیا تو نوحؑ کے پاس

وحی آئی ہاتھی کی دُم دباؤ دُم دباتے ہی ہاتھی کے اندر سے ایک سُور اور سُوریا نکل پڑی اور دونوں نے گوبر (کھا کر) صاف کر دیا۔ چوہوں نے جب کشتی کو نقصان پہنچایا اور رسیاں کاٹنے لگے تو اللہ کی طرف سے نوحؑ کو حکم ہوا شیر کی دونوں آنکھوں کے درمیان ضرب لگاؤ، ضرب لگاتے ہی شیر کی ناک کے سوراخوں سے ایک بلی اور ایک بلا نکل پڑے دونوں چوہوں پر دوڑ پڑے۔

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم آ پہنچا اور تنور اُبل پڑا۔

ابوالشیخ نے عکرمہ اور زہری کا قول نقل کیا ہے کہ تنور کا معنی ہے روئے زمین۔ بغوی نے بھی یہی نقل کیا ہے سعید بن منصور، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے اس قول کی نسبت حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی کی ہے صورت اس طرح ہوئی کہ حضرت نوحؑ سے کہا گیا جب تم رُوئے زمین پر پانی اُبلتا دیکھو تو کشتی میں سوار ہو جانا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے قتادہؒ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت میں تنور سے مراد ہے زمین کا اونچا بلند حصہ ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے کہ آیت میں عینُ الوردہ مراد ہے۔ جو جزیرہ میں ایک چشمہ تھا۔

ایک روایت میں حضرت علیؓ کا قول آیا ہے کہ فار التنور کا مطلب یہ ہے کہ فجر نکل گئی اور صبح کی روشنی ہو گئی۔ حسن، مجاہد اور شعبی نے تنور سے مراد یہی تنور بتائی ہے جس میں روٹی پکائی جاتی ہے۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے۔ بروایتِ عطیہ حضرت ابن عباسؓ کا بھی یہی قول آیا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے آیت کا مطلب اس طرح فرمایا جب تم اپنے گھر کے تنور سے پانی نکلتا دیکھو تو سمجھ لو یہ تمہاری قوم کا پیام ہلاکت ہے۔ حسن نے کہا پتھروں سے بنا ہوا ایک تنور تھا جس میں حضرت حواؑ روٹی پکایا کرتی تھیں (وراثتہً) وہ حضرت نوحؑ کے پاس پہنچ گیا اور آپؑ کو حکم ہوا کہ جب تنور سے پانی اُبلتا دیکھو تو تم اپنے ساتھیوں کو لے کر سوار ہو جانا۔

یہ تنور کہاں تھا مجاہد اور شعبی نے کہا کوفہ کے ایک کنارہ پر تھا۔ شعبی نے اللہ کی قسم کھا کر کہا تنور کوفہ کے کنارہ سے ہی جوش زن ہوا تھا۔ نوحؑ نے کوفہ کی مسجد کے اندر ہی کشتی تیار کی تھی اور بابِ کِندہ کی جانب سے مسجد میں داخل ہونے والے کے دائیں جانب وہ تنور تھا اور تنور سے پانی کا اُبلنا حضرت نوحؑ کے لئے (طوفانِ آب کی) علامت تھی۔

ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت علی بن ابی طالبؓ کا قول نقل کیا ہے کہ مسجدِ کوفہ کے اندر بابِ کندہ کی جانب سے تنور اُبلا تھا۔ ابوالشیخ نے باسنادِ شعبی، نقل کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا قسم ہے اس کی جس نے دانہ کو چیرا اور جاندار کو پیدا کیا کہ یہ مسجد مسلمانوں کی چار مسجدوں میں چوتھی مسجد ہے اور سوائے مسجدِ حرام (کعبہ) اور مسجدِ رسول اللہ ﷺ کے دوسری کسی مسجد میں دس رکعت نماز پڑھنے سے اس مسجد میں دو رکعت پڑھنا مجھے زیادہ عزیز ہے۔ اسی کے دائیں جانب قبلہ کی طرف تنور اُبلا تھا۔

مقاتل نے کہا یہ حضرت آدمؑ والا تنور تھا اور شام میں اس جگہ واقع تھا جس کو عین وردہ کہا جاتا ہے۔ ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ یہ تنور ہند میں تھا (معلوم نہیں ہند سے مراد ہندوستان ہے یا وہ مقام جو عراق میں ہے) یہ قول ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور حاکم نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی قرار دیا ہے۔

(فَارَ ماضی کا صیغہ ہے اس کا مصدر فَوْرَانٌ ہے) فوران کا معنی ہے جوش زن ہونا (اُچھلنا اُبلنا)

قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ ہم نے کہا ہر ایک (قسم کے جانوروں) میں سے ایک ایک نر اور ایک مادہ یعنی دو عدد کشتی میں چڑھا لو۔

زوجین زوج نر مادہ کا جوڑ ہوتا ہے اور مادہ نر کا جوڑ، نر یا مادہ کوئی بھی دوسرے سے بے نیاز نہیں ہوتا اس لئے ہر ایک کو جوڑ کہا جاتا ہے ہر ایک موزہ کو دوسرے موزہ کا اور ہر جوتہ کو دوسرے جوتہ کا زوج (جوڑ) کہا جاتا ہے۔ یعنی ہر حیوان کا ایک جوڑا، نر و مادہ، کشتی میں سوار کر لو، لفظ اثنین، زوجین کی تاکید ہے اور زوجین مفعول ہے۔

بغوی نے اسی قصے کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے عرض کیا پروردگار میں ہر ایک کا جوڑا کس طرح لوں، اللہ نے آپ کے سامنے درندوں اور پرندوں کو جمع کردیا اور آپ نے اپنے دونوں ہاتھ ان پر مارے، دایاں ہاتھ نر پر پڑا اور بایاں ہاتھ مادہ پر۔ اس طرح ایک نر اور ایک مادہ آپ کے ہاتھ میں آگیا اور آپ نے ان کو کشتی میں سوار کرلیا۔

وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ اور اپنے گھر والوں کو بھی باستثنا اس کے جس (کے ڈوبنے) کا حکم پہلے ہی نافذ ہوچکا ہے اور (گھر والوں کے علاوہ دوسرے) مؤمنوں کو بھی یعنی ازل میں اللہ نے جن کو غرق کرنے کا فیصلہ کردیا ہے ان کو چھوڑ کر دوسرے گھر والوں کو سوار کرلو۔ حضرت نوحؑ کی بیوی واہلہ اور واہلہ کے پیٹ سے حضرت نوحؑ کا بیٹا کنعان یہ دونوں کافر تھے۔ مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ سے یہ ہی دونوں مراد ہیں۔

وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ اور نوحؑ کے ساتھ ایمان لانے والے بس تھوڑے ہی تھے۔

......نوحؑ پر ایمان لانے والوں کی تعداد کیا تھی؟......

اس کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ قتادہ، ابن جُریج اور محمد بن کعب قرظی کے قول پر کشتی میں سوار ہونے والے صرف آٹھ آدمی تھے، حضرت نوحؑ، آپ کی بیوی، آپؑ کے تین لڑکے سام، حام، یافث اور تینوں کی بیویاں۔

ابن جریر، ابوالشیخ نے ابن جریج کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھ اپنے تینوں بیٹوں اور ان کی بیویوں کو سوار کرلیا تھا۔ حام نے کشتی میں اپنی بیوی سے قربت کرلی، حضرت نوحؑ نے بددعا کی کہ اس کے نطفہ کا رنگ بدل جائے، چنانچہ اس عورت سے حبشی پیدا ہوئے۔

اعمش کا قول ہے کہ کشتی میں کل سات آدمی تھے، نوحؑ ان کے تین بیٹے اور بیٹوں کی تین بیویاں۔

یہ دونوں قول صراحتِ قرآنی کے خلاف ہیں۔ آیت میں مَنْ اٰمَنَ کا عطف اَهْلَكَ پر ہے اور مذکورہ بالا تمام لوگ نوحؑ کے گھر والوں میں داخل تھے۔ (لہٰذا گھر والوں کے علاوہ کچھ دوسرے مؤمنوں کا بھی کشتی میں ہونا لازم ہے)۔

ابن اسحاق نے کہا دس شخص تھے حضرت نوحؑ، آپ کے تینوں بیٹے سام، حام، یافث اور چھ دوسرے مؤمن اور سب کی بیویاں یعنی دس مرد اور دس عورتیں مقاتل نے کہا کل اٹھتر (۷۸) آدمی تھے آدھے مرد اور آدھی عورتیں، تین بیٹے اور ان کی بیویاں اور بہتر (۷۲) دوسرے مؤمن۔

ایک روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ کشتی میں کل اسّی (۸۰) مرد تھے جن میں سے ایک جرہم بھی تھا ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے حضرت ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ نوحؑ نے اپنے ساتھ اسّی آدمیوں کو سوار کرلیا تھا اور آپ کی زبان عربی تھی یہ بھی حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ سب سے پہلے حضرت نوحؑ نے کشتی میں چھوٹی چیونٹی کو لیا اور سب سے آخر میں گدھے کو، گدھا داخل ہونے لگا اور اس کا سینہ اندر آگیا تو ابلیس اس کی دم سے لٹک گیا جس کی وجہ سے اس کی ٹانگیں اٹھ نہ سکیں۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا ارے اندر آجا گدھا اٹھا مگر اٹھ نہ سکا حضرت نے فرمایا ارے اندر آجا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو یہ لفظ بیساختگی میں آپ کی زبان سے نکل گیا ان الفاظ کو سنتے ہی شیطان نے گدھے کا راستہ چھوڑ دیا، گدھا اندر آگیا اور شیطان بھی اس کے ساتھ داخل ہوگیا حضرت نوحؑ نے فرمایا دشمنِ خدا تجھے کس نے داخل کیا۔ شیطان نے کہا آپ نے (گدھے سے) نہیں فرمایا تھا کہ اندر آجا خواہ شیطان ہی تیرے ساتھ ہو۔ آپ نے فرمایا دشمنِ خدا نکل جا۔ شیطان نے کہا اب تو مجھے اپنے ساتھ سوار کرنے کے بغیر آپ کے لئے کوئی چارہ نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے شیطان کشتی کی پشت پر تھا۔

بعض اہل روایت کا خیال ہے کہ سانپ اور بچھو حضرت نوحؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ہمیں بھی چڑھا لیجئے حضرت نے فرمایا تم ضرر رساں اور سببِ مصیبت ہو میں تم کو نہیں چڑھاؤں گا، کہنے لگے آپ ہمیں چڑھا تو لیجئے، ہم ذمہ دار ہیں کہ جو بھی آپؑ کا ذکر کرے گا ہم اس کو ضرر نہیں پہنچائیں گے، چنانچہ جس نے سانپ بچھو کے ضرر کے خوف سے سَلٰمٌ

عَلٰی نُوۡحٍ فِی الۡعٰلَمِیۡنَ پڑھا اس کو سانپ اور بچھو نے کوئی ضرر نہیں پہنچایا۔

حسن کا قول ہے کہ حضرت نوحؑ نے کشتی میں صرف ان جانوروں کو چڑھایا جو بچہ یا انڈا دیتے ہیں جو کیچڑ سے پیدا ہیں جیسے مچھر، پسو وغیرہ ان کو کشتی میں سوار نہیں کیا تھا۔

وَقَالَ ارۡكَبُوۡا فِيۡهَا اور نوحؑ نے کہا کشتی میں سوار ہو جاؤ پڑھتے ہوئے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ مَجۡرٖٮهَا وَمُرۡسٰٮهَا ؕ اللہ ہی کے نام کے ساتھ (یا سبب و مدد سے) ہے کشتی کا چلنا اور لنگر انداز ہونا (یعنی ٹھہرنا) مَجْرٰی اور مُرْسَا یا ظرف زمان ہے یعنی چلنے اور ٹھہرنے کا وقت یا ظرف مکان ہے یعنی چلنے اور ٹھہرنے کا مقام یا مصدر ہے یعنی چلنا اور ٹھہرنا۔

اِنَّ رَبِّیۡ لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۴۱﴾ حقیقت یہ ہے کہ میرا رب بڑی مغفرت اور رحمت والا ہے یعنی اگر وہ تمہارے قصور معاف نہ کرتا اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو تم کو نجات نہ ملتی۔

بغوی نے ضحاک کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے جب ارادہ کیا کہ کشتی روانہ ہو جائے تو بسم اللہ کہا، کشتی چل دی اور جب کشتی کو ٹھہرانا چاہا تو بسم اللہ کہا کشتی ٹھہر گئی۔

وَهِیَ تَجۡرِیۡ بِهِمۡ فِیۡ مَوۡجٍ كَالۡجِبَالِ ۟ اور کشتی ان کو لے کر پہاڑوں جیسی موجوں میں چلنے لگی۔ مَوْجٌ مَوْجَۃٌ کی جمع ہے لہریں۔

وَنَادٰی نُوۡحُ ۨ ابۡنَهٗ وَكَانَ فِیۡ مَعۡزِلٍ اور نوحؑ نے پکارا اپنے بیٹے کو اور بیٹا نوح سے یا دینِ نوحؑ سے الگ تھا۔

یّٰبُنَیَّ ارۡكَبۡ مَّعَنَا وَلَا تَكُنۡ مَّعَ الۡكٰفِرِیۡنَ ﴿۴۲﴾ اے میرے پیارے بیٹے! (ایمان لے آ اور) ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ اور کافروں کے ساتھ نہ رہ۔ (یعنی کافروں کے مذہب یا ہم سے الگ رہنے میں کافروں کے ساتھ شامل نہ ہو) اس بیٹے کا نام کنعان یا عبید بن عمیر یام تھا۔

قَالَ سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ مِنَ الۡمَآءِ ؕ بیٹے نے کہا میں (آپ کے ساتھ سوار نہیں ہوں گا بلکہ) پہاڑ کی پناہ پکڑ لوں گا وہ مجھے پانی سے بچا لے گا (یعنی پہاڑ پر چڑھ کر ڈوبنے سے محفوظ رہوں گا)۔

قَالَ لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ ۚ نوحؑ نے کہا، آج اللہ کے عذاب سے (جس کا حکم ہو چکا ہے) بچانے والا کوئی نہیں، سوائے اس کے جس پر وہ رحم کرے۔

استثناء یا متصل ہے اور مَنْ محلِ رفع میں ہے۔ یعنی رحم کرنے والا اللہ ہی بچا سکتا ہے یا لفظ "مکان" محذوف ہے یعنی اسی شخص کا مقام بچا سکتا ہے جس پر اللہ رحم کر دے یعنی اہل ایمان کا مقام، مطلب یہ کہ پہاڑ وغیرہ کوئی چیز بچا نہیں سکتی، ہاں کشتی جو اہلِ ایمان کا مقام ہے ڈوبنے سے بچا سکتی ہے۔

یا مَنْ محل نصب میں ہے، یعنی آج کوئی بھی محفوظ نہ رہے گا سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے۔ یا استثناء منقطع ہے یعنی سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے اللہ اس کو بچا لے گا۔

وَحَالَ بَیۡنَهُمَا الۡمَوۡجُ فَكَانَ مِنَ الۡمُغۡرَقِیۡنَ ﴿۴۳﴾ اور دونوں کے درمیان یعنی نوحؑ اور ان کے بیٹے کے درمیان یا پسر نوح اور پہاڑ کے درمیان لہریں حائل ہو گئیں اور وہ غرق کردہ لوگوں میں سے ہو گیا۔ یعنی ڈوبنے والوں کے ساتھ وہ بھی ڈوب گیا۔ یا علمِ الٰہی میں پہلے ہی یہ بات تھی، روایت میں آیا ہے کہ پانی پہاڑوں کی چوٹیوں سے چالیس ہاتھ یا پندرہ ہاتھ اوپر چڑھ گیا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے، بعض روایات میں آیا ہے جب گلی کوچوں میں پانی بہت بڑھ گیا تو ایک بچے کی ماں کو اپنے بچے کے ڈوب جانے کا اندیشہ ہوا وہ بچے کو لے کر پہاڑ کی طرف بھاگی۔ پہاڑ کے ایک تہائی حصہ پر ہی چڑھی تھی کہ کچھ دیر میں وہاں تک پانی پہنچ گیا عورت اور اوپر چڑھی اور دو تہائی پہاڑ تک پہنچ گئی، پانی وہاں بھی پہنچ گیا تو عورت اور اوپر چڑھی اور چوٹی پر پہنچ گئی، مگر

قرء حفص بفتح المیم وامالۃ الراء ۱۲

پانی وہاں بھی پہنچ گیا اور عورت کے گلے تک آ گیا اس نے بچے کو دونوں ہاتھوں سے اوپر اٹھالیا، آخر پانی عورت کو بہالے گیا۔ اگر (اس روز) اللہ کسی پر رحم کرنے والا ہوتا تو اس بچے کی ماں پر ضرور کرتا۔

میں کہتا ہوں یہ قصہ اس روایت کے خلاف ہے جس میں آیا ہے کہ طوفان آنے سے برسوں پہلے سے قوم نوح کی عورتیں بانجھ ہوگئی تھیں، طوفان آنے کے وقت کوئی بچہ ہی نہ تھا۔

وَقِيلَ يَاأَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ اور حکم دیا گیا (یعنی امر طوفان پورا ہونے کے بعد زمین کو حکم دیا گیا) اے زمین اپنا پانی پی لے (نگل لے، جذب کرلے) یعنی وہ پانی جو تیرے اندر سے پھوٹ کر نکلا ہے وہ جذب کرلے۔ زمین نے اپنے اندر سے نکلا ہوا پانی جذب کرلیا۔ آسمان سے برسا ہوا پانی باقی رہا اور دریاؤں اور نہروں کی شکل میں (سمٹ کر) بہنے لگا۔

وَيَاسَمَاءُ أَقْلِعِي اور اے آسمان تھم جا، پانی برسانا ختم کردے۔ آسمان سے بارش ہونی بند ہوگئی۔

وَغِيضَ الْمَاءُ اور پانی کم کردیا گیا۔ یعنی اللہ نے پانی کو کم کردیا۔ غِيضَ فعل لازم بھی ہے اور متعدی بھی۔ اس جگہ متعدی ہے۔

وَقُضِيَ الْأَمْرُ اور کام تمام کردیا گیا (کام پورا ہو گیا) یعنی اللہ نے کافروں کو ہلاک کرنے اور مؤمنوں کو بچانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا۔

وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ اور کشتی جُودی پر ٹھہر گئی۔ جُودی جزیرہ میں موصل کے قریب ایک پہاڑ کا نام ہے یا ملک شام میں ایک پہاڑ ہے۔

وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ﴿۴۴﴾ اور کہا گیا (یعنی اللہ نے فرمایا) دوری ہو ظالم قوم کو یا ظالم قوم اللہ کی رحمت سے دور ہوگئی، اور سب ہلاک ہوگئی۔ ع

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت نوحؑ نے زمین کی خبر لانے کے لئے کوے کو بھیجا وہ کسی مردار پر جا پڑا اور لوٹ کر نہیں آیا تو آپؑ نے کبوتر کو بھیجا، کبوتر واپس آیا تو اس کو چونچ میں زیتون کا ایک پتہ تھا اور پاؤں کیچڑ میں آلودہ تھے، یہ حالت دیکھ کر حضرت نوحؑ سمجھ گئے کہ پانی خشک ہو گیا۔ کہا گیا ہے کہ آپ نے کوے کو بد دعا دی کہ ہمیشہ ڈرتا رہے۔ اسی بد دعا کا اثر ہے کہ کوا گھروں میں نہیں رہتا۔ اور کبوتر کی گردن میں ایک سبز کنٹھا ڈال دیا اور اس کو امن کی دعا دی، اس لئے وہ گھروں میں رہنے کا عادی ہے۔

عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے بیان کیا قتادہ نے کہا ہم سے ذکر کیا گیا تھا کہ دس رجب کو کشتی سب کو لے کر اٹھی اور ایک سو پچاس روز پانی میں رہی پھر دس محرم کو جُودی پر ٹھیری اور لوگ زمین پر اترے۔ ابن عساکر نے خالد زیات کی روایت سے اتنا زائد نقل کیا ہے کہ عاشورہ کے دن کشتی ٹھیری۔ حضرت نوحؑ نے اپنے ساتھ والے جن و انس سے فرمایا آج روزہ رکھو۔ بغوی نے بھی لکھا ہے کہ نوح ۱۰ رجب کو کشتی میں سوار ہوئے اور چھ مہینہ تک کشتی چلتی رہی اور بیت اللہ (کعبہ) کی طرف سے گزری تو اس کے گرداگرد سات چکر لگائے کعبے کو اللہ نے اوپر اٹھادیا تھا اس کی جگہ ڈوبنے سے باقی رہ گئی تھی۔ ۱۰ محرم کو کشتی سے اترے حضرت نوحؑ نے شکرانہ کا روزہ خود بھی رکھا اور ساتھ والوں کو بھی حکم دیا۔

بعض اقوال میں آیا ہے کہ صرف ایک کافر یعنی عوج بن عنق ڈوبنے سے بچ گیا تھا طوفان کا پانی اس کی کمر تک آیا تھا، محفوظ رہنے کی وجہ یہ تھی کہ کشتی کے لئے ساکھ کی لکڑیوں کی ضرورت تھی اور ان کو ڈھونا ممکن نہ تھا تو اس نے ملک شام سے خود لاکر حضرت نوحؑ کو لکڑیاں دی تھیں۔

میں کہتا ہوں عوج کی یہ داستان قرآن مجید کی ظاہری عبارت کے خلاف ہے اللہ نے تو فرمایا ہے قَالَ نُوحٌ رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكَافِرِينَ دَيَّارًا دوسری آیت میں ہے قِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ اس سے پہلے آیا ہے لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ إِلَّا مَنْ رَحِمَ (ان تمام آیات سے معلوم ہورہا ہے کہ کوئی کافر زندہ نہیں بچا تھا) عموم آیات سے کسی کی

تخصیص بغیر قطعی نص کے ممکن نہیں اور قصۂ مذکورہ کی تائید نہ عقل سے ہوتی ہے نہ نقل سے۔ (عوج کا قصہ محض افسانہ اور داستان ہے)

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ اور نوحؑ نے پکارا اپنے رب کو اور کہا اے میرے رب یہ واقعہ ہے کہ میرا بیٹا (کنعان) میرے اہل میں سے ہے اور تیرا وعدہ بلا شبہ سچا ہے۔ جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کر لیا ہے (اس لئے میرے بیٹے کو ڈوبنے سے بچالے) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ڈوبنے کے بعد حضرت نوحؑ نے یہ عرض کیا ہو کہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے تھا اور تو نے میرے اہل کو بچانے کا وعدہ کر لیا تھا پھر میرے لڑکے کو کیوں نہیں بچایا۔

وَاَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿۴۵﴾ اور تو سب سے بڑا حاکم ہے۔

کیونکہ تو سب سے زیادہ علم والا اور سب سے بڑھ کر منصف ہے، تیرے حکم کے خلاف نہیں ہو سکتا اور تو قوم کی ہلاکت اور میرے اہل کی نجات کا فیصلہ کر چکا ہے۔ یا احکم الحاکمین کا یہ مطلب ہے کہ تو ہر حکم و حکمت والے سے زیادہ حکمت والا ہے (اس مطلب پر احکم کا ترجمہ ہو گا سب سے بڑی حکمت والا اور الحاکمین سے مراد ہوں گے حکم والے یا حکمت والے)

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۖ اللہ نے فرمایا نوحؑ حقیقت یہ ہے کہ وہ تیرے اہل میں سے ہی نہیں (مؤمن کا کافر سے کوئی رشتہ و ولایت نہیں) کیونکہ اس کے عمل درست نہیں۔ عَمَلٌ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی عمل والا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس کو بچانے کا سوال کرنا درست عمل نہیں ہے۔

فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ؕ پس تو ایسی بات کا مجھ سے سوال نہ کر جس (کے صحیح یا غلط ہونے) کا تجھے علم نہیں۔

چونکہ نوحؑ کی نداء کے اندر نجاتِ اہل کا وعدہ تھا اور وعدہ کو پورا کرنے کی درخواست اس نداء کے اندر مضمر تھی اس لئے نداء کو سوال قرار دیا اور سوال کی ممانعت فرمادی یا یوں کہا جائے کہ وعدہ پورا نہ کرنے کی وجہ نوحؑ نے دریافت کی تھی، اس کو اللہ نے سوال قرار دیا اور ایسے سوال کی ممانعت فرمادی، اور اس سوال کو نادانی قرار دے کر اس سے روک دیا اور بطورِ زجر فرمایا۔

اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۴۶﴾ میں تجھے قطعی نصیحت کرتا ہوں کہ نادانوں میں سے نہ ہو جائے۔

کیوں کہ جب مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ کا نجات سے استثناء کر دیا تو خود ڈوبنے والوں کی کیفیت معلوم ہو گئی، مزید سوال کی ضرورت ہی نہیں رہی (بیان کردہ چیز پر غور نہ کرنا اور نہ سمجھنا اور سوال کرنا نادانوں کا کام ہے)۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد و حسن نے کہا یہ لڑکا حضرت نوحؑ کا نہ تھا حرامی تھا۔ امام ابو جعفر باقرؒ نے فرمایا وہ حضرت نوحؑ کی بیوی کا بیٹا تھا حضرت نوحؑ کا بیٹا نہ تھا، اسی لئے آپ نے مِنْ اَهْلِيْ (میری بیوی کا) کہا تھا۔ مِنِّيْ میرا نہیں کہا۔

حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، ضحاک اور اکثر علماء کا قول ہے وہ حضرت نوحؑ کا ہی حقیقی بیٹا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کسی پیغمبر کی بیوی نے زنا کا ارتکاب کبھی نہیں کیا۔ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ کا ہم مذہب نہیں، آپ کے دین والوں میں سے نہیں یعنی کافر ہے۔ اور اِنِّيْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ کا یہ مطلب ہے کہ خود ہی کافروں کے ہلاک ہو جانے کی دعا کرتے رہے اور خود ہی ایک کافر کو بچا دینے کی درخواست کر رہے ہو یہ نادانی ہے۔

شیخ ابو منصور نے کہا حضرت نوحؑ کا یہ بیٹا منافق تھا ظاہر میں مؤمن باطن میں کافر اور حضرت نوحؑ کو اس کا باطنی کفر معلوم نہ تھا ورنہ آپ کبھی بھی اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ نہ کہتے نہ درخواست نجات کرتے جبکہ کافروں کے سلسلے میں بولنے کی آپ کو ممانعت کر دی گئی تھی اور فرمایا گیا تھا کہ لَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا (کافروں کے بچانے کے سلسلے میں مجھ سے کچھ نہ کہنا) پھر اللہ نے حضرت نوحؑ کو بتا دیا کہ تیرا یہ بیٹا (باطنی طور پر) کافر ہے۔

شیخ کا یہ قول قابل تسلیم نہیں۔ کیونکہ یَا بُنَیَّ ارْکَبْ مَّعَنَا وَلَا تَکُنْ مَّعَ الْکٰفِرِیْنَ قَالَ سَاٰوِیْ اِلٰی جَبَلٍ یَّعْصِمُنِیْ مِنَ الْمَآءِ صراحۃً دلالت کررہی ہے کہ وہ کافر تھا۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْٓ اَعُوْذُ بِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ ؕ وَاِلَّا تَغْفِرْ لِیْ وَتَرْحَمْنِیْٓ اَکُنْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۴۷﴾ نوحؑ نے کہا اے میرے رب جس چیز (کی صحت) کا مجھے علم نہ ہو اس کے متعلق (آئندہ) سوال کرنے سے میں تیری پناہ مانگتا ہوں اور ممانعت کے بعد اپنی اجتہادی غلطی کی وجہ سے جو میں نے کافر کی نجات کی درخواست کی تھی اگر تو میری اس خطا کو معاف نہ کردے گا اور (بصورتِ توبہ و عصمت مجھ پر رحم نہ فرمائے گا تو میں خاسر الاعمال ہو جاؤں گا عملی خسارے میں رہوں گا۔

قِیْلَ یٰنُوْحُ اھْبِطْ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَکٰتٍ عَلَیْکَ وَعَلٰٓی اُمَمٍ مِّمَّنْ مَّعَکَ ؕ کہا گیا اے نوحؑ کشتی سے اترو ہماری طرف سے سلامتی اور برکتیں لے کر جو تم پر نازل ہوں گی اور ان جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں (حضرت مولانا تھانوی نے جودی سے زمین پر اترنا مراد لیا ہے) برکت کا معنی ہے نُمو پذیر خیر۔ برکات سے مراد ہیں اللہ کے قُرب کے درجات اس کی رحمت و فضل، نسل کی کثرت اور قیامت تک ان کی بقاء اور انبیاء و اولیاء کا انہی میں سے پیدا ہونا۔

اُمَمٌ جماعتیں، یعنی وہ لوگ جو حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں سوار تھے۔ وہ خود بھی جماعتوں کی شکل میں تھے اور تمام اقوام انہیں کی نسل سے پیدا ہونے والی تھیں اس لئے ان کو اُمم فرمایا۔ یا مِمَّنْ میں مِنْ ابتدائیہ ہے، یعنی وہ اقوام جو تمہارے ساتھیوں کی نسل سے پیدا ہوں گی ان پر بھی اللہ کی طرف سے سلامتی اور برکات کا نزول ہے۔ محمد بن کعب قرظی نے کہا قیامت تک جتنے مؤمن ہوں گے سب اس لفظ میں داخل ہیں۔

ایک شبہ

آیت وَجَعَلْنَا ذُرِّیَّتَہٗ ھُمُ الْبٰقِیْنَ کہ ہم نے نوحؑ کی نسل کو ہی باقی رکھا بتا رہی ہے کہ صرف حضرت نوحؑ کی نسل باقی رہی، دوسرے ساتھیوں کی نسل باقی نہ رہی۔

ازالہ

بے شک نوحؑ کی نسل ہی باقی رہی لیکن آپ کے ساتھ کشتی میں آپ کے تینوں بیٹے بھی تھے انہی کی نسل چلی اور باقی رہی۔ دوسرے ساتھیوں کی نسل نہیں رہی (مِمَّنْ مَّعَکَ سے تینوں بیٹے ہی مراد ہیں)۔

وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُھُمْ ثُمَّ یَمَسُّھُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۴۸﴾ اور (تمہارے ساتھیوں کی نسل سے) کچھ ایسی قومیں ہوں گی جن کو (تحریر ازلی کے مطابق دنیا میں) ہم بہرہ اندوز کریں گے پھر ہماری طرف سے (آخرت میں ان کے کفر کی وجہ سے) دردرساں عذاب ان کو پہنچے گا۔

بعض علماء کے نزدیک اُمم سے مراد حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کی قومیں ہیں۔ اور عذاب الیم سے مراد ہے دنیوی عذاب۔

تِلْکَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ یہ (نوحؑ کا قصہ) مُجملہ غیبی خبروں کے ہے۔

یعنی جو خبریں تم کو معلوم نہیں تھیں (ان میں سے ایک نوحؑ کا قصہ بھی ہے)۔

نُوْحِیْھَآ اِلَیْکَ ۚ مَا کُنْتَ تَعْلَمُھَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُکَ مِنْ قَبْلِ ھٰذَا ؕ جس کو ہم تمہارے پاس وحی کے ذریعے پہنچا رہے ہیں، نہ تم اس سے پہلے اس کو جانتے تھے اور نہ تمہاری قوم۔ اس کلام میں تنبیہ ہے اس بات پر کہ قصۂ نوحؑ کا علم ایک معجزہ ہے منجانب اللہ، کیونکہ آپ کی پوری قوم اس سے واقف نہیں تھی، ہم نے آپ کو اطلاع دی اور اسی کے

مطابق اطلاع دی جیسی گزشتہ آسمانی کتابوں میں تھی۔ گزشتہ آسمانی کتابوں کے بیان سے اس اطلاع کی مطابقت یقیناً معجزہ ہے۔

فَاصْبِرْ ۛ پس (نوح کی طرح تبلیغِ رسالت پر اور تبلیغ کے راستہ میں کافروں کی طرف سے پہنچنے والے دُکھوں پر) صبر کیجئے ___ کیونکہ

اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۴۹﴾ بلاشبہ (دنیا و آخرت میں) اچھا نتیجہ اور انجام انہیں لوگوں کے لئے ہے جو لوگ شرک و معاصی سے بچنے والے ہیں۔ اس جملہ میں صبر کرنے اور نہ گھبرانے کی علت کا اظہار ہے۔

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۭ اور عاد کے پاس (ہدایت کے لئے) ان کے نسبی بھائی ہودؑ کو ہم نے بھیجا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ۭ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾

ہودؑ نے کہا اے میری قوم (برادرانِ نسب) تنہا اللہ کی پوجا کرو (عبادت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو) اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں (تم جو اس کی عبادت میں بتوں کو بھی حصہ دار بنالیتے ہو اور ان کو دربارِ الٰہی میں اپنا سفارشی قرار دیتے ہو یہ محض اختراع ہے تم محض دروغ بندی کرنے والے ہو (کہ خود ایک عقیدہ تم نے تراش رکھا ہے اور خدا کی طرف اس کی نسبت کردی ہے (مترجم)

يٰقَوْمِ لَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اے قوم والو! میں اس نصیحت کا تم سے کوئی معاوضہ طلب نہیں کرتا کہ تم پر مالی بوجھ پڑے، اور بار پڑنے کی وجہ سے تم میری نصیحت کو نہ مانو۔ یا مال کا لالچ مجھے دروغ تراشی پر آمادہ کرے۔

اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ۭ میرا ثواب تو بس اسی کے ذمّے ہے جس نے مجھے پیدا کیا (یعنی ثواب کا ذمّہ تو اسی نے لے رکھا ہے اس لئے مجھے تم سے کوئی لالچ نہیں۔ مترجم

اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۵۱﴾ کیا تم نہیں سمجھتے۔ یعنی کیا اپنی اپنی عقل سے کام لے کر تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ایسے بے لالچ، مخلص کا قول جھوٹ کے احتمال سے بھی پاک ہوتا ہے اور اس کی تصدیق کرنی تم پر لازم ہے۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اور اے قوم اپنے رب سے مغفرت طلب کرو۔ یعنی سابق شرک اور گناہ کرنے کی معافی مانگو۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان لے آؤ، مسلم ہو جاؤ۔ حضرت عمرو بن عاصؓ کی مرفوع روایت صحیح مسلم میں آئی ہے کہ اسلام گزشتہ (گناہوں) کو ڈھا دیتا ہے۔

ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ پھر (شرک کو چھوڑ کر اور خالص توحید کے ساتھ مطیع بن کر) اس کی طرف لوٹو۔

يُرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا وَّيَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وہ خوب بارشیں تم پر برسائے گا اور تمہاری موجودہ قوت میں مزید ترقی دے گا۔

سورۂ اعراف میں ہم نے بیان کردیا ہے کہ قوم عاد سہ سالہ کال میں مبتلا ہوگئی تھی، تین سال سے بارش نہیں ہوئی تھی اور عورتیں بھی بانجھ ہوگئی تھیں، کسی کے کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ حضرت ہودؑ نے فرمایا اللہ سے استغفار اور توبہ کرو، وہی پانی برسائے گا جس سے تمہاری مالی ترقی ہوگی اور وہی عورتوں کا بانجھ پن دور کرے گا اور بچے پیدا ہونے لگیں گے۔ اس طرح تم کو مال و اولاد کی مزید طاقت حاصل ہو جائے گی۔ بعض نے قوت سے مراد لی ہے بدنی طاقت یعنی اللہ تمہاری جسمانی طاقت بڑھا دے گا۔

وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۵۲﴾ اور مجرم رہ کر رُخ گردانی مت کرو۔ یعنی اپنے جرائم پر قائم رہتے ہوئے میری دعوت سے منہ نہ پھیرو اور جس چیز کی طرف آنے کی میں تم کو دعوت دے رہا ہوں، اس سے اعراض نہ کرو۔

قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ قوم نے کہا ہودؑ تم نے کوئی قطعی دلیل پیش نہیں کی۔ یعنی ایسی دلیل پیش نہیں کی جس سے تمہارے دعوے کی صحت ثابت ہو سکے۔ حضرت ہودؑ نے معجزات تو پیش کئے تھے (جو ثبوتِ رسالت کے لئے کافی تھے) مگر قوم والوں کے دلوں میں عناد تھا اس لئے انہوں نے مذکورہ جملہ کہا۔

وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْٓ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ اور ہم تمہارے کہنے سے اپنے معبودوں کی عبادت چھوڑنے والے نہیں۔ اور نہ ہم تم پر ایمان لانے والے ہیں، یعنی تمہاری تصدیق نہیں کریں گی۔ مطلب یہ کہ نہ تمہارے قول کا عملی اِتباع کریں گے کہ اپنے معبودوں کی عبادت ترک کردیں۔ نہ اعتقادی تصدیق کریں گے۔

اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ اٰلِهَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ ہم تو یہی کہتے ہیں کہ تم کو ہمارے کسی معبود کا جھپٹا لگ گیا ہے۔

اِعْتَرٰی (باب افتعال) عَرٰی یَعْرُوْ سے ماخوذ ہے، عَرٰی کا معنی ہے پہنچ گیا۔ سوء سے مراد ہے۔جنون بدحواسی یعنی تم جو ہمارے معبودوں کو برا کہتے ہو اور ان کی عبادت سے ہم کو روکتے ہو تو ہمارے کسی معبود نے اس کا انتقام تم سے لیا ہے اور تمہارا دماغ خراب کردیا ہے کہ ایسی خرافات بک رہے ہو۔

یا ماضی بمعنی مضارع ہے کہ تم جو معبودوں کو برا کہتے ہو ہمارا یقینی خیال ہے کہ کوئی معبود تم کو پٹ کردے گا ہلاک کردے گا، چونکہ ایسا ہوجانا قوم کے نزدیک ضروری اور یقینی تھا۔ اس لئے قطعی دھمکی دینے کے لئے مضارع کی جگہ ماضی کا صیغہ بولا۔ ہودؑ کا جواب آگے ذکر کیا گیا ہے۔ یہ توجیہ اس کے مناسب ہے۔

قَالَ اِنِّيْٓ اُشْهِدُ اللّٰهَ وَاشْهَدُوْٓا اَنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ﴿۵۴﴾ مِنْ دُوْنِهٖ ہودؑ نے کہا میں اللہ کو شاہد بناتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ تم جو اللہ کے سوا دوسرے (بتوں وغیرہ) کو اس کا شریک قرار دیتے ہو میں اس سے بیزار ہوں۔ میں نہ اللہ کے سوا بتوں کی پوجا کرتا ہوں نہ کسی بت سے ڈرتا ہوں۔

فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا پس اب تم سب (باہم امداد و تعاون کے ساتھ) مجھے دکھ پہنچانے اور ہلاک کرنے کی تدبیریں کر دیکھو۔

ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۵۵﴾ پھر مجھے مہلت بھی نہ دو۔ حضرت ہودؑ کے اس کلام میں اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ تمہاری تدبیریں میری نظر میں حقیر ہیں۔ مجھے اللہ پر پورا بھروسہ ہے۔ تمہارے معبود عاجز ہیں پتھر ہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان۔ آپ کا یہ قول ایک معجزہ تھا جو پورا ہوا، قوم والے شہ زور تھے بڑے طاقتور اور جابر ظالم تھے۔ آپ کے خون کے پیاسے بھی تھے مگر کچھ نہ بگاڑ سکے۔

اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ ؕ مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌۢ بِنَاصِيَتِهَا ؕ مجھے بلاشک و شبہ اللہ پر اعتماد ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی۔ ہر جاندار کو اللہ پیشانی کے بالوں سے پکڑے ہوئے ہے، یعنی ہر جاندار اس کے پورے قابو میں ہے اسی کی قدرت و قابو کے آگے عاجز و ذلیل ہے وہی جیسا چاہتا ہے تصرّف کرتا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ناصیہ کا لفظ خصوصیت کے ساتھ اس لئے ذکر کیا گیا کہ اگر کسی چیز کی ذلت و بے بسی کا اظہار کرنا ہوتا ہے تو عرب کہتے ہیں فلاں شخص کے پیشانی کے بال فلاں شخص کے ہاتھ میں ہیں (جس طرف کو چاہے موڑ دی اردو میں پیشانی کے بالوں کی جگہ گردن کا لفظ بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص کی گردن فلاں شخص کے ہاتھ میں ہے مطلب دونوں محاروں کا ایک ہی ہے۔ مترجم)

ضحاک نے کہا ناصیہ ہاتھ میں ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ ہی زندگی دیتا ہے اور وہی مارتا ہے۔ فراء نے کہا وہی مالک اور قادر ہے۔ قتیبی نے کہا وہی ہر جاندار کو مقہور (بے بس) کردیتا ہے جس کی پیشانی کے بال تم پکڑ لو وہ بے بس (و مقہور) ہوجاتا ہے۔

اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۵۶﴾ یقیناً میرا رب سیدھے راستے پر ہے یعنی حق اور عدل پر قائم ہے نیک کو نیکی کی جزا اور بد کو بدی کی سزا دے گا جو اس کا دامن پکڑ لے کبھی نامراد نہیں رہے گا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖٓ اِلَيْكُمْ ؕ اب اگر (میری دعوت سے) تم اعراض کر رہے ہو تو (میرا کوئی نقصان نہیں) میں تم کو وہ پیام پہنچا چکا جس کو پہنچانے کے لئے مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔

وَيَسْتَخْلِفُ رَبِّيْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۚ (اگر تم اعراض کرو گے تو اللہ تم کو ہلاک کر دے گا) اور تمہاری جگہ دوسرے لوگوں کو لے آئے گا۔ جو موحّد ہوں گے اللہ ہی کے عبادت گزار اور اس کے فرماں بردار ہوں گے۔

وَلَا تَضُرُّوْنَهٗ شَيْـًٔا ۭ اور (روگرداں ہو کر) تم اس کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے (بلکہ اپنا ہی نقصان کرو گے) بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہارا وجود و عدم اس کے لئے برابر ہے۔ اس لئے اگر وہ تم کو ہلاک کر دے گا تو اس کا کچھ بگاڑ نہ ہوگا۔

اِنَّ رَبِّيْ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ حَفِيْظٌ ۝۵۷ میرا رب یقیناً ہر چیز کا نگراں ہے تم جو کچھ کر رہے ہو اس سے پوشیدہ نہیں ہے نہ وہ تم کو سزا دینے سے غافل ہے۔ یا یہ مطلب کہ اللہ ہر چیز پر غالب ہے ہر چیز اس کی نگہداشت میں ہے کوئی چیز اس کو ضرر نہیں پہنچا سکتی۔

وَلَمَّا جَاۗءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُوْدًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا ۚ وَنَجَّيْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ۝۵۸

اور جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم یا عذاب) ان کو پہنچا تو ہم نے ہودؑ کو اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے مؤمنوں کو اپنی مہربانی کے ساتھ بچا لیا اور سخت عذاب سے بچا لیا۔ یعنی ان کے اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنی رحمت سے ان کو محفوظ رکھا یا رحمت سے مراد ہے ایمان، یعنی ہم نے جو ایمان ان کو عطا کیا تھا اس کی وجہ سے ان کو محفوظ رکھا۔ مؤمنوں کی کل تعداد چار ہزار تھی۔ عذابِ غلیظ سے مراد ہے طوفان جس سے قوم عاد کو ہلاک کیا گیا تھا۔

وَتِلْكَ عَادٌ ڐ جَحَدُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهٗ اور یہ ہیں عاد کے قبائل یا عاد کی بستیوں کے نشانات جنہوں نے اپنے رب کی آیات کا انکار کیا اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی یعنی ہودؑ اور دوسرے پیغمبروں کو نہیں مانا۔ ہر پیغمبر توحید کی دعوت دیتا ہے اور ہر پیغمبر کی تصدیق کرتا ہے اس لئے ایک کا انکار سب کا انکار ہے اور ایک کی نافرمانی سب کی نافرمانی۔ قوم عاد نے ہودؑ کی رسالت کا انکار کیا۔ تو گویا پیغمبروں کا انکار کیا۔

وَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ ۝۵۹ اور تمام تر ایسے لوگوں کے کہنے پر چلتے رہے جو ظالم اور ضدی تھے۔

عَنِيْدٌ کسی چیز کو قبول کرنے سے انکار کرنے والے کو کہتے ہیں یہاں مراد ہے حق کو قبول کرنے سے انکار کرنے والا یہ لفظ عَنَدَ يَعْنِدُ عُنُوْدًاؔ سے مشتق ہے۔ عُنُوْدًا انکار کرنا۔

ابو عبیدہ نے کہا عَنید عنود اور مُعانِد مخالفت کرنے والے مقابل کو کہتے ہیں۔ جبارِ عنید سے مراد ہیں قوم عاد کے سرکش سردار یعنی دعوت ایمان دینے والے ہادیانِ برحق کی تو انہوں نے نافرمانی کی اور جو تعلیم ان کے لئے ذریعۂ نجات تھی اس کو ترک کر دیا اور ایسے لوگوں کے پیرو بنے جو کفر کی طرف لے کر جا رہے تھے اور ان کی تعلیم تباہ کُن تھی۔

وَاُتْبِعُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اور اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے (انسانوں اور فرشتوں کی) لعنت ڈالی گئی اور قیامت کے دن بھی (لعنت پڑے گی)۔

لعنت کا معنی اس جگہ ہے اللہ کی رحمت سے دور کر دینا مردود بنا دینا۔ یعنی انسانوں اور فرشتوں کی طرف سے ان پر لعنت ہونے کی دعا پڑے گی۔

اَلَآ اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ۭ گوشِ ہوش سے سن لو کہ عاد والوں نے اپنے رب کا انکار کیا تھا یا رب کی نعمتوں کی ناشکری کی تھی۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ ۝۶۰ ع خوب سن لو دوری ہے (اللہ کی رحمت سے یا ہلاکت ہے) عاد کے لئے جو ہودؑ کی قوم تھی۔ ع ۵/۱۱

ع باب ن، ص، س، کرم تینوں سے اس کا مصدر عُنُوداً آتا ہے۔ (مصحح)

بغوی نے لکھا بُعد کے دو معنی ہیں (۱) دُوری یعنی قُرب کی ضد (۲) ہلاکت۔ وکذافی القاموس۔ جملہ اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ بددعائیہ ہے مراد یہ ہے کہ قوم عاد اپنے مذکورہ جرائم کی وجہ سے اس عذاب کی مستحق تھی جو ان پر آیا (مقصد یہ کہ جملہ اگرچہ دعائیہ انشائیہ ہے مگر خبریہ کے معنی میں ہے دعا وہ شخص کرتا ہے جس کو کسی چیز کی خواہش ہو اور وقتِ دعا تک وہ حاصل نہ ہوئی ہو اللہ تو محتاج نہیں پھر وہ کس طرح اور کس سے دعا کر سکتا ہے اس کے دعائیہ کلام کا مطلب محض خبر ہے اور اس جگہ تو خبر کے ساتھ ساتھ یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ قومِ عاد عذاب کی مستحق ہی تھی جو عذاب ان پر آیا غلط نہیں آیا۔ (مترجم)

قوم عاد کی مزید تشنیع ظاہر کرنے اور ان کی حالت کو سبقِ عبرت بنانے کے لئے حرفِ تنبیہ (اَلَا) کو مکرّر ذکر کیا۔ قوم ہودؑ کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اس بات کی طرف کہ قوم کو استحقاق عذاب ولعنت صرف اس وجہ سے ہوا کہ ہودؑ کی انہوں نے مخالفت کی۔ ہودؑ کے اور قوم کے درمیان جو واقعات ہوئے انہوں نے قوم کو مستحقِ لعنت وعذاب بنا دیا۔ (یہ بھی ممکن ہے کہ قوم ہودؑ کہنے کی یہ وجہ ہو کہ عاد نام کی دو قومیں گزری ہیں، عادِ اُولیٰ اور عادِ ثانیہ، یعنی قومِ ثمود اور آیت میں عادِ اولیٰ یعنی قوم ہودؑ مراد ہے قوم ثمود کا ذکر کرنا اس جگہ مطلوب نہیں ہے)

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اور ہم نے ثمود کی طرف ان کے بھائی صالحؑ کو بھیجا، صالحؑ نے کہا اے میری قوم اللہ کی پوجا کرو اس کے سوا تمہارا اور کوئی معبود نہیں ہے کیونکہ

هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ اسی نے تم کو زمین کے مادہ سے پیدا کیا یعنی تم کو آدمؑ (کی نسل) سے پیدا کیا اور آدمؑ کو مٹی سے۔

وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا اور تم کو زمین میں آباد کیا۔

اِسْتَعْمَرَ کا مادہ عمر ہے اور عمر سے یہ لفظ بنا ہے۔ ضحاک نے ترجمہ کیا ہے تمہاری عمریں دراز کیں، ۳۰۰ سے ۱۰۰۰ برس تک قومِ ثمود والوں کی عمریں ہوتی تھیں۔ قوم عاد کی بھی یہی عمریں تھیں۔

اِسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا کا یہ مطلب بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ نے تم کو زمین میں آباد ہونے کی قدرت دی تم کو زمین کا آباد کرنے والا اور زمین کا باشندہ بنایا۔

مجاہد نے کہا اِسْتَعْمَرَ کا لفظ عُمْرٰی سے مشتق ہے (عُمْرٰی ہبہ کی ایک قسم ہے عمر بھر کے لئے اگر کوئی چیز کسی کو دے دی جائے اور موہوب لہ کے مرنے کے بعد وہ چیز واہب کی طرف لوٹ آئے تو ایسے ہبہ کو عُمْرٰی کہا جاتا ہے) یعنی اللہ نے یہ زمین تمہارے لئے بنا دی ہے جب تک تم زندہ رہو پھر تمہارے مرنے کے بعد اللہ اپنی ملک میں لے لیتا ہے (یعنی تمہارا عارضی قبضہ بھی ختم ہو جاتا ہے) یا یہ مطلب کہ زمین پر مکانوں میں تم کو عمر بھر رکھا جاتا ہے پھر تمہارے مرنے کے بعد تمہارے مکان دوسروں کو دیئے جاتے ہیں۔

فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ پس تم اللہ سے استغفار کرو نادم وشرمسار ہوتے ہوئے اللہ کی طرف رجوع کرو۔

اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ مُّجِيْبٌ ﴿۶۱﴾ بلاشبہ میرا رب اپنے بندوں کے قریب ہے اور ان کی دعاؤں کو قبول کرنے والا ہے۔ یعنی اللہ کا بندوں سے قُرب ذاتی ہے مگر کیفیت معلوم نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ بندوں سے قریب ہے کہ اس نے وجود عطا کیا یا یہ مراد ہے کہ اللہ کی رحمت اپنے دوستوں سے قریب ہے۔

قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قوم ثمود نے کہا صالحؑ تم تو ہم میں ہونہار معلوم ہوتے تھے، یعنی ہمیں امید تھی کہ تم ہمارے سردار ہو گے یا یہ مطلب ہے کہ ہم امید کرتے تھے کہ تم ہمارے مذہب پر رہو گے یا یہ مطلب ہے کہ ہم امید کرتے تھے کہ تم ہمارے مذہب پر رہو گے اور ہمارے دین کی طرف رجوع کرو گے۔

قَبْلَ هٰذَآ اس سے پہلے یعنی نبوّت کے دعوے اور ترکِ بت پرستی کی دعوت سے پہلے لیکن اب چونکہ ہم نے

تمہاری یہ باتیں سن لیں تو ہماری امید تم سے ٹوٹ گئی۔

اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا کیا تم ہمیں ان معبودوں کی پوجا سے منع کیا کرتے تھے (حکایتِ حال ماضی یا منع کرتے ہو) جن کی پوجا ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔

وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ﴿۶۲﴾ اور جس (توحید کو ماننے اور بت پرستی کو ترک کرنے) کی تم ہم کو دعوت دے رہے ہو ہم قطعی طور پر اس کی طرف سے تردد آفریں شک میں ہیں مُرِیْبٌ (اسم فاعل) اَرَابَ فِی الْاُمُوْرِ سے ماخوذ ہے۔ تردد پیدا کر دینے والا۔ یا اَرَابَہٗ سے ماخوذ ہے بے چینی، اضطراب طبع اور بے اطمینانی پیدا کر دینے والا۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ آپ نے فرمایا اے قوم اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلائل پر قائم ہوں اور خدا نے مجھ کو نبوت سے نوازا ہے تب اگر میں خدا کی نافرمانی کرنے لگوں تو خدا کے عذاب سے مجھے کون بچائے گا۔ چونکہ کافروں کو حضرت صالحؑ کا صاحبِ بصیرت ہونا تسلیم نہ تھا، اس لئے آپ نے بھی لفظ اِنْ شکیہ بولا ورنہ آپ کو اپنی جگہ یقین تھا کہ میں صداقت و بصیرت پر ہوں) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنْ (شرطیہ شکیہ نہ ہو بلکہ) مخففہ ہو۔ یعنی بلاشبہ میں اپنے رب کی طرف سے بیّنہ پر ہوں۔ رحمت سے مراد ہے نبوت اور حکمت۔ مِنَ اللّٰهِ سے مراد ہے مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ نافرمانی سے مراد ہے تبلیغِ احکام اور ممانعتِ شرک میں کوتاہی کرنا۔

فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ﴿۶۳﴾ (یعنی اللہ نے جو نبوت و ہدایت مجھے عطا فرمائی ہے تم اس کی تکذیب کرتے ہو۔ اور اللہ کے عذاب کے مستحق بنتے ہو اور اس میں میرا سراسر نقصان ہے) پس تم لوگ میرے خسارے کو ہی بڑھا رہے ہو۔ حسین بن فضل نے کہا حضرت صالحؑ تو کبھی بھی خسارے میں نہیں رہے۔ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم میرے لئے خسارہ بڑھا رہے ہو بلکہ تخسیر کا معنی ہے کسی کی طرف خسارے کی نسبت کر دینا۔ خسارہ یاب قرار دینا۔ جیسے تکفیر و تفسیق کا معنی ہے کسی کو کافر اور فاسق قرار دینا۔ کفر و فسق کی طرف منسوب کرنا۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری تکذیب سے میرے لئے اس بات کا اضافہ ہو جاتا ہے کہ میں تم کو خاسر قرار دوں اور خسارہ یاب کہوں۔ حضرت ابن عباسؓ نے تخسیر کا ترجمہ کیا ہے خسارے کو دیکھنا یعنی تمہاری تکذیب سے مجھے یوں نظر آتا ہے کہ تم بہت نقصان اٹھاؤ گے، بڑے خسارے میں رہو گے، یا بڑے خسارے اور نقصان میں ہو۔

قوم ثمود نے کہا اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لئے پتھر کی چٹان سے ایک اونٹنی جو دس ماہہ گابھن ہو برآمد کر دو۔ حضرت نے دعا کر دی، فوراً چٹان سے ایک اونٹنی برآمد ہو گئی، جس کا بچہ بھی فوراً ہو گیا۔ اس وقت آپ نے فرمایا۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً اور اے قوم والو! یہ (براہِ راست بغیر ماں باپ کے پیدا کی گئی) اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے لئے ایک معجزہ ہے۔

فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ پس اس کو اللہ کی زمین میں گھومتی پھرتی رہنے دو تاکہ زمین کا سبزہ چرتی پھرے اور زمین کا پانی پیتی رہے۔ تم پر اس کی خوراک اور پانی کا کوئی بار نہیں۔

وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ اور اس کو بُری نیت سے ہاتھ مت لگانا ورنہ تم کو عذابِ الٰہی سے دوچار ہونا پڑ جائے گا۔

یعنی تین دن میں تم پر عذاب آ جائے گا۔

فَعَقَرُوْهَا پس ثمود نے اس کی کونچیں کاٹ دیں۔ یعنی قوم ثمود کے مشورے اور حکم سے قدار بن سالف نے اونٹنی کو قتل کر دیا۔

فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ صالحؑ نے کہا تم

اپنے گھر (یعنی دنیا یا بستی) میں تین روز مزے اُڑاؤ (تین روز کے بعد ہلاک کر دیئے جاؤ گے) یہ جھوٹا وعدہ نہیں ہے۔ یعنی چہار شنبہ، پنجشنبہ اور جمعہ، تین روز زندہ رہو گے، پہلے روز صبح کو تمہارے چہرے زرد ہو جائیں گے، دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ، پھر سب مر جاؤ گے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِىِٕذٍ

پھر جب ہمارا (عذاب کا) حکم آپہنچا تو ہم نے صالحؑ کو اور ان کے ساتھ والے مؤمنوں کو اپنی رحمت کے سبب بچالیا اور اس روز کی رُسوائی (یعنی ہلاکت) سے محفوظ رکھا۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ بلاشبہ تمہارا رب ہر شئے پر قادر اور غالب ہے۔

وَاَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ اور جن لوگوں نے ظلم یعنی کفر کیا تھا ان کو ایک چیخ نے پکڑ لیا۔

یعنی جبرئیلؑ نے ایک چیخ ماری یا آسمان سے ایک کڑک دار چیخ آئی اور زمین سے بھی ایک گرجدار چیخ نکلی جس کی وجہ سے ان کے دل پھٹ گئے۔

فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾ اور سب اپنے گھروں میں مردہ ہو گئے (یعنی صبح کو مرے کے مرے رہ گئے۔ مترجم)

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا گویا گھروں میں رہتے ہی نہ تھے۔

اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَاۡ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾ خوب سن لو (قوم) ثمود نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا۔ خوب سن لو قوم ثمود کو رحمت سے دوری ہوئی۔

ع ۶ ۸

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِيْمَ بِالْبُشْرٰى اور یقیناً پہنچے ہمارے قاصد (ملائکہ) ابراہیمؑ کے پاس (اسحٰق اور یعقوب بن اسحاقؑ کی پیدائش یا قوم لوطؑ کی) ہلاکت کی خوشخبری لے کر۔ بقول حضرت ابن عباسؓ و عطاءؒ یہ ملائکہ تین تھے۔ جبرئیلؑ، میکائیلؑ، اسرافیلؑ۔ محمد بن کعب نے کہا جبرئیلؑ اور ان کے ساتھ سات دوسرے ملائکہ تھے، ضحاک نے کہا نو تھے، مقاتل نے کہا ۱۲ تھے۔ سعدی نے کہا گیارہ تھے، سب ملائکہ خوبصورت لڑکوں کی شکل میں پہنچے تھے۔

قَالُوْا سَلٰمًا ۭ قَالَ سَلٰمٌ فرشتوں نے کہا (ہم آپ کو) سلام کرتے ہیں ابراہیمؑ نے کہا تم پر بھی سلام ہو۔ فرشتوں نے جملہ فعلیہ استعمال کیا جو حدوثِ فعلی اور زمانے کو بتا رہا ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے سلام کہہ کے جملہ اسمیہ کہا جو استمرار و دوام پر دلالت کر رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا جواب فرشتوں کے سلام سے بہتر تھا۔

بعض علماء کے نزدیک سَلٰمًا سے مراد ہے صلح و سلامتی، یعنی ہماری تم سے دشمنی اور جنگ نہیں ہے دوستی اور صلح ہے۔

فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ ﴿۶۹﴾ حَنِيْذٌ گرم پتھر پر بُھنا ہوا، قاموس میں ہے، حَنَذَ الشَّاةَ (ماضی) يَحْنِذُ (مضارع) حَنْذًا یا تَحْنَاذًا (دونوں مصدر) بکری کا گوشت بھوننا، گوشت پر گرم پتھر بھوننے کے لئے رکھ دے حَنِيْذٌ (صفت مشبہ بمعنی اسم مفعول) بھونا ہوا۔

بعض نے کہا حَنِيْذٌ کا ترجمہ ہے چربی ٹپکتا ہوا، حَنَذْتُ الْفَرَسَ میں نے گھوڑے پر جھول ڈال کر اس کے بدن سے پسینہ نکال دیا۔ قاموس میں ہے حَنَذْتُ الْفَرَسَ گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اس کو ایک مخصوص حد تک دوڑ لیا۔ پھر اس پر تہ بہ تہ جھول ڈال کر دھوپ میں کھڑا کر دیا تاکہ خوب پسینہ آجائے۔

مؤخر الذکر ترجمہ پر بطور مجاز فربہ بچھڑا مراد ہو گا اور دوسری آیت میں جو بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ آیا ہے اس سے معنیٰ مطابقت ہو جائے گی۔ قتادہ نے کہا حضرت ابراہیمؑ کا اکثر مال گائیں تھیں (یعنی آپ بطور ذخیرہ گائے پالتے تھے)

فَلَمَّا رَاٰۤ اَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَيْهِ نَكِرَهُمْ جب ابراہیمؑ نے دیکھا کہ یہ کھانے کی طرف راغب نہیں

ہیں تو ان سے اجنبیت محسوس کی۔
بیضاوی نے لکھا ہے کہ نَکِرَ (ثلاثی، مجرد باب سمع) اور اَنْکَرَ (ثلاثی مزید باب اِفعال) اور اِسْتَنْکَرَ (باب استفعال) ہم معنی ہے۔ قاموس میں ہے تَنَکَّرَ (باب تفعّل) خوش گوار حالت سے بدل کر کسی ناگوار حالت پر پہنچ جانا۔
وَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ۭ　　اور محسوس کیا اپنے دل میں ان کی طرف سے خوف۔ قاموس میں ہے۔ اَوْجَسَ محسوس کیا اور دل میں چھپایا۔ مقاتل نے کہا اَوْجَسَ یعنی حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہو گیا۔ بغوی نے لکھا ہے وُجُوْس کا اصل (لغوی) معنی ہے داخل ہونا۔ یعنی خوف ابراہیمؑ کے دل میں داخل ہو گیا۔
مِنْهُمْ مہمانوں کی طرف سے دل میں خوف محسوس کیا۔ قتادہ نے کہا اس زمانہ میں ان لوگوں کا دستور تھا کہ اگر مہمان میزبان کا کھانا نہیں کھاتے تھے تو میزبان خیال کرتا تھا کہ یہ لوگ بُرے ارادے سے آئے ہیں ان کی نیت بخیر نہیں ہے رات کو آنے والے مہمان کو کھانا پیش کیا جاتا، اگر وہ کھالیتا تو گھر والے اس کی طرف سے بے خوف ہو جاتے اور نہ کھاتا تو ڈرنے لگتے کہیں یہ چور تو نہیں کہ لوٹنے آیا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کو بھی مہمانوں کی طرف سے برے ارادے کا اندیشہ ہوا۔ صحیح ظاہر مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ وہ ملائکہ ہیں کیونکہ انہوں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھائے (مگر آپ کو یہ خوف ہوا کہ کہیں اللہ کو میری کوئی حرکت پسند نہ آئی ہو اور فرشتے کوئی مصیبت ڈالنے کے لئے بھیجے گئے ہوں یا ان کی قوم پر عذاب نازل کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہوں۔
قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمِ لُوْطٍ ۝　　ملائکہ نے کہا آپ (اپنے یا اپنی قوم کے متعلق مترجم) کوئی خوف نہ کریں ہم کو تو قومِ لوط کی طرف ان پر عذاب نازل کرنے کے لئے) بھیجا گیا ہے۔
وَامْرَاَتُهٗ قَاۗىِٕمَةٌ　　اور ابراہیمؑ کی بیوی (سارہ بنت ہاران بن ناخور جو حضرت ابراہیمؑ کے چچا کی بیٹی تھی) کھڑی ہوئی تھی۔ پردہ کے پیچھے سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بیٹھے ہوئے تھے اور بیوی کھڑی مہمانوں کی خدمت کر رہی تھی۔
فَضَحِكَتْ　　پس حضرت سارہ بشارت سن کر ہنس پڑیں۔ مجاہد اور عکرمہ نے ترجمہ کیا ہے اس کو اسی وقت حیض ہو گیا۔ عرب بولتے ہیں ضَحِكَتِ الْاَرْنَبُ خرگوش کو حیض ہو گیا۔ قاموس میں بھی یہی ہے ضَحِكَتِ السَّمُرَةُ کیکر کے درخت سے گوند بہنے لگا۔ اکثر اہل تفسیر کے نزدیک اس جگہ ضَحِكَتْ سے مراد ہنس دینا ہی ہے۔ ہنسنے کا سبب کیا تھا علماء نے اس کے مختلف اسباب بیان کئے ہیں۔
(۱) خوشی کی وجہ سے ہنس پڑی تھیں۔ فرشتوں نے جب لَاتَخَفْ کہا تو حضرت ابراہیمؑ کا خوف بھی جاتا رہا اور بیوی کا بھی۔ اس سے خوشی ہوئی اور خوشی سے ہنسی۔
(۲) سدی نے کہا ہنسی کا سبب تعجب تھا، حضرت ابراہیمؑ نے کھانا پیش کیا، مہمانوں نے نہیں کھایا۔ ابراہیمؑ کو ان کی طرف سے خوف ہوا، خیال کیا کہیں یہ چور نہ ہوں، پوچھا کیوں نہیں کھاتے۔ مہمانوں نے کہا ہم بغیر قیمت (ادا کئے) نہیں کھاتے۔ ابراہیم نے کہا تو اس کی قیمت دے دو۔ مہمانوں نے پوچھا قیمت کیا ہے۔ ابراہیمؑ نے کہا کھانے سے پہلے بسم اللہ کہنا اور کھانے کے بعد الحمد للہ کہنا۔ یہ جواب سن کر جبرئیل نے میکائیل کی طرف دیکھا اور کہا اس شخص کو حق ہے کہ اللہ اس کو اپنا خلیل بنالے اس کے بعد بھی حضرت ابراہیمؑ اور سارہ نے مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہ دیکھے تو سارہ تعجب سے ہنس دیں۔ اور بطورِ تعجب کہا ہم ان مہمانوں کی خدمت کر رہے ہیں ان کے اعزاز میں کھانا پیش کر رہے ہیں، تعجب ہے کہ یہ نہیں کھاتے۔
(۳) قتادہ نے کہا اس بات پر ہنسیں کہ قوم لوط پر عذاب قریب آ گیا اور وہ غفلت میں پڑی ہے۔
(۴) بیوی کو اس بات پر ہنسی آئی کہ میں نے ابراہیمؑ سے جو بات پہلے کہی تھی وہ ہی آخر صحیح نکلی، بیوی نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا تھا لوطؑ کو اپنے پاس بلا لیجئے، مجھے نظر آ رہا ہے کہ اس کی قوم پر عذاب آئے گا۔

(۵) مقاتل اور کلبی نے کہا بیوی کو اس بات پر ہنسی آئی کہ یہ تو تین شخص ہیں جن سے ابراہیمؑ ڈر رہے ہیں اور ابراہیمؑ کے ساتھ تمام نوکر چاکر خدمت گار موجود ہیں پھر ڈرنے کے کیا معنی۔

(۶) بیٹے اور پوتے کی بشارت اور قوم لوطؑ کے ہلاک ہونے کی خبر سن کر خوشی سے ہنس پڑیں۔

(۷) حضرت ابن عباسؓ اور وہب کا قول ہے کہ اس بات پر ان کو تعجب ہوا کہ میرا شوہر بوڑھا اور میں بوڑھی ایسی حالت میں اولاد ہونا عجیب بات ہے۔ اور عبارت میں کچھ تقدیم تاخیر ہے۔ وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ کے بعد ہے۔

فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ پس ہم نے عورت کو اسحٰقؑ کے پیدا ہونے کی اور اسحٰق کے پیچھے (اسحٰق کے بیٹے) یعقوبؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی۔ اس کے بعد ہے فَضَحِکَتْ یعنی یہ بشارت سن کر وہ ہنس پڑیں۔

عورت کو خصوصیت کے ساتھ بشارت دینے کی تین وجود تھیں۔

(۱) یہ بتانا مقصود تھا کہ اسحٰقؑ و یعقوبؑ تیری نسل سے ہوں گے کسی دوسری صورت سے ابراہیمؑ کی یہ نسل نہ ہو گی۔

(۲) اولاد ہونے کی خوشی مردوں سے زیادہ عورتوں کو ہوتی ہے۔

(۳) بیوی بانجھ تھی اور اولاد سے ناامید۔ اس لئے اس کو بشارت دی گئی کہ تیرے لڑکا ہو گا اور پوتا بھی تیرے سامنے ہی ہو جائے گا۔ تو پوتے کو بھی دیکھ لے گی۔ جب بیوی کو اولاد کی بشارت دی گئی تو اس نے منھ پیٹ لیا اور کہا۔

قَالَتْ یٰوَیْلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَاَنَا عَجُوْزٌ وَّهٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ﴿۷۲﴾

کہنے لگیں کیا خوب بھلا اس بڑھاپے میں ہمارے بچے ہوں گے یہ بڑے اچنبھے کی بات ہے۔

یٰوَیْلَتٰی کلمۂ تعجب ہے، اصل لغت میں یہ کلمۂ نوحہ ہے (جو کسی کے مرنے پر کہا جاتا ہے) پھر ہر مصیبت اور قابلِ تعجب چیز میں اس کا استعمال کیا جانے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی عمر اس وقت بقولِ ابن اسحاق ۹۰ سال اور بقولِ مجاہد ۹۹ سال تھی۔

بَعْلٌ شوہر اصل میں کسی کام کے منتظم کو بَعْلٌ کہا جاتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کی عمر اس وقت بقول ابن اسحاق ۱۲۰ برس اور بقول مجاہد ۱۰۰ سال تھی، اور بشارت سے ایک سال بعد بچہ پیدا ہو گیا تھا۔

قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ فرشتوں نے کہا کیا اللہ کے حکم پر تجھے تعجب ہو رہا ہے۔ حکم سے مراد ہے اللہ کی قدرت اور قضاء یعنی اللہ کی قدرت پر تجھے تعجب نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ اللہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا، پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

ایک شبہ

تعجب نام ہے اس حالت کا جو کسی انوکھے اور غیر معمولی امر کو دیکھنے کی وجہ سے انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اور اولاد کی بشارت تھی بھی انوکھی، غیر معمولی چیز، لیکن کسی امر کے غیر معمولی اور انوکھے ہونے سے یہ بات تو نہیں کہی جاسکتی کہ وہ اللہ کی قدرت سے باہر ہے۔ ہر نادر امر اللہ کی قدرت میں داخل ہے اور اس پر تعجب کرنا نامناسب (اور خلافِ فطرت۔ مترجم) بھی نہیں ہے۔ پھر فرشتوں نے حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کے تعجب کا انکار کیوں کیا (اور اس کو نازیبا کیوں قرار دیا۔ مترجم)۔

ازالہ

کاشانۂ نبوت اور مہبطِ وحی و معجزات میں رہنے والوں کے خصوصی مرتبہ کا تقاضا تھا کہ (روز مرّہ) ہونے والے غیر معمولی واقعات اور خارقِ عادت حوادث ان کے لئے غیر معمولی اور کوئی اچنبھے کی چیز نہ ہوں۔ نہ ان کو ان پر کوئی تعجب کرنا چاہئے کوئی

ہوش مند (مؤمن) ایسے نادر واقعات پر (روز مرّہ دیکھنے کے وجہ سے) تعجب نہیں کر سکتا، حضرت ابراہیمؑ کی بیوی کی تو ساری عمر ایسے نشانہائے قدرت دیکھنے ہی میں بیتی تھی ان کا تعجب کرنا تو بہت ہی زیادہ تعجب آفریں تھا۔

رَحۡمَتُ اللّٰهِ وَبَرَكٰتُهٗ عَلَيۡكُمۡ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ　　اے اہل خانہ تم پر اللہ کی رحمت اور اس کی نازل کردہ برکتیں ہیں یا ہوں۔

بعض علماء نے کہا یہ جملہ دعائیہ ہے بعض نے کہا خبریہ ہے (ہم نے دونوں ترجمے کر دیئے ہیں۔ مترجم) رحمت سے مراد ہے نعمت یا محبت اور برکت سے مراد ہے ہر خیر کی ترقی اور بڑھوتری، بعض علماء کے نزدیک رحمت سے مراد ہے نبوّت اور برکات سے مراد ہیں نبی اسرائیل کے (بارہ) خاندان۔ کیونکہ تمام انبیاء نبی اسرائیل حضرت سارہ کی نسل سے ہوئے ہیں۔

رحمت اللہ مستقل جملہ ہے اور رفعِ تعجّب کی علت ہے۔ مطلب یہ کہ اے اہلِ خانہ تم کو بشارتِ اولاد پر تعجب نہ کرنا چاہئے۔ اللہ کی ایسی رحمتیں اور برکتیں تو تمہارے لئے بکثرت موجود ہیں۔ اَهۡلَ الۡبَيۡتِ میں لام کا زیر فعلِ مدح کے محذوف ہونے کی وجہ سے ہے یا نداء کی وجہ سے یا فعلِ تخصیص مقدّر ہونے کی وجہ سے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہّراتؓ اہلِ بیت میں شامل نہ تھیں، آیت میں شیعہ کے اس قول کی تردید ہے (حضرت سارہ کو اہلبیت کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے) لغت کے لحاظ سے اہل خانہ تو بیویاں ہی حقیقت میں ہوتی ہیں، دوسرے لوگوں کو تو تبعاً اہلِ بیت کہا جاتا ہے۔

اِنَّهٗ حَمِيۡدٌ مَّجِيۡدٌ ﴿۷۳﴾　　وہ نہایت قابلِ ستائش بڑی ہی شان والا ہے۔

حَمِيۡدٌ یعنی مستحق ستائش کام کرنے والا۔ مجد کے معنی جوہری نے صحاح میں لکھے ہیں (ذاتی) بزرگی اور (افادی) کرم کی وسعت۔ کریم اللہ کی صفت بھی ہے اور انسان کی بھی۔ اللہ کے کرم کا معنی ہے احسان اور پیہم عطائے نعمت، اور انسان کے کریم ہونے کا معنی ہے اس کے اخلاق و افعال کا قابلِ ستائش ہونا جب تک اخلاقِ حمیدہ کا ظہور انسان سے نہ ہوگا اس کو کریم نہیں کہا جا سکتا۔

بغوی نے لکھا ہے (لغت میں) مجد کا اصل معنی ہے بلندیٔ شان۔ بیضاوی نے مجید کا ترجمہ کیا ہے کَثِيۡرُ الۡخَيۡرِ وَالۡاِحۡسَانِ۔ قاموس میں ہے مجید بلند شان والا۔ کریم، شرف والا، فعّال۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنۡ اِبۡرٰهِيۡمَ الرَّوۡعُ　　پھر جب ابراہیمؑ (کے دل) سے خوف جاتا رہا اور گھبراہٹ دور ہوگئی۔

وَجَآءَتۡهُ الۡبُشۡرٰى　　اور اس کے پاس (اسحٰق ویعقوب کی) بشارت آگئی۔ یعنی خوف کی جگہ بشارت نے لے لی۔

يُجَادِلُنَا　　تو ہم سے جھگڑنے لگا۔ یعنی ہم سے کلام کرنے لگا۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنے رب سے جھگڑا کرنا تو ممکن ہی نہ تھا اس لئے جھگڑنے سے مراد ہے سوال اور دعا کرنا۔

عام اہل تفسیر نے (مضاف کو محذوف مانا ہے اور) مطلب بیان کیا ہے ہمارے قاصدوں سے جھگڑنے لگا۔

فِىۡ قَوۡمِ لُوۡطٍ ﴿۷۴﴾　　قوم لوطؑ کے بارے میں۔ حضرت ابراہیمؑ نے ملائکہ سے فرمایا اگر لوط کی بستیوں میں پچاس مؤمن ہوں گے تو کیا تم ان کو ہلاک کر دو گے۔ فرشتوں نے جواب دیا۔ نہیں فرمایا اگر چالیس ہوں۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ (ہلاک کریں گے) فرمایا اگر تیس ہوں۔ فرشتوں نے کہا نہیں۔ اسی طرح آپ پانچ تک پہنچے۔ اور فرشتے نہیں کہتے رہے۔ آخر آپؑ نے فرمایا اگر وہاں ایک مسلمان ہوگا تو کیا تم اس کو ہلاک کر دو گے۔ فرشتوں نے کہا نہیں، حضرت نے فرمایا تو وہاں لوطؑ موجود ہے (اس لئے تم ان بستیوں کو ہلاک نہ کرو) فرشتوں نے کہا ہم خوب جانتے ہیں کہ وہاں کون (کون مؤمن) ہے۔ ہم لوطؑ کو اور ان کی بیوی کے علاوہ دوسرے گھر والوں کو بچالیں گے۔ ان کی بیوی پیچھے رہ جانے اور ہلاک ہو جانے والے لوگوں میں شامل ہوگی۔

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ لَحَلِيۡمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيۡبٌ ﴿۷۵﴾　　واقعی ابراہیم بڑے حلیم الطبع، رحیم المزاج، رقیق القلب تھے۔

لَحَلِيمٌ سے مراد ہے مجرم سے انتقام لینے میں جلدی نہ کرنے والا (بُردبار، متحمل مزاج) اَوَّاهٌ گناہوں پر بہت زیادہ آہ آہ کرنے والا، اور لوگوں کی حالت پر بڑا افسوس کرنے والا۔ مُنِيبٌ اللہ کی طرف رجوع کرنے والا۔ قاموس میں ہے اَوَّاهٌ یقین کرنے والا۔ یا بہت دعا کرنے والا، یا مہربان، نرم دل، یا دانش مند۔ حبشی زبان میں اَوَّاهٌ کا معنی ہے مؤمن۔

حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوط کو ہلاک نہ کرنے کے متعلق جو ملائکہ سے جھگڑا کیا اس کی وجہ آپ کے یہ تین اوصاف تھے، آپ کا دل نرم تھا، آپ کے دل میں بڑا جذبۂ رحم تھا، آپ مجرم سے انتقام لینے میں عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر ابراہیمؑ کے جواب میں فرشتوں نے کہا۔

يَاإِبْرَاهِيمُ أَعْرِضْ عَنْ هَذَا إِنَّهُ قَدْ جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ ابراہیمؑ! یہ جھگڑا چھوڑو (قضاء ازلی کے موافق قوم لوط پر عذاب نازل ہونے کا) تمہارے رب کا حکم ہو چکا۔

وَإِنَّهُمْ آتِيهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُودٍ ﴿۷۶﴾ اور ان پر عذاب ضرور آئے گا جو لوٹایا نہیں جاسکتا نہ جھگڑے سے نہ دعا سے، نہ کسی اور طرح سے۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا اور جب ہمارے قاصد (یعنی وہی ملائکہ) لوطؑ کے پاس پہنچے۔ نوخیز خوبصورت بے ڈاڑھی مونچھ کے لڑکوں کی شکل میں۔

سِيءَ بِهِمْ تو لوط کو ان کا آنا ناگوار ہوا۔ حضرت لوطؑ ان کو آدمی سمجھے اس لئے (قوم کی طرف سے خطرے کے زیر اثر) آپ کو فکر ہوگئی کہ کہیں قوم والے کچھ ناشائستہ ارادہ نہ کریں اور میں ان کو دفع کرنے پر قادر نہ ہوں۔

وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا ان قاصدوں کی وجہ سے لوطؑ دل تنگ ہوئے۔

بغوی نے ذَرْعٌ کا ترجمہ کیا ہے دل، بیضاوی نے لکھا ہے ان کی موجودگی سے لوط کا سینہ تنگ ہو گیا یعنی آنے والی مصیبت کو دفع کرنے کی قوت نہ تھی اور کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی۔ اس لئے آپ کے دل میں کوفت پیدا ہوگئی کہ اب کیا کروں، میں کہتا ہوں ذَرْعٌ کا لغت میں معنی ہے بانہہ یا کلائی مجازاً قوت مراد ہوتی ہے۔ يَدٌ سے بھی بطورِ مجاز قوت مراد ہوتی ہے، یہاں مراد یہ ہے کہ ان کی قوت مدافعت سے عاجز ہوگئی کذافی القاموس۔

وَقَالَ هَذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿۷۷﴾ اور کہا یہ بڑا سخت دن ہے۔

قتادہ اور سدی کا بیان ہے کہ ابراہیمؑ کے پاس سے نکل کر فرشتے لوطؑ کے پاس ان کی بستی میں دوپہر کے وقت پہنچے، لوطؑ اپنی زمین میں کچھ کام کر رہے تھے یا لکڑیاں جمع کرنے جنگل کو گئے تھے اور اللہ نے حکم دے دیا تھا کہ جب تک چار مرتبہ لوطؑ اپنی قوم کے خلاف شہادت نہ دے دے تم ان کو ہلاک نہ کرنا۔ فرشتوں نے لوطؑ کے پاس بطور مہمان رُکنا چاہا لوطؑ ان کو لے کر چل دیئے، تھوڑی دیر چلے تھے کہ آپ نے مہمانوں سے پوچھا تم کو اس بستی کی حالت بھی معلوم ہے۔ فرشتوں نے پوچھا ان کی کیا حالت ہے۔ آپ نے فرمایا اس زمین پر سب سے زیادہ بد عمل بستی ہے۔ حضرت نے یہ الفاظ چار مرتبہ کہے غرض ملائکہ آپ کے ساتھ آپ کے گھر آگئے۔ یہ بھی منقول ہے کہ آپ لکڑیاں اٹھائے آرہے تھے اور فرشتے پیچھے پیچھے تھے، قوم کی ایک جماعت کی طرف سے گزر ہوا ان لوگوں نے آپس میں آنکھ ماری، حضرت لوطؑ نے فرمایا اللہ کی مخلوق میں میری قوم سب سے زیادہ بُری ہے اسی طرح دوسری جماعت کی طرف سے گزر ہوا تو انہوں نے بھی ایسا ہی کیا اور حضرت نے یہی فرمایا، تیسری جماعت کا قصہ بھی یونہی ہوا۔ حضرت لوطؑ جب بھی مذکورہ الفاظ زبان سے ادا کرتے تھے حضرت جبرئیل فرشتوں سے کہتے تھے گواہ رہو، آخر حضرت لوطؑ اپنے گھر پہنچ گئے۔ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ فرشتے حضرت لوطؑ کے گھر پوشیدہ طور سے آئے تھے اور گھر والوں کے سوا کسی کو ان کا آنا معلوم نہ تھا لوطؑ کی بیوی نے جا کر اپنی قوم کو اطلاع دی کہ لوطؑ کے گھر ایسے لوگ آئے ہیں کہ ان سے زیادہ خوبصورت میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا۔

وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ اور لوطؑ کے پاس اس کی قوم والے لپکتے ہوئے آئے۔ حضرت ابن عباسؓ اور

قتادہ نے ترجمہ کیا ہے تیز تیز آئے۔ مجاہد نے کہا لپکتے آئے۔ شمر بن عطیہ نے کہا تیز چال اور لپکنے کے درمیان چال سے آئے۔ حسن نے کہا دونوں چالوں کے درمیانی رفتار سے آئے۔ صاحبِ قاموس نے ہَرَعَ کا ترجمہ کیا ہے، ایسی چال جس میں جھپک اور تیزی ہو۔

یُھْرَعُوْنَ (فعلِ مجہول) انتہائی سرعت و اضطراب پر دلالت کر رہا ہے، گویا کوئی (اندرونی یا بیرونی قوت) ان کو تیز لئے جا رہی تھی۔

وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ ؕ اور اس سے پہلے بھی وہ بُری حرکتیں کرتے رہے تھے۔ مردوں سے لواطت کرتے تھے اور طرح طرح کی فحش حرکتوں کے عادی تھے، بے حیا ہو گئے تھے اسی لئے ایسے برے ارادے سے علی الاعلان لپکتے جھپکتے آئے تھے۔

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِيْ لوطؑ نے کہا اے میری قوم یہ میری لڑکیاں ہیں۔ یعنی تم ان سے نکاح کر لو۔

پہلے حضرت کی لڑکیوں سے نکاح کرنے کی درخواست قوم والوں نے کی تھی مگر ان کی بدکاریوں کو دیکھ کر آپ نے انکار کر دیا تھا۔ درخواست کو رد کر دینے کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کافر تھے۔ کافروں سے نکاح کی حرمت تو شریعتِ اسلامیہ میں بعد کو ہوئی ہے، پہلے ازدواجی رشتہ کافر و مؤمن کا جائز تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دونوں صاحبزادیوں کا رشتہ عتبہ بن ابی لہب اور ابو العاص بن ربیع سے نزولِ ممانعت سے پہلے کیا تھا۔ حسین بن فضل نے کہا حضرت لوطؑ نے اپنی لڑکیوں سے نکاح کی پیش کش ان کے مسلمان ہو جانے کی شرط پر کی تھی، مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا بَنَاتِیْ سے قوم کی ساری عورتیں مراد ہیں، ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے حضرت ابی بن کعب کی قراءت میں آیت اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ وَاَزْوَاجُہٗ اُمَّھَاتُھُمْ کے آخر میں وَھُوَ اَبٌ لَّھُمْ بھی آیا ہے اس قولِ مذکور کی تائید ہوتی ہے۔ اس قول کی تائید اس امر سے بھی ہوئی ہے کہ حضرت لوطؑ کی لڑکیاں دو تھیں اور لڑکوں کی طلب گار پوری جماعت تھی، دو لڑکیوں کا ایک جماعت سے نکاح کیسے ممکن تھا جو لوگ بنات سے مراد حضرت لوطؑ کی لڑکیاں لیتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ قوم لوط کے دو سردار تھے، سب لوگ ان کا حکم مانتے تھے انہی دونوں سے آپ نے اپنی لڑکیوں کا نکاح کرنا چاہا تھا۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت لوطؑ نے جو ھٰٓؤُلَاۗءِ بَنَاتِیْ فرمایا اس سے نکاح کی حقیقتاً پیشکش مقصود نہ تھی بلکہ) مقصد تھا قوم والوں کی بدترین خباثت کا اظہار اور دفاع۔

هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ وہ زیادہ پاک ہیں تمہارے لئے (اس کا یہ مطلب نہیں کہ لواطت پاک ہے اور امرد پرستی سے لڑکیوں سے نکاح زیادہ پاک ہے) مطلب یہ کہ تمہارے لئے اس فعل میں زیادہ نظافت ہے یا اسی میں بے حیائی کم ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کہے چھینے ہوئے مال سے تو مردار زیادہ پاک اور زیادہ حلال ہے (ظاہر ہے کہ حلال نہ مردار ہے نہ مال مغصوب مگر مالِ مغصوب کی زیادہ برائی ظاہر کرنے کے لئے ایسا جملہ بولا جاتا ہے)

فَاتَّقُوا اللّٰهَ پس اللہ سے ڈرو۔ یعنی ان بے حیائی کے کاموں کو ترک کرو۔

وَلَا تُخْزُوْنِ اور مجھے رُسوا نہ کرو۔ یہ لفظ یا خِزْیٌ سے بنا ہے خِزْیٌ کا معنی ہے رُسوائی (اسی کی مطابق ترجمہ کیا گیا ہے) یا خزایۃ سے بنا ہے خزایۃ کا معنی ہے حیا۔ یعنی مجھے شرمندہ نہ کرو۔

فِيْ ضَيْفِيْ ؕ میرے مہمان کے معاملہ میں۔ مہمان کو ذلیل کرنے کا معنی ہے میزبان کو ذلیل کرنا۔

اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝۷۸ کیا تم میں کوئی بھی ہدایت یافتہ نہیں جو حق پر چلے اور بُری حرکتوں سے پرہیز کرے۔

ابن اسحٰق نے رَشِیْد کا ترجمہ کیا ہے بھلائی کا حکم دینے والا اور برائی سے روکنے والا۔

قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ قوم والوں نے کہا (لوط) تم جانتے ہو کہ تمہاری لڑکیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں۔ یعنی وہ ہماری بیویاں نہیں، ان سے ہمارا نکاح نہیں ہوا کہ ہم ان کے حقدار بن جائیں۔

بعض علماء نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ تمہاری لڑکیوں کی ہم کو کوئی ضرورت نہیں۔

وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿٧٩﴾ اور ہمارا جو کچھ ارادہ ہے اس کو تم یقیناً جانتے ہو، یعنی ہم لڑکوں کو چاہتے ہیں۔

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً لوط نے (ان سے) کہا اگر میرے بدن کے اندر تم کو دفع کرنے کی طاقت ہوتی۔ تو میں بچاؤ کر لیتا تم کو دفع کر دیتا۔

أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ﴿٨٠﴾ یا میں کسی مضبوط پایہ کی پناہ پکڑ سکتا۔ یعنی یا میرا خاندان طاقتور ہوتا اور مجھے برادری کی طاقت حاصل ہوتی تو میں برادری کی قوت پر تم سے اپنی حفاظت کر لیتا۔ رُكْنٍ شَدِيدٍ (مضبوط تھم) سے قوت و استحکام میں اپنے خاندان کو تشبیہ دی۔ اس سے مراد ہے قوی پہلو۔ صاحب قاموس نے رُکن کے معنی لکھے ہیں قوی ترین پہلو قوت کے تمام اسباب جیسے حکومت، فوج، عزت، غلبہ، اقتدار۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ میرے بھائی لوطؑ پر رحم فرمائے وہ رکنِ شدید کی پناہ لینے کے خواستگار ہوئے تھے۔ دوسری روایت میں رحم فرمائے کی جگہ معاف فرمائے کا لفظ آیا ہے۔

ابن عساکر اور اسحٰق نے بسندِ جریر و مقاتل بروایتِ ضحاک حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے اور بغوی نے بھی یہی بیان کیا ہے کہ حضرت لوطؑ نے دروازہ بند کر لیا ملائکہ اندر گھر میں تھے اور دروازہ کے اندر سے ہی آپ قوم والوں سے جھگڑا کر رہے تھے اور ان کو قسمیں دے رہے تھے وہ لوگ سب دروازہ کے باہر تھے آخر وہ لوگ دیوار پھاند کر اندر جانے کی تدبیر کرنے لگے، جب ملائکہ نے لوطؑ کی یہ حالت دیکھی تو۔

قَالُوا يَا لُوطُ إِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَن يَصِلُوا إِلَيْكَ انہوں نے کہا لوطؑ ہم آپ کے رب کے فرستادہ ہیں ان لوگوں کی دسترس آپ تک ہرگز نہیں ہو سکے گی دروازہ کھول دیجئے اور ہم کو ان سے نبٹنے دیجئے حضرت لوطؑ نے دروازہ کھول دیا، وہ لوگ اندر گھس آئے جبرئیلؑ نے اپنے رب سے عذاب نازل کرنے کی اجازت طلب کی، اجازت مل گئی تو انہوں نے اپنی وہی صورت اختیار کر لی۔ جو اُن کی عموماً اور معمولاً ہوتی ہے پر پھیلا دیئے، موتیوں کا ہار پہنے، چمکدار دانت، جھلکتی پیشانی، سر کے بال گھنگریالے برف کی طرح سفید اور دونوں پاؤں مائل بہ سبزی (یہ شکل تھی حضرت جبرئیلؑ کی) پھر جبرئیلؑ نے اپنا ایک پر اُن لوگوں کے منہ پر مارا جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں چٹ نابینا ہو گئیں، گھروں کا راستہ بھی سجھائی نہیں دیتا تھا فوراً یہ کہتے ہوئے پلٹ پڑے بھاگو بھاگو لوطؑ کے گھر میں روئے زمین کے سب سے بڑے جادوگر آئے ہیں جنہوں نے ہم پر جادو کر دیا پھر حضرت لوطؑ سے کہنے لگے ذرا ٹھہر و صبح ہونے دو کل صبح ہم تم سے سمجھیں گے صبح کو تم کو پتہ چل جائے گا۔ لوطؑ نے فرشتوں سے قوم والوں کے ہلاک ہونے کی میعاد دریافت کی، فرشتوں نے کہا صبح کو ___ لوطؑ نے کہا میں اس سے بھی جلد چاہتا ہوں۔ ابھی ان کو ہلاک کر دو تو بہتر ہے۔ فرشتوں نے کہا کیا صبح قریب نہیں ہے۔

فَأَسْرِ بِأَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ اللَّيْلِ آپ اپنے گھر والوں کو لے کر کچھ رات سے ہی چل دیجئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے قطع کا ترجمہ کیا ہے ایک ٹکڑا، ضحاک نے کہا بقیہ شب، قتادہ نے کہا اول رات گزرنے کے بعد۔ بعض نے فجرِ اول (صبح کاذب)

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنكُمْ أَحَدٌ اور تم میں سے کوئی پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھے۔ یعنی کوئی تمہارے ساتھ سے مڑ کر پیچھے نہ رہ جائے۔

قاموس میں ہے لَفَتَہٗ اس کو موڑ دیا، رائے سے پھیر دیا۔ التفات (افتعال) اور تلفت (تفعّل) اسی سے بنا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ثلاثی مجرد (لفت) متعدی ہے اور ثلاثی مزید (افتعال اور تفعّل) لازم۔ بعض نے لایلتفت کا ترجمہ کیا ہے کوئی پیچھے کو نہ دیکھے۔ رات سے سب کو لے کر نکلنے کا حکم تو لوطؑ کو دیا گیا اور منہ پھیر کر پیچھے کو نہ دیکھنے یا مڑ کر پیچھے نہ رہ جانے کا حکم لوطؑ کے ساتھ والوں کو دیا گیا۔

اِلَّا امْرَاَتَكَ ؕ مگر اپنی عورت کو ساتھ لے کر نہ نکلو یا سوائے تمہاری عورت کے اور کوئی مُڑ کر پیچھے کو نہ دیکھے۔
بغوی وغیرہ نے لکھا ہے کہ اِلَّا امْرَاَتَكَ کا استثناء فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ سے ہے۔ یعنی بیوی کو ساتھ نہ لو۔ قوم کے ساتھ چھوڑ دو۔ اس کا میلان قوم کی طرف ہے اس مطلب کی تائید حضرت مسعودؓ کی قرأت سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں آیت اس طرح ہے فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ اِلَّا امْرَاءَ تَكَ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ۔ حاصل کلام یہ ہے کہ زوجۂ لوطؑ کو ساتھ لے کر نکلنے کے متعلق دو روایتیں ہیں ایک روایت میں ساتھ لے کر نکلنا مذکور ہے اس وقت ساتھ والوں کو حکم دیا گیا تھا کہ کوئی مُڑ کر پیچھے نہ دیکھے یا پیچھے رہ نہ جائے، مگر عورت نے منہ پھیر کر اپنی قوم کی طرف دیکھا اور ان کو ہلاک ہوتے دیکھ کر کہا ہائے میری قوم والے تباہ ہو گئے۔ دوسری روایت میں ہے کہ عورت کو کافروں کے ساتھ چھوڑ کر جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ کیونکہ عورت کا قلبی جھکاؤ قوم کی طرف تھا۔ اسی اختلاف روایت کی وجہ سے اِلَّا امْرَاَتَكَ کے اعراب میں اختلاف منقول ہے ایک میں اِلَّا امْرَاَتَكَ آیا ہے اور دوسری روایت میں اِلَّا امْرَاَتُكَ كذا قال صاحب المدارک۔
اور چونکہ دونوں روایتوں کی بنا پر مفہوم حکم میں تضاد ہو جاتا ہے اور اس تضاد کو دور نہیں کیا جا سکتا اس لئے ایک روایت یقیناً غلط ہے یہی وجہ ہے کہ بیضاوی نے صراحت کی ہے کہ کوئی قرأت بھی مانی جائے بہر حال اِلَّا امْرَاَتَكَ استثناء لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ سے قرار دینا اولیٰ ہے یعنی التفات کی ممانعت سے عورت مستثنیٰ تھی یعنی اس کو ممانعت نہ تھی، لیکن کیا اس کو التفات کی اجازت تھی یہ بات آیت میں مذکور نہیں ہے۔
اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ؕ جو عذاب قوم والوں پر آئے گا وہ اس عورت پر بھی یقیناً آئے گا۔ بیضاوی کے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعودؓ کی قرأت کی بنا خود ان کی تفسیر پر ہے۔ جب کہ اکثر اہل تفسیر کا خیال ہے کہ استثناء اہل سے ہے یعنی قرأت ابن مسعودؓ روایت پر مبنی نہیں بلکہ ابن مسعودؓ نے چونکہ استثناء اہل سے قرار دیا ہے اور آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے اس لئے آپ نے اس جگہ اعراب بھی وہی پڑھا جو تفسیر کے مناسب تھا۔ میں کہتا ہوں اِمْرَاَتَكَ کی تاء پر اگر زبر پڑھا جائے تو استثناء منقطع بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ حضرت لوطؑ کی بیوی مؤمنہ صالحہ نہ تھیں اس لئے حضرت لوطؑ کے اہل میں داخل ہی نہیں تھیں۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے کو عدم صلاح کی بناء پر اہل نوحؑ میں شمار نہیں کیا گیا اور جب وہ اہل لوطؑ میں داخل نہ تھیں تو لَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ سے جن لوگوں کو خطاب کیا گیا وہ ان سے خارج تھی۔ ہاں اگر اِمْرَاَتُكَ کی تا پر پیش پڑھا جائے تو ضرور اہل لوط میں داخل رہے گی مگر اس داخلے کی وجہ صلاحیت اعمال وایمان نہیں بلکہ محض رشتۂ زوجیت تھا زوجیت کی وجہ سے عورت لوطؑ کی اہل تھی اور صلاحِ اعمال نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی اہل نہیں بھی تھی دونوں اعتبارات مختلف ہیں۔
میں کہتا ہوں دونوں قرأتوں کا اختلاف اس وجہ سے نہیں ہے کہ ایک روایت میں عورت کا نکلنا مذکور ہے اور دوسری روایت میں نہ نکلنا۔ بلکہ زبر کی قرأت اس بنا پر ہو سکتی ہے کہ اِمْرَاَتَكَ کا اہل سے استثناء ہے اور پیش کی قرأت پر اَحَدٌ سے استثناء ہے اول صورت میں یہ مطلب ہو گا کہ اپنے اہل کے ساتھ نکل جاؤ۔ بیوی کو ساتھ نہ لو۔ ان الفاظ کا یہ مطلب نہیں کہ جن کو ساتھ لے کر جانے کا حکم دیا گیا وہ ساتھ گئے بھی تھے یا نہیں گئے تھے ایسی صورت میں نافرمان بیوی کا ساتھ جانا ضروری نہیں۔ جبکہ ساتھ لے جانے کا لوطؑ کو حکم بھی نہیں دیا گیا نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ساتھ نہیں گئی۔ اور اگر اَحَدٌ سے استثناء مانا جائے تو حضرت لوطؑ کے ساتھ والوں کو منہ پھیر کر دیکھنے کی ممانعت ہو جائے گی۔ بیوی کو ممانعت نہیں ہو گی اس صورت میں بھی بیوی کا ساتھ جانا نہ جانا معلوم نہیں ہوتا۔ دونوں باتوں کی طرف سے آیت میں سکوت ہے، ممکن ہے وہ گئی ہو اور منہ پھیر کر دیکھا ہو اور ممکن ہے ساتھ ہی نہ گئی ہو خواہ لوطؑ نے اس کو بھی حکم دیا ہو۔ کیونکہ بہر حال وہ سرکش اور نافرمان تھی ماننے والی نہ تھی۔
شاید بیضاوی نے جو لفظ اَولیٰ استعمال کیا ہے اور واجب کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس کی مصلحت یہی ہو۔

اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ؕ ان پر عذاب آنے کا وقتِ وعدہ یقیناً صبح ہے۔ یہ سابق حکم کی گویا علت ہے۔ یعنی تم اپنے ساتھیوں کو لے کر رات ہی سے نکل جاؤ، اس لئے کہ ان لوگوں کی ہلاکت کا وقت صبح مقرر کر دیا گیا ہے۔ لیکن جب حضرت لوطؑ نے درخواست کی کہ جلد عذاب آجائے تو فرمایا۔

اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ﴿۸۱﴾ کیا صبح قریب نہیں ہے۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا پر جب ہمارا حکم (یعنی عذاب کا حکم یا عذاب) آگیا۔ اول مفہوم کی تائید اگلی آیت سے ہو رہی ہے۔

جَعَلْنَا عَالِیَهَا سَافِلَهَا تو ہم نے ان بستیوں کو الٹ کر زیروزبر کر دیا۔ یعنی الٹ دیا اوپر کا تختہ نیچے اور نیچے کا اوپر کر دیا اگرچہ یہ فعل ملائکہ کا تھا ملائکہ نے الٹا تھا لیکن چونکہ بحکم الٰہی تھا اس لئے الٹنے کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی۔ اس سے اپنے امر کی عظمت کا اظہار مقصود ہے۔ بغوی نے لکھا ہے قوم لوط کی پانچ بستیاں تھیں حضرت جبرئیلؑ نے بستیوں کے نیچے اپنا ایک بازو ڈال کر اتنا اٹھالیا کہ اوپر والوں نے مرغ کی بانگ کی اور کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی اور کسی کا کوئی برتن بھی نہ الٹا نہ کوئی سویا ہوا شخص بیدار ہوا پھر بالکل الٹ دیا۔ سب زیروزبر ہو گئے۔ ان پانچوں شہروں کی آبادی چار لاکھ یا چار کروڑ تھی۔ ان بستیوں کو مُؤْتَفِکَات الٹی ہوئی بستیاں کہا جاتا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیرؓ کی روایت سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

وَاَمْطَرْنَا عَلَیْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۙ اور ہم نے ان پر کنکریلے پتھر برسائے یعنی ان کو الٹنے کے بعد اوپر سے سنگ باری کی۔ یا یہ مطلب کہ جو ادھر ادھر بچے کھچے مقامات میں راہ گیر رہ گئے تھے۔ ان پر کنکروں کی بارش کی اور اس طرح ان کو ہلاک کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ اور سعید بن جبیرؓ کا قول ہے کہ سجیل سنگِ گِل کا معرب ہے۔ قتادہ اور عکرمہ کا قول ہے کہ سجیل سے مراد ہے کیچڑ، کیونکہ دوسری آیت میں آیا ہے۔ لِنُرْسِلَ عَلَیْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِیْنٍ۔ مجاہد نے کہا شروع میں پتھر اور آخر میں خشک کیچڑ کی بارش کی۔ حسن نے کہا وہ پتھر اصل میں کیچڑ ہی کے تھے کیچڑ خشک ہو کر پتھر ہو گئی تھی۔ ضحاک نے کہا سجیل سے مراد ہیں پختہ اینٹیں۔

بعض علماء نے کہا کہ سجیل کا لفظ سجل سے بنا ہے اسجال کا معنی ہے رواں کر دینا، دے دینا گویا ہر پتھر بھیجا ہوا اور دیا ہوا تھا یا سجل سے ماخوذ ہے سجل لکھا ہوا۔ یعنی اللہ نے پتھروں پر لکھ دیا تھا کہ قوم لوط کو ان سے عذاب دیا جائے گا۔ بعض نے کہا سجیل اصل میں سجین دوزخ کا ایک طبقہ تھا نون کو ل سے بدل دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دنیوی آسمان کا نام سجیل ہے۔ بعض نے کہا کہ سجیل آسمان میں پہاڑ ہیں، اللہ نے فرمایا ہے وَیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِیْهَا مِنْ بَرَدٍ

مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا ہے پیہم نَضَدَ کا معنی ہے ایک چیز پر دوسری چیز چننا۔

مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ؕ جو نشان زدہ تھے تمہارے رب کے پاس۔ ابن جریج نے کہا ان پتھروں پر ایک خاص علامت تھی وہ زمین کے پتھروں کے ہم شکل نہ تھے۔

قتادہ اور عکرمہ نے ان پر سرخ دھاریاں بتائی ہیں۔ حسن اور سدی نے کہا وہ مُہر زدہ تھے، مہر کی طرح ان پر نشان تھا۔ ہر پتھر پر اس شخص کا نام لکھا ہوا تھا جس پر وہ گرنے والا تھا۔

وَمَا هِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ بِبَعِیْدٍ ﴿۸۳﴾ اور وہ (اجاڑ بستیاں) ان ظالموں سے کچھ دور نہیں۔ الظّٰلِمِیْنَ سے مراد ہے مشرکینِ مکہ۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ اور عکرمہ کے نزدیک الظّٰلِمِیْنَ سے مراد ہیں اس امت کے ظالم، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کی طرف اس قول کی نسبت کی ہے۔ یعنی اس امت کے ظالم بھی اس امر کے مستحق ہیں کہ ان پر سنگباری کی جائے۔ قتادہ اور عکرمہ نے کہا اللہ نے کسی ظالم کو ان پتھروں سے محفوظ نہیں رکھا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بعض آثار میں آیا ہے کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو۔ ہر ظالم پر ہر وقت پتھر گر سکتا ہے۔ بیضاوی میں ہے کہ

ع ۷ النصف ۱۵

رسول اللہ ﷺ کے دریافت کرنے کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے کہا کہ آپ کی امت کے ظالم مراد ہیں، کوئی ظالم ایسا نہیں کہ وہ پتھر کے نشانے پر نہ ہو ہر وقت پتھر اس پر گر سکتا ہے۔ سیوطی نے لکھا ہے ثعلبی نے اس کو بغیر سند کے نقل کیا ہے اور مجھے اس کی سند معلوم نہیں۔ دُرِّ منثور میں ہے کہ ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے آیت مذکورہ کے ذیل میں ربیع کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ ہم نے جو کچھ سنا ہے وہ یہ ہے کہ ہر ظالم کی سیدھ میں ایک پتھر موجود ہے جو اس بات کا منتظر ہے کہ کب اس کو ظالم پر گرنے کا حکم دیا جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ ہِیَ ضمیر ان بستیوں کی طرف راجع ہے جو شام کو جاتے ہوئے کفارِ مکہ کے راستہ میں اِدھر اُدھر پڑتی تھیں۔

بعید کو بصیغہ مذکر لانا (باوجودیہ کہ ضمیر ھی مؤنث ہے) اس وجہ سے ہے کہ ھی سے مراد پتھر یا مقام ہے (یعنی لفظ مؤنث کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ معنی کے لحاظ سے مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا)۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ اور ہم نے قوم مدین کے نسبی بھائی شعیبؑ کو اہلِ مدین کی طرف (ہدایت کے لئے) بھیجا۔

حضرت ابراہیمؑ کے ایک بیٹے کا نام مدین تھا اسی کے نام پر حضرت شعیبؑ کی بستی کا نام بھی مدین رکھ دیا گیا تھا۔ آیت میں مراد اہلِ مدین (مدین کے باشندے) یا مدین کی نسل ہے۔

قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ

شعیبؑ نے کہا اے میری قوم! صرف اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود واقع میں نہیں ہے اور ناپ تول میں (خریداروں کے ساتھ یا آپس میں) کمی نہ کرو۔ توحید پر ہی تمام احکام کا مدار ہے اس لئے اول توحید کی تبلیغ کی، پھر ناپ تول کی کمی سے روکا۔ قوم شعیب والے ناپ تول میں بے ایمانی کے خوگر تھے اور بے ایمانی عدل کے خلاف ہے اور تبادلہ اشیاء کی حکمت کے بھی منافی ہے۔

إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ میں تم کو فراغت کی حالت میں دیکھتا ہوں۔ یعنی میں تم کو مالدار پاتا ہوں، آرام اور چین سے ہو۔ لوگوں کے حق مارنے اور ناپ تول میں کمی کرنے کی تم کو ضرورت نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ نعمتیں اور آسائشیں تم کو حاصل ہیں جن کا تقاضا ہے کہ تم اللہ کا شکر کرو اور لوگوں پر مہربانی کرو۔ کسی کا حق مارنے کا تو کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ مجاہد نے کہا حضرت شعیبؑ نے ان کو ڈرایا کہ اگر توبہ نہ کرو گے تو یہ نعمت تم سے چھین لی جائے گی ہر چیز کا نرخ گراں ہو جائے گا اور اللہ کا عذاب آجائے گا۔

وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾ اور مجھے تمہارے متعلق اندیشہ ہے اس دن کے عذاب کا جو طرح طرح کی تکلیفوں کو اپنے گھیرے میں لینے والا ہوگا۔ یعنی مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر اس روز کا عذاب آجائے گا جو تم کو گھیر لے گا اور سب کو ہلاک کر دے گا۔ کوئی بھی نہیں بچے گا۔ بعض لوگوں نے محیط کا ترجمہ کیا ہے ہلاک کرنے والا وَأُحِيطَ بِثَمَرِهِ اور اس کے پھل تباہ کر دیئے گئے۔ عذابِ یوم محیط سے مراد ہے روزِ قیامت کا عذاب یا سب کی جڑ بنیاد اکھاڑ پھینکنے اور سب کو تباہ کر دینے کا عذاب۔

وَيَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ اور اے میری قوم! ناپ تول پوری پوری کیا کرو۔ پہلے ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت تھی (جس سے ضمناً پورا ناپنے تولنے کا حکم معلوم ہو گیا) پھر زور دینے کے لئے اس جملہ میں صراحتہً پورا ناپنے تولنے کا حکم دیا اس صریح حکم سے اس امر پر بھی تنبیہ ہو گئی کہ قصداً ناپ تول میں کمی سے اجتناب کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ پورا پورا دینے کی کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ کچھ زیادہ ہی دینا پڑے، جس کے بغیر پورا پورا ادا کرنا مقصود نہ ہو۔ اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ اگر کوئی پیمائشی یا وزنی چیز کسی نے ناپ تول کر خریدی ہو اور بائع نے ناپ تول کر دی ہو تو

جب تک خریدار خود دوبارہ اس کی ناپ تول نہ کر لے نہ خود اس کو استعمال کر سکتا ہے۔ نہ فروخت کر سکتا ہے رسول اللہ ﷺ نے (خریدے ہوئے) غلہ کو فروخت کرنے سے اس وقت تک روکا ہے جب تک دوبارہ ایک بار بائع نے اور ایک بار مشتری۔ نے اپنے اپنے پیمانوں سے اس کی ناپ تول نہ کر لی ہو۔ رسول اللہ کے زمانہ میں غلہ پیمانوں سے ناپ کر فروخت کیا جاتا تھا صاع یا فرق یا وسق وغیرہ غلہ ناپنے کے پیمانے تھے تول کر نہیں بیچا جاتا تھا یہ حدیث حضرت جابرؓ کی روایت سے ابن ماجہ اور اسحٰق بن ابی شیبہ نے نقل کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک راوی عبدالرحمٰن بن ابی لیلی ہے جس کی وجہ سے محدثین نے اس روایت کو معلل قرار دیا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث آئی ہے حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے یہ حدیث منقول ہے لیکن

یہ روایت بھی ضعیف ہے ابن ہمام نے لکھا ہے کہ یہ حدیث بہت سندوں سے آئی ہے اور ائمہ نے اس کو قبول کیا ہے اس لئے قابل استدلال ہے۔ امام مالک، امام شافعی اور امام احمدؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔

یہ بھی رسول اللہ نے فرمایا تھا وزن کر کے ذرا جھکتا ہوا دو۔ کیونکہ ہم گروہ انبیاء اسی طرح تولتے ہیں۔ رواہ احمد وابوداؤد والترمذی والنسائی وابن ماجہ والحاکم وابن حبان من حدیث سوید بن قیسؓ حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

بِالْقِسْطِ　انصاف کے ساتھ۔

وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ　اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو۔ پہلے صرف ناپ تول میں کمی نہ کرنے کی ہدایت تھی اس آیت میں عمومی حکم ممانعت ہے کہ ناپ سے بکنے والی چیز ہو یا تول سے مقداری ہو یا زرعی کیسی ہی چیز ہو اور جس کسی کے حق کی ہو اس میں کمی نہ کرو۔

وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۸۵﴾　اور زمین میں فساد کرتے ہوئے (حد توحید وعدل سے) مت نکلو۔

عثو (مصدر) ہر طرح کے فساد کو شامل ہے خواہ ادائے حقوق کی کمی کی شکل میں ہو یا کسی اور شکل میں۔ بعض علماء نے کہا کہ بخس (جس کی پہلے ممانعت کی گئی) سے مراد ہے ٹیکس اور معاملات میں دوسری حق تلفیاں اور عثو (جس کی ممانعت اس آیت میں کی گئی ہے) سے مراد ہے چوری، ڈاکہ رہزنی۔

لَا تَعْثَوْا کا معنی جب لَا تُفْسِدُوْا ہے تو پھر مفسدین کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ایک سوال کیا جاسکتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ مفسدین کہنے سے وہ صورتیں نکل گئیں جو واقعی صحیح ہوتی ہیں لیکن بظاہر فساد نظر آتی ہیں جیسے حضرت خضر کا فعل (بچے کو قتل کرنا، کشتی کا تختہ اکھاڑ دینا) یہ بھی کہا گیا ہے کہ مفسدین (کا مفعول محذوف ہے اس لفظ کو بڑھانے) سے مراد یہ ہے کہ اپنے دینی امور اور دنیوی مصالح کو بگاڑ کر فساد کرتے نہ پھرو۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ حالِ مؤکدہ ہے کیونکہ عثی کا معنی خود ہی افسد ہے (یعنی عثو جب افساد کا ہم معنی ہے تو مفسدین سے تاکید ہو گئی کوئی نیا معنی مراد نہیں ہے۔

بَقِيَّتُ اللّٰهِ خَيْرٌ لَّكُمْ　اللہ کا دیا ہوا جو کچھ (حلال مال) بچ جائے وہ تمہارے لئے بہتر ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ صحیح صحیح ناپ تول کر دینے کے بعد جو حلال چیز باقی رہ جاتی ہے وہ بہتر ہے اس حرام مقدار سے جو ناپ تول میں کمی کر کے تم حاصل کرتے ہو۔

مجاہد نے کہا بَقِيَّتُ اللّٰهِ سے مراد ہے اللہ کی اطاعت جیسے دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۚ　اگر تم مؤمن ہو۔ یعنی بَقِيَّتُ اللّٰهِ کا تمہارے لئے بہتر ہونا ایمان کے ساتھ مشروط ہے مؤمن کو ہی نیکی کا اجر ملے گا۔ کافر کی بھلائیاں تو اکارت جائیں گی۔

بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اگر تم میرے قول کو سچ مانتے ہو تو میں نے جو صحیح ناپنے تولنے کا تم کو حکم دیا ہے اس پر عمل کرو۔

وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ﴿۸۶﴾ اور میں تمہارا پہرہ دینے والا نہیں ہوں کہ برائیوں سے تم کو بچالوں یا تمہارے اعمال کی نگہداشت کروں۔ اور پھر ان کا بدلہ دوں۔ میں تو صرف ناصح اور مبلغ ہوں، میرا فرض تو حکم پہنچانے کے بعد پورا ہو جاتا ہے (مانو یا نہ مانو) یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم اپنی بداعمالی نہ چھوڑو تب بھی میں اللہ کی نعمت تم پر قائم رکھوں، میں ایسا نہیں کر سکتا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ انہوں نے کہا شعیبؑ کیا تمہاری نماز تم کو حکم دیتی ہے کہ جن بُتوں کی پوجا ہمارے بڑے کرتے چلے آئے ہیں ہم ان کو چھوڑ دیں یا اپنے مال میں اپنی منشاء کے مطابق جو ہم تصرف کرتے ہیں اس کو ترک کر دیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا حضرت شعیبؑ نماز بہت پڑھتے تھے اسی لئے کافروں نے آپ کی نماز کا تذکرہ کیا۔ اعمش کے نزدیک نماز سے مراد ہے نماز پڑھنا۔ حضرت شعیبؑ نے قوم کو توحید کی دعوت دی اس کے جواب میں انہوں نے آپ سے استہزاء میں اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ اس قسم کی دعوت تم سے یہ نماز کی پابندی اور مداومت کرا رہی ہے اس نے تمہارے دماغ میں خلل پیدا کر دیا ہے ورنہ صحیح ہوش و خرد کا تو یہ تقاضا نہیں۔

اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾ واقعی آپ ہیں بڑے عقلمند دین دار۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا انہوں نے حضرت شعیبؑ کو حلیم و رشید بطورِ طنز کہا تھا، حقیقت میں ان کا مقصد تھا یہ کہنا کہ تم سادہ لوح گمراہ ہو۔ عرب لوگ ایک مفہوم کی تعبیر اس کی ضد سے کر لیتے ہیں نیک شگون یا دعا کے طور پر اس شخص کو جس کو بچھو ڈس لے سلیم کہتے ہیں اور خطرناک بیابان کو مَفازۃ "کامیابی کی جگہ"۔ بعض علماء نے کہا انہوں نے حلیم و رشید بطورِ استہزاء کہا تھا، مقصد تھا حضرت شعیبؑ کے اندر سفاہت و ضلالت ثابت کرنا۔ حضرت ابن عباسؓ کے قول پر استعمال مجازی ہوگا اور مؤخر الذکر قول پر حقیقی کنائی (یعنی بطورِ کنایہ مذمت مراد ہوگی) بعض نے کہا کلام مبنی بر حقیقت ہے اور کنایۃً مذمت کرنا بھی غرض نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں تو تم بڑے سنجیدہ اور صاحبِ رُشد ہو۔ ہم تو گمان بھی نہیں کرتے تھے کہ ایسی بات کہو گے۔ حضرت صالحؑ کی قوم نے بھی حضرت صالحؑ سے ایسا ہی کلام کیا تھا اور کہا تھا قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ

بعض علماء نے کہا (بِزَعْمِکَ کا لفظ محذوف ہے اور کلام حقیقی ہے یعنی) تم تو اپنے خیال میں حلیم و رشید ہو پھر ایسی بات تم نے کیوں کی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ شعیبؑ نے کہا اے میری قوم! دیکھو تو اگر میں اپنے رب کی جانب سے دلیل پر قائم ہوں اور اس نے مجھے اپنی طرف سے اچھا رزق عطا فرمادیا ہے (تو کیسے اس کا حکم نہ مانوں)۔

بَيِّنَةٍ بصیرت اور واضح بیان۔ مِنْ رَّبِّيْ اپنے رب کی طرف سے یعنی وحی اور نبوت کے ذریعے سے۔ رَزَقَنِيْ مِنْهُ یعنی محنت مشقت اٹھائے بغیر اللہ نے حلال رزق عطا فرمادیا۔ رِزْقًا حَسَنًا سے مراد ہے حلال رزق۔ کہا گیا ہے کہ حضرت شعیبؑ بڑے مالدار تھے۔[۱]

---

[۱] اس فقیر کی نظر میں حضرت شعیبؑ کے مالدار ہونے نہ ہونے کو آیت کے مفہوم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ آپ نے قوم کو ایسے بلیغ طرز سے ہدایت کی کہ کسی کو بُرا ماننے کا موقع نہ ملے۔ آپ کا مقصد تو یہ تھا کہ جب اللہ نے اپنی رحمت سے تم کو وحی کے ذریعے سے بصیرت عطا فرمادی اور واضح طور پر بیان کر دیا اور کثیر حلال رزق عطا فرمادیا تو پھر شرک کرنا اور حرام رزق حاصل کرنے کی تدبیریں اور طریقے اختیار کرنا حماقت ہے۔ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے عبارت کو متکلم کے سانچے میں ڈھال لیا اور فرمادیا کہ اگر مجھ پر اللہ کا اتنا کرم ہو گیا تو پھر اس کے احکام کی مخالفت کیسے جائز ہو سکتی ہے، اسلوبِ کلام بدلنے اور خطاب سے متکلم کی طرف کلام کا رخ موڑنے سے ہدایت بحُسنِ اسلوب ہو گئی اور مخاطب کی ناگواری کا احتمال بھی نہیں رہا۔ مترجم۔

اِنْ کُنْتُ میں اِنْ حرفِ شرط ہے جزاء محذوف ہے مطلب یہ کہ جب اللہ نے نبوّت و وحی کے ذریعے سے مجھے بصیرت عطا فرما دی اور مجھے بغیر محنت و مشقّت کے حلال رزق عطا فرما دیا تو کیا اب یہ جائز ہے کہ میں اس کے احکام کی مخالفت کروں اور وحی میں خیانت کروں اور اس کا پیام نہ پہنچاؤں۔

قوم نے حضرت شعیبؑ پر طنز کیا تھا کہ تم ساری قوم کے مذہب کی مخالفت کر رہے ہو، حضرت نے مذکورہ بالا الفاظ میں ان کو جواب دیا اور قوم کے افکار و اعمال کی مخالفت کرنے کی وجہ بیان کر دی۔

وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰكُمْ عَنْهُ ؕ اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ تمہارے برخلاف ان کاموں کو کروں جن سے تم کو روکتا ہوں۔ یعنی جس بات سے تم کو روک رہا ہوں خود اس کا ارتکاب کروں اور اپنے عمل کو قول کے خلاف ظاہر کروں۔ میں ایسا کرنا نہیں چاہتا اگر یہ بات بہتر ہوتی تو میں اس کو کیوں چھوڑتا۔ میں تمہارے لئے وہی بات پسند کرتا ہوں جو اپنے لئے پسند کرتا ہوں اور تمہارے لئے وہی بات ناپسند کرتا ہوں جو اپنے لئے ناپسند کرتا ہوں۔ اگر زید کوئی کام نہ کر رہا ہو اور تم نے اس کام کو کرنے کا ارادہ کر لیا ہو تو کہہ سکتے ہو۔ خَالَفْتُ زَيْدًا اِلٰى كَذَا اور اگر زید ایک کام کر رہا ہو اور تم اس کو کرنا پسند نہیں کرتے تو کہہ سکتے ہو خَالَفْتُ زَيْدًا عَنْ كَذَا۔

اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ (یعنی شرک اور ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت اور توحید وایفاء کا حکم دینے سے) میرا مقصد تو محض (تم کو اور سارے عالم کو) بگاڑ سے روکنا اور فساد کی درستی کرنا ہے۔ جہاں تک یا جب تک مجھ سے ہو سکے (یعنی بقدرِ امکان و طاقت میں اصلاح کی کوشش کا ارادہ رکھتا ہوں۔ کوشش میں کمی نہیں کروں گا)

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ اور (عملِ صالح کی) مجھے جو کچھ توفیق ہے وہ اللہ ہی کی مدد سے ہے یعنی اللہ کی ہدایت و مدد کے بغیر میرے لئے صداقت و حقّانیت کا حصول ناممکن ہے۔ توفیق کا معنی ہے، مقصدِ خیر کے حصول کے اسباب و ذرائع فراہم کر دینا اور اسباب کو مقصد کے موافق بنا دینا۔

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ میں نے اسی پر بھروسہ کر لیا ہے اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں۔ یعنی اللہ ہی ہر چیز پر قادر ہے، اسی کے قابو میں سب کچھ ہے اس کے سوا ہر چیز عاجز بلکہ حقیقتاً معدوم ہے ناقابلِ اعتماد ہے اس لئے میرا بھروسہ اسی پر ہے اور تمام مصائب و حوادث میں، میں اسی کی طرف رُجوع کرتا ہوں، اس آیت میں خالص توحید کی طرف اشارہ ہے۔

اِلَيْهِ اُنِيْبُ کا یہ مطلب بھی ہو سکتا کہ مرنے کے بعد لوٹ کر میں اسی کی طرف جاؤں گا۔ اِنابت کا معنی ہے تمام امور میں اللہ ہی سے توفیقِ صداقت و حقّانیت کی درخواست کرنا ہر کام میں اللہ ہی سے مدد کا طلب گار ہونا اور کامل طور پر سراسر اسی کی طرف متوجہ ہو جانا۔

پورے کلام میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ میں تمہاری مخالفتوں کی پرواہ نہیں کرتا میرا رجوع اپنے رب کی طرف ہے تم کو مجھ سے کوئی امیدِ موافقت نہ رکھنی چاہئے۔ اس میں کافروں کو تہدید ہے کہ اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے وہی سزا جزا دے گا۔

وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ

اور اے میری قوم مجھ سے عداوت و مخالفت کا تمہارے لئے کہیں یہ نتیجہ نہ نکلے کہ جو عذاب قوم نوح یا قوم ہود یا قوم صالح پر آیا تھا ویسا ہی عذاب تم پر آجائے۔ یعنی غرق ہو جانے کا یا طوفان کا یا زلزلہ اور کڑک کا عذاب تم پر کہیں نہ آجائے شِقَاق کا معنی ہے عداوت اور مخالفت۔

وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ اور قوم لوط کا زمانہ تم سے دور نہیں ہے یعنی عذاب سے ہلاک ہونے والی قوموں میں سب سے قریب ترین زمانہ لوط کی قوم کا ہے تم سمجھ لو کہ پیغمبر کی مخالفت کی وجہ سے کیسے عذاب نے ان کو ہلاک کر

دیا، یا یہ مراد ہے کہ قوم لوط کی اُجڑی ہوئی۔ بستیاں تم سے دور نہیں ہیں تمہارے ملک کے متصل ہیں یا یہ مراد ہے کہ شرک و معاصی کی وجہ سے مستحقِ عذاب ہونے میں قوم لوط تم سے بعید نہیں تھی (تم دونوں میں زیادہ تفاوت نہیں) لفظ قریب و بعید اور قلیل و کثیر میں مذکر و مؤنث برابر ہیں دونوں کے لئے ان کا استعمال ہوتا ہے اس لئے بعید کو بصیغہ مفرد لانے میں کوئی خرابی نہیں۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ　اور اپنے رب سے گزشتہ شرک و معاصی کی معافی طلب کرو۔ یعنی ایمان لے آؤ۔ اور گزشتہ گناہوں پر پشیمانی کا اظہار کرو۔ اور معافی مانگو۔

ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ　پھر اس کی طرف رجوع کرو۔ آئندہ اس کے احکام کی تعمیل کرو اور ممنوعات سے باز رہو۔

اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ۝۹۰　بلا شبہ میرا رب توبہ کرنے والے مومنوں پر بڑا مہربان اور ان سے بڑی محبت کرنیوالا ہے۔ وَدُوْدٌ بروزن فعول اسم فاعل کے معنی میں بھی آتا ہے اور اسم مفعول کے معنی میں بھی۔ اللہ مؤمنوں سے محبت کرنے والا ہے اور مؤمن اللہ سے محبت کرتے ہیں، پس وہ محبّ بھی ہے اور محبوب بھی۔

اول آیات میں حضرت شعیبؑ نے کفر و معصیت پر جمے رہنے کی صورت میں عذابِ الٰہی سے ڈرایا پھر توبہ کر لینے کی صورت میں مغفرت کا امیدوار بنایا۔

قَالُوْا يٰشُعَيْبُ مَا نَفْقَهُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَقُوْلُ　کہنے لگے شعیب ہماری سمجھ میں تو تیری بہت سی باتیں آتی نہیں۔ نہ توحید سمجھ میں آتی ہے نہ ناپ تول میں کمی کرنے کی ممانعت نہ تیری بیان کی ہوئی دلیلیں۔ چونکہ ان کی قوتِ فہم کمزور تھی اور سوچنے سمجھنے سے وہ عاری اس لئے ایسی بات کہی یا یہ وجہ تھی کہ حضرت شعیبؑ کے کلام کو وہ حقیر نا قابلِ التفات سمجھتے تھے یا یہ وجہ تھی کہ ان کو حضرت کے پیام سے انتہائی نفرت تھی اس لئے اس کو سمجھنے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے تھے۔ میرے نزدیک حقیقت یہ تھی کہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی تھی انسانوں کے دل اللہ کی چٹکی میں ہیں وہ جس طرف کو چاہتا ہے دلوں کو موڑ دیتا ہے۔

وَاِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْنَا ضَعِيْفًا ۚ　اور حقیقت یہ ہے کہ ہم تم کو اپنے گروہ کے اندر کمزور پاتے ہیں اگر ہم تم کو کچھ دکھ پہنچائیں تو تمہارے اندر دفاع کی طاقت نہیں۔ یا ضَعِیفًا سے مراد ہے ذلیل یعنی ہم اپنے گروہ میں تم کو ذلیل پاتے ہیں ہم میں تمہاری کوئی عزّت نہیں۔

بغوی نے لکھا ہے ضعیف سے مراد ہے ضعیفُ البصر۔ حضرت شعیبؑ نابینا تھے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حمیری محاورہ میں ضعیف اندھے کو ہی کہا جاتا ہے۔ مگر فِیْنَا کا لفظ بتا رہا ہے کہ ضعیف سے نابینا مراد نہیں ہے (اس فقیر کے نزدیک یہ بات ممکن ہے کہ بے بصر کہہ کر قوم کی مراد بے بصیرت ہو یعنی ہمارے گروہ میں تم بے بصیرت ہو بے وقوف ہو جو ایسی باتیں کہتے ہو۔ مترجم)

......فائدہ......

بعض علماء معتزلہ نے نبوت کو قضا اور شہادت پر قیاس کیا ہے ان حضرات کے نزدیک جس طرح نابینا شاہد اور قاضی نہیں ہو سکتا اسی طرح نبی بھی نہیں ہو سکتا۔ مگر یہ قیاس غلط ہے (قضاو شہادت کا تعلق معاینہ سے ہے اور نبوت کا مدار مشاہدے پر نہیں۔ واقعات کا اظہار اور فیصلہ الگ چیز ہے اور ہدایت در سالت جدا حیثیت رکھتی ہے۔ مترجم)

حضرت یعقوبؑ کا نابینا اور پھر بینا ہو جانا عبارتِ قرآنی سے ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ۔ پھر فرمایا فَارْتَدَّ بَصِيْرًا۔

وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ؗ　اور اگر تمہارے قبیلے کی پاسداری نہ ہوتی تو ہم پتھراؤ کر کے تم کو ہلاک کر

دیتے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت شعیبؑ کی قوم طاقت ور تھی اور آپ ان کی حفاظت میں تھے۔ بیضاوی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تمہاری قوم چونکہ ہماری ہم مذہب ہے اس لئے ان کی عزت ہماری نظر میں ہے اگر تمہاری قوم کی عزت ہماری نظر میں نہ ہوتی تو ہم تم کو سنگسار کر دیتے۔ حضرت شعیبؑ کے قبیلے کی طاقت کا خوف مراد نہیں ہے کیونکہ تین سے دس تک یا سات تک جس جماعت کے افراد ہوں اس کو رہط کہا جاتا ہے (اور ظاہر ہے کہ دس پانچ آدمیوں کی طاقت پوری بستی کے مقابل کیا ہو سکتی ہے)۔

میں کہتا ہوں کہ اول قول کی تائید آیت تِسْعَةُ رَهْطٍ سے ہوتی ہے۔ جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ دس سے کم کی جماعت کو رہط کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا چالیس تک رہط کا اطلاق ہوتا ہے۔ جزری نے نہایۃ میں لکھا ہے کہ رہط دس سے کم مردوں کی جماعت کو کہتے ہیں جن میں کوئی عورت نہ ہو۔ بعض نے چالیس سے کم کو رہط کہا ہے۔ قاموس میں ہے رہط کسی شخص کی قوم اور اس کا قبیلہ یا تین سے سات تک یا دس تک یا دس سے نیچے۔ (یعنی نو) تک کی جماعت جبکہ ان میں کوئی عورت نہ ہو۔ لفظ رہط کا کوئی مفرد اس لفظ سے نہیں (یعنی کوئی ایسا مفرد لفظ نہیں ہے جس کی جمع رہط ہو) بغوی کے کلام میں بھی صاحبِ قاموس کے بیان کئے ہوئے اول معنی کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَآ اَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيْزٍ ﴿۹۱﴾ اور تم ہمارے لئے کوئی عزت والے نہیں ہو کہ تمہاری عزت تم کو سنگباری سے محفوظ رکھے۔ جو احمق، جاہل دلائل براہین کا جواب دلیل سے نہیں دے سکتے وہ گالیاں اور دھمکیاں دینے پر اتر آتے ہیں۔ مَا (حرف نفی) کے بعد اَنْتَ کا لفظ ذکر کرنا اس امر پر دلالت کر رہا ہے کہ کافروں کا کلام حضرت شعیبؑ کی ذات سے متعلق تھا۔ آپ کی عزت سے متعلق نہ تھا۔ عزت تو خاندانِ شعیب کی حضرت شعیبؑ کو ایذا دینے سے روک رہی تھی۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاتَّخَذْتُمُوْهُ وَرَآءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۭ

شعیبؑ نے کہا اے میری قوم کیا میرا خاندان تمہارے نزدیک اللہ سے بھی زیادہ عزت والا ہے اور تم نے اس کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ یعنی میرے خاندان کی رعایت سے تم نے مجھے قتل نہیں کیا اور اللہ کی طرف سے جو مجھے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا ہے اس خدا اور رسالت کا تم نے کوئی لحاظ نہیں کیا اور اللہ کو بالکل فراموش کر دیا نہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہوئے تم کو کوئی اندیشہ ہوا نہ اس کے رسول کی توہین کرنے سے کوئی باک۔

اَرَهْطِيْٓ میں ہمزہ استفہام انکاری کا بھی ہو سکتا ہے اور زجر و تہدید کے لئے بھی۔ ظِهْرِيًّا: ظَہر (پشت) سے بنایا گیا ہے۔ یائے نسبت کی وجہ سے دوسرے تغیرات لفظی کے ساتھ ظا کو زیر بھی دے دیا گیا۔

اِنَّ رَبِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۹۲﴾ جو کچھ تم کر رہے ہو بلاشک وشبہ اللہ اس کو اپنے عملی دائرے میں گھیرے ہوئے ہے یعنی تمہارا کوئی عمل اس سے چھپا ہوا نہیں ہے وہ یقیناً تمام اعمال کا بدلہ دے گا۔

وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰي مَكَانَتِكُمْ اِنِّىْ عَامِلٌ ۭ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۙ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۭ

اور اے میری قوم تم اپنی حالت میں عمل کرتے رہو۔ میں بھی اپنے طور پر عمل کر رہا ہوں اب جلد ہی تم کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کون شخص ہے جس پر ایسا عذاب آیا چاہتا ہے جو اس کو رسوا کر دے گا اور وہ کون شخص ہے جو جھوٹا ہے۔ مَكَانَة سے مراد ہے عداوت پر قائم رہنا۔ مَنْ يَّاْتِيْهِ میں مَنْ استفہامیہ ہے (کس پر عذاب آئے گا تم پر یا مجھ پر) یا موصولہ ہے (جس پر عذاب آئے گا) سورۂ انعام میں بھی ایسی آیت گزر چکی ہے۔ وَمَنْ هُوَ كَاذِبٌ کا عطف مَنْ يَّاْتِيْهِ پر ہے یعنی عنقریب تم جانو گے کہ کس پر عذاب آتا ہے تم پر یا مجھ پر اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ کون جھوٹا ہے تم یا میں۔

وَارْتَقِبُوْٓا اِنِّىْ مَعَكُمْ رَقِيْبٌ ﴿۹۳﴾ اور تم انجام کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔ رَقِيْبٌ

بروزنِ فعیل بمعنی رَاقِبٌ جیسے صَرِیْمٌ بمعنی صَارِمٌ یا بمعنی مُرَاقِبٌ (باہم ایک دوسرے کا نگراں) جیسے عَشِیْرٌ بمعنی مُعَاشِرٌ باہم ساتھ رہنے والے یا بمعنی مرتقب منتظر جیسے رفیع بمعنی مرتفع (اونچا)

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا　　اور جب ہمارا عذاب یا عذاب کا حکم آپہنچا۔ اس جگہ اور عاد کے قصے میں عذاب کا وعدہ پہلے مذکور نہیں ہے اس لئے جملہ کو واؤ سے شروع کیا اور صالحؑ ولوطؑ کے قصوں میں نزولِ عذاب سے پہلے وعدۂ عذاب مذکور ہے، فرمایا ہے وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ۔ اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ اس لئے ان دونوں مقاموں میں فَا سے جملہ شروع کیا ہے اور فَلَمَّا فرمایا ہے گویا فا نتیجہ پر آئی جس کا سبب پہلے ذکر کر دیا گیا ہے۔

نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَاَخَذَتِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۹۴﴾　　ہم نے بچالیا شعیبؑ کو اور ان کے ساتھ والے مؤمنوں کو اپنی رحمت سے اور کافروں کو پکڑ لیا ایک چیخ نے اور وہ اپنے گھروں میں صبح کو مرے کے مرے رہ گئے۔

کہا گیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے ایک چیخ ماری تھی جس سے سب کی جانیں نکل گئیں یا آسمان کی طرف سے ایک چیخ آئی تھی جس سے سب مر گئے۔

جُثُوْمٌ کا لغوی معنی ہے زمین سے چمٹ جانا۔

كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا　　ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گھروں میں زندگی کی حالت میں رہتے ہی نہ تھے (یعنی گھر اُجاڑ ہو گئے)۔

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ ﴿۹۵﴾　　خوب سن لو (اور عبرت حاصل کرو) کہ مَدین کو رحمت سے دُوری ہوئی جیسے ثمود رحمت سے دور ہوئے تھے۔ قومِ ثمود کی ہلاکت بھی ایک چیخ سے ہوئی تھی، اس لئے اہلِ مدین کی ہلاکت کو قومِ ثمود کی ہلاکت سے تشبیہ دی، فرق اتنا تھا کہ ثمود کی ہلاکت زمین کی اندرونی چیخ سے ہوئی تھی اور قوم شعیبؑ کی ہلاکت آسمانی چیخ سے۔ ع ۸

بَعُدَ (باب کَرُمَ) اصل ہے اور بَعِدَ (باب سَمِعَ سے) بھی آیا ہے دونوں کا مصدر بُعْدًا آتا ہے۔ (بَعُدَ باب کرم) دور ہو گیا۔ بعِد (باب سمع) ہلاک ہونے کی وجہ سے دور ہو گیا۔ صرف باب سَمِعَ سے مصدر بَعَدًا بھی آتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ

اور ہم نے موسیٰؑ کو اپنی نشانیاں اور کھلا ہوا غلبہ عطا کر کے فرعون کے اور اس کے سرداروں کے پاس بھیجا۔ آیات سے مراد ہیں معجزات۔ توریت کی آیات مراد نہیں ہیں کیونکہ توریت کا نزول تو فرعون کے ڈوبنے کے بعد ہوا تھا۔

سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ کھلا ہوا غلبہ۔ ایک طرف تنہا حضرت موسیٰؑ تھے دوسری طرف فرعون اور اس کا لاؤ لشکر تھا جو سب کے سب حضرت موسیٰؑ کے قتل کے درپے تھے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ حضرت موسیٰؑ کو اللہ نے کھلا ہوا غلبہ عنایت فرمایا۔

یا سُلْطَانٌ مُّبِيْنٌ سے مراد صرف عصا کا معجزہ ہے یہ معجزہ سب سے زیادہ واضح اور غالب تھا یا آیات اور سلطان سے مراد ایک ہی ہے۔ آیات و معجزات حضرت موسیٰؑ کی نبوّت کی کھلی نشانیاں بھی تھے اور سببِ غلبہ بھی۔

مُبِیْنٌ لازم بھی ہے اور متعدی بھی اس لئے اس کا ترجمہ روشن وواضح بھی ہے اور روشنی پیدا کرنے والا واضح کرنے والا بھی ہے۔ آیۃ کا مفہوم سلطان کے مفہوم سے عام ہے آیت نشانی علامت کو بھی کہتے ہیں اور دلیلِ قطعی کو بھی اور سلطان صرف دلیلِ قطعی کو۔

فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ ۚ وَمَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾　　سو وہ لوگ بھی فرعون ہی کی رائے پر چلتے رہے اور فرعون کی رائے کچھ صحیح نہیں تھی، یعنی کفر، سرکشی اور حد سے بڑھی ہوئی گمراہی میں فرعونیوں نے فرعون کی

پیروی کی اور فرعون کا فکریہ وعملیہ محض گمراہی وکجروی تھا۔ نام کو بھی اس میں صلاح ورُشد نہیں تھا۔ ہر پسند قابلِ ستائش امر کو رُشد اور ہر بُرے امر کو غَیّ کہا جاتا ہے۔

آیت میں فرعون کے گروہ کی جہالت وحماقت کا اظہار ہے کہ فرعون اُلوہیت کا مدّعی تھا باوجودیکہ اپنے مصاحبین کی طرح معمولی انسان تھا علی الاعلان کفر وشرک اور ظلم کرتا تھا اور موسیٰ ہادیٔ برحق تھے۔ آپ کا قول مبنی برحق تھا، عقل ونقل کی شہادت اور معجزات کی تائید آپ کے قول کو ثابت کر رہی تھی پھر بھی فرعون کے ساتھی ایسے کورن تھے کہ موسیٰ جیسے ہادیٔ برحق کے اِتباع سے روگرداں اور فرعون جیسے باطل پرست کے پیرو تھے۔

یَقْدُمُ قَوْمَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ قیامت کے دن دوزخ کی جانب وہ اپنی قوم کا پیشوا ہوگا اور دوزخ میں سب کو اُتار دے گا۔ جس طرح دنیا میں گمراہی کی جانب بڑھنے میں سب کا امام تھا۔ قیامت کے دن چونکہ ایسا ہونا اتنا یقینی ہے کہ گویا ایسا ہو گیا اس لئے بجائے مستقبل کے ماضی کا صیغہ استعمال کیا اور اَوْرَدَھُمْ فرمایا۔ وِرْدٌ کا معنی ہے چشمہ وغیرہ میں اُترنا۔ دوزخ کو پانی فرض کر کے اس میں داخل ہونے کو وُرُوْدٌ قرار دیا (گویا دوزخ ایک چشمہ یا تالاب ہوگا جس میں فرعون آگے آگے اس کے اَتباع جو جانوروں کی طرح جاہل ناسمجھ تھے پیچھے پیچھے اس میں اتریں گے)۔

وَ بِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ اور وہ دوزخ بہت ہی بُری جگہ ہے اترنے کی جس میں یہ لوگ اتارے جائیں گے۔ پانی میں اترنا، پیاس بجھانے اور خنکی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے اور دوزخ میں اترنے سے پیاس اور سوزش میں مزید اضافہ ہوگا، اس لئے فرمایا کہ بُرا چشمہ ہوگا۔

آیت وَمَا اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِیْدٍ ایک دعویٰ تھا اور یَقْدُمُ قَوْمَهٗ الخ اس کی دلیل ہے کیونکہ جس کی رہنمائی دوزخ میں لے جائے وہ یقیناً غلط رو ہوگا اور اس کی رہبری تباہ کن ہوگی یا یوں کہا جائے کہ رشید وہ ہے جس کا انجام اچھا ہو اور فرعون کی پیشوائی کا انجام تباہ کن ہوگا۔ گویا دوسری آیت پہلی آیت کی تشریح ہے۔

وَاُتْبِعُوْا فِیْ هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ اور اس دنیا میں بھی لعنت ان کے ساتھ رہی اور قیامت کے دن بھی وہ ملعون ہوں گے یعنی اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے انبیاء اور مؤمنوں کی زبانی ان پر لعنت کی گئی اور قیامت کے دن بھی ان پر لعنت کی جائے گی۔

بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾ بُرا انعام ہے جو ان کو دیا گیا۔

رِفْدٌ کا معنی ہے مدد مَرْفُوْدٌ اسی سے اسم مفعول کا صیغہ ہے یا رِفْدٌ کا معنی ہے عطیہ اور مَرْفُوْدٌ کا معنی ہے عطا کیا ہوا۔ قاموس میں ہے اِرْفَادٌ مدد کرنا اور عطا کرنا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰی یہ (جو ہم نے بیان کیا ہلاک شدہ) بستیوں کی کچھ اطلاعات ہیں۔

نَقُصُّهٗ عَلَیْكَ ہم آپ کو ان کی خبریں بتا رہے ہیں، یعنی ان کی خبریں آپ کو بتائی گئی ہیں۔

مِنْهَا قَآئِمٌ وَّ حَصِیْدٌ ﴿۱۰۰﴾ ان بستیوں میں سے کچھ تو کھڑی ہیں۔ یعنی ان کے نشانات باقی ہیں اور کچھ کٹی ہوئی کھیتی کی طرح بے نشان ہو گئی ہیں۔ مقاتل نے کہا قَآئِمٌ سے مراد ہیں جن کے نشان دکھائی دے رہے ہیں اور حَصِیْدٌ سے مراد وہ ہیں جن کی نمود بھی نہیں دکھائی دیتی۔

بعض علماء نے قَآئِمٌ کا ترجمہ آباد اور حَصِیْدٌ کا ترجمہ ویران کیا ہے۔

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ اور ہم نے ان کو ہلاک کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا۔ کفر ومعصیت کر کے اپنی جانوں کو تباہی کا مستحق بنا دیا جمع مذکر غائب کی ضمیریں بستیوں والوں کی طرف راجع ہیں۔

فَمَاۤ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ الَّتِیْ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ؕ وَمَا زَادُوْهُمْ غَیْرَ تَتْبِیْبٍ ﴿۱۰۱﴾

اور جب آپ کے رب کی طرف سے ہلاکت کا حکم آگیا تو ان کے معبود جن کو وہ پوجتے تھے اور اللہ کے سوا پکارا کرتے تھے کچھ بھی کام نہ آئے (اور عذاب کو دفع نہ کر سکے) اور ہلاکت آفرینی و بربادی کے سوا اور کچھ ان کے لئے نہ بڑھا سکے اَمْرُ رَبّ سے مراد ہے عذاب تتبیب بربادی، ہلاکت اور نقصان۔

وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ ط اور مذکورہ اقوام کی گرفت کی طرح آپ کے رب کی طرف سے پکڑ دوسری بستیوں والوں کی بھی ہوئی ہے جبکہ وہ ظالم تھے۔ یعنی وہ ظالم ہونے کی وجہ سے مستحقِ عذاب تھے۔ اس لئے اللہ نے ان کی بھی گرفت کی۔

اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ۝۱۰۲ بے شک اللہ کی پکڑ سخت دکھ پہنچانے والی ہے جس سے رہائی ناممکن ہے

حضرت ابو موسیٰؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے آخر اس کی گرفت کرتا ہے تو ایسی کرتا ہے کہ پھر وہ چھوٹ نہیں سکتا۔ یہ فرمانے کے بعد حضورؐ نے آیت كَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ الْقُرٰى وَهِيَ ظَالِمَةٌ تلاوت فرمائی رواہ الشیخان فی الصحیحین والترمذی (فی السنن) وابن ماجہ۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّمَنْ خَافَ عَذَابَ الْاٰخِرَةِ ط بے شک اس میں (یعنی کافر و ظالم بستیوں کو ہلاک کرنے اور ان کے مذکورہ واقعات میں) بڑی عبرت ہے ان لوگوں کے لئے جو آخرت کے عذاب سے ڈرتے ہیں اللہ سے ڈرنے والے عذاب آخرت کی عظمت کا اندازہ اس سے کر سکتے ہیں اور سمجھ سکتے ہیں کہ مجرموں پر دنیا میں جو عذاب آیا وہ عذابِ آخرت کا ایک نمونہ ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان واقعات کے بیان کو سن کر وہ اللہ کی نافرمانیوں کو ترک کر دیتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عذاب اس الٰہِ مختار کی طرف سے آیا ہے جو اپنی مرضی کے مطابق جس کو چاہے عذاب دے اور جس پر رحم کرنا چاہے رحم کرے رہے منکرینِ آخرت تو وہ جانوروں کی طرح ہیں نہ ان میں فہم ہے نہ بصیرت بلکہ وہ اس قسم کے عذاب کو محض اتفاق اور سلسلۂ اسباب و مسببات کی پوشیدہ کڑی قرار دیتے ہیں۔

ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ ۙ لَّهُ النَّاسُ یہ (یوم قیامت جس میں عذاب ہوگا) ایسا دن ہوگا کہ سب لوگ اس روز جمع کئے جائیں گے۔ یعنی اس روز سب کی حساب فہمی ہوگی۔ جزا و سزا ہوگی اس کے لئے سب کو جمع کیا جائے گا۔

وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ ۝۱۰۳ اور یہ ہی ایسا دن ہوگا کہ جس میں شہادت دینے والے لوگوں پر شہادت دیں گے یا یہ مطلب ہے کہ سب کو حاضر کیا جائے گا کوئی غائب نہیں ہوگا۔

وَمَا نُؤَخِّرُهٗٓ اِلَّا لِاَجَلٍ مَّعْدُوْدٍ ۝۱۰۴ اور ہم اس دن کو صرف اس لئے پیچھے رکھ رہے ہیں کہ وہ مدت (زندگی) جو اللہ کے نزدیک مقرر ہے پوری ہو جائے۔ اَجَل سے پہلے لفظ انتہا محذوف ہے اَجَل سے پوری مدت زندگی مراد ہے، ختم زندگی کا وقت مراد نہیں ہے۔ کیونکہ ساعتِ اختتام میں تعدد نہیں اس کو معدود نہیں کہا جا سکتا۔

يَوْمَ يَاْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۚ جب وہ دن آجائے گا تو کوئی شخص اللہ کی اجازت کے بغیر بات نہیں کر سکے گا۔ یعنی شفاعت نہ کر سکے گا۔ یا ایسی کوئی بات نہ کہہ سکے گا جو اس کو فائدہ پہنچا سکے۔ دوسری آیت میں آیا لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ

يَوْمَ يَاْتِ میں يَاْتِ کا فاعل یا اجل ہے یعنی جس روز سزا و جزا آجائے گی یا يَوْم سے مراد ہے وقت اور يَاْتِ کا فاعل ہے يَوْم یعنی جب اور جس وقت وہ دن آجائے گا یا اللہ فاعل ہے یعنی جس روز اللہ آجائے گا اللہ کے ظہور کو دوسری آیات میں بھی بیان کیا گیا ہے فرمایا ہے هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ، وَجَآءَ رَبُّكَ۔

فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَّسَعِيْدٌ ۝۱۰۵ پس کچھ ان اہل حشر میں بدبخت ہوں گے اور کچھ خوش نصیب۔ جس کے لئے بدبختی لکھ دی گئی ہے وہ بدبخت ہوگا اور جس کے لئے خوش نصیبی لکھ دی گئی وہ سعید ہوگا۔

حضرت علی بن ابی طالبؓ نے فرمایا ہم ایک جنازہ کے ساتھ نکلے بقیع میں پہنچے تو رسول اللہ ﷺ بھی (چھڑی ہاتھ میں

لئے سامنے سے آتے) نظر آئے آپ تشریف لا کر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر چھڑی سے زمین کریدتے رہے، پھر فرمایا کوئی جان کسی بدن میں پھونکی ہوئی ایسی نہیں کہ جنت یا دوزخ میں اس کی جگہ پہلے سے لکھ نہ دی گئی ہو یا اس کا شقی و سعید ہونا نہ لکھ دیا گیا ہو یہ سن کر ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ تو پھر اپنے مقدر میں لکھے پر بھروسہ کیوں نہ کروں اور عمل کو ترک کیوں نہ کردوں۔ فرمایا نہیں عمل کئے جاؤ ہر ایک کو تقدیر میں لکھے ہوئے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ شقاوت والوں کو اہلِ شقاوت کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے اور اہلِ سعادت کو سعادت مندوں کے عمل کی توفیق دی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے آیت فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَ اتَّقٰی وَ صَدَّقَ بِالْحُسْنٰی الخ تلاوت فرمائی۔ رواہ البغوی، بخاری و مسلم میں بھی اسی طرح کی حدیث آئی ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ ﴿۱۰۶﴾ سو جو لوگ شقی ہیں وہ دوزخ میں ہوں گے۔ دوزخ میں ان کی چیخ و پکار ہو گی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا زَفِیْرٌ سخت آواز اور شَهِیْقٌ پست آواز۔ ضحاک اور مقاتل نے کہا گدھے کی آواز کی ابتدائی حالت کو زفیر کہتے ہیں اور آواز کی آخری حالت جب آواز لوٹ کر گدھے کے پیٹ میں گھومتی ہے شہیق کہلاتی ہے۔ قاموس میں بھی یہی ہے۔ ابوالعالیہ نے کہا حلق میں ہونے کی حالت میں آواز کو زفیر اور سینے میں اترنے کی حالت میں آواز کو شہیق کہا جاتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے سانس کا باہر نکالنا زفیر ہے اور سانس کا لوٹا کر اندر لے جانا شہیق ہے۔ لیکن زفیر کا استعمال گدھے کی ابتدائی آواز کے لئے اور شہیق کا استعمال گدھے کی آخری آواز کے لئے ہوتا ہے۔ قاموس میں آیا ہے زَفَرَ یَزْفِرُ زَفْرًا اور زَفِیْرًا کھینچ کر سانس کو باہر نکالا (یعنی زفیر آہ بھرنے کو کہتے ہیں)۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ ہمیشہ اس میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں۔

ضحاک نے کہا آسمان و زمین سے جنت و دوزخ کے آسمان و زمین مراد ہیں، جو چیز سر کے اوپر کی جانب ہو وہ سماء ہے اور جس پر قدم ٹکے ہوئے ہوں وہ ارض ہے۔ یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ حشر میں سب لوگوں کا اجتماع ہو گا تو وہ کسی جگہ ہو گا قدموں کے نیچے بھی کوئی چیز ہو گی اور سر کے اوپر کی جانب بھی کچھ ہو گا۔ اہلِ معنی کہتے ہیں کہ عرب لوگ جب کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کو آسمان و زمین کے وجود کے ساتھ مشروط کرتے ہیں تو ان کی مراد اس سے فعل یا عدمِ فعل کا دوام ہوتا ہے۔ اس قول کی روشنی میں مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ کی مراد ہو گی۔ دوامی ہمیشہ۔

اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ہاں اگر آپ کے رب ہی کو نکالنا منظور ہو تو دوسری بات ہے یہ جملہ بظاہر دلالت کر رہا ہے کہ دوزخ کے اندر دوزخی ایک خاص وقت تک رہیں گے پھر مدتِ سکونت دوزخ ختم ہو جائے گی۔

ایک روایت میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ و حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے جو اقوال آئے ہیں ان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جہنم پر ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ اس میں کوئی نہ ہو گا اور یہ حالت اس وقت ہو گی جب لوگ اس میں احقاب (صدیوں) تک رہ چکے ہوں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ایک بیان بھی اسی طرح آیا ہے صوفیاء میں سے شیخ محی الدین ابن عربی کا قول بھی یہی ہے۔ لیکن یہ قول اجماع کے اور صریحی آیات و احادیث کے خلاف ہے اللہ نے فرمایا فِی الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ عذاب میں ہی وہ ہمیشہ رہیں گے۔ طبرانی، ابونعیم اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر دوزخیوں سے کہہ دیا جائے کہ تم کو (دوزخ میں) اتنے (برسوں) رہنا ہے جتنی سنگریزوں کی تعداد ہے تو وہ اس کو سن کر خوش ہو جائیں گے اور اگر اہل جنت سے کہہ دیا جائے کہ تم جنت میں اس قدر (مدت) رہنا ہے جتنی سنگریزوں کی گنتی ہے تو ان کو یہ سن کر غم پیدا ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہ ہو گا بلکہ ان سب دوزخیوں اور جنتیوں کے لئے وہاں دوام

سکونت مقرر کر دیا گیا ہے۔ طبرانی نے الکبیر میں اور حاکم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ کو یمن (کا حاکم بنا کر) بھیجا، حضرت معاذ وہاں پہنچے تو ایک تقریر میں فرمایا لوگو! میں اللہ کے رسول ﷺ کا قاصد ہوں مجھے تمہارے پاس یہ اطلاع دینے کے لئے بھیجا گیا ہے کہ لوٹ کر اللہ کی طرف جانا ہے جنت کی طرف یا دوزخ کی طرف، وہاں دوامی قیام ہوگا، دوامی زندگی ہوگی، بغیر موت کے اور قیام ہوگا بغیر کوچ کے (یعنی کبھی وہاں سے کوچ نہیں کیا جائے گا) اور ایسے جسموں کے اندر رہو گا جو کبھی نہیں مریں گے۔ شیخین نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے پھر ایک منادی (دونوں فریق کے درمیان) ندا کرے گا، اے دوزخ والوں (آئندہ) موت نہیں اور اے جنت والو (آئندہ) موت نہیں۔ ہر شخص جس حالت میں ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ بخاریؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہا جائے گا اے اہلِ جنت (جنت میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے اور اے اہل نار (دوزخ میں تمہارے لئے) دوام ہے موت نہیں ہے۔

ایک اور حدیث جس میں موت کو ذبح کر دینے کا ذکر ہے اس میں یہ بھی آیا ہے کہ ندا دی جائے گی، اے اہلِ جنت موت نہیں ہے اور اے دوزخ والو آئندہ موت نہیں ہے۔ یہ حدیث شیخینؒ نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کا اول الذکر قول اگر صحیح روایت سے ثابت ہو جائے تو اس قول کا یہ مطلب ہے کہ جہنم پر ایک ایسا وقت آئے گا جب اس کے اندر کوئی اہل ایمان میں سے نہیں رہے گا (سب کافر ہی رہ جائیں گے) اور کافر تو اس میں ہمیشہ بھرے رہیں گے۔

میں نے آیت لٰبِثِیْنَ فِیْهَآ اَحْقَابًا کی تفسیر میں لکھ دیا ہے کہ یہ آیت بدعتی مسلمانوں کے حق میں نازل ہوئی۔ لیکن اکثر اہل تفسیر کے نزدیک احقاب سے مراد غیر متناہی صدیاں ہیں۔ جب علماء کا یہ اجماع ہو گیا کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے تو اب اس آیت کا اور آیۃ کے اندر جو دو استثناء کئے گئے ہیں ان کا مطلب کیا ہوگا۔ اس کی توضیح علماء نے مختلف طور پر کی ہے۔ میرے نزدیک سب سے اچھا مطلب یہ ہے کہ کفار ہمیشہ جہنم میں رہیں گے مگر جب ان کو بھڑکتی آگ سے نکال کر کھولتے اُبلتے پانی میں لے جا کر ڈالنا ہوگا تو جحیم سے کھینچ کر حمیم میں ڈال دیا جائے گا اور اس طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

بغوی نے آیت یَطُوْفُوْنَ بَیْنَهَا وَبَیْنَ حَمِیْمٍ اٰنٍ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ وہ حمیم و جحیم کے درمیان چکر لگاتے رہیں گے۔ آگ کی شدت کی وجہ سے جب وہ فریاد کریں گے تو گرم ابلتا پانی جو پگھلے ہوئے تانبے یا تیل کی طرح ہوگا ان کو پلایا جائے گا۔

اللہ نے فرمایا وَاِنْ یَّسْتَغِیْثُوْا یُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ یا آگ اور زمہریر (سخت ترین سردی) کے عذاب میں چکر لگاتے رہیں گے۔ شیخین نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ دوزخ نے اپنے رب سے شکایت کی اور عرض کیا اے میرے رب میرے ایک حصے کو (شدتِ گرمی کی وجہ سے) دوسرا حصہ کھائے جاتا ہے۔ اللہ نے اس کو سال میں دو سانسیں لینے کی اجازت دے دی ایک سردی کے موسم میں اور ایک گرمی کے موسم میں (موسم گرما میں) جو لوگ سخت ترین گرمی محسوس کرتے ہیں وہ دوزخ کی سانس کی وجہ سے ہوتا ہے اور سخت ترین سردی جو محسوس کرتے ہیں وہ بھی دوزخ کے سانس کے سبب سے ہوتا ہے۔ بزار نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے اور حضرت ابو سعیدؓ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ آیت فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا میں استثناء کا رجوع (گناہ گار) مؤمنوں کی طرف ہے۔ بدبخت مؤمنوں کو گناہوں کی سزا میں اللہ دوزخ میں ڈال دے گا پھر ایک مدت کے بعد وہاں سے رہا کر دے گا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگوں کو گناہوں کی سزا میں دوزخ کی لپٹ لگے گی، پھر اللہ اپنی رحمت سے ان کو جنت میں داخل فرما

دے گا اور ان کو اہل جنت کی طرف سے جہنمی کہا جائے گا رواہ البخاری۔

حضرت عمران بن حصینؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سے دوزخ سے نکال لئے جائیں گے پھر ان کو جنت میں داخل کر لیا جائے گا لوگ ان کو جہنم والے کہیں گے۔ رواہ البخاری۔ طبرانی نے حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی روایت سے بھی ایسی حدیث نقل کی ہے۔ اس روایت میں اتنا زائد ہے۔ کہ وہ لوگ اللہ سے دعا کریں گے کہ جہنمی کا نام اللہ ان سے مٹا دے ان کی دعا پر اللہ یہ نام ان سے مٹا دے گا۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور جتنی مدت اللہ چاہے گا وہ دوزخ میں رہیں گے۔ دوزخ میں مشرک ان کو عار دلائیں گے کہ تم کو تمہارے ایمان نے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا (ہماری طرح تم بھی دوزخ میں ہو) اس پر اللہ ہر موحّد کو دوزخ سے نکال لے گا کوئی موحّد وہاں باقی نہیں رہے گا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ اسی مفہوم کو دوسرے الفاظ میں ایک طویل حدیث کے ذیل میں طبرانی اور بیہقی اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور طبرانی نے حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بھی اس کو نقل کیا ہے۔ گناہگار مؤمنوں کا دوزخ میں جانا پھر وہاں سے نکلنا اتنی احادیث میں آیا ہے جو حدِ تواتر تک پہنچ چکی ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے بدکار مؤمن دوزخ سے نکالے جائیں گے اور صحتِ استثناء کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ مجموعے سے کسی حکم کے منفی ہونے کے لئے بعض افراد سے حکم کا زوال کافی ہے۔ اور استثناء دویم سے یہی (گناہگار مؤمن) مراد ہیں عذاب کے زمانے میں باوجود مؤمن ہونے کے یہ لوگ جنت سے دور ہوں گے۔ دوامی، ابدی حکم کی نفی دونوں طور پر ہوتی ہے انتہا کی جانب منقطع ہونا اور ابتداء کی جانب نقطۂ آغاز ہونا۔ پس یہ لوگ نہ دوامی سعید ہوں گے نہ ابدی شقی بلکہ گناہوں کی وجہ سے شقی اور ایمان ویقین کی وجہ سے سعید۔

ایک شبہ

اس صورت میں تو فَمِنْهُمْ شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ کہنا صحیح نہ ہوگا کیونکہ جب تیسری قسم نکل آئی جو سعید بھی ہے اور شقی بھی عقیدہ کے اعتبار سے سعید اور اعمال کی وجہ سے شقی تو شقی اور سعید کو دو قسمیں قرار دینا اور دونوں کو باہم مقابل اور حریف سمجھنا غلط ہوگا۔

ازالہ

تقابل اور دو چیزوں کے انفصال کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) دونوں چیزیں ایک وقت میں ایک جگہ جمع نہ ہو سکیں اور نہ یہ ممکن ہو کہ دونوں نہ ہوں بلکہ ایک کا ہونا اور دوسری کا نہ ہونا ضروری ہے جیسے وجود و عدم، اثبات و نفی۔

(۲) دونوں چیزوں کا ایک وقت میں ایک جگہ جمع ہونا ممکن نہ ہو لیکن یہ ممکن ہو کہ دونوں چیزیں نہ ہوں تیسری کوئی چیز ہو۔ جیسے سیاہی اور سفیدی۔ ایک چیز سیاہ بھی ہو اور سفید بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ سیاہ بھی نہ ہو اور سفید بھی نہ ہو، سرخ یا زرد ہو۔

(۳) یہ ممکن نہ ہو کہ دونوں چیزیں نہ ہوں لیکن دونوں کا جمع ہونا ممکن ہو۔ جیسے یہ ممکن نہیں کہ قیامت کے دن حشر کے بعد کوئی شخص سعید بھی نہ ہو اور شقی بھی نہ ہو۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ سعید بھی ہو اور شقی بھی۔ عارضی مدت کے لئے دوزخ

میں چلا جائے یہ اس کی شقاوت ہو پھر رہائی پاکر جنت میں داخل ہو جائے یہ اس کی سعادت ہو (مترجم)
آیت میں یہی تیسری قسم مراد ہے یعنی کچھ لوگ خالص سعید ہوں گے کچھ خالص شقی اور کچھ سعید و شقی کا مجموعہ ایسا کوئی نہ ہوگا کہ سعید بھی نہ ہو اور شقی بھی نہ ہو۔

بعض علماء نے کہا مَا شَآءَ سے مراد ہے مَنۡ شَآءَ اور مَنۡ شَآءَ سے مراد ہیں گناہ گار مؤمن۔

بعض اہل تفسیر نے کہا کہ حساب کے لئے میدانِ حشر میں کھڑے ہونے کا وقت یا دنیا میں عالمِ برزخ میں رہنے کا وقت مستثنیٰ ہے۔ اہلِ سعادت کا دوامی جنتی ہونا اور اہلِ شقاوت کا دوامی دوزخی ہونا حساب و کتاب کے بعد ہوگا۔ اللہ نے حساب کا پورا وقت یا دنیا میں رہنے کا وقت یا برزخ میں رہنے کا وقت، سکونتِ جنت و دوزخ کے حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ ان اوقات میں آدمی نہ جنت میں ہوگا نہ دوزخ میں۔ اس تفسیر پر ممکن ہے بلکہ احتمال ہے کہ حسبِ قول بیضاوی خلود سے استثناء ہو یعنی ان اوقات کے علاوہ جنتی کا جنت میں اور دوزخی کا دوزخ میں خلود و دوام ہوگا۔

بعض علماء نے کہا استثناء کا رجوع لَهُمۡ فِيهَا زَفِيرٌ وَّ شَهِيقٌ کی طرف ہے یعنی جتنی مدت اور جن اوقات میں اللہ کو منظور ہوگا ان کا زفیر و شہیق نہ ہوگا۔

سیوطی نے البدور السافرہ میں لکھا ہے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ لفظ اِلَّا کو لَیۡسَ کے معنی میں قرار دیا جائے۔ استثناء کے لئے نہ قرار دیا جائے یعنی اِلَّا کے معنی اس جگہ علاوہ اور سوا کے ہیں جیسے عربی میں بولا جاتا ہے لَکَ عَلَیَّ اَلۡفُ دِرۡھَمٍ اِلَّا الۡاَلۡفَانِ الۡقَدِیۡمَانِ تیرے مجھ پر ہزار درہم ہیں علاوہ سابق کے دو ہزار کے یعنی کل تین ہزار ہیں۔ آیت کا مطلب اس صورت میں یہ ہوگا کہ وہ وہاں اتنی مدت رہیں گے جتنی مدت دنیا کے آسمان و زمین باقی تھے علاوہ اس زیادہ غیر متناہی مدت کے جتنا اللہ ان کو وہاں رکھنا چاہے گا مراد یہ ہے کہ ہمیشہ وہاں رہیں گے لیکن اس پیچ دار اسلوبِ عبارت کا فائدہ کیا ہے اور بیچ میں مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الۡاَرۡضُ ذکر کرنے کا نتیجہ کیا ہے؟ اس نکتہ کو سمجھنے کے لئے دقتِ نظر کی ضرورت ہے۔ پہلے طویل مدت کو ذہن نشین کرنے کے لئے مدتِ بقائے سماء و ارض کو ذکر کیا جس سے لوگ واقف تھے پھر اس کے بعد غیر متناہی اور ان گنت مدت کی طرف اشارہ کیا ہے تاکہ غیر متناہی مدت کا طول سمجھ میں آجائے۔

بعض علماء نے کہا اِلَّا بمعنی واو (اور) ہے جیسے دوسری آیت میں آیا ہے لِئَلَّا یَكُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَیۡكُمۡ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا تاکہ تمہارے خلاف لوگوں کو کوئی دلیل نہ ملے اور نہ ظالموں کو تم پر کوئی حجت حاصل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں رہیں گے جب تک آسمان اور زمین قائم رہیں گے اور جب تک اللہ چاہے گا یعنی ہمیشہ رہیں گے۔ فراء نے کہا یہ استثناء تو ہے مگر ایسا استثناء ہے کہ اس کا فعلی ظہور کبھی نہیں ہوگا، اگر تمہارا ارادہ پختہ طور پر کسی کو مارنے کا ہو مگر تم اس طرح کہو خدا کی قسم میں تجھے ضرور ماروں گا مگر اس وقت جب کہ نہ مارنا میری نظر میں بہتر ہو (تو نہیں ماروں گا) اس صورت میں مطلب اس طرح ہوگا کہ وہ وہاں اس وقت تک رہیں گے جب تک اللہ چاہے گا جب اللہ اس کے خلاف چاہے گا تو وہ نکال لئے جائیں گے یعنی اگر اللہ چاہے گا تو ان کو رہائی دے دے گا، لیکن وہ ایسا کبھی نہیں چاہے گا۔

قتادہ نے کہا (ہمیں نہیں معلوم) اللہ ہی اس استثناء کے مطلب سے واقف ہے۔[1]

---

[1] اس فقیر کی نظر میں آیت کے مطلب میں کوئی ابہام نہیں بلکہ اس طرزِ بیان میں خاص قدرت ہے اور کوتاہ نظر لوگوں کے دماغوں میں پیدا ہونے والے شبہ کا جواب بھی ہے۔
یہ ظاہر ہے کہ آیت میں بعض احوالِ آخرت کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ مؤمنوں کے لئے دوامی جنت اور کافروں کے لئے دوامی دوزخ کی صراحت کی ہے اور یہی قرینہ ہے اس بات کا کہ سماوات و ارض سے مراد جنت و دوزخ کے آسمان و زمین ہیں اور چونکہ یہ اُخروی آسمان و زمین لازوال ہیں اور جنت و دوزخ کے اندر سکونت کو بقائے سماوارض کے ساتھ مقید کیا ہے۔ اس لئے جنت و دوزخ کی سکونت بھی دوامی (بقیہ اگلے صفحے پر)

اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ﴿١٠٧﴾ بے شک آپ کا رب جو کچھ چاہے پورے طور پر اس کو کر سکتا ہے۔ (یعنی اس کا اختیارِ کلی اور ہمہ گیر ارادہ اور محیطِ کل مشیت آزاد ہے وہ مجبور نہیں ہے کہ اہلِ جنت کو جنت اور اہلِ نار کو دوزخ کی سکونت دوامی دینے کے بعد بے اختیار ہو گیا ہو کہ کسی کو اس کے مسکن سے باہر نہ نکال سکے لیکن نکالے گا نہیں۔ بقولِ فراء یہ استثناء صحیح ہے لیکن اس کا فعلی ظہور کبھی نہیں ہوگا۔

وَاَمَّا الَّذِيْنَ سُعِدُوْا فَفِي الْجَنَّةِ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ

اور لیکن جو خوش نصیب ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمان وزمین قائم رہیں گے مگر جب آپ کے رب کی مشیت ہو گی (تو نکل سکیں گے اگرچہ کبھی نہیں نکلیں گے) استثناء کے متعلق علماء کے مختلف اقوال اس آیت میں بھی وہی ہیں جو گزشتہ آیت کی تفسیر میں بیان کر دیئے گئے۔

میرے نزدیک اس جگہ پسندیدہ قول یہ ہے کہ بعض اوقات میں اہلِ جنت کو اس درجہ پر فائز کر دیا جائے گا۔ جو جنت سے بھی اعلیٰ ہو گا یعنی اللہ کے دیدار میں استغراق اور بارگاہِ قدس سے ناقابلِ بیان اتصال۔ اہلِ تفسیر نے آیت وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ کی تشریح میں لکھا ہے کہ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ میں اِلٰى رَبِّهَا کو نَاظِرَةٌ سے پہلے ذکر کرنا مفیدِ حصر ہے (اپنے رب ہی کی طرف دیکھ رہے ہوں گے) یعنی اللہ کے دیدار میں اتنا غرق ہوں گے کہ کسی دوسری چیز کی طرف نگاہ بھی نہیں اٹھائیں گے۔ حضرت جابرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہلِ جنت اپنے عیش میں ہوں گے کہ اچانک اوپر سے ایک نور اُن پر نمودار ہو گا وہ سر اٹھا کر دیکھیں گے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اوپر اُن کو جھانکتا دکھائی دے گا اور خطاب فرمائے گا اے اہلِ جنت تم پر سلام ہو۔ آیت سَلٰمٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ کا یہی مطلب ہے غرض اللہ ان کی طرف دیکھے گا اور وہ اللہ کی طرف۔ اللہ کی جانب دیکھنے کے وقت وہ کسی اور نعمت کی طرف التفات بھی نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ اللہ حجاب کر لے گا اور اس کی چمک و برکت اہلِ جنت کی گردن میں رہ جائے گی رواہ ابن ماجہ وابن ابی الدنیا و دار قطنی۔

حضرت مجددرحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبؒ جلد سوئم میں یعقوبؑ کی یوسفؑ کے ساتھ دلآویزی کی حقیقت کی تشریح کے ذیل میں لکھا ہے کہ اللہ کے اسماء میں سے جو اسم جس شخص کا مبدءِ تعین (مرکزِ ظہور) ہوتا ہے اس اسم کا ظہور (کسی جسم کے اندر) اس شخص کی جنت ہوتا ہے اور اس اسم کا ظہورِ تجلی درختوں، نہروں، شاندار محلات اور حور وغلمان کی شکل میں ہو گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنت کی مٹی پاکیزہ ہے اور پانی شیریں ہے اور وہاں میدان ہیں اور اس کے پودے یہی ہیں یعنی سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ جنت کے پودے ہیں۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا کبھی یہ درخت اور نہریں چمکدار روشن زجاجی اجسام (جیسے عینک کے آئینے) کی شکل اختیار کر لیں گے اور اللہ کے بے کیف دیدار کے حصول کا ذریعہ ہو جائیں گے انہیں کے ذریعے سے اللہ کا دیدار حاصل ہو جائے گا مگر یہ رؤیت ہر کیفیت سے پاک ہو گی پھر اپنی اصلی (شجری یا نہری) شکل کی طرف لوٹ آئیں گے اور مؤمن پھر انہیں سے (اسی شجری یا نہری شکل میں) تفریح کرے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ ہمیشہ ہوتا رہے گا ہم نے اس مقام کی مزید توضیح سورۂ قیامۃ کی آیتِ رؤیت کی تفسیر کے ذیل میں کی ہے۔

عَطَآءً غَيْرَ مَجْذُوْذٍ ﴿١٠٨﴾ وہ غیر منقطع عطیہ ہو گا۔ یعنی اللہ کا وصال اور دیدار ایک ایسا عطیہ خداوندی ہو گا

(بقیہ پچھلے صفحہ کا) ہو گی۔ لیکن اس صراحت کے بعد کیا خدا مجبور ہو گیا کیا وہ مشیت سے معطل ہو گیا۔ کیا اس کا کوئی اختیار نہیں رہا یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا اس کو زائل کرنے کے لئے مشیت کا استثناء کر لیا جس کا مطلب یہ نکلا کہ اللہ نے جنتیوں کے لئے جنت اور دوزخیوں کے لئے دوزخ کو دوامی کر دی لیکن وہ مجبور نہیں ہو گیا اس کی مشیت اس کے خلاف بھی کارفرما ہو سکتی ہے یعنی یہ دوامی حکم اس نے اپنی مشیت سے جاری کیا ہے اور اس حکم کے اجراء کے بعد اس کی مشیت واختیار کی صفت سلب نہیں ہو گئی وہ جب چاہے مذکورہ صراحت کے خلاف بھی اپنے اختیار کو استعمال کر سکتا ہے مگر چونکہ اس نے وعدہ کر لیا ہے اور سزا وجزا دوامی ہونے کی صراحت کر دی ہے اس لئے باوجود اختیارِ کامل اور مشیتِ تامہ کے اس حکم کو منسوخ نہیں کرے گا۔ واللہ اعلم (مترجم)

جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوگا۔ یوں تو جنت کی ہر نعمت غیر منقطع اور لازوال ہوگی لیکن اللہ کا وجود اصل اور حقیقی ہے اور دوسری چیزوں کا وجود ظلّی ہے اللہ کے وجود سے وابستہ (بلکہ اس کا پرتو۔ مترجم) پس بذاتہ اور خود بخود موجود صرف اللہ ہے باقی ہر چیز ہالک اور معدومُ الاصل ہے جیسے مانگے کپڑے اپنے نہیں ہوتے مالک کے ہوتے ہیں۔ پس اللہ جو اہلِ جنت کو اپنا بے کیف وصل عنایت کرے گا اور بے حجاب دیدار دکھائے گا وہی اصل، حقیقی اور غیر منقطع عطا ہوگی، باقی دوسری نعمتیں واصلِ ذات کے مقابلے میں ذیلی، ظلّی اور اصلاً معدوم ہوں گے۔ واللہ اعلم۔

ابن زید نے کہا اہلِ جنت کے لئے تو اللہ نے اپنی غیر منقطع عطا کا ذکر کر دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ وہ دوزخیوں کے لئے کیا چاہے گا کیا کبھی ان کا عذاب منقطع کرنا چاہے گا یا ان کا عذاب بھی لازوال ہوگا بلکہ دوزخیوں کے حق میں فرمایا اِنَّ رَبَّکَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔

فَلَا تَکُ فِیْ مِرْیَةٍ مِّمَّا یَعْبُدُ هٰۤؤُلَآءِ ؕ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا کَمَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُهُمْ مِّنْ قَبْلُ ؕ وَاِنَّا لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ غَیْرَ مَنْقُوْصٍ ﴿۱۰۹﴾

سو (اے مخاطب) جس چیز کی یہ پرستش کرتے ہیں اس کے بارے میں ذرا شبہ نہ کرنا یہ لوگ بھی اسی طرح بلا دلیل کے غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں جس طرح ان کے بزرگ ان سے پہلے عبادت کرتے تھے۔ یعنی تمام لوگوں کی سزا و جزا کی جو تفصیل ہم نے بیان کر دی اس کے بعد آپ شک میں نہ رہیں کہ مشرک جو غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں وہ سراسر گمراہی ہے اور اسی عذاب کا مستحق بنانے دینے والی ہے جس عذاب کے مستحق ان کے اسلاف اپنی مشرکانہ عبادت کی وجہ سے ہوئے یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے بیان کے بعد آپ کو شک نہ کرنا چاہئے کہ ان مشرکوں کے معبود نہ نفع پہنچا سکتے ہیں نہ ضرر، ان کے معبود بھی ویسے ہی ہیں جیسے ان کے مشرک اسلاف کے۔ (اول مطلب پر مِمَّا یَعْبُدُ میں ما مصدریہ ہوگا اور دوسرے مطلب پر موصولہ مترجم)۔

اِلَّا کَمَا یَعْبُدُ الخ یہ ممانعت شک کی علت ہے یعنی ان کی عبادت بھی ویسی ہی مشرکانہ ہے جیسی ان کے اسلاف کی تھی (ما مصدریہ) یا یہ بھی انہیں کی پوجا کرتے ہیں جن کی ان کے اسلاف کرتے تھے (ما موصولہ) اور یہ آپ کو پہلے معلوم ہی ہو چکا کہ ان کے اسلاف کا نتیجہ کیا ہوا۔ پس جو نتیجہ اُن کا ہوا وہی اِن کا ہوگا اسباب ایک جیسے ہیں تو نتائج بھی ایک ہی طرح کے ہوں گے۔

نَصِیْبَهُمْ نصیب سے مراد ہے حصۂ عذاب یعنی ان کا عذاب کا حصہ بھی اپنے اسلاف کی طرح پورا پورا ہوگا یا حصۂ رزق مراد ہے اس مطلب پر تاخیر عذاب کی وجہ کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے جو اُن کے عذاب کو مؤخر کر دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ان کے رزق کا حصہ پورا کر رہے ہیں۔ لَمُوَفُّوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ کا مصدر تَوْفِیَه (باب تفعیل) ہے جس کا معنی ہے ادا کرنا، خواہ پورا پورا ہو یا کمی کے ساتھ۔

وَفَّیْتُهٗ حَقَّهٗ میں نے اس کا حق دے دیا اگر کچھ حصۂ حق بھی دے دیا ہو تب بھی یہ جملہ بولا جاتا ہے اور یہاں مراد ہے پورا پورا حق دینا اس لئے تاکید کے لئے غیر منقوص فرمایا کہ ان کے حصے کی ادائیگی میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔)

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی الْکِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِیْهِ ؕ　اور یقیناً ہم نے موسیٰؑ کو کتاب دی (یعنی توریت) پھر اس میں اختلاف کیا گیا کسی نے اس کو مانا تصدیق کی کسی نے نہ مانا تکذیب کی۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کے لئے تسلی کا پیام ہے کہ قرآن کی تصدیق و تکذیب کوئی نئی بات نہیں، موسیٰؑ کو جو توریت دی گئی تھی اس کو ماننے نہ ماننے میں ایسے ہی اختلاف ہو گیا تھا۔

وَلَوْلَا کَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَقُضِیَ بَیْنَهُمْ ؕ　اور اگر ایک بات آپ کے رب کی طرف سے نہ ہو چکی ہوتی تو ان کا قطعی فیصلہ دنیا میں ہی ہو چکا ہوتا یعنی اگر قیامت تک مُہلت دینے کا اللہ کا (ازلی) حکم نہ ہو گیا ہوتا تو حق

پرست اور باطل پرست کا فیصلہ یہیں ہو چکتا حق پرست کو بچالیا جاتا اور باطل پرست پر عذاب آجاتا۔

وَ اِنَّهُمْ لَفِیْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِیْبٍ ﴿۱۱۰﴾ اور وہ (یعنی کفارِ مکہ) قرآن (یا عذاب) کی طرف سے شک میں مبتلا ہیں جو ان کو متردّد بنائے ہوئے ہے۔

وَ اِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ اور بالیقین یہ سب کے سب ایسے ہیں کہ آپ کا رب ان کو ان کے اعمال کا پورا پورا حصہ دے گا۔ (اصل میں اِنَّ تھا) كُلًّا میں تنوین مضاف الیہ کے بجائے آئی ہے یعنی اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک خواہ مؤمن ہو یا کافر۔ لَمَّا اصل میں لَمَنْ مَا تھا نون کو میم سے بدل دیا۔ تین میم جمع ہو گئے اول میم کو حذف کر دیا پھر ایک میم کا دوسرے میم میں اوغام کر دیا مَا زیادہ ہے۔ بعض نے کہا اصل میں لَمًّا تھا لَمَمْتُ کا مصدر لَمًّا ہے جس کا معنی ہے جمع کرنا۔ اِنْ حرفِ تحقیق ہے نافع ابن کثیر اور ابو بکر کے نزدیک اِنْ مخففہ ہے

صاحبِ ایجاز نے لکھا ہے کہ یہ لَمَّا ظرفیہ ہے اور کلام میں کچھ اختصار ہے اصل کلام اس طرح تھا وَاِنْ كُلًّا لَّمَّا بُعِثُوْا لَیُوَفِّیَنَّهُمْ جب ہر شخص کو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا تو اللہ اس کے اعمال کا ضرور بدلہ دے گا۔

اِنَّهٗ بِمَا یَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ ﴿۱۱۱﴾ جو کچھ وہ کرتے ہیں یا کرتے تھے اللہ اس سے پورا واقف ہے کوئی پوشیدہ عمل بھی اس سے مخفی نہیں ہے۔ خیر ہو یا شر (ہر چیز سے وہ باخبر ہے)۔

فَاسْتَقِمْ كَمَاۤ اُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ پس جو حکم آپ کو دیا گیا ہے آپ بھی اس پر قائم رہیں اور وہ لوگ بھی جو آپ کے ساتھ ایمان لائے ہیں۔

جب اللہ نے مؤمنوں اور کافروں یعنی توحید و نبوّت کو ماننے اور نہ ماننے والوں کا ذکر پہلے کر دیا اور سزا و جزا کے وعدے اور وعید کی بھی وضاحت کر دی تو اب استقامت کا حکم دیا رسول اللہ ﷺ کو بھی اور دوسرے اہل ایمان کو بھی۔ استقامت کا لفظ اپنے اندر عموم رکھتا ہے ہر طرح کی استقامت کو شامل ہے۔

(۱) عقائد کی استقامت، یعنی اللہ کی ذات کو تمام صفاتِ کمالیہ کا جامع سمجھنا (صفاتِ خداوندی کا انکار نہ کرنا) مگر اس کی صفات کو مخلوق کی صفات کے مشابہ بھی نہ قرار دینا (یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ کی کوئی صفت مخلوق کی صفت ..... کی طرح نہیں ہے۔ اس کی صفات کامل ہیں) اور نہ بندوں کو بالکل مجبور سمجھ لینا نہ کامل مختار (یعنی انسان کو در و دیوار اور چرند و پرند کی طرح بے اختیار بھی نہ سمجھنا اور نہ قادر مطلق، بے لگام مختار کہ جیسا چاہے کر سکے اور جب چاہے جا سکے بلکہ درمیانی سیدھی راہ پر ہی چلنا)۔

(۲) اعمال کی استقامت یعنی وحی اور شریعت کو پورا پورا بیان کر دینا نہ اس میں زیادتی کرنا نہ کمی۔

(۳) عبادات اور معاملات کو ان کے حقوق کے موافق ادا کرنا نہ ان میں (جذبۂ خیر کے زیر اثر) زیادتی کرنا کہ پانچ وقت کی جگہ چھ وقت کی نماز فرض قرار دے دی جائے نہ کمی کرنا کہ چار رکعت فرض کی جگہ تین رکعتیں مقرر کر لی جائیں)

حضرت سفیان بن عبد اللہ ثقفیؓ کا بیان ہے میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اسلام کے متعلق مجھے کوئی ایسی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد میں کسی سے پوچھنے کا محتاج نہ رہوں فرمایا اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ کہو اور استقامت رکھو، رواہ مسلم۔ (یعنی سیدھی چال چلو اور اس پر قائم رہو) لفظ استقامت تمام اُمور کو حاوی ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا، استقامت سے مراد یہ ہے کہ اوامر و نواہی پر قائم ہو جائے اور لومڑی کی طرح (راہِ مستقیم سے ادھر ادھر) نہ مڑے۔

استقامت بہت ہی سخت حکم ہے (یعنی اس پر عمل کرنا انتہائی دشوار ہے) اس لئے صوفیاء کا قول ہے کہ استقامت کا مرتبہ کرامت سے اونچا ہے۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری نبوت کی مدت میں اس آیت

سے زیادہ سخت آپ ﷺ پر کوئی اور آیت نازل نہ ہوئی اس لئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا، میں کہتا ہوں حضرت ابن عباسؓ کے اس قول سے معلوم ہو رہا ہے کہ سورۂ ہود نے جو رسول اللہ ﷺ کو بوڑھا کر دیا اس سے مراد پوری سورت نہیں بلکہ اس سورت کی یہی آیت ہے جس میں استقامت کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ حضور ﷺ کو فطرتاً اور تخلیقاً استقامت کے حامل تھے مگر آپ پر ایمان لانے والے اور آپ کا اتباع کرنے والی ساری امت تو ایسی نہ تھی اور امت پر آپ بڑے مہربان تھے اسی فکر نے آپ کو بوڑھا کر دیا کہ امت کے لئے استقامت سخت دشوار ہے اس کا کیا ہو گا۔

بظاہر فرمانِ نبوی شَیَّبَتْنِیْ سُوْرَۃُ هُوْدٍ کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ ہود میں گزشتہ امتوں کی نافرمانی اور ان کی ہلاکتوں کا بیان کیا گیا ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف بھی مستفاد ہوتا ہے کہ اس امت کے ظالموں کو بھی دنیا اور آخرت میں ایسے ہی عذاب میں مبتلا کیا جائے گا اس اندیشے نے حضور ﷺ کو بوڑھا کر دیا۔

وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ اور حدودِ شرع سے تجاوز نہ کرو۔ کہ اللہ تمہارے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

بعض علماء نے کہا طُغیان نہ کرنے سے مراد ہے غلو کرنا یعنی اوامر و نواہی کو ان کی مقررہ حدود سے آگے بڑھانا۔ حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دین آسان ہے اس میں جو شدّت اختیار کرے گا (آخر تھک جائے گا، قوّت جسمانی جواب دے دے گی اور) دینی شدّت اس کو مغلوب کر دے گی۔ لہٰذا تم سیدھی اور درمیانی چال چلو اور کامیابی کی لوگوں کو بشارت دو، (سختی کر کے مایوس نہ بناؤ) اور رفتار صبح و شام اور کچھ سیرِ شب سے مدد حاصل کرو۔ رواہ البخاری والنسائی۔

میں کہتا ہوں اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو بوڑھا کر دینے والا بارِ استقامت تھا (کہ لوگ احکام میں استقامت نہیں رکھ سکیں گے)

وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ اور ظالموں کی طرف نہ جھکو کہ اس میلان کی وجہ سے تم کو بھی آگ لگ جائے گی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رُکون سے مراد ہے محبت اور دل کا جھکاؤ یعنی دل سے مائل نہ ہو۔ ابو العالیہ نے کہا ظالموں کے اعمال کو پسند نہ کرو۔ سدی نے کہا ظالموں کے معاملہ میں چشم پوشی اور مُداہنت نہ کرو۔ عکرمہ نے کہا ظالموں کا کہنا نہ مانو۔ بیضاوی نے لکھا ہے ادنیٰ جھکاؤ بھی ظالموں کی طرف نہ کرو۔ رُکون کا معنی ہے ادنیٰ میلان۔ مثلاً ظالموں کا کلچر اور طور طریقہ اختیار کرنا ان کا ذکر تعظیم کے ساتھ کرنا۔ یہ ادنیٰ میلان ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے جب ظالموں کی طرف ادنیٰ جھکاؤ کا نتیجہ دوزخ ہے تو سمجھو کہ خود ظلم کرنے اور ظلم میں منہمک رہنے کا نتیجہ کیا ہو گا۔ یہ ظلم سے باز داشت کرنے کا بلیغ ترین اُسلوب بیان ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ ایک شخص کسی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا۔ امام نے یہ آیت پڑھی، یہ شخص سن کر بے ہوش ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد ہوش میں آیا اور بے ہوشی کی وجہ دریافت کی گئی تو بولا یہ سزا تو ظالم کی طرف مائل ہونے والے کی ہے ظالم کا کیا ہو گا۔ (اس تصور نے مجھے بے ہوش کر دیا)

حسن بصریؒ کا قول منقول ہے کہ اللہ نے دین کو دو لَا کے درمیان کر دیا ہے ایک لَا تَطْغَوْا اور دوسرا لَا تَرْكَنُوا (خود بھی حد سے تجاوز نہ کرو، اور ظالم کی طرف مائل بھی نہ ہو)۔

امام اوزاعیؒ نے فرمایا اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض وہ عالم ہے جو ظالم کی ملاقات کو جاتا ہے۔

حضرت اویسؓ کا بیان ہے کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص ظالم کو ظالم جانتے ہوئے قوت پہنچانے کے لئے اس کے ساتھ جاتا ہے وہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ ظالم اپنا ہی نقصان کرتا ہے دوسرے کا نہیں کرتا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے یہ بات سنکر فرمایا کیوں نہیں ظالم کے ظلم سے تو چڑیاں بھی اپنے آشیانہ میں بھوکی مر جاتی ہیں۔ یہ دونوں حدیثیں شعب الایمان میں مذکور ہیں۔ بیضاویؒ نے لکھا ہے رسول اللہ ﷺ کو اور آپ کے ساتھ مؤمنوں کو اس آیت میں خطاب کی غرض یہ ہے کہ استقامت یعنی عدل پر ثابت قدم رہیں (افراط و تفریط کی طرف مائل نہ ہوں) افراط یا تفریط کی طرف جھکاؤ سے اپنے اوپر ظلم ہو یا دوسرے پر وہ تو فی نفسہ ظلم ہے (خواہ اس کی زد کسی پر پڑے یا نہ پڑے)

وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ اور اللہ کے مقابلہ میں تمہارا کوئی مدد گار نہ ہوگا۔ پھر تمہاری مدد (کہیں سے بھی) نہیں کی جائے گی۔

اولیاء، یعنی مددگار۔ جو عذاب کو دفع کر سکیں۔ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ یعنی پھر اللہ تمہاری مدد نہیں کرے گا۔ تم کو عذاب دینے کا محکم ازلی فیصلہ ہو چکا ہے۔ ثُمَّ استبعاد کے لئے ہے یعنی اللہ کی طرف سے تمہاری مدد ہونی بہت بعید نا ممکن ہے یا کسی طرف سے بھی تمہاری مدد ممکن نہیں جس کو اللہ عذاب دینا طے کرلے اس کی مدد کون کر سکتا ہے ترمذی اور نسائی نے بیان کیا کہ حضرت ابوالیسرؓ (بقولِ بغوی ان کا نام عمرو بن عربیہ انصاری تھا) نے فرمایا ایک عورت کچھ چھوارے خریدنے میرے پاس آئی۔ میں نے کہا گھر کے اندر اس سے اچھے چھوارے ہیں (تم میرے ساتھ چل کر دیکھ لو) وہ میرے ساتھ اندر چلی گئی اندر پہنچ کر میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اس کا بوسہ لے لیا (کرنے کو تو ایسا کر گزرا) پھر مجھے اپنے کئے پر پچھتاوا ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آکر واقعہ عرض کر دیا، آپ نے فرمایا توبہ کرو اور اس کو ظاہر نہ کرو میں حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا اور ان سے تذکرہ کیا انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ توبہ کرو اور ظاہر نہ کرو آخر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا جو شخص اللہ کی راہ میں جہاد کے لئے گیا ہوا ہے تو نے اس کی غیبت میں اس کی بیوی کے ساتھ ایسی حرکت کی، اندازہ ہوتا تھا کہ حضورؐ نے میرے دوزخی ہونے کا خیال کر لیا پھر آپ نے تھوڑی دیر سر جھکایا اور آیتِ ذیل نازل ہوئی۔

وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ آپ نماز کی پابندی رکھئے دن کے دونوں سروں پر۔ اور رات کے کچھ حصوں میں۔ جو دن کے قریب ہوں۔

صحابہؓ نے عرض کیا کہ یہ آیت کیا آپ کے لئے مخصوص ہے یا سب لوگوں کے لئے ہے فرمایا سب لوگوں کے لئے ہے۔ صاحبِ لباب النقول نے لکھا ہے حضرت ابوالیسرؓ کی روایت کی طرح حضرت ابوامامہؓ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت بریدہؓ وغیرہم کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے۔

دن کے دونوں کناروں سے مراد ہے صبح اور شام۔ زُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ رات کا ایک ٹکڑا یا چند ساعات جو دن سے متصل ہوں (یعنی پچھلی رات یا شروع رات) زُلَفٌ زُلْفَةٌ کی جمع ہے۔ اَزْلَفَهٗ اس کو قریب کر دیا۔

حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک دن کے دونوں کناروں سے فجر اور مغرب کی نمازیں اور زُلَفًا سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ حسنؒ نے کہا دن کے دونوں کناروں سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں اور زُلَفٌ سے مراد مغرب و عشاء ہیں۔ حسن بصری کی اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر و عصر کی اور مغرب و عشاء کی نمازیں بوقتِ ضرورت ایک ہی شمار کی جاتی ہیں، اسی بنا پر امام مالک و امام شافعی و امام احمدؒ کا قول ہے کہ اگر عصر کے آخر وقت میں کوئی کافر مسلمان ہو جائے یا حائضہ پاک ہو جائے یا لڑکا بالغ ہو جائے تو اس پر ظہر و عصر دونوں نمازیں واجب ہو جائیں گی اور عشاء کے آخر وقت میں صورتِ مذکورہ اگر پیدا ہو جائے تو مغرب اور عشاء دونوں کا وجوب ہوگا امام ابوحنیفہؒ کا قول جمہور ائمہ کے قول کے خلاف ہے آپ کے نزدیک صرف عصر اور عشاء کی نماز واجب ہوگی آیت اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا کی تشریح میں سورۂ نساء میں ہم نے امام ابوحنیفہؒ کے قول کی تائید میں مختلف احادیث نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز کا وقت دوسری نماز کے وقت سے جدا ہے اس لئے امام صاحبؒ کے نزدیک سفر، یا بیماری یا بارش کے عذر کی وجہ سے بھی ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کو ملا کر ایک وقت میں پڑھنا درست نہیں اور بغیر عذر کے تو دو نمازوں کو ایک وقت میں ادا کرنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

امام مالکؒ و امام احمدؒ کے نزدیک سفر کی حالت میں دو نمازوں کو جمع کرنا درست ہے، امام مالک اور امام احمد بارش کی وجہ سے صرف مغرب و عشاء کو ایک وقت میں ادا کرنا جائز کہتے ہیں اور امام شافعی بارش کی وجہ سے صرف ظہر و عصر کو ملا کر پڑھنا درست

قرار دیتے ہیں اور امام احمد کے نزدیک بیماری کی وجہ سے بھی دو نمازوں کو جمع کرنا جائز ہے۔

جمہور نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت حمنہ بنت جحشؓ کا واقعہ پیش کیا ہے، حمنہ استحاضہ کی مریض تھیں (استحاضہ یعنی پیر اکا مرض جس ہر وقت خون جاری رہتا ہے) رسول اللہ ﷺ نے ان کو دو نمازوں کو جمع کرنے کا حکم دے دیا تھا اور فرمایا تھا ظہر میں تاخیر اور عصر میں عجلت (یعنی اول وقت ادا کر لیا کرو۔ پھر غسل کر کے دونوں نمازیں (ترتیب کے ساتھ) جمع کر لیا کرو۔ رواہ احمد والترمذی۔ ترمذی نے اس روایت کو حسن صحیح کہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سفر کی حالت میں ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء سے ملا کر پڑھا تھا۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سفر میں مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں ملا کر پڑھا کرتے۔ صحیحین میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب زوال سے پہلے سفر کرتے تھے تو ظہر (آغاز عصر تک مؤخر کر دیا کرتے تھے پھر اُتر کر دونوں کو ملا کر ادا کرتے تھے اور زوال کے بعد سفر کرتے تھے تو ظہر پڑھ کر سوار ہوتے تھے مسلم میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ تبوک میں ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء سے ملا کر پڑھا تھا۔ میں نے عرض کیا حضور ﷺ نے ایسا کیوں کیا فرمایا تاکہ امت کو دشوار نہ رہے امام ابو حنیفہؒ نے ان تمام احادیث کے جواب میں فرمایا کہ ان احادیث میں ملا کر پڑھنے سے مراد ہے جمع صوری یعنی ظہر کو آخر وقت میں پڑھنا اور عصر کو شروع وقت میں مغرب کو دیر کر کے آخرِ وقت میں پڑھنا اور عشاء کو جلدی کر کے آغازِ وقت میں ادا کرنا اس طرح حضور ﷺ نے ہر نماز اسی کے وقت میں ادا کی لیکن ایک میں تاخیر اور دوسری میں عجلت کرنے کی وجہ سے دونوں نمازیں ملی ہوئی بیک وقت نظر آنے لگیں اور حقیقت میں ہر نماز اپنے وقت میں ہوئی۔ حضرت حمنہؓ والی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔ اور اسی معنی پر وہ حدیث محمول ہے جو صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے آئی ہے کہ مدینہ میں بغیر خوف اور بغیر سفر کے رسول اللہ ﷺ نے دو نمازیں جمع کر کے پڑھیں (یعنی ایک میں تاخیر کی اور دوسری میں عجلت) مسلم کی دوسری روایت کے یہ الفاظ ہیں کہ بغیر خوف اور بغیر بارش کے ظہر کو عصر سے اور مغرب کو عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھا۔ حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا گیا اس سے حضور ﷺ کی غرض کیا تھی فرمایا امت کو دشواری میں نہ رکھنا۔ طبرانی کی روایت ہے بغیر کسی وجہ کے مدینے میں دو نمازوں کو جمع کیا تھا۔ دریافت کیا گیا اس سے حضور ﷺ کا مقصد کیا تھا فرمایا امت کے لئے سہولت پیدا کرنا۔ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں جمع صوری (یعنی اول نماز کو آخرِ وقت میں اور دوسری کو اولِ وقت میں پڑھنا) ہی مراد ہے بلا وجہ دونوں نمازوں کو ایک نماز کے وقت میں پڑھنا تو بالاجماع درست نہیں۔ صحیح بخاری میں عمرو بن دینار کی روایت سے تو صریحاً یہی مضمون آیا ہے، الفاظ اس طرح ہیں میں نے کہا ابو الشعثاء میرا خیال ہے کہ حضور ﷺ نے ظہر کے وقت میں تاخیر اور عصر کی نماز میں عجلت کی ہوگی اور مغرب کو آخرِ وقت میں اور عشاء کو شروع وقت میں ادا کیا ہوگا۔ ابو الشعثاء نے جواب دیا میرا بھی یہی خیال ہے۔

......ایک سوال......

جمع تاخیر کو تو جمع صوری قرار دیا جا سکتا ہے (یعنی ظہر کو اتنا مؤخر کرنا کہ عصر سے مل جائے اور مغرب کو اتنا مؤخر کرنا کہ عشاء سے متصل ہو جائے) لیکن بعض روایات میں تو جمع تقدیم کی شکل آئی ہے جس کو جمع صوری قرار ہی نہیں دیا جا سکتا (یعنی عصر کو وقت سے پہلے ظہر کے وقت میں ادا کیا اور عشاء کو اس کا وقت آنے سے پہلے مغرب کے وقت میں پڑھا) چنانچہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے جس کو امام احمد اور بیہقی و دار قطنی نے حسین بن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عباس اور عکرمہ و کریب از ابن عباسؓ کے سلسلہ سے نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا فرودگاہ پر زوالِ آفتاب ہو جاتا تو سوار ہونے سے پہلے حضور ﷺ ظہر و عصر کو جمع کر لیا کرتے اور فرودگاہ پر (قیام کی حالت میں) زوال نہ ہوتا تھا تو (بغیر ظہر پڑھے) روانہ

ہو جاتے تھے پھر جب عصر کا وقت آجاتا تھا تو اُتر کر ظہر اور عصر کو ملا کر پڑھتے تھے (اسی طرح) فرودگاہ پر مغرب کے وقت ہوتے تھے تو مغرب وعشاء (کو مغرب کے وقت) پڑھ لیتے تھے اور (مغرب کے وقت) فرودگاہ پر نہیں پہنچتے تھے تو سوار رہ کر چلتے رہتے تھے یہاں تک کہ جب عشاء کا وقت آجاتا تھا تو اُتر کر دونوں نمازوں کو جمع کر کے پڑھتے تھے رہی حضرت انسؓ والی روایت تو اسماعیلی و بیہقی نے اسحاق بن راہویہ کے حوالے سے اس کے الفاظ اس طرح نقل کئے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر میں ہوتے تھے اور آفتاب ڈھل جاتا تھا تو ظہر وعصر کو ملا کر پڑھ لیتے تھے پھر کوچ کرتے تھے۔ نووی نے اس کی اسناد کو صحیح کہا ہے۔ اور حضرت معاذؓ والی حدیث کو امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان، حاکم، دار قطنی اور بیہقی نے بحوالہ قتیبہ از لیث از یزید بن حبیب از ابوالطفیل از معاذ بن جبلؓ ان الفاظ کے ساتھ بیان کیا ہے کہ غزوۂ تبوک میں اگر روانگی سے پہلے زوال ہو جاتا تو حضور ﷺ ظہر اور عصر کو ظہر کے وقت میں جمع کر کے پڑھتے اور اگر زوال سے پہلے روانہ ہو جاتے تو ظہر کو مؤخر کر دیتے یہاں تک کہ عصر کے لئے اُترتے تھے (تو ظہر بھی شروع میں پڑھتے تھے پھر عصر پڑھتے تھے) مغرب کے متعلق بھی ایسی ہی روایت آئی ہے۔

ہم کہتے حسین بن عبداللہ کی روایت سے جو حدیث آپ نے بیان کی ہے وہ روایت ضعیف ہے۔ حسین ضعیف ہے ابن معین کا یہی تبصرہ ہے اور نسائی نے اس کو متروک کہا ہے۔ رہی حضرت انسؓ والی حدیث تو اس کی اسناد کو نووی نے صحیح کہا ہے۔ لیکن ذہبی نے بیان کیا ہے کہ ابوداؤد نے اسحٰق بن راہویہ کی تردید کی ہے مگر اس روایت کی متابع وہ روایت بھی ہے جس کو حاکم نے الاربعین میں بیان کیا ہے اس کے الفاظ اس طرح ہیں جب روانہ ہونے سے پہلے زوال ہو جاتا تو ظہر وعصر پڑھ کر سوار ہوتے۔ یہ زیادتی اگرچہ غریب ہے مگر صحیح ہے۔ طبرانی نے الاوسط میں لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر میں ہوتے اور روانگی سے پہلے زوالِ آفتاب ہو جاتا تو ظہر وعصر کو یکجا (ظہر کے وقت میں) پڑھ لیتے تھے اور اگر زوال سے پہلے روانہ ہو جاتے تو شروع عصر میں دونوں کو جمع کر کے پڑھ لیتے اور مغرب اور عشاء میں بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ مگر طبرانی نے کہا یعقوب بن محمد زہری اس روایت میں منفرد ہیں۔

حضرت معاذؓ والی مذکورہ بالا حدیث کے متعلق ترمذی نے کہا اس کی روایت میں قتیبہ منفرد ہے اور معروف وہ ہے جو مسلم نے نقل کیا ہے۔ ابوداؤد نے کہا یہ حدیث منکر ہے جمع تقدیم کے متعلق کوئی صحیح حدیث نہیں ہے۔ ابوسعید بن یونس نے کہا یہ حدیث سوائے قتیبہ کے کسی نے نہیں بیان کی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس کے بیان میں غلطی ہے ابو حاتم نے اس کو معلل کہا ہے حاکم نے بھی اس پر لمبی جرح کی ہے بخاری اور ابن حزم کے نزدیک بھی قتیبہ مجروح ہے سفر کی حالت میں دو نمازوں کو اول نماز کے وقت میں جمع کرنے کے سلسلے میں ایک اور حدیث بھی آئی ہے جس کو دار قطنی نے اپنی سند سے بواسطۂ اہل بیت بیان کیا ہے مگر اس سند میں بھی غیر معروف راوی ہیں۔ اس میں ایک راوی منظر قابوسی بھی ہے جو ضعیف ہے امام ابو حنیفہؒ نے اپنے استدلال میں حضرت ابن مسعودؓ کی وہ روایت پیش کی ہے کہ جو صحیحین میں مذکور ہے حضرت عبداللہؓ نے فرمایا میں نے نہیں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کوئی نماز غیر وقت میں پڑھی ہو سوائے مزدلفہ کے۔ مزدلفہ میں تو حضور ﷺ نے مغرب وعشاء کو جمع کر کے پڑھا تھا اور دوسرے دن فجر کی نماز تڑکے سے وقت سے پہلے پڑھی تھی۔ شاید حضرت ابن مسعودؓ کی مراد یہ ہے کہ معمولاً فجر کی نماز جس وقت پڑھتے تھے اس سے پہلے مزدلفہ میں پڑھ لی تھی۔ عرفہ میں دو نمازوں کو جمع کرنے کا مسئلہ چونکہ مشہور ہے اسی لئے شاید حضرت ابن مسعودؓ نے عرفہ کا ذکر نہیں کیا (صرف مزدلفہ کا ذکر کیا)۔

لَیْلَۃُ التَّعْرِیْس والی (جب کہ پچھلی رات کو ایک جگہ سفر میں حضور ﷺ نے پڑاؤ کیا تھا اور بلال کو جاگتے رہنے اور فجر کے لئے بیدار کرنے کا حکم دے کر خود سو گئے تھے اور صحابہؓ بھی سو گئے اور اتفاقاً بلال بھی سو گئے اور سب کی نماز قضا ہو گئی تو حضور ﷺ نے یہ حدیث فرمائی۔ اس (حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ سونے کی حالت میں (نماز قضا ہونے میں) کوئی قصور نہیں قصور تو اس بات میں ہے کہ بیداری کی حالت میں نماز میں اتنی تاخیر کر دی جائے کہ دوسری نماز کا وقت آجائے۔ امام ابو حنیفہؒ

نے اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ نیکیاں لے جاتی ہیں برائیوں کو بے شک

یعنی نیکیوں کی وجہ سے برائیاں ساقط کر دی جاتی ہیں۔ طبرانی نے ضعیف سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نیکی پرانی بدی کا جس طرح خوبی کے ساتھ پیچھا کرتی اور تیزی کے ساتھ اس کو پہنچ جاتی ہے اتنی پہنچ والی اور کوئی خبر میں نے نہیں دیکھی۔ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ۔

امام احمد ناقل ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے کچھ نصیحت فرمائیے، فرمایا جب تو کوئی گناہ کرے تو اس کے پیچھے نیکی بھی ضرور کرنا۔ نیکی بدی کو مٹا دے گی، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا نیکیوں میں سے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ (کا اقرار) بھی ہے۔ فرمایا وہ سب نیکیوں سے افضل ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ کسی شخص[1] نے کسی اجنبی عورت کا بوسہ لے لیا پھر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کر دیا، اس پر اللہ نے آیت وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ الخ نازل فرمائی۔ اس شخص نے عرض کیا، کیا یہ تنہا میرے لئے ہے، فرمایا میری تمام امت کے لئے۔ دوسری روایت میں ہے میری امت میں سے جو بھی اس پر عمل کرے اس کے لئے (یہی حکم) ہے، رواہ البخاری و مسلم۔

مسلم کی روایت میں اس کے بعد اتنا اور بھی ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس شخص سے فرمایا اللہ تیری پردہ پوشی کرتا اگر تو اپنا جرم چھپا لیتا۔ حاکم و بیہقی نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پانچوں نمازیں اور جمعہ کی نماز جمعہ تک اور رمضان کے روزے رمضان تک درمیانی گناہوں کو ساقط کر دینے والے ہیں۔ جبکہ آدمی کبیرہ گناہوں سے بچا رہے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر تم میں سے کسی کے دروازے پر دریا ہو اور وہ اس میں روز پانچ بار غسل کرتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ بھی میل رہ جائے گا صحابہؓ نے عرض کیا کچھ نہیں رہے گا پس یہی حالت پانچ نمازوں کی ہے اللہ ان سے گناہوں کو مٹا دیتا ہے اور دل گناہوں کی کثافت سے پاک ہو جاتا ہے رواہ البخاری و مسلم فی صحیحیہما

ذٰلِكَ یہ۔ یعنی اِسْتَقِمْ اور اس سے بعد والا حکم یا قرآن

ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ نصیحت ہے نصیحت قبول کرنے والوں کے لئے۔

وَاصْبِرْ اور اے محمدؐ آپ طاعت پر قائم رہیں یا جو دکھ آپ کو پہنچتا ہے اس پر آپ صبر کریں۔ بعض نے کہا نماز پر پابند رہیں، جیسا دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾ بلاشبہ نیکی کرنے والوں کا ثواب اللہ ضائع نہیں کرے گا۔ ضمیر (یعنی اجرھم) کی جگہ اسم ظاہر (یعنی المحسنین) سے کلام حالی دلیل ہو گیا کہ چونکہ وہ نیکوکار ہیں اس لئے اللہ ان کے ثواب کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس آیت میں اشارہ ہے اس امر کی جانب کہ صلوٰۃ اور صبر ہم زاد ہیں اور اخلاصِ نیت نہ ہو تو دونوں ناقابلِ اعتبار ہیں۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ

جو امتیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں ان میں ایسے سمجھ دار لوگ نہ ہوئے جو دوسروں کو ملک میں بگاڑ پیدا کرنے (یعنی شرک و کفر) سے منع کرتے بقیۃ (وہ شئے جس کو باقی رکھا جائے یا وہ شئے جو باقی رہے) سے مراد ہے عقل و خرد اور فضیلت۔ جو چیزیں آدمی باقی رکھتا ہے۔ یا جو باقی رہنا چاہیے ان میں عقل و دانش ہی سب سے اعلیٰ چیز ہے (جسمانی طاقت و صحت اور مال وغیرہ کا درجہ دانش و عقل سے کم ہے) اگر کسی میں کوئی اچھی بات اور بھلائی ہو تو اس کو ذوبقیۃ کہا جاتا ہے اور اگر کوئی برگزیدہ اور اعلیٰ طبقے میں سے ہو تو کہا جاتا ہے هُوَ مِنْ بَقِيَّةِ الْقَوْمِ ایک اور کہاوت ہے فِي الزَّوَايَا خَفَايَا وَفِي الرِّجَالِ بَقَايَا یعنی گوشوں میں کچھ چھپی چیزیں ہوتی ہیں اور آدمیوں میں کچھ اعلیٰ اشخاص ہوتے ہیں۔ بعض کے نزدیک بقیۃ سے طاعت مراد ہے آیت بَقِيَّةُ

[1] اس شخص کا نام بقول بغوی عمرو بن غزیہ انصاری تھا جو ابوالیسر سے مشہور تھا۔ مصحح

اللّٰہ خَیْرٌ لَّکُمْ اور الباقیات الصالحات خیر میں ہم نے اس کی تشریح کر دی ہے۔ بعض نے کہا بقیۃ سے مراد ہے خیر باقی یعنی اچھی خصلت، یہ بھی ممکن ہے کہ بقیۃ مصدر ہو جیسے تقیۃ۔ قاموس میں ہے۔ بقی یبقی (فتح یفتح) اور بقاءً اور بقًا اور بقیًا اس صورت میں اُولو بقیۃ کا معنی ہوا اپنے اوپر رحم کرنے والے اور اپنی جانوں کو عذاب سے محفوظ رکھنے والے۔

اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّنْ اَنْجَیْنَا مِنْهُمْ　سوائے تھوڑے آدمیوں کے جن کو ہم نے بچالیا یعنی سوائے ان لوگوں کے جو انبیاء کے متبع تھے اور لوگوں کو زمین میں تباہی پھیلانے سے روکتے تھے۔

وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مَاۤ اُتْرِفُوْا فِیْهِ وَكَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿١١٦﴾　اور جو لوگ نافرمان تھے اور جس ناز و نعمت میں تھے اس کے پیچھے پڑے رہے اور جرائم کے خوگر ہو گئے۔

اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا سے مراد ہیں وہ لوگ جنہوں نے بُرائی سے باز داشت نہیں کی۔ یعنی خواہشاتِ عیش میں پڑے رہے آرام و عیش کی تلاش میں سرگرم رہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے روگرداں ہو گئے۔ مقاتل بن حبان نے مَاۤ اُتْرِفُوْا کا ترجمہ کیا ہے وہ چیزیں جن کی گردش میں ان کو منتقل کیا جاتا رہا تھا۔ فراء نے کہا جن چیزوں کے وہ خوگر ہو گئے تھے۔ مجرمین سے مراد ہیں کافر۔

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِیُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿١١٧﴾　اور آپ کا رب ہرگز ایسا نہیں کہ ظلم کے ساتھ بستیوں کو تباہ کر دے جب کہ بستیوں والے مسلم ہوں۔

لِیُهْلِكَ میں لام تاکیدِ نفی کے لئے ہے اور اَنْ مصدریہ محذوف ہے یعنی ظلم کے ساتھ بستیوں کو تباہ کر دینا اللہ کی عادت نہیں۔ اَهْلُهَا یعنی ان بستیوں کے باشندے۔ مُصْلِحُوْنَ سے مراد ہیں مسلمان مراد یہ ہے کہ اللہ ظالم نہیں۔ بعض کے نزدیک ظلم سے مراد ہے شرک یعنی بستی والوں کے شرک کی وجہ سے اللہ ان کو تباہ اور ہلاک نہیں کرتا بشرطیکہ ان کے آپس کے تعلقات میں بے انصافی نہ ہو اور وہ باہم حق تلفیاں نہ کرتے ہوں (حاصلِ مقصد یہ ہے کہ شرک سے تباہی نہیں آتی بکثرت مشرک آباد اور دنیوی لحاظ سے مرفّہ الحال اور کثیرُ النسل ہوتے ہیں تباہی کی جڑ یہ ہے کہ لوگ باہم حق تلفیاں کرنے لگیں کسی کی آبرو اور جان و مال محفوظ نہ ہو، خیانت، بے ایمانی، ڈاکہ، چوری، زنا، امرد پرستی، ناپ تول میں کمی بیشی اور معاملات میں کھوٹ، اور باہم بغض و عناد پیدا ہو جائے ایسی بستیوں کو اللہ تباہ کر دیتا ہے، مترجم)۔

طبرانی اور ابوالشیخ نے حضرت جریر بن عبداللہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے (مصلحون کی تشریح میں) فرمایا باہم انصاف کرتے ہوں (تو اللہ ان کو ہلاک نہیں کرتا) شرک کی وجہ سے ہلاک نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ بڑی رحمت والا ہے، اپنے حقوق سے درگزر فرما دیتا ہے۔ اگر اللہ کے اور بندوں کے حقوق میں کہیں ٹکراؤ ہوتا (کہ بندوں کے حقوق ادا کرنے سے اللہ کا حق فوت ہوتا ہو اور حق اللہ کی ادائیگی سے بندوں کی حق تلفی ہوتی ہو) تو فقہاء نے حقوق العباد کی ادائیگی کو قابلِ ترجیح قرار دیا ہے، ایک مشہور مقولہ ہے کہ حکومت شرک کے ساتھ تو باقی رہ جاتی ہے ظلم کے ساتھ باقی نہیں رہتی۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً　اور اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ایک گروہ بنا دیتا، یعنی سب کو نیکوکار مسلمان بنا دیتا (اگرچہ اس نے سب کو نیک مسلمان ہو جانے کا حکم دیا ہے) آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ کی مشیّت الگ چیز ہے اور حکم جُدا حیثیت رکھتا ہے اور دونوں ایک نہیں ہیں اللہ نے ہر شخص کو مؤمن بنانے کا وعدہ نہیں کیا ہے اگر وہ چاہتا تو اس کی مشیّت کے مطابق ضرور ہو جاتا۔

وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ ﴿١١٨﴾　اور لوگ ہمیشہ حق سے اختلاف کرتے رہیں گے اور طرح طرح سے باطل کی طرف مائل ہوتے رہیں گے۔ کوئی یہودی رہے گا، کوئی عیسائی، کوئی آتش پرست، کوئی بت پرست، کوئی جبری، کوئی قدری، کوئی رافضی، کوئی خارجی وغیرہ (جبریہ فرقہ انسان کو بالکل بے اختیار قرار دیتا ہے اس کے نزدیک پتھر اور انسان میں کوئی فرق نہیں غیر

اختیاری تکوین کی طرح عملاً بھی آدمی پتھر کی طرح غیر مختار ہے۔ قدریہ انسان کو اپنے افعال کا خالق و مختار جانتا ہے اور اختیارِ کامل کا حامل قرار دیتا ہے۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ سوائے ان کے جن پر آپ کا رب رحم کرے یعنی سوائے ان لوگوں کے جن کو اللہ اپنی مہربانی سے راہِ مستقیم کی ہدایت کر دے یہ لوگ تو صحیح عقائد اور اوامرِ الٰہیہ کی تعمیل پر متفق رہیں گے باقی گمراہ گروہ اور اشخاص اختلاف کرتے ہی رہیں گے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہمارے سامنے رسول اللہ ﷺ نے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا یہ اللہ کا راستہ ہے پھر دائیں بائیں کچھ خطوط ترچھے اور کھینچے اور فرمایا یہ مختلف راستے ہیں۔ ان میں سے ہر راستہ پر شیطان بیٹھا اپنی طرف بلا رہا ہے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ۔ رواہ احمد والنسائی والدارمی۔

وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ اور اسی کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ یعنی رحمت کے لئے ہی ان کی پیدائش کی ہے۔ اس مطلب پر ذٰلِکَ سے اشارہ رحمت کی طرف ہوگا اور ھُمْ ضمیر مَنْ رَّحِمَ کی طرف راجع ہوگی۔ حسن اور عطاء نے کہا ذٰلک سے اشارہ اختلاف کی طرف ہے اور ھُمْ ضمیر اختلاف کرنے والوں کی طرف راجع ہے۔ یعنی اختلاف ہی کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ اشہب نے کہا میں نے مالک سے اس آیت کے متعلق دریافت کیا، مالک نے فرمایا، اللہ نے ان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ ایک فریق جنت میں اور دوسرا فریق جہنم میں چلا جائے۔ ابو عبیدہ نے کہا میرے نزدیک بھی یہی صحیح ہے کہ اللہ نے ایک فریق کو رحمت کے لئے اور دوسرے فریق کو عذاب کے لئے پیدا کیا ہے۔ فراء نے کہا اللہ نے اہلِ رحمت کو رحمت کے لئے اور اہلِ اختلاف کو اختلاف کے لئے پیدا کیا۔ فراء کے نزدیک ذٰلک سے اشارہ رحمت اور اختلاف دونوں کی طرف ہے اور ضمیر کا مرجع اہلِ رحمت واہلِ اختلاف دونوں ہیں۔ گویا اَلنَّاس ضمیر کا مرجع ہے اس کی تائید آئندہ آیت سے ہو رہی ہے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ اور آپ کے رب کی بات پوری ہو گئی۔ کلمہ سے مراد ہے حکم یا وہ قول جو فرشتوں سے فرمایا تھا۔

لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ⑲ کہ میں جہنم کو (نافرمان) اور جنات اور انسانوں سے سب سے ضرور بھر دوں گا۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ اور ہم پیغمبروں کے قصے میں سے یہ سارے مذکورہ قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں۔

وَكُلًّا اور ہر خبر۔ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ پیغمبروں کی اور ان کی امتوں کی خبریں مَا نُثَبِّتُ، کُلًّا کا بیان ہے یا بدل ہے۔ یعنی انبیاء اور اقوام پارینہ کے احوال بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے یقین میں استحکام اور ادائے رسالت کے لئے دل میں قوت اور ایذائے کفار کو برداشت کرنے کی طاقت پیدا ہو۔

وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ اور اس دنیا میں آپ کے پاس حق آگیا (حسن و قتادہ)۔ دوسرے اہل تفسیر نے کہا ھٰذہ سے مراد ہے سورت۔ ظاہر ہے کہ اَنْبَاءُ الرُّسل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی بیان کردہ قصص واخبار میں جو بات حق تھی وہ آپ کے پاس آگئی۔

وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ⑳ اور وہ چیز آگئی جو اہلِ ایمان کے لئے نصیحت اور یاد داشت ہے، یہ رُسل واقوام کے احوال کے بیان کے فوائد کا اظہار ہے۔

وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ㉑

اور جو لوگ نہیں مانتے ان سے آپ کہہ دیجئے کہ آپ لوگ اپنی جگہ جو چاہو کئے جاؤ ہم اپنی جگہ اپنی قدرت کے موافق کر رہے

ہیں۔
مکانت سے مراد ہے حالتِ قدرت اور وہ رخ جس پر وہ چل رہے ہیں اس کلام میں تہدید اور نتیجۂ بد کی کافروں کے لئے دھمکی ہے۔
وَانْتَظِرُوْا ۚ اور (ہم پر مصائب آنے کا) تم انتظار کرتے رہو۔
اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ ہم بھی (تم پر اس عذاب کے آنے کے) منتظر ہیں۔ (جو تم جیسے لوگوں پر گزشتہ زمانوں میں آچکا ہے)۔
وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اور اللہ ہی کے لئے ہے آسمانوں کا اور زمین کا وہ علم جو بندوں کے علم میں نہیں ہے۔ اس سے کوئی مخفی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے اس لئے وہی تمہارے اعمال سے بھی واقف ہے۔
وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ اور (بندوں کے) تمام اُمور کا رجوع اسی کی طرف ہے آپ کے امور کا بھی اور ان کے امور کا بھی، وہی آپ کا ان سے انتقام لے گا، وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جیسی اس کی مرضی ہوتی ہے حکم دیتا ہے۔
فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ پس تم اس کی عبادت کرو اور اس پر بھروسہ رکھو۔ عبادت کا حکم توکّل کے حکم سے پہلے دینے سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ توکّل کی افادیت اس وقت ہے جب عبادت کے ساتھ ہو (تنہا عبادت بغیر توکّل کے مغرور بنا سکتی ہے۔ اور تنہا توکّل بغیر عبادت کے اندھا توکّل ہے جو اعمال کو غیر مکلّف قرار دے دیتا ہے۔ مترجم)

ع ۱۰

وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ اور تم لوگ جو کچھ کرتے ہو آپ کا رب اس سے غافل نہیں ہے۔
بغوی نے کعب کا قول نقل کیا ہے کہ توریت کا خاتمہ جس آیت پر ہوا ہے اُسی پر سورۂ ہود کا خاتمہ ہوا۔
حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ پر بڑھاپا آگیا فرمایا مجھے سورۂ ہود اور الواقعہ اور المرسلات اور عَمَّ یتساءلون اور اذا الشمس کُوِّرت نے بوڑھا کر دیا۔ رواہ الترمذی والحاکم، حاکم نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔ بغوی نے بھی اس کی تصحیح کی ہے۔ اس حدیث کو حاکم نے حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت سعدؓ کی روایت سے بھی بیان کیا ہے۔
ابن مردویہ نے حضرت ابو بکرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا مجھے سورۃ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے بڑھاپے سے پہلے بوڑھا کر دیا۔
ابو یعلیٰ نے ضعیف سند سے حضرت انسؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت عمرانؓ کی روایت سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں، مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والی مفصّلات نے بوڑھا کر دیا۔[1]
ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے مجھے سورۃ ہود نے اور اس کی ساتھ والیوں نے یعنی الواقعہ اور القارعہ اور الحاقہ اور اذا الشمس کوّرت اور سأل سائل نے بوڑھا کر دیا۔
طبرانی نے الکبیر میں حضرت عقبہ بن عامرؓ اور حضرت ابو جحیفہؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیث نقل کی ہے۔ مجھے سورۃ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے بوڑھا کر دیا۔ طبرانی میں ضعیف سند کے ساتھ حضرت سہیل بن سعدؓ کی روایت سے اتنا زائد آیا ہے الواقعہ، الحاقہ اور اذا الشمس کوّرت نے۔ ابن عساکر نے بروایتِ محمد بن علی مرسلاً نقل کیا ہے مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والیوں نے اور ان واقعات نے جو مجھ سے پہلے دوسری امتوں کو پیش آئے بوڑھا کر دیا۔

---

[1] حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ آپ پر بڑھاپا جلد آگیا۔ فرمایا مجھے سورۂ ہود اور اس کی ساتھ والی الواقعہ اور عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ اور اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ نے بوڑھا کر دیا۔ (ازالۃ الخفاء)۔

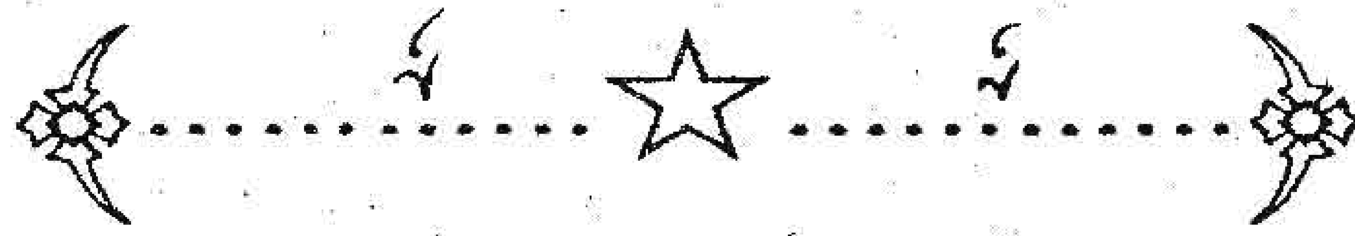
عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں اور ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں، ابو عمران جونی کے حوالہ سے مرسلاً بیان کیا کہ مجھے سورۂ ہود نے اور اس کی ساتھ والیوں نے اور روزِ قیامت کے ذکر نے اور گزشتہ امتوں کے قصوں نے بوڑھا کر دیا۔

احادیثِ مذکورہ سے صراحۃً معلوم ہو رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر بڑھاپا روزِ قیامت کے تذکرے اور گزشتہ امتوں پر ہونے والے عذاب کے ذکر سے آیا۔ امر بالاستقامۃ کو بڑھاپا آنے میں دخل نہیں ورنہ صرف سورۂ ہود کا ذکر کیا جاتا۔ (کیونکہ استقامت کا حکم صرف اسی سورت میں ہے) دوسری ساتھ والی سورتوں کا ذکر نہ کیا جاتا۔

واللہ اعلم

سورۂ ہود کی تفسیر بحمد اللہ ختم ہوئی اس کے بعد سورۂ یوسف کی تفسیر آرہی ہے۔

(۱۶/ ذیقعدہ ۱۴۰۱ھ) الحمد للہ سورۂ ہود کی تفسیر کا ترجمہ مع تشریحی اضافات کے ۷ دسمبر ۱۹۶۶ء کو ختم ہوا۔



سورۂ یوسف

یہ سورت مکی ہے اس میں ۱۱۱ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ① الٓر۔ یہ آیتیں ہیں ایک کتاب واضح کی۔ تِلْکَ سے آیاتِ قرآن کی طرف اشارہ ہے اور اَلْکِتَاب کی طرف اٰیَاتُ کی اضافت بتقدیر مِنْ ہے۔ (کتاب سے یعنی کتاب کی آیات) اور الکتاب سے مراد قرآن مجید ہے۔ یعنی یہ آیات اس قرآن کی جس کا اعجاز ظاہر ہے یا جس کے مضامین حلال و حرام حدود اور احکام واضح ہیں۔ قتادہ نے کہا واللہ اس کی برکت، ہدایت اور رُشد آگئینی ہے۔ زجاج نے کہا یہ حق کو باطل سے اور حرام کو حلال سے واضح کرنے والا ہے (اس قول پر مُبین متعدی ہوگا اور قتادہ کے قول پر لازم ہوگا)۔

بعض علماء کے نزدیک تِلْکَ سے آیاتِ سورۃ کی طرف اشارہ ہے۔ اور الکتاب سے مرادِ سورۃ ہے یعنی یہ سورۃ کی آیات ہیں جو اس پر غور کرے گا اس پر واضح ہو جائے گا کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے (مخلوق کا کلام نہیں ہے)۔

یا یہ مراد ہے کہ یہودیوں پر (ان کے سوال کا جواب) واضح کر دینے والا ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ علماء یہود نے مشرکوں سے کہا تھا کہ محمد ﷺ سے دریافت کرو اولادِ یعقوبؑ شام چھوڑ کر مصر کیوں آگئی ہے اور یوسفؑ کا کیا واقعہ ہوا تھا۔ اس پر یہ سورت نازل ہوئی۔ صاحب باب النقول الباب نزول نے اس شان نزول کا ذکر نہیں کیا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا۔ قرآن اس میں جنس ہے اس کا اطلاق پوری کتاب پر بھی ہوتا ہے اور ہر جز پر بھی اگرچہ غلبۂ استعمال کی وجہ سے پورے قرآن کا نام اس کو قرار دے دیا گیا ہے لہٰذا قرآن کا حمل الکتاب پر ہو سکتا ہے خواہ الکتاب سے مراد سورت ہی لی جائے (کیونکہ اجزاء کتاب کو بھی قرآن کہا جاسکتا ہے)۔

عَرَبِيًّا کا لفظ حال ہے اور قُرْاٰنًا اس کی تمہید۔ یا قرآن موصوف ہے (جب کہ قرآن کو بمعنی اسم مفعول کے لیا جائے) اور عَرَبِيًّا صفت ہے۔

عَرَبِيًّا کہنے سے مراد یہ ہے کہ قرآن تمہاری زبان میں نازل کیا گیا ہے۔

لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲ تاکہ تم سمجھو یعنی قرآن کے معانی کو سمجھو اور فہم و دانش سے کام لے کر اس کے لطائف اور لفظی و معنوی خوبیاں جان لو۔[1]

حاکم وغیرہ نے بیان کیا کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ پر قرآن نازل ہوا اور آپ ﷺ نے ایک زمانہ تک لوگوں کو پڑھ کر سنایا تو صحابہؓ نے (ایک روز) عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر آپ ہم کو کوئی قصہ سناتے تو بہتر ہوتا اس پر آیت اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ الخ نازل ہوئی ابن ابی حاتم نے اس روایت میں اتنا اور زائد نقل کیا ہے کہ اس کے بعد صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اگر حضور ﷺ ہم کو نصیحت فرماتے اور یاد دہانی کرتے (تو ہمارے لئے مفید ہوتا) اس پر آیت اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ الخ نازل ہوئی۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے اور ابن مردویہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بھی اسی طرح نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ (یا حضرت ابن مسعودؓ) نے فرمایا کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کوئی قصہ بیان فرمائیے تو نازل ہوا۔)

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ہم تم سے بہترین قصہ بیان کرتے ہیں۔ اَلْقَصَصُ یا مصدر ہے اس وقت مفعول مطلق ہوگا بہترین بیان، نادر ترین اسلوب کے ساتھ۔ یعنی ہم گزشتہ اُمم اور پارینہ اقوام کے قصے بہترین اُسلوب کے ساتھ بیان کرتے ہیں یا اَلْقَصَصُ سے مراد ہے قصہ اس وقت مفعول یہ ہوگا یعنی قصۂ یوسفؑ بیان کرتے ہیں جو بہترین قصہ ہے اس قصہ میں عجائباتِ قدرت ہیں عبرتیں اور حکمتیں ہیں، دقائق اور فوائد ہیں جو دین و دنیا کے حالات کو درست کرنے والے ہیں۔ بادشاہوں اور رعایا کی مسرتیں اور علماء کے خصائل ہیں، عورتوں کی مکاری کا اظہار ہے، دشمنوں کی ایذا پر صبر کرنے کا بیان ہے، قابو پانے کے بعد بھی دشمنوں سے درگزر کرنے کی تعلیم ہے اس صورت میں قصص بروزن فعل بمعنی اسم مفعول کے ہوگا جیسے نقض بمعنی منقوض اور سلب بمعنی مسلوب کے آتا ہے۔ قصّ اثرہٗ اس کے نقشِ قدم پر چلا اس کی پیروی کی قصہ بیان کرنے والا واقعات کو صحیح صحیح بیان کرتا ہے جیسی خبر ہوتی ہے اسی کے موافق اظہار کرتا ہے (گویا اپنے بیان میں گزرے ہوئے واقعہ کا اتباع کرتا ہے)

خالد بن معدان نے کہا سورۂ یوسفؑ اور سورۂ مریمؑ مزے لے لے کر اہل جنت جنت میں پڑھیں گے۔ ابن عطاء نے کہا ہر غم رسیدہ سورۂ یوسف سن کر کچھ چین پاتا ہے۔

[1] خالد بن عرفطہؓ کا بیان ہے میں حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ خاندان عبد القیس کے ایک آدمی کو پیش کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تو فلاں شخص ہے خاندان عبد القیس کا، اس شخص نے جواب دیا جی ہاں، آپ نے اس کو اپنی چھڑی سے مارا اس شخص نے کہا امیر المؤمنین میں نے کیا کیا ہے۔ فرمایا بیٹھ جا۔ وہ بیٹھ گیا، آپ نے اس کو تین بار یہ آیات سنائیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

بِمَآ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ　اس قرآن کو وحی کے ذریعے سے آپ کے پاس بھیجنے کے سبب سے مَا اَوْحَیْنَا سے مراد ہے وحی کرنا یعنی مَا مصدری ہے اور قرآن سے مراد سورت یوسف ہے

وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۝۳　اگرچہ آپ اس سے پہلے ناواقف تھے، یعنی وحی کرنے سے پہلے آپ اس قصہ سے یا ان تمام قصص یا احکام وشرائع سے ناواقف تھے جن کی اطلاع آپ کو وحی کے ذریعے سے دی گئی ہے۔

اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْہِ　جبکہ یوسفؑ نے اپنے باپ سے کہا تھا اگر اَحْسَنَ الْقَصَصِ کو مفعول بہ قرار دیا جائے تو اِذْ قَالَ یُوْسُفُ اس سے بدل اشتمال ہوگا۔ یا یوں کہا جائے۔ اُذْکُرْ فعل محذوف ہے اور اِذْ قَالَ اس کا مفعول فیہ ہے۔ (اس وقت کو یاد کرو جب یوسفؑ نے کہا تھا) یوسف عبرانی لفظ ہے اسی لئے یہ لفظ غیر منصرف ہے آپ کے باپ یعقوبؑ بن اسحاق بن ابراہیمؑ تھے اور یہ سب بزرگ پیغمبر تھے) امام احمد اور بخاری نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، کریم بن کریم بن کریم بن کریم، یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ تھے۔

یٰٓاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ کَوْکَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ　ابا میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور چاند سورج دیکھے۔

رَاَیْتُ (اس جگہ) رؤیا (خواب سے مشتق ہے۔ رؤیت (دیکھنا) سے ماخوذ نہیں ہیں کیونکہ آگے آیت میں لَا تَقْصُصْ رُؤْیَاکَ اور ھٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ آیا ہے۔

سعید بن منصور نے سنن میں اور بزار وابویعلی نے اپنی اپنی مسندوں میں اور ابن جریر وابن المنذر وابن ابی حاتم وابوالشیخ و ابن مردویہ نے اپنی تفسیروں میں اور عقیلی وابن حبان نے ضعفاء میں، اور حاکم نے مستدرک میں اور ابونعیم وبیہقی نے دلائل النبوۃ میں حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو بشرط مسلم صحیح بھی قرار دیا ہے کہ ایک یہودی نے خدمتِ گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا (بیہقی نے اس یہودی کا نام بستان لکھا ہے) محمد ﷺ ان ستاروں کے متعلق وضاحت کرو۔ جو یوسفؑ نے خواب میں دیکھے تھے۔ حضور ﷺ خاموش رہے اور جبرائیلؑ نے نازل ہو کر آپ کو اطلاع دی، تو حضور ﷺ نے فرمایا اگر میں تجھے بتادوں گا تو کیا تو مان لے گا، یہودی نے جواب دیا جی ہاں فرمایا (گیارہ ستارے) جرثان، الطارق، الذیال، قابس، عمودان، الفلیق، المصبح، الفروح، الفرغ، وثاب اور ذوالکتفین تھے۔ ان کو اور سورج و چاند کو یوسفؑ نے دیکھا تھا کہ اوپر سے اتر کر ان

(گزشتہ سے پیوستہ) الرحیم۔ الر تلک اٰیٰت الکتاب المبین۔ انا انزلناہ قرانا عربیا لعلکم تعقلون اور ہر مرتبہ قمچی سے مارا، اس شخص نے عرض کیا امیر المؤمنین میرا قصور کیا ہے۔ فرمایا تجھے دانیال (پیغمبر) کی کتاب پسند ہے۔ اس شخص نے کہا پھر آپ مجھے کچھ حکم دیں، میں اس کی تعمیل کروں گا، فرمایا جا کر کوئلے اور اونی کپڑے کے ٹکڑے سے رگڑ کر اس کو مٹادے آئندہ پھر اس کو نہ خود پڑھنا نہ کسی کو پڑھانا حضرت عمرؓ نے فرمایا میں اہل کتاب سے ان کی کتاب کی ایک نقل چمڑے میں رکھ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ تیرے ہاتھ میں کیا ہے میں نے عرض کیا یہ کتاب کی نقل ہے ہم نے اپنے علم میں اضافہ کرنے کے لئے اس کو حاصل کیا ہے یہ سنتے ہی حضور ﷺ کے دونوں رخسار (غصہ سے) سرخ ہوگئے پھر نداء دی گئی الصلوٰۃ جامعۃ انصار کہنے لگے، رسول اللہ ﷺ کو غصہ آگیا (کوئی خاص بات ہے) مسلح ہو جاؤ یہ کہہ کر انصار نے رسول اللہ ﷺ کے منبر کو (حفاظت کے لئے) چاروں طرف سے گھیر لیا رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگو مجھے کلماتِ جامعہ وخاتمہ عطا کر دیئے گئے ہیں میرے لئے سب کا خلاصہ کر دیا گیا (یعنی تمام گزشتہ آسمانی کتابوں کا یہ مختصر خلاصہ جامعہ ہے) میں تمہارے پاس ان کلمات کو روشن صاف ستھری شکل میں لے آیا تم تردد نہ کرو اور حیرانی میں پڑے ہوئے لوگوں کے تردد سے فریب نہ کھاؤ میں نے یہ سن کر کھڑے ہو کر عرض کیا میں دل سے پسند کرتا ہوں اللہ کے رب ہونے کو اور اسلام کے دین ہونے کو اور آپ کے رسول ہونے کو پھر حضور ﷺ منبر سے اتر آئے۔ ابراہیم نخعی نے اسی طرح روایت کی ہے (ازالۃ الخفاء)

سب نے یوسفؑ کو سجدہ کیا۔ یہودی بولا، بے شک خدا کی قسم ان کے یہی نام تھے۔

رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ ④ میں نے ان کو دیکھا کہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ سجدہ کرنا ذوی العقول کی خصوصیت ہے اس لئے ستاروں کے بے عقل ہونے کے باوجود ان کو صاحبِ عقل قرار دے کر بصیغۂ ذوی العقول ان کی تعبیر کی اور ذوی العقول ہی کی ضمیر ان کی طرف راجع ہے۔ تعبیر کے لحاظ سے گیارہ ستاروں سے گیارہ بھائی مراد تھے ستاروں کی طرح وہ بھی سرچشمۂ انوار تھے اور سورج سے اشارہ باپ کی طرف اور چاند سے اشارہ ماں کی طرف تھا۔

سدی نے کہا حضرت یوسفؑ کی ماں راحیل کا تو انتقال ہو چکا تھا اس لئے چاند سے اشارہ آپ کی خالہ کی طرف تھا۔ ابن جریج نے کہا شمس مؤنث (مستعمل) ہے اور قمر مذکر ہے اس لئے شمس سے ماں کی طرف اور قمر سے باپ کی طرف اشارہ تھا۔ مگر یہ قول غلط ہے شمس کی تانیث اور قمر کی تذکیر تو عربی لغت میں ہے (واقعہ میں نہ سورج مؤنث ہے اور نہ چاند مذکر) سورج چاند سے زیادہ روشن ہے اس لئے سورج سے باپ اور چاند سے اشارہ ماں کی طرف تھا۔ حضرت یوسفؑ نے یہ خواب جمعہ کی رات میں جو شبِ قدر بھی تھی دیکھا تھا یہ قول بعض علماء کا ہے (جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ مترجم)

قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ باپ نے کہا بیٹا اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے نہ بیان کرنا۔

بُنَیَّ تصغیر کا صیغہ ہے کم عمر ہونے کی وجہ سے یا بوجہ انتہائی پیار کے تصغیر کا صیغہ استعمال کیا۔ بغوی نے لکھا ہے۔ یوسفؑ اس وقت بارہ سال کے تھے۔

رؤیا نیند میں یا نیند جیسی کسی استغراق کی حالت میں کچھ دیکھنا، معمولی دیکھنے کو رؤیت تا کے ساتھ کہتے ہیں اور نیند (وغیرہ) میں دیکھنے کو رؤیا بالف مقصورہ کہا جاتا ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے قوتِ خیالیہ سے اتر کر اگر کوئی صورت حسِ مشترک میں چھپ جاتی ہے تو اس کو رؤیا کہا جاتا ہے۔ نفسِ ناطقہ اور عالم ملکوت میں (تجردِ ذاتی کی) مناسبت ہے اس لئے نفس کو جب انتظام بدن سے (نیند وغیرہ میں) کسی قدر فرصت ملتی ہے تو اس کا رخ عالمِ ملکوت کی طرف ہو جاتا ہے (اور چونکہ عالمِ ملکوت میں تمام غیر مادی حقائق و معانی کی غیر مادی صورتیں موجود ہیں اس لئے نفس) وہاں سے کچھ غیر مادی معانی کو غیر مادی صورتوں میں حاصل کرتا ہے (اور واپس لوٹ کر قوتِ خیالیہ کے سامنے رکھتا ہے) پھر قوتِ خیالیہ ان کو مناسب مادی شکلیں پہنا کر حسِ مشترک کے سامنے لاتی ہے اس طرح غیر محسوس حقائق محسوس ہو جاتے ہیں اور یہ سچا خواب ہوتا ہے۔ اب اگر غیر مادی اور مادی صورتوں میں گہری مناسبت ہوتی ہے کہ دونوں میں سوائے کلی اور جزئی ہونے کے اور کوئی فرق نہیں ہوتا (غیر مادی صورت کلی اور مادی شکل جزئی) تو تعبیر کی بھی ضرورت نہیں ہوتی اور گہری مناسبت نہیں ہوتی تو تعبیر کی حاجت ہوتی ہے۔

میں کہتا ہوں قوتِ متخیلہ سے جو صورتیں اتر کر حسِ مشترک میں چھپتی ہیں نفس ان کا مطالعہ اسی وقت کرتا ہے جب نیند یا استغراق کی حالت میں اس کو مطالعۂ محسوسات (اور بیرونی انتظامات) سے فرصت ملتی ہے اس کی تین قسمیں ہیں دو غلط اور ایک صحیح اور صحیح بھی کبھی مختلف عوارض کی وجہ سے مخلوط ہو جاتی ہے۔ غلطی بھی اس میں شامل ہو جاتی ہے اور کبھی تعبیر میں غلطی ہو جاتی ہے۔

(۱) بیداری میں دیکھی ہوئی صورتیں خواب میں دکھائی دیتی ہیں یا قوتِ خیالیہ از خود ان کو اختراع کر لیتی ہے واقع میں ان کی کوئی اصل نہیں ہوتی اس خواب کو حدیث نفس کہتے ہیں۔

(۲) انسان کے بدن کے اندر شیطان ان تمام مقامات میں تیر جاتا ہے جہاں جہاں خون دوڑتا ہے اس لئے بعض وقت قوتِ خیالیہ میں کوئی ہیبت آفریں ڈراونی شکل یا تفریح آگیں صورت ڈال دیتا ہے ایسے خواب کو بد خواب یا حُلم یا تخویف الشیطان کہا جاتا ہے۔

(۳) اللہ کی طرف سے خزائن غیب میں سے کسی امر کا یا اپنی پوشیدہ صفات میں سے کسی خاص صفت کا یا مدارجِ قربِ ذات میں سے کسی درجۂ خاص کا الہام اور القاء ہوتا ہے (یعنی قلبی فیضان یا روحانی تنویر) یہی الہام بندے کے لئے بشارت (غیبی) بن جاتا ہے۔ حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا خواب ایک کلام ہوتا ہے کہ بندے سے اس کا رب کلام کرتا ہے رواہ الطبرانی بسند صحیح۔ یہ خواب صحیح ہوتا ہے۔

صوفیاء کے نزدیک خواب کی تحقیق یہ ہے کہ عالم کبیر تو یہ سارا عالم ہے اور عالم صغیر انسان ہے عالم کبیر ایک شخص معین کا نام ہے جس کا نفس بھی ہے روح بھی ہے اور مختلف قوتیں بھی ہیں اس کی شکل انسانی شکل کی طرح ہے اسی لئے اس کو انسان کبیر کہا جاتا ہے۔ گویا جس طرح انسان عالم صغیر ہے اسی طرح یہ سارا جہان انسان کبیر ہے دونوں میں گہری اور کامل مشابہت ہے جس طرح انسان میں قوتِ متخیلہ (اور اس کی کار فرمائی) ہے اسی طرح عالم کبیر کی بھی قوت متخیلہ ہے جس کے اندر تمام محسوسات اور غیر محسوسات، اعراض، جواہر، مجرّدات اور معانی (حقائق غیر مادّیہ) موجود ہیں تمام ممکنات خواہ مادی ہوں یا مادّے سے خالی۔ یہاں تک کہ وہ چیزیں بھی جن کی خارج ہیں کوئی صورت نہیں مثلاً موت، زندگی، دن، سال، بیماری بلکہ اللہ کی ذات و صفات کی صورتیں بھی اللہ نے عالم کبیر کی قوتِ متخیلہ میں پیدا کر دی ہیں اور ہر چیز مصوّر ہو کر اس میں موجود ہے اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے بخار کو سیاہ فام عورت کی شکل میں دیکھا تھا اور حضرت یوسفؑ نے گائے اور گیہوں کی بالیوں کی تعبیر میں کہا تھا کہ یہ ارزانی اور قحط کے سال ہیں اب یہ ضروری نہیں کہ جو شکل عالم کبیر کی متخیلہ میں کسی چیز کی ہو وہ اسی طرح ہو جس طرح ہمارے دماغوں میں اس کی آتی ہے یعنی خواب کی شکل کا محکی عنہ (عالم کبیر کی متخیلہ والی شکل) سے مطابق اور اس کی جنس سے ہونا ضروری نہیں بلکہ دونوں میں قدرے مناسبت کافی ہے یہ مناسبت ظاہر ہو یا مخفی بہر حال اس مناسبت کی وجہ سے عالم کبیر کی متخیلہ میں اس چیز کی صورت آجاتی ہے اسی مناسبت کی وجہ سے حضرت یوسفؑ نے اپنے ماں باپ اور بھائیوں کو چاند سورج اور ستاروں کی صورت میں دیکھا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب چھ ہیں عورت کو خواب میں دیکھا جائے تو اس سے مراد بھلائی ہے۔ اور اونٹ سے مراد لڑائی ہے اور دودھ سے مراد فطرت ہے اور سبزی سے مراد جنت ہے اور کشتی سے مراد نجات ہے اور چھوارے سے مراد رزق ہے یہ روایت ابویعلی نے معجم میں ضعیف سند سے بیان کی ہے۔

عالم کبیر کی اسی متخیلہ کو صوفیاء کی اصطلاح میں عالم مثال کہتے ہیں (امام غزالیؒ اور امام الہند شاہ ولی اللہؒ نے اسی کو عالم اشباح کہا ہے۔ مترجم) جب نفسِ انسانی محسوسات کے مطالعہ سے کسی قدر فرصت پاتا ہے تو عالم کبیر متخیلہ میں آجاتی ہیں یہی سچا خواب ہوتا ہے انبیاء علیہ السلام چونکہ منجانب اللہ شیطان کی چیرہ دستیوں سے محفوظ ہیں ان کی قوتِ خیالیہ وہم کی دخل اندازیوں سے مأمون ہوتی ہے، نیند کی رسائی محض ان کی آنکھوں تک ہوتی ہے دل بیدار رہتے ہیں اس لئے خیال کی خود تراشیدہ تصویروں اور الہامی حقائق میں ان کو کامل امتیاز ہوتا ہے ان کے خوابوں میں غلطی پیدا کرنے والے مُفسد عوارض مفقود ہوتے ہیں اسی وجہ سے ان کے خواب ہمیشہ حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور قطعی وحی کا حکم رکھتے ہیں جب حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہا ہوں اور بیٹے سے فرمایا اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُکَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی تو بیٹے نے جواب دیا یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ (دیکھو حضرت اسماعیلؑ نے نبوت کے خواب کو اغواء شیطانی اور وہم کی کار فرمائی نہیں قرار دیا بلکہ امرِ خداوندی سمجھا۔ مترجم۔

سخت ریاضت کی وجہ سے اولیاء کے نفوسِ قدسیہ پاک صاف ہوتے ہیں، خلقی کدورتیں دُھل جاتی ہیں، گناہوں کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور ذنوب و معاصی کی سیاہی سے ان کا آئینہ دل صاف ہو جاتا ہے اور انوارِ نبوت کی پرتو اندازی سے ان کے باطن روشن ہوتے ہیں، اس لئے ان کے خواب بھی اکثر سچے اور مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں، ہاں اگر کبھی وہ کوئی مشتبہ یا مشکوک چیز کھالیں یا ضرورت بقائی سے زیادہ کھالیں تو کچھ باطنی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے خواب کی سچائی میں کبھی فرق

آجاتا ہے۔ کبھی عوامی صحبت کا پَرتو ان کے اندرونی احوال پر پڑجاتا ہے جس کی وجہ سے کچھ اندرونی کثافت پیدا ہوجاتی ہے کبھی کسی گناہ کا کوئی کچو کا لگ جاتا ہے، کیونکہ فطرتاً وہ انبیاء کی طرح معصوم نہیں ہوتے ان وجوہ سے کبھی ان کے خوابوں میں اتفاقی طور پر فساد پیدا ہوجاتا ہے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے مؤمن کے خواب کو نبوّت کا چھیالیسواں جز قرار دیا اور فرمایا مؤمن کا خواب نبوّت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے حضرت انسؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کی روایت سے اور امام احمد، ترمذی اور ابوداؤدؒ نے صرف حضرت عبادہؓ کی روایت سے اور صرف بخاری نے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے اور مسلم نے حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور امام احمد و ابن ماجہ نے حضرت ابورزینؓ کی روایت سے اور طبرانی نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔ صحیحین کی اول الذکر روایت کے علاوہ باقی روایات میں مؤمن کے خواب کی بجائے رویائے صالحہ کا لفظ آیا ہے۔ ابن ماجہ اور امام احمد نے صحیح سند سے حضرت ابوسعیدؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ نیک مسلمان کا خواب نبوّت کے ستّر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ ترمذی نے حضرت ابورزینؓ کی روایت سے بیان کیا کہ مؤمن کا خواب نبوّت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ طبرانی نے حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ کی روایت سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں نیک مؤمن کا خواب اللہ کی طرف سے بشارت اور نبوّت کے پچاس اجزاء میں سے ایک جزء ہوتا ہے۔ ابن النجار کی روایت میں حضرت ابن عمرؓ کی بیان کردہ حدیث میں نبوّت کے پچیس اجزاء میں سے ایک جزء فرمایا ہے۔

ایک سوال

خواب کا جزء نبوّت ہونا کیا حقیقت رکھتا ہے اور تعداد اجزاء کے اختلاف کو دور کرنے کی کیا صورت ہے۔

جواب

کل مدّتِ وحی (و نبوّت) ۲۳ سال ہوئی جس میں سے ابتدائی چھ ماہ تک سچے خواب دکھائی دیتے تھے جو خواب بھی نظر آتا تھا فجر کے تڑکے کی طرح بعینہٖ سامنے آجاتا تھا اس لئے نبوّت کے چھیالیس اجزاء میں سے خواب ایک جزء ہوگیا (کیونکہ ۲۳ سال کی ششماہیاں چھیالیس ہوتی ہیں اور ابتدائی ششماہی نبوّت بصورتِ خواب کی تھی اس طرح سچا خواب نبوّت کا چھیالیسواں حصہ ہوگیا) باقی چالیس اور پچاس والی روایتیں تخمینی ہیں تحقیقی نہیں کسر کو اس میں بالکل ساقط کردیا گیا ہے یا پورا جوڑ لیا گیا ہے۔ رہی وہ روایت جس میں ستّر کی تعداد آئی ہے تو وہاں ستّر سے عدد مخصوص مراد نہیں ہے بلکہ عددِ کثیر مراد ہے جیسے آیت اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً میں عددِ کثیر مراد ہے عرب ستّر کا لفظ بول کر عددِ کثیر مراد لے لیتے ہیں۔ اس روایت پر حدیث کا یہ مطلب ہوگا کہ خواب نبوّت کے کثیر اجزاء میں سے ایک جزء ہے۔ باقی پچیس والی روایت شاذ ہے۔

عوام کے خواب بھی اگرچہ عالم مثال سے ہی مستفاد اور حاصل ہوتے ہیں لیکن اکثر غلط اور جھوٹے ہوتے ہیں کیونکہ ان کے خیالات میں نفسانی اور فطری کثافتوں اور کدورتوں کی آمیزش ہوتی ہے اور کدورتوں کی پیدائش کا سرچشمہ گناہ ہوتے ہیں۔

اگر تصویر خوابی اور عالم مثال کی صورت میں مشابہت اور تعلق واضح نہ ہو تو کبھی تعبیر میں غلطی ہوجاتی ہے، صحتِ تعبیر یا تو اللہ کی طرف سے الہامی ہوتی ہے جیسے وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَأْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ میں مراد ہے کہ اللہ خواب کی تعبیریں تم کو الہام کرتا ہے۔ الہامی تعبیر تو اکثر انہی لوگوں کو میسّر آتی ہے جو صالح اور اہلِ الہام ہوں یا صحتِ تعبیر، عقل سلیم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے۔ ترمذی نے صحیح سند سے حضرت ابورزینؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا خواب نبوّت کے چالیس اجزاء میں سے ایک جزء ہے اور خواب جب تک بیان نہ کیا جائے، پرندے کی ٹانگ پر معلق رہتا ہے جب بیان کردیا جاتا ہے تو گر پڑتا ہے تم سوائے دانش مند یا حبیب کے کسی سے اپنا خواب نہ بیان کرو، بعض روایات میں حبیب کی جگہ مَنْ

تُحِبُّ کالفظ آیا ہے (یعنی جس سے تم محبت کرتے ہو جو تمہارا دوست ہو) ابوداؤد اور ابن ماجہ نے صحیح سند سے حدیث کے یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ خواب پرندہ کی ٹانگ پر رہتا ہے جب تک اس کی تعبیر نہ دے دی جائے جب تم اس کی تعبیر دے وہ تو وہ گر پڑتا ہے اور خواب دوست یا صاحب رائے (وعقل وفہم) کے سوا اور کسی سے نہ بیان کرو۔

میرے نزدیک اس حدیث میں طائر سے مراد ہے قضاء وقدر یعنی جو آدمی کے لئے مقدر کیا جا چکا ہے آیت مبارکہ ہے وَکُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیۡ عُنُقِهٖ یعنی ہر انسان کے گلے سے اس کا مقدر (عمل وغیرہ) ہم نے باندھ دیا ہے۔ اس صورت میں حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ مؤمن کا خواب اللہ کی طرف سے مقرر کیے ہوئے فیصلے اور تقدیر پر مبنی ہوتا ہے جب تک اس کو بیان کر کے تعبیر نہ لے لی جائے معلوم نہیں ہوتا کہ کیا مقدر کیا گیا ہے۔ جب تعبیر دینے والا الہام کے زیر اثر یا عقل، قوت، فہم اور وہبی ملکۂ استنباط کی وجہ سے تعبیر دے دیتا ہے تو خواب گر پڑتا ہے یعنی ظاہر ہو جاتا ہے اور خواب کا مقتضیٰ واضح ہو جاتا ہے اور خواب سوائے دانشمند یا حبیب اور صاحب مودّت کے اور کسی سے نہ بیان کرو۔ حبیب اور صاحب مودّت سے مراد ہے مرد صالح جو اللہ سے اور مؤمنوں سے محبت رکھتا ہے اور اس کے صالح ہونے کی وجہ سے اللہ کو اور مؤمنوں کو بھی اس سے محبت و مودّت ہوتی ہے۔ مَنۡ تُحِبُّ کے لفظ کا بھی یہی مطلب ہے کہ جس سے تم کو محبت ہو یعنی وہ مرد صالح ہو کیونکہ مؤمن کو مرد صالح سے ہی محبت ہوتی ہے حاصل یہ کہ دانش مند تو دانش و عقل کی روشنی میں صحیح تعبیر دے گا اور حبیب (یعنی اللہ اور مؤمنوں کا محبّ و محبوب) الہام کے زیر اثر درست تعبیر دے گا ان دونوں کی تعبیر میں غلطی واقع نہیں ہوگی۔

خواب کے اقسام مذکورہ احادیث سے مستفاد ہیں ابن ماجہ نے صحیح سند سے حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین (قسم کے) ہوتے ہیں۔

(۱) آدمی کو رنجیدہ کرنے کے لئے شیطان کی طرف سے تخویف۔

(۲) بیداری میں آدمی بعض باتیں کرتا یا ان کا ارادہ کرتا ہے پھر خواب میں انہی کو دیکھ لیتا ہے (یعنی حدیث نفس)۔

(۳) نبوت کے چھیالیس اجزاء میں سے ایک جزء۔

ترمذی اور ابن ماجہ نے صحیح سند سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خواب تین ہیں، اللہ کی طرف سے ڈراوا۔ اگر کوئی خوش کن خواب دیکھے اور بیان کرنے کو دل چاہے تو بیان کردے اور اگر ناپسندیدہ خواب دیکھے تو کسی سے بیان نہ کرے بلکہ اٹھ کر نماز پڑھنے لگے۔ میں (خواب میں) طوق دیکھنے کو برا سمجھتا ہوں (یہ مصائب اور دنیوی مشاغل میں پھنساؤ ہے (مترجم) اور بیڑی کو (خواب میں دیکھنا) پسند کرتا ہوں بیڑی (کی تعبیر) دین کی پابندی ہے)

مسلم نے حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے جو شخص برا، ناگوار خواب دیکھے وہ بائیں جانب تھوک دے اور شیطان سے اللہ کی پناہ کا خواستگار ہو اور کسی سے بیان نہ کرے خواب سے اس کو کچھ ضرر نہیں پہنچے گا اور اگر اچھا خواب دیکھے تو خوش ہو اور سوائے اس کی جس سے اس کو محبت ہو اور کسی سے بیان نہ کرے۔ بخاری و مسلم نے صحیحین میں اور ابوداؤد نے سنن میں اور ترمذی نے جامع میں حدیث ان الفاظ کے ساتھ نقل کی ہے اچھا خواب اللہ کی طرف سے ہے اور برا خواب شیطان کی طرف سے اگر کوئی شخص کوئی برا خواب دیکھے تو بیدار ہونے کے بعد بائیں طرف تین بار تھتکار دے اور اللہ کی پناہ مانگے خواب سے اس کو ضرر نہ ہوگا۔

بات یہ ہے کہ خواب اگر شیطان کی طرف سے تخویف اور وسوسہ ہو تو اللہ کی پناہ مانگنے سے اس کا اثر زائل ہو جائے اور اگر عالم مثال کی عکاسی اور صورت کشی ہو تو یہ صورت کشی کبھی قضاء معلق کی ہوتی ہے (کہ اگر اس کا شرعی تدارک و تلافی نہ ہو تو اس کا وقوع ہو جائے گا اور تدارک ہو جائے تو وقوع نہ ہوگا) اللہ کی پناہ گیری قضاء معلق کو بھی رد کر دیتی ہے (کیونکہ دعا اور تعوّذ سے اس کا تدارک ہو جاتا ہے) اور رسول اللہ ﷺ نے جو برے خواب بیان کرنے کی ممانعت اور اٹھ کر نماز پڑھنے کی ہدایت فرمائی

ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعبیر سے خواہ مخواہ رنج ہوگا اس لئے مناسب یہ ہے کہ نماز کی طرف رجوع کرے اور اللہ سے اس کو دفع کرنے کی دعا کرے۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت سلمان کی روایت سے اور ابن حبان وحاکم نے حضرت ثوبانؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضاء (معلق) کو سوائے دعا کے اور کوئی چیز رد نہیں کرتی بُرے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت نہ تحریمی ہے نہ تنزیہی (بلکہ رنجیدگی اور غم سے بچانے کے لئے ہے) رسول اللہ ﷺ نے خود اُحد کی جنگ سے پہلے اس کے متعلق فرمایا تھا میں نے خواب میں اپنی شمشیر ذوالفقار کی دھار ٹوٹی ہوئی دیکھی اور یہ مصیبت ہے اور میں نے گائے کو ذبح ہوتے دیکھا یہ بھی مصیبت ہے۔ آیت وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ سورۂ آل عمران کی تفسیر میں یہ حدیث ذکر کردی گئی ہے۔ حضور ﷺ نے خواب میں اپنے منبر پر بنی امیہ کو چڑھے دیکھا اور حضور کو یہ امر ناگوار گزرا، مگر آپ نے یہ خواب بیان کر دیا سورۂ قدر کی تفسیر میں ہم نے یہ حدیث ذکر کر دی ہے۔

جس روز امام حسینؓ کو شہید کیا گیا اسی روز حضرت ابن عباسؓ نے آپ کو شہید ہوتے خواب میں دیکھ لیا اور آپ نے اس خواب کو بیان بھی کر دیا۔ اس موضوع کی احادیث بکثرت آئی ہیں۔

میں کہتا ہوں بُرے خواب کو بیان کرنے کی ممانعت ممکن ہے اس وجہ سے بھی ہو کہ دشمن اس کو سن کر خوش نہ ہوں اور اچھے خواب کو سوائے دانشمند یا حبیب کے اور کسی سے بیان کرنے کی ممانعت کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ کہیں اس کو سن کر دشمن حسد نہ کرنے لگیں اسی لئے حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے سامنے خواب بیان کرنے سے منع فرمادیا تھا۔

فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا ؕ پس وہ تیرے خلاف بڑی سازش کریں گے۔ یعنی حسد کی وجہ سے وہ تجھے ہلاک کرنے کی کوئی سازش کریں گے۔

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ کوئی شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے سازش کو انسان کی نظر میں پسندیدہ بنا کر فریب پر آمادہ کر دیتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ اور تیرا رب (جس نے یہ خواب دکھایا جس سے تیری بزرگی اور برتری ظاہر ہو رہی ہے اسی طرح وہ) تجھے (نبوت حکومت اور دوسرے بڑے کاموں کے لئے) منتخب کرلے گا۔

اِجتباء (باب افتعال) جَبَيْتُ الشَّيْئَ (میں نے اس چیز کو اپنے لئے منتخب کر لیا (چھانٹ لیا) سے ماخوذ ہے جَبَيْتُ الْمَاءَ فِي الْحَوْضِ میں نے حوض میں پانی جمع کر لیا۔

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ اور تجھے خوابوں کی تعبیر سکھا دے گا۔ خواب اگر سچا ہو تو حدیثِ مَلک (الہام ملکوتی) ہوتا ہے اور جھوٹا ہو تو حدیثِ شیطان (تخویفِ شیطانی) ہوتا ہے تعبیر نتیجۂ خواب ہوتی ہے اور تعبیر کا رجوع خواب کی طرف ہوتا ہے اس لئے اس کو تاویل کہتے ہیں (اَول لوٹنا، تاویل لوٹانا) یا یہ محاورہ (یعنی تعبیر کو تاویل کہنا) تاویل کلام اللہ اور تاویل اقوال انبیاء سے ماخوذ ہے یعنی اللہ اور انبیاء کے کلام کی باریکیاں اور اسرار بیان کرنا اور ان کی تفسیر کرنا۔

وَيُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ اور تجھ پر اور آل یعقوب پر پورا پورا احسان کرے گا۔

نعمت سے مراد ہے نبوت اور آل یعقوب سے مراد ہے اسرائیلی انبیاء بعض کے نزدیک حضرت یعقوبؑ کے صلبی بیٹے مراد ہیں کیونکہ آپ کے سب بیٹے پیغمبر ہوئے تھے (یہ قول ضعیف ہے) حضرت یعقوبؑ یہ بات ستاروں کے لفظ سے سمجھ گئے۔ ستارے بھی روشن ہوتے ہیں۔ ستاروں کی روشنی سے آپ نے نبوّت کی روشنی پر استدلال کیا۔

كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ جیسے اس سے پہلے اس نے تیرے دونوں دادا اور ابراہیمؑ و اسحٰقؑ کو اپنی بھرپور نعمت عطا کی تھی (یعنی نبوّت عطا کی تھی) اَبَوَيْنِ (دو باپ) سے مراد ہے دادا اور پردادا۔

اِنَّ رَبَّكَ عَلِيمٌ یقیناً تیرا رب خوب واقف ہے کہ کون انتخاب اور فضیلت کا مستحق ہے۔
حَكِيمٌ ۞ بڑی حکمت والا ہے جیسا ہونا چاہئے ویسا ہی کرتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ فِي يُوسُفَ وَإِخْوَتِهِ آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ ۞ پوچھنے والوں کے لئے یوسف اور ان کے (بھلائی) بھائیوں کے قصے میں (توحید کی) بکثرت نشانیاں (اللہ کی قدرت و حکمت کی دلیلیں) ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کے ماموں کی بیٹی لیّا بنت لیان کے بطن سے آپ کے چھ بیٹے اور دینہ نام کی ایک بیٹی تھی سب سے بڑا روبیل تھا، دوسرا شمعون، تیسرا لادی، چوتھا یہودا، پانچواں ریان، چھٹا یشخر اور چار بیٹے زلفہ اور بلہمہ دو باندیوں کے بطن سے تھے دان، نفتالی، جاد، آشر، کذاء قال البغوی۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ لیّا کے مرنے کے بعد حضرت یعقوبؑ نے اس کی بہن راحیل سے نکاح کر لیا تھا جس کے بطن سے دو بیٹے یوسف اور بنیامین پیدا ہوئے۔ اس طرح کل بارہ بیٹے ہو گئے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ شریعتِ اسرائیل میں ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح درست تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے نکاح میں ایک ہی زمانے میں دو بہنیں (لیّا اور راحیل) تھیں۔

آيَاتٌ لِلسَّائِلِينَ کی تشریح میں بغوی نے لکھا ہے کہ یہودیوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسفؑ کا قصہ دریافت کیا تھا۔

بعض علماء نے لکھا ہے کہ کنعان سے مصر کو اولادِ یعقوب کے منتقل ہونے کی وجہ دریافت کی تھی حضور ﷺ نے یہ قصہ بیان فرما دیا، تو یہودیوں نے اس بیان کو توریت کے بیان کے موافق پایا، بعض کے نزدیک سائلین سے مراد (صرف) یہودی ہی نہیں بلکہ جو بھی سوال کرے اس کے لئے اس قصہ میں توحید و نبوّت کی نشانیاں ہیں۔ بعض کے نزدیک آیات سے مراد ہیں نصیحتیں اور عبرتیں اور سائلین سے مراد ہیں عبرت حاصل کرنے والے اس قصہ میں برادرانِ یوسف کے حسد اور حسد کے مآلِ بد اور ان کی ذلت کا بیان ہے حضرت یوسفؑ کے خواب اور اس کی تعبیر کے ظہور کی تفصیل ہے، حضرت یوسفؑ کی عفت اور صبر عن الشہوت کا اظہار ہے، غلامی پر اور قید خانہ کے مصائب پر صبر رکھنے اور مآلِ کار حکومت و اقتدار حاصل ہونے کی توضیح ہے۔ حضرت یعقوبؑ کے غم و اندوہ اور بالآخر حصولِ مسرت اور شادمانی کی تصریح ہے (یہ سب اللہ کی قدرت و حکمت کی نشانیاں اور رسول اللہ ﷺ کی نبوت کے دلائل ہیں)

إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا جب یوسفؑ کے بھائیوں نے (یعنی ایک دوسرے سے کہا کہ اس میں شک نہیں یوسفؑ اور اس کا بھائی ہمارے باپ کو ہم سے زیادہ پیارے ہیں۔ أَخُوهُ سے مراد ہے حضرت یوسفؑ کا حقیقی بھائی۔

وَنَحْنُ عُصْبَةٌ باوجود یہ کہ ہماری دس کی جماعت ہے۔ فراء نے کہا عصبہ دس اور دس سے اوپر کی جماعت کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ایک سے دس تک عصبہ ہے۔ بعض نے تین سے دس تک کی جماعت کو عصبہ کہا ہے، بعض نے دس سے چالیس تک اور مجاہد نے دس سے پندرہ تک کی جماعت کو عصبہ قرار دیا ہے۔ قاموس میں ہے عصبہ مردوں اور گھوڑوں اور پرندوں کی دس سے چالیس تک کی جماعت۔ عصابہ بھی اسی طرح ہے جزری نے نہایہ میں لکھا ہے کہ عصابۃ دس سے چالیس تک کی انسانوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ عصابۃ کی طرح عصبۃ کی جمع عُصَب ہے (گویا عصابۃ اور عصبۃ اسم جمع ہے) اس کا واحد اس لفظ سے نہیں آتا جیسے نفر اور رہط (اسم جمع ہے اور اس کا مفرد نہیں آتا) بعض نے کہا عصبۃ اس جماعت کو کہتے ہیں جو باہم متفق اور آپس میں تعاون کرنے والی ہو۔ اس صورت میں نَحْنُ عُصْبَةٌ کا مطلب یہ ہوا کہ ہماری جماعت متفق الرائے اور آپس میں تعاون کرنے والی ہے۔ (پھر بھی باپ کو محبت یوسفؑ اور اس کے بھائی سے زیادہ ہے)۔

إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۞ واقعی ہمارے باپ کھلی ہوئی غلطی میں پڑے ہیں ضلٰل سے مراد دینی گمراہی نہیں ہے ورنہ ایسا لفظ کہنے سے سب کافر ہو جاتے بلکہ مراد یہ ہے کہ باپ کا یہ عمل عقل کے خلاف ہے ان کی یہ رائے غلط

ہے ہم ان کے جانوروں کو چرانے امورِ معاش کا انتظار کرنے اور دُنیوی کاروبار کی درستی میں کام آسکتے ہیں یوسف اور اس کا بھائی اس سے قاصر ہیں اس لئے ہم سے محبت زیادہ ہونی چاہئے یوسف اور اس کے بھائی کو ہم سے زیادہ چاہنا کھلی ہوئی غلطی ہے جس میں باپ مبتلا ہے۔

اُقْتُلُوْا یُوْسُفَ یوسف کو مار ڈالو..... وہب نے کہا یہ بات شمعون نے کہی تھی، کعب نے کہا دانی نے کہی تھی، مقاتل نے کہا روبیل نے کہی تھی، بہر حال قائل ایک ہی تھا، دوسرے اس رائے سے متفق تھے اس لئے کہنے کی نسبت سب کی طرف کر دی گئی۔ ہاں جو لوگ اس قول سے متفق نہیں ہیں تو وہ قائل نہیں قرار دیئے جائیں گے مگر اکثر افراد جماعت کیونکہ اس سے متفق تھے اس لئے پوری جماعت کی طرف نسبت مجازاً کر دی گئی۔

اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا یا اس کو کہیں دور گمنام جگہ ڈال اَرْضاً کی تنوین بتا رہی ہے کہ اس سے مراد کوئی دور گمنام آبادی سے الگ زمین تھی۔

یَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِیْكُمْ تاکہ تمہارے باپ کی خالص توجہ تمہاری طرف ہو جائے۔ یوسفؑ کی طرف سے توجہ ہٹ جائے۔ محض تمہاری طرف رُخ ہو جائے۔

وَتَكُوْنُوْا مِنْۢ بَعْدِهٖ قَوْمًا صٰلِحِیْنَ ۝۹ اور اس کے بعد (یعنی یوسف کے بعد یا یوسف کے قتل سے فراغت کے بعد یا کہیں پھینک دینے کے بعد) تم صالح لوگ ہو جانا، یعنی اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لینا وہ معاف کر دے گا۔ یا یہ مطلب اپنے باپ کے ساتھ ٹھیک ٹھاک ہو کر رہنا کوئی عذر پیش کر دینا۔ باپ مان جائیں گے اور تمہارے معاملات باپ سے درست ہو جائیں گے مؤخر الذکر مطلب مقاتل نے بیان کیا ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے دنیوی امور ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ تمہارا کام بن جائے گا باپ کی توجہ تمہاری طرف کامل طور پر ہو جائے گی۔

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ ان میں سے کہنے والے نے کہا۔ قتادہ نے کہا یہ کہنے والا روبیل تھا بغوی نے کہا یہ یہودا تھا اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

لَا تَقْتُلُوْا یُوْسُفَ یوسف کو قتل نہ کرو۔ قتل گناہِ کبیرہ ہے۔

وَاَلْقُوْهُ فِیْ غَیٰبَتِ الْجُبِّ اور گہرے کنوئیں کے گڑھے میں ڈال دو۔

غَیابۃ گڑھا۔ اصلِ لغت میں غَیاب اس جگہ کو کہتے ہیں جس میں داخل ہونے والی چیز بالکل چھپ جائے، غائب ہو جائے۔ گہرے گڑھے میں بھی جو چیز داخل ہو جاتی ہے وہ نظر سے چھپ جاتی ہے اسی لئے گہرے گڑھے کو غَیابت کہا جاتا ہے بغوی نے لکھا ہے کہ جس کنوئیں کی مَن نہ ہو وہ جُب ہے۔ جبؔ قطع کرنا۔ بے مَن کا کنواں بھی گویا کٹا ہوا ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے جُب کنواں یا گہرا کنواں جس میں پانی بہت ہو۔ اور دور اندر کی طرف ہو۔ یا وہ کنواں جو کسی اچھے یا سرسبز مقام میں ہو، یا بے مَن کا کنواں جو قدرتی ہو آدمیوں کا کھودا ہوا نہ ہو۔

یَلْتَقِطْهُ بَعْضُ السَّیَّارَةِ کہ کوئی راہ گیر اس کو پالے (اور لے جائے) اِلتقاط پا لینا کسی چیز کا اس جگہ مل جانا کہ ملنے کا خیال بھی نہ ہو۔

اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِیْنَ ۝۱۰ اگر تم (میرے مشورے پر) عمل کرنے والے ہو تو کرو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم صرف اتنی بات پر اکتفا کر سکتے ہو کہ باپ کو یوسف سے علیحدہ کر دو تو اسی پر اکتفا کرو۔ (قتل نہ کرو)

محمد بن اسحٰق نے لکھا ہے کہ برادرانِ یوسف کی یہ حرکت مختلف جرائم کی حامل تھی۔ قطعِ رحم، باپ کی نافرمانی، بے گناہ بچے پر ظلم اور بے رحمی، امانت میں خیانت، وعدہ شکنی اور دروغ بانی۔ اللہ نے ان کے تمام جرائم کو معاف فرما دیا تاکہ کوئی اس کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اللہ نے ان کے تمام جرائم معاف فرما دیئے، شاید اس کا سبب یہ ہو کہ ان کو باپ سے بہت زیادہ محبت تھی اور اسی شدتِ محبت نے ان کو رشک و حسد تک پہنچا دیا۔ اور انہوں نے کوشش کی کہ باپ کی توجہ ان کی طرف خالص ہو جائے۔

بعض اہلِ علم نے کہا برادرانِ یوسف نے قتل کا ارادہ کر لیا تھا مگر اللہ نے اپنی رحمت سے ان کو جرمِ قتل سے محفوظ رکھا اگر وہ ایسا کر گزرتے تو سب کے سب ہلاک ہو جاتے۔

یہ تمام واقعات اس زمانے کے ہیں جب ان حضرات میں سے کوئی نبوّت سے سرفراز نہیں ہوا تھا ابو عمرو بن علاء کا یہی قول ہے جو لوگ ابنائِ یعقوب (یعنی برادرانِ یوسف) کے پیغمبر ہونے کے قائل ہیں ان کے نزدیک نبوّت سے پہلے انبیاء سے صدورِ معصیت ناممکن نہیں ہے۔ اکثر علماء کا قول ہے کہ برادرانِ یوسف پیغمبر نہیں تھے اور قرآن مجید میں انبیاء کے ذیل میں اسباطِ یعقوب کا ذکر آیا ہے ان سے مراد اسرائیلی انبیاء ہیں۔ جو حضرت یعقوبؑ کی نسل سے پیدا ہوئے (بیٹے مراد نہیں) غرض سازش کر کے جب انہوں نے یوسفؑ کو باپ سے جدا کر دینے کا پختہ ارادہ کر لیا تو۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا عَلٰى يُوْسُفَ کہا ابا آپ یوسف پر ہمارا اعتماد کیوں نہیں کرتے، یعنی یوسفؑ کے معاملے میں آپ کو ہم سے اندیشہ کیوں ہے۔

وَاِنَّا لَهٗ لَنٰصِحُوْنَ ﴿۱۱﴾ اور بلاشک و شبہ ہم تو اس کے خیر خواہ ہیں، حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کو یوسفؑ سے حسد کرتے پایا تو بدگمان ہو گئے اس بدگمانی کو دور کرنے کے لئے بیٹوں نے یہ بات کہی اور یوسفؑ کی خیر خواہی کا اظہار کیا۔ مقاتل نے کہا کلام کی ترتیب میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے۔ اصل ترتیب اس طرح ہے۔ اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ الخ باپ نے اس کے جواب میں کہا اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ الخ اس پر بیٹوں نے کہا مَا لَكَ لَا تَاْمَنَّا الخ۔

نُصح کا معنی ہے خیر خواہی یا بھلائی کرنا اور شفقت کرنا، یعنی ہم تو اس کے بہی خواہ ہیں اس کی حفاظت کریں گے اور حفاظت کے ساتھ واپس لے آئیں گے۔

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَيَلْعَبْ کل اس کو ہمارے ساتھ (جنگل کو) بھیج دیجئے کہ وہ تفریح کرے۔ رَتع (باب فتح) سربلندی (یعنی کثرتِ فواکہ) مراد یہ ہے کہ جنگل میں جا کر وہ خوب پھل کھائے، تفریح کرے، کھیلے، دوڑ لگائے، شکار کرے، تیر اندازی کرے۔

وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۱۲﴾ اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے اس کو کوئی تکلیف نہ ہو گی۔

قَالَ اِنِّيْ لَيَحْزُنُنِيْٓ اَنْ تَذْهَبُوْا بِهٖ یعقوبؑ نے کہا تم اس کو لے کر چلے جاؤ گے مجھے اس سے رنج ہو گا (یعنی اس کی جدائی سے میرے دل کو دکھ ہو گا اور مجھے صبر نہ آئے گا) حُزن سے اس جگہ مراد ہے وہ قلبی دکھ جو محبّت کو محبوب کے فراق سے پیدا ہوتا ہے۔

وَاَخَافُ اَنْ يَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَاَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳﴾ اور مجھے اندیشہ ہے کہ تم تو اس کی طرف سے غافل ہو جاؤ گے اور بھیڑیا اس کو کھا جائے گا..... اس جنگل میں بھیڑیئے بہت ہوتے تھے، اس لئے حضرت یعقوبؑ نے یہ اندیشہ ظاہر فرمایا اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ فرمانے کا منشاء یہ تھا کہ مجھے تمہاری کسی سازش کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ تم تو کھانے کھیلنے اور سیر و تفریح میں مشغول ہو گے، یوسفؑ کی حفاظت نہ کر سکو گے کوئی بھیڑیا آ کر اس کو کھا جائے گا۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت یعقوبؑ نے خواب میں دیکھا تھا کہ کسی بھیڑیے نے یوسفؑ پر حملہ کیا ہے۔ یہ خواب دیکھنے کے بعد آپ کو یوسفؑ کے معاملہ میں اندیشہ رہتا تھا۔ میرے نزدیک یہ روایت غلط ہے، انبیاء کے خواب کا متحقق ہونا لازم ہے اگر حضرت یعقوبؑ نے ایسا خواب دیکھا ہوتا تو ایسا واقع ہو جانا ضروری تھا کوئی احتیاط اس کو نہیں روک سکتی تھی (اس فقیر کی نظر میں حضرت مفسّر کا دلیل مذکورہ سے خواب دیکھنے کی روایت کو غلط قرار دینا صحیح نہیں۔ ممکن ہے خواب دیکھا ہو لیکن تعبیر میں غلطی کی ہو۔ بھیڑیئے کے حملے کی تعبیر یہ ہے کہ کوئی دشمن یوسفؑ پر حملہ کرے گا چنانچہ ایسا ہو گیا بھائیوں نے بھیڑیئے کا کام کیا۔ مترجم) الذئب میں الف لام جنسی ہے کوئی بھیڑیا۔

قَالُوْا لَئِنْ اَكَلَهُ الذِّئْبُ وَنَحْنُ عُصْبَةٌ اِنَّآ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۱۴﴾

بیٹوں نے کہا (ہماری دس کی جماعت ہے سب یوسفؑ سے غافل ہو جائیں یہ ممکن نہیں) ہماری دس کی جماعت ہوتے ہوئے کوئی بھیڑیا یوسفؑ کو کھا جائے تو ہم بالکل ہی گئے گزرے ہوئے۔

ان کی مراد یہ تھی کہ اگر ہم دس ہونے کے باوجود اپنے آدمی کی حفاظت نہ کر سکیں تو پھر ہمارے جانوروں کی جس کو ہم جنگل میں چراتے ہیں کیسے حفاظت ہو سکتی ہے۔ ہم بدنصیب ہوں گے اگر حفاظت نہ کر سکیں یا لَخٰسِرُوْنَ کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اگر ہماری جماعت بھی نگرانی نہ کر سکی تو ہم مستحق ہیں کہ نامراد رہنے کی ہم کو بددعا دی جائے۔

حضرت یوسفؑ کو بھائیوں کے ساتھ نہ چھوڑنے کی دو وجہیں حضرت یعقوبؑ نے بیان فرمائی تھیں جدائی کا غم اور اندیشۂ ہلاکت۔ بیٹوں نے دوسری وجہ کو دور کرنے کے لئے تو حفاظت کی یقین دہانی کر دی اور غم دور کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا بلکہ یوسفؑ سے یعقوبؑ کی اتنی محبت کہ ایک دن کی جدائی بھی گوارا نہ ہو۔ بیٹوں کے حسد کا سبب تھی اس لئے اول بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ پھر جب وہ یوسفؑ کو لے گئے اور کنویں کے گہرے گڑھے میں ڈالنے کا انہوں نے پختہ ارادہ کر لیا۔ (تو پھر جو چاہا کیا، کنویں میں ڈال دیا) شرط کا جواب محذوف ہے، جس کی تشریح مترجم نے بین القوسین کر دی ہے۔ بغوی نے لکھا ہے اس شرط کی جزا اگلی آیت وَاَوْحَيْنَآ الخ ہے وَاَوْحَيْنَآ میں واؤ زائد ہے، جیسے آیت فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ وَنَادَيْنٰهُ میں وَنَادَيْنٰهُ جزا ہے اور اس میں واؤ زائد ہے۔

بغوی نے وہب وغیرہ کے بیان سے اخذ کر کے لکھا ہے کہ باپ کے سامنے بھائیوں نے یوسفؑ کو نہایت عزت کے ساتھ اپنے ہاتھوں پر لیا اپنے اوپر سوار کر لیا لیکن آبادی سے باہر نکل کر ان کو پھینک دیا اور مار پیٹ کرنے لگے۔ ایک مارتا تھا تو یوسفؑ دوسرے سے فریاد کرتے تھے مگر وہ بھی مارتا تھا تو تیسرے کی پناہ ڈھونڈتے تھے، پر کوئی پناہ نہ دیتا تھا۔ سبھوں نے مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔ حضرت یوسفؑ چیخ رہے تھے اور باپ کو پکار رہے تھے اور فرما رہے تھے ابا دیکھئے ان باندی بچوں نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا۔ آخر یہودا نے دیکھا کہ یہ لوگ یوسفؑ کو قتل ہی کر ڈالیں گے تو بولا قتل نہ کرنے کا تم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے اس لئے قتل نہیں کر سکتے غرض اس طرح ایک کنویں پر غیر معروف راستے سے لے گئے کنویں کا منہ تنگ تھا مگر اندر بہت وسیع تھا حضرت یعقوبؑ کے مکان سے بر قولِ مقاتل یہ کنواں تین فرسخ دور تھا۔ کعب نے کہا مدین اور مصر کے درمیان تھا۔ قتادہ نے کہا بیت المقدس کا کنواں تھا۔ حضرت یوسفؑ کی عمر اس وقت بارہ یا اٹھارہ برس تھی جب کنویں میں آپ کو لٹکانے لگے تو آپ نے کنویں کا کنارہ پکڑ لیا مگر انہوں نے آپ کے ہاتھ باندھ دیئے اور کرتہ اتار لیا حضرت یوسفؑ نے کہا بھائیو! کرتہ تو دے دو میں کنویں کے اندر اس کو پہن کر سردی وغیرہ سے بچاؤ کر لوں گا۔ بھائیوں نے کہا سورج اور چاند ستاروں کو پکار وہی تیرا دل بہلائیں گے، آپ نے فرمایا میں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ آخر آپ کو کنویں میں ڈال ہی دیا۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ ایک ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنویں میں لٹکا دیا جب ڈول آدھے کنویں تک پہنچا تو رسی چھوڑ دی تاکہ یوسف گر کر مر جائیں لیکن کنویں میں پانی تھا، آپ پانی میں گر پڑے، وہاں ایک پتھر نظر آیا آپ اس پر کھڑے ہو گئے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ یوسفؑ کو روتا ہوا کنویں میں ڈال دیا گیا پھر اوپر سے آواز دی، یوسفؑ سمجھے کہ بھائیوں کے دل میں کچھ رحم آ گیا۔ اس لئے آپ نے آواز دی، بھائیوں نے اوپر سے پتھر برسانا چاہا تاکہ پتھر مار کر ہلاک کر دیں۔ مگر یہودا نے روک دیا۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے سدی کی روایت سے ایک طویل بیان کے ذیل میں لکھا ہے کہ خاندانِ یعقوبؑ کی سکونت شام میں تھی، حضرت یعقوبؑ کی نظر میں ہر وقت یوسفؑ اور بنیامین سمائے ہوئے تھے اس پر دوسرے بھائیوں کو جلن پیدا ہوئی وہ یوسفؑ کو آبادی کے باہر صحرا میں لے گئے۔ اس روایت میں ہے کہ یوسفؑ کو ڈول میں بٹھا کر ڈول کو کنویں میں لٹکا دیا، نصف

کنویں تک ڈول پہنچا تو رسی ہاتھ سے چھوڑ دی، تاکہ یوسفؑ گر کر مر جائیں، کنویں میں پانی تھا یوسفؑ پانی میں گر گئے پھر ایک پتھر پر کھڑے ہو گئے اور روتے رہے، فوراً جبرئیلؑ وحی لے کر آ پہنچے جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے۔

وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ اور ہم نے یوسفؑ کے پاس وحی بھیجی (تاکہ اس کو اطمینان ہو جائے) بظاہر یہ وحیِ نبوّت نہ تھی۔ بلکہ اس کی صورت اس وحی کی سی تھی جیسی حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے پاس بھیجی گئی تھی (یعنی الہام) وحیِ رسالت و تبلیغ تو بعد کو آئی بھی جس کا بیان آیت، وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا میں کیا گیا ہے، لیکن ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے مجاہد کا قول بیان کیا کہ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ میں وحیِ نبوّت مراد ہے، جب آپ کنویں میں تھے تو وحیِ نبوّت آتی تھی۔

لَتُنَبِّئَنَّهُمْ بِاَمْرِهِمْ هٰذَا کہ تو ان کو ان کی اس حرکت پر (آئندہ) آگاہ کرے گا (اور وہ پشیمان اور ذلیل ہوں گے۔ مترجم)

وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ اور وہ جانتے بھی نہ تھے کہ ہم نے یوسفؑ کے پاس وحی بھیجی ہے اور اس کو اطلاع دے دی ہے۔ اور اس کے دل کو اطمینان دے دیا ہے۔

بعض علماء کے نزدیک (یہ جملہ وحی کا جزء ہے) مطلب یہ ہے کہ جس روز تم ان کو ان کی اس حرکت پر آگاہ کرو گے تو اس وقت ان کے خیال میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ تو ہی یوسفؑ ہے۔ یوسفؑ کے مرتبے کی رفعت، زمانہ کا طول اور جسمانی تغیرات ان کو پہچاننے بھی نہ دیں گے، چنانچہ آیت میں آیا ہے حِيْنَ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ جب برادرانِ یوسفؑ، یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا مگر وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ یہودا یوسفؑ کو کھانا پہنچا دیتا تھا۔ آپ تین روز وہاں رہے اور یہ پیام (جو آیت میں مذکور ہے) وحی کے ذریعے سے ان کے پاس پہنچا۔ اللہ نے ان کا دل بہلانے اور کنویں سے نکلنے کی بشارت دینے کے لئے جبرئیلؑ کو ان کے پاس بھیج دیا۔

امام احمد نے الزہد میں اور ابن عبدالحکم نے فتوح مصر میں اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے حسن بصریؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ اس وقت حضرت یوسفؑ کی عمر سترہ برس کی تھی بعض نے کہا جوان ہونے کے قریب تھے آپ کے پاس جوانی سے پہلے وحی آ گئی تھی جیسے حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے پاس آئی تھی۔

قصۂ یوسفؑ کی بعض روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب آگ میں ڈالا گیا تھا تو آپ کے کپڑے اُتار لئے گئے تھے۔ حضرت جبرئیلؑ نے جنت سے لا کر ایک ریشمی کُرتہ آپ کو پہنا دیا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ سے وہ کُرتہ حضرت اسحٰقؑ کو پہنچا تھا اور حضرت اسحٰقؑ سے حضرت یعقوبؑ کو حضرت یعقوبؑ نے اس کا تعویذ بنا کر حضرت یوسفؑ کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ حضرت جبرئیلؑ نے وہی کُرتہ کھول کر حضرت یوسفؑ کو پہنا دیا۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس کے بعد برادرانِ یوسفؑ نے ایک بکری کا بچہ ذبح کر کے یوسف کے کُرتہ کو اس کے خون سے رنگین کر لیا۔

وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ اور شام کو اندھیرا پڑے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے۔ اہلِ معانی نے لکھا ہے کہ اندھیرے میں عشاء کے وقت آنے کی مصلحت یہ تھی کہ جھوٹ بولنے کا جرأت آفریں موقع ہاتھ آ جائے۔ چنانچہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے ان کی چیخ پکار سنی تو باہر نکل آئے اور فرمایا لڑکو! کیا ہو گیا۔ کیا بکریوں پر کوئی اُفتاد پڑ گئی۔ کہنے لگے نہیں! حضرت یعقوبؑ نے پوچھا یوسفؑ کہاں ہے۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾

الثلاثة

بولے ابا! ہم آپس میں دوڑ لگانے گئے تھے اور یوسفؑ کو اپنے سامان کے پاس چھوڑ گئے تھے (ہمارے پیچھے) بھیڑیئے نے اس کو کھالیا، آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا، خواہ ہم سچ کہہ رہے ہوں (کیونکہ آپ کو یوسفؑ سے انتہائی محبت ہے اور ہم لوگوں سے بدگمانی ہے، یوسفؑ کی محبت ہی آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں ہونے دے گی۔ مزید یہ کہ آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اس لئے ہم اس بیان میں سچے بھی ہوں تب بھی آپ یقین کرنے والے نہیں)۔

بعض نے کہا وَمَا اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اس لئے آپ یقین کرنے والے نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ ہمارے پاس اپنی سچائی کی کوئی دلیل نہیں اس لئے آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ اگرچہ ہم عند اللہ سچے ہیں۔

نَسْتَبِقُ (جمع متکلم باب افتعال) باب تفاعل کے معنی میں ہے یعنی باہم دوڑ میں ہم مقابلہ کرنے گئے تھے۔ بعض نے کہا تیر اندازی میں مقابلہ کرنا مراد ہے۔ باب افتعال اور تفاعل مشارکت کے لئے آتا ہے جیسے انتصال و تناصل تیر اندازی میں مقابلہ کرنا۔ مَتَاع سے مراد ہیں کپڑے۔

وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ؕ اور یوسفؑ کے کرتے پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لائے۔

کَذِب کا معنی ہے جھوٹ موٹ کا یا جھوٹا، کذب مصدر بھی ہو سکتا، جھوٹ، خون کو جھوٹ مبالغۃً قرار دیا۔

ابن جریر، ابن المنذر اور ابوالشیخ نے حسن بصریؒ کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت یعقوبؑ، یوسفؑ کی خبر سن کر چیخ پڑے اور یوسفؑ کا قمیص جب پیش کیا گیا تو الٹ پلٹ کر اس کو دیکھنے لگے مگر قمیص میں شگاف کہیں نظر نہ آیا، یہ دیکھ کر فرمایا لڑکو! واللہ بھیڑیا بھی کیسا ہوشیار تھا، میرے بیٹے کو تو کھا گیا اور کرتے کو سالم چھوڑ دیا۔ حضرت یعقوبؑ جب بیٹوں کا جھوٹ سمجھ گئے تھے تو

قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ کہا (بھیڑیے نے یوسفؑ کو نہیں کھایا) بلکہ تم نے اپنے لئے اپنے دل میں ایک بات بنالی ہے۔ سَوَّلَتْ لَكُمْ یعنی تمہارے نفسوں نے ایک بہت بڑے امر کو تمہاری نظر میں آسان اور حقیر بنا کر دکھایا ہے (مطلب یہ کہ یوسفؑ کی گمشدگی یا قتل کو تم نے اتنا آسان قرار دے لیا کہ اس کے لئے اتنی غلط عذر تراشی کرلی)

سَوَّلَتْ: السّول سے ماخوذ ہے سول کا معنی ہے لٹک جانا ڈھیلا ہو جانا۔ قاموس میں ہے اسول وہ شخص جس کے زیریں جسم میں ڈھیلا پن ہو اور سولۃ پیٹ وغیرہ کے لٹک آنے کو کہتے ہیں۔ بعض کا قول ہے اس جگہ سَوَّلَتْ کا معنی ہے سجا کر دکھایا (یعنی برے کام کو اچھا کام بنا کر پیش کیا) کذافی القاموس۔ سوّل له الشیطان شیطان نے اس کو بہکا دیا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سوّل کا معنی ہے حاجت اور غرض جس کو حاصل کرنے کی نفس کو حرص ہوتی ہے اور تسویل کا معنی برے کو اچھے کی شکل میں پیش کرنا۔

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ سو اب میں صبر ہی کروں گا، جس میں کسی شکایت کی آمیزش نہ ہو گی، بغوی نے لکھا ہے صبرِ جمیل (اچھا صبر) یعنی ایسا صبر جس میں مخلوق سے کوئی شکوہ نہ ہو گا اور جزع فزع نہ ہو گی۔ ابن جریر نے حبان بن حمیہ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے کہ صبرِ جمیل وہ ہے جس میں کوئی شکوہ نہ ہو۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ۝۱۸

یعنی یوسفؑ کے مرنے کی جو خبر تم بیان کر رہے ہو میں اس مصیبت پر صبر کرنے اور اس دکھ کو اٹھانے میں اللہ ہی سے مدد کا خواستگار ہوں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قصۂ یوسفؑ کے ذیل میں یہ بات بھی بیان کی گئی ہے کہ برادرانِ یوسفؑ ایک بھیڑیے کو پکڑ لائے اور کہنے لگے اس نے یوسفؑ کو کھایا ہے۔ حضرت یعقوبؑ نے اس سے پوچھا کہ تو نے میرے جگر پارے کو کھایا ہے۔ بھیڑیے کو اللہ نے گویائی عطا فرما دی، اس نے جواب دیا خدا کی قسم میں نے تو آپ کے بیٹے کو دیکھا بھی نہیں! حضرت یعقوبؑ نے پوچھا پھر کنعان کی اس سرزمین میں تو کیسے آیا۔ بھیڑیے نے کہا بھائی بندوں سے ملنے آیا تھا۔ کہ یہ پکڑ لائے۔ الحاصل یوسفؑ

تین روز کنویں میں رہے کہ

وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ　ایک قافلہ ادھر آ گزرا یہ لوگ مدین سے مصر کو جا رہے تھے غلط راستے پر پڑ گئے تھے، تو کنویں کے قریب اُتر پڑے، کنواں چرواہوں اور راہ گیروں کے لئے آبادی سے دور تھا اس کا پانی شور تھا جب حضرت یوسفؑ کو اس میں ڈالا گیا تو اس کا پانی میٹھا ہو گیا۔

فَأَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ　(جب کنویں کے پاس اترے) تو ایک ہراول کو (کنویں سے پانی لینے کے لئے) بھیجا۔ یہ شخص مدین کا باشندہ تھا جس کا نام مالک بن دعر تھا۔ وَارِد اس شخص کو کہتے ہیں جو قافلہ کے آگے پانی کی تلاش میں بطورِ ہراول جاتا ہے۔

فَأَدْلٰى دَلْوَهٗ　اس نے جا کر اپنا ڈول کنویں میں لٹکایا۔

ادلی الدلو کنویں میں ڈول ڈالنا۔ اَدلیتُ الدَّلو میں نے کنویں میں ڈول ڈالا۔ دلوتُ الدَّلو میں نے کنویں سے ڈول نکالا۔ حضرت یوسفؑ رسی پکڑ کر لٹک گئے اور اوپر آ گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ ایک حسین ترین لڑکا بر آمد ہوا، تعجب میں پڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یوسفؑ کو سارے انسانوں کے حسن کا آدھا حصہ دیا گیا تھا۔ رواہ ابن ابی شیبۃ واحمد وابو یعلی والحاکم عن انسؓ۔

بغوی نے لکھا ہے یوسفؑ میں یہ حسن ان کی دادی حضرت سارہ کا منتقل ہو کر آیا تھا، حضرت سارہ کو کل حسن کا چھٹا حصہ اللہ کی طرف سے ملا تھا۔ ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ یوسفؑ اور ان کی والدہ کے حصے میں دو تہائی حسن آ گیا تھا۔ مالک بن دعر نے جب یوسفؑ کو دیکھا تو

قَالَ يٰبُشْرٰى　بولا اے لوگو تم کو بشارت ہو یا فرطِ مسرت میں اس نے بشارت کو پکارا۔ بعض علماء نے کہا بُشریٰ اس کے ساتھی کا نام تھا مدد کرنے کے لئے مالک نے بُشریٰ کو پکارا تھا۔

هٰذَا غُلٰمٌ　یہ تو لڑکا ہے۔ مجاہد نے اپنے باپ کا قول بیان کیا کہ جب یوسفؑ کنویں سے نکال لئے گئے تو کنواں رونے لگا۔

وَأَسَرُّوْهُ　اور انہوں نے یوسفؑ کو چھپائے رکھا۔ یعنی مالک اور اس کے ساتھیوں نے دوسرے قافلے والوں سے یوسفؑ کو چھپا لیا۔ تاکہ وہ شرکت کے دعویدار نہ بن جائیں۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یوسفؑ کے معاملے کو ان لوگوں نے چھپا لیا اور دوسرے لوگوں سے کہا کنویں پر رہنے والوں نے ہم کو یہ لڑکا دیا ہے تاکہ ان کی طرف سے مصر میں لے جا کر اس کو فروخت کر دیں۔ بعض علماء نے کہا کہ برادرانِ یوسف نے یوسف کی بات قافلہ والوں سے پوشیدہ رکھی (اور یوسف کو بھائی نہیں بتایا) بات یہ ہوئی کہ یہودا روز یوسف کا کھانا لاتا تھا ایک روز جو کھانا لایا اور یوسف کو کنویں میں نہ پایا تو بھائیوں کو جا کر اطلاع دی بھائی ڈھونڈنے نکلے تلاش کرتے کرتے مالک کے پاس یوسف دستیاب ہوئے، انہوں نے قافلے والوں سے اصل بات چھپالی اور یوسف کو اپنا بھائی ظاہر کرنے کے بجائے کہنے لگے یہ ہمارا بھاگا ہوا غلام ہے کہا جاتا ہے بھائیوں نے حضرت یوسفؑ کو بھی ڈرا دھمکا دیا تھا۔ بھائیوں کے ڈر سے یوسف بھی کچھ نہ بولے خاموش رہے۔

بِضَاعَةً　یعنی یوسف کو بطورِ مال تجارت چھپائے رکھا۔ بضاعت بضع سے مشتق ہے۔ بضع تجارتی مال کو کہتے ہیں۔

وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ⑲　اور وہ جو کچھ کر رہے تھے اللہ اس سے بخوبی واقف تھا۔ اس سے ان کی کوئی پوشیدہ بات بھی مخفی نہیں تھی یا برادرانِ یوسف اپنے باپ اور بھائی سے جو سلوک کر رہے تھے اللہ اس سے واقف تھا۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ　انہوں نے یعنی برادرانِ یوسفؑ نے یوسفؑ کو حقیر قیمت یعنی گنتی کے چند درہموں میں بیچ ڈالا۔ بعض اہلِ علم نے شروہ کا ترجمہ اِشتروہ کیا ہے، یعنی قافلے والوں نے یوسفؑ کو

بہت کم قیمت یعنی چند درہموں میں خرید لیا۔ ضحاک، مقاتل اور سدی نے بَخْسٍ کا ترجمہ کیا ہے حرام کیونکہ آزاد انسان کی قیمت حرام ہے بَخَسٍ کا لغوی معنی ہے کم کرنا، گھٹانا۔ مالِ حرام کی برکت گھٹ جاتی ہے اس لئے حرام کو بَخْسٍ کہا۔ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابن مسعودؓ نے بَخْسٍ کا ترجمہ کیا کھوٹے عکرمہ اور شعبی نے ترجمہ کیا قلیل تھوڑے۔ کیونکہ اگر اوقیہ کے برابر درہم ہوتے تو وزن سے بکتے اور خریدے جاتے تھے اور اوقیہ سے کم کا تبادلہ گنتی سے ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن مسعودؓ اور قتادہؒ نے فرمایا بیس درہم کو فروخت کر دیا۔ ہر بھائی کے حصے میں دو دو درہم آئے۔ عکرمہ نے کہا چالیس درہم کو بیچا۔ اور مجاہد نے بائیس درہم کی صراحت کی۔

۲ ع ۱۲ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ ﴿۲۰﴾ اور وہ (برادرانِ یوسفؑ یا خریدار) یوسفؑ کی طرف سے بے رغبت تھے۔ ان کو معلوم ہی نہ تھا کہ یوسفؑ کا مرتبہ اللہ کے نزدیک کتنا بڑا ہے۔ بعض اہلِ تفسیر نے فِیْهِ کی ضمیر کو ثمن کی طرف لوٹایا ہے، یعنی یوسفؑ کی قیمت کی ان کو رغبت نہ تھی۔ ان کا مقصد حصولِ قیمت نہ تھا بلکہ یوسفؑ کو دور پھینک دینا تھا۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ کَانُوا کی ضمیر اگر قافلے والوں کی طرف راجع کی جائے تو دو صورتیں ہیں قافلہ والوں نے بے رغبتی سے خریدا تھا یوسفؑ کی طرف راغب نہ تھے کیونکہ ان کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ بھاگا ہوا غلام ہے اور اگر قافلہ والوں کو بائع قرار دیا جائے (کیونکہ مصر میں لے جا کر انہوں نے حضرت کو فروخت کر دیا تھا) تو یہ مطلب ہو گا کہ چونکہ انہوں نے مفت میں یوسفؑ کو پا لیا تھا ان کو آپ کی قدر نہ تھی اور اندیشہ تھا کہ کوئی دعویدار نہ پیدا ہو جائے اس لئے جلدی فروخت کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد مالک اور اس کے ساتھی حضرت یوسفؑ کو لے کر روانہ ہو گئے۔ بھائیوں نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا پیچھے ہو لئے اور خریداروں سے کہنے لگے مضبوطی کے ساتھ اس کی حفاظت کرنا کہیں بھاگ نہ جائے۔ مالک آپ کو لے کر مصر پہنچا اور فروخت کے لئے پیش کیا قِطفیر نے آپ کو خرید لیا، یہ قول حضرت ابن عباسؓ کا ہے بعض لوگوں نے اس کا نام اِطفیر بتایا ہے یہ بادشاہ کا نائب اور شاہی خزانہ کا سب سے بڑا آفیسر تھا اس کا خطاب عزیز تھا اس زمانہ میں مصر اور اطرافِ مصر کا بادشاہ ریان بن ولید بن ثروان عملیقی تھا بعض روایات میں آیا ہے یہ بادشاہ اپنی موت سے پہلے حضرت یوسفؑ کے ہاتھ پر مسلمان ہو گیا تھا اور مذہبِ یوسفی کا پابند بن گیا تھا اور آپ کی زندگی میں اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب یوسفؑ مصر میں داخل ہوئے تو قطفیر نے مالک بن دعر سے مل کر حضرت یوسفؑ کو بیس دینار یا ایک جوڑے جوتے اور دو سفید کپڑوں کے عوض خرید لیا۔ وہب بن منبہ کا بیان ہے کہ قافلہ یوسفؑ کو لے کر مصر کے بازار میں پہنچا اور فروخت کے لئے آپ کو پیش کیا تو لوگوں نے بڑھ چڑھ کر قیمت لگائی یہاں تک کہ آپ کے وزن کے برابر سونا اور اتنی ہی چاندی اور اتنے وزن کا ریشمی کپڑا اور اتنا ہی مشک آپ کی قیمت قرار پائی آپ کی عمر ۱۳ سال تھی اور وزن چار سو رطل تھا آخر اس قیمت پر قطفیر نے آپ کو مالک سے خرید لیا۔

وَقَالَ الَّذِي اشْتَرَاهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَأَتِهِ اور مصر کے جس شخص نے یوسفؑ کو خریدا تھا اس نے اپنی بیوی راعیل یا زلیخا سے کہا۔

أَكْرِمِي مَثْوَاهُ اس کو خاطر سے رکھنا۔ مَثْوٰی ٹھہرنے کی جگہ اس جگہ مراد مرتبہ ہے۔ قتادہ کا یہی قول ہے۔ ابن جریج نے بھی اس کی تائید کی ہے بعض نے کہا مَثْوٰی سے مراد غذا، لباس اور مکان۔

عَسَىٰ أَنْ يَنْفَعَنَا امید ہے یہ ہم کو فائدہ پہنچائے یعنی اگر ہم اس کو فروخت کریں تو نفع مل جائے اگر نہ فروخت کریں تو ہمارے مال جائیداد اور دوسرے کاموں کا انتظام کرے۔

أَوْ نَتَّخِذَهُ وَلَدًا ۚ یا (بیٹا بنانا ہو تو) ہم اس کو بیٹا بنالیں گے (کیونکہ اس کے اندر ہم کو ہوشیاری کی علامات دکھائی دے رہی ہیں) عزیزِ مصر لاولد اور ناقابلِ تولید تھا۔

وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ اور (جس طرح ہم نے یوسفؑ کو قتل سے بچایا کنویں سے نکلوایا اور عزیز کو اس پر مہربان بنایا) اسی طرح ہم نے اس کو ملکِ مصر میں جماؤ عطا کیا (اور مصر کی ساری پیداوار کا اس کو حاکمِ اعلیٰ بنا دیا۔

وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ؕ (تاکہ وہ وہاں انصاف کے ساتھ حکومت کرے) اور تاکہ ہم اس کو خوابوں کی تعبیر سکھادیں، یعنی یوسفؑ کو بچانے اور حکومت عطا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرے اور عدل کے ساتھ انتظامِ خلق کرے اور اللہ کی کتابوں کی صحیح تعلیم دے اور اللہ کے احکام جاری کرے (اس مطلب پر تاویلِ احادیث سے مراد ہوگی، کتبِ الٰہیہ کی تعلیم اور اللہ کے احکام کا اجراء) یا اس سے خوابوں کی تعبیر مراد ہے اس صورت میں یہ مطلب ہوگا کہ یوسفؑ کو ان خوابوں کی تعبیر سکھادیں جو آئندہ ہونے والے واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہیں تاکہ ان کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے یوسف ان کے لئے تیار ہوجائیں اور پہلے سے انتظام کرلیں (جیسے قحط کے سات سال بادشاہ نے خواب میں سات دبلی گایوں کی شکل میں دیکھے تھے اور حضرت یوسفؑ کو اللہ نے ان کی تعبیر بتادی تھی پھر آپ نے کال پڑنے سے برسوں پہلے غذا کا اسٹاک کرنا شروع کردیا تھا اور جب کال پڑا تو اندوختہ غلہ ملک میں تقسیم کیا اور اس طرح قحط پر قابو پایا)

بعض علماء کے نزدیک وَلِنُعَلِّمَهٗ کا عطف فعل محذوف پر نہیں ہے بلکہ واؤ زائد ہے۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ اور اللہ اپنے کام پر غالب ہے۔ اَمْرِهٖ کی ضمیر لفظِ اللہ کی طرف راجع ہے۔ یعنی اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اس کے حکم کو کوئی رد نہیں کرسکتا، یا یوسفؑ کی طرف ضمیر لوٹ رہی ہے یعنی یوسفؑ کے بھائی یوسف کے متعلق کچھ اور چاہتے تھے اور اللہ کچھ اور چاہتا تھا اور ہُوا وہی جو اللہ چاہتا تھا۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۲۱ لیکن اکثر لوگ اللہ کی حکمت کی باریکیوں کو نہیں جانتے اور اس کی مخفی مہربانیوں سے ناواقف ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ جو کچھ چاہتا ہے اور جو کچھ کرتا ہے اس سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔

وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗۤ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ؕ اور جب یوسف اپنی بھرپور جوانی اور قوت کو پہنچ گئے تو ہم نے ان کو حکم اور علم عطا کیا۔

اَشُد انتہائی جوانی اور قوت۔ مجاہد نے کہا ۳۳ سال کی عمر، سدی نے کہا ۳۰ سال کی عمر یہی سنِ وقوف ہے۔ ضحاک نے کہا ۲۰ سال، کلبی نے کہا اَشُد کی عمر ۱۸ سے ۲۰ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ امام مالک سے اَشُد کا ترجمہ پوچھا گیا تو فرمایا سمجھ اور دانش۔

حکم سے مراد ہے نبوت بعض نے کہا درستیٔ قول۔ علم سے مراد ہے دینی سمجھ یا خواب کی تعبیر کا علم۔ بعض اہل علم نے کہا حکیم اور عالم کے درمیان فرق یہ ہے کہ عالم تو جاننے والے کو کہتے ہیں اور حکیم وہ ہوتا ہے جو علم کے تقاضے کے مطابق عمل بھی کرے۔

وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ۝۲۲ اور اسی طرح نیکو کاروں کو ہم بدلہ دیتے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول میں مُحسنین، کا ترجمہ مؤمنین آیا ہے، دوسرے قول میں آیا ہے کہ مُحسنین سے مراد ہیں ہدایت یافتہ لوگ، ضحاک نے کہا مصائب پر صبر کرنے والے، بیضاوی نے لکھا ہے آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اللہ نے یوسفؑ کو یہ جزا ان کے حسن عمل اور عنفوانِ جوانی میں متقی رہنے کی دی تھی۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِىْ هُوَ فِىْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ اور یوسفؑ جس عورت کے گھر میں تھے اس عورت نے اپنا مطلب ان سے حاصل کرنے کے لئے ان کو پھسلایا اور دروازے بند کر دیئے۔

رَاوَدَتْ کا مصدر مُرَاوَدَت ہے اور اس کا مجرد رَادَ یَرُوْدُ آتا ہے رَوْد مادہ ہے رَوْد کا معنی ہے کسی چیز کی طلب میں آنا جانا اسی سے رائد بنا ہے۔ (قافلہ یا لشکر سے پہلے پانی اور گھاس کی تلاش میں جانے والا راہبر اول) بعض نے کہا آہستگی کے ساتھ کسی چیز کے طلب کرنے کو رَوْد کہتے ہیں، رُوَید (کچھ ڈھیل دو) اسی سے بنا ہے یہاں مراد یہ ہے کہ زلیخا نے تدبیر اور بہانے سے یوسف سے اپنے مطلب کی درخواست کی۔ زلیخا عزیز کی بیوی تھی۔ دروازے سات تھے تغلیق: خوب مضبوط یا بکثرت دروازے بند کر دیئے باب تفعیل تکثیر یا مبالغہ کے لئے آیا ہے۔

وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ؕ اور کہا آجاؤ تمہیں سے کہتی ہوں۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا مجھے رسول اللہ ﷺ نے ھَیْتَ لَکَ ہی پڑھایا تھا۔ کسائی نے کہا یہ اہل حوران کا محاورہ تھا جو حجاز میں مستعمل ہو گیا تھا۔ کسائی کا یہ قول ابو عبیدہ نے نقل کیا ہے اس کا معنی ہے۔ "آ"۔ عکرمہؒ نے بھی کہا کہ حورانی محاورہ میں اس کا معنی "آ" ہے۔ مجاہد نے کہا یہ عربی لفظ ہے کسی چیز کی ترغیب دینے کے لئے بولا جاتا ہے گویا یہ اسم بمعنی فعل ہے اور اَیْنَ کی طرح مبنی بر فتح ہے اس کا نہ تثنیہ آتا ہے نہ جمع۔ کذا قال ابو عبیدہ۔

قاموس میں ہے ھَیْتَ، ھَیْتِ، ھَیْتُ تینوں حرکات کے ساتھ آتا ہے اس کا معنی ہے "آ"، کبھی ہا کو مکسور بھی بولا جاتا ہے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ یوسفؑ نے (اس وقت زلیخا سے) کہا میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں (اس بُری حرکت سے)۔

اِنَّهٗ رَبِّیْٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ط بلا شبہ وہ میرا آقا ہے اس نے مجھے اچھی طرح رکھا۔ اِنَّهٗ میں ضمیر شان ہے۔ یعنی بات یہ ہے کہ میرے آقا قطفیر نے میری خاطر مدارات اور پرداخت اچھی طرح کی اس نے تجھ سے بھی کہا تھا کہ اس کی خاطر اچھی طرح کرنا ایسے محسن کا بدلہ یہ تو نہیں کہ میں اس کی خیانت کروں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اِنَّهٗ کی ضمیر قطفیر کی طرف راجع ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کی طرف ضمیر راجع ہے، یعنی اللہ بلا شبہ میرا خالق ہے اس نے میرا ٹھکانا اچھا بنا دیا قطفیر کے دل کو مجھ پر مہربان کر دیا۔ میں اللہ کی نافرمانی نہیں کر سکتا۔

اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ حقیقت یہ ہے کہ ظالم فلاح یاب نہیں ہوتے۔ بھلائی کا بدلہ برائی سے دینے والے ظالم ہیں۔ بعض نے کہا اَلظّٰلِمُوْن سے مراد ہیں زنا کرنے والے۔ زنا کرنے والے اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور اس شخص پر بھی ظلم کرتے ہیں جس کی بیوی سے زنا کرتے ہیں۔

سدی اور ابن اسحاق نے بیان کیا کہ عزیز کی بیوی نے یوسفؑ کو جب پھسلانا چاہا تو اس کی تدبیر یہ کی کہ یوسفؑ کے حسن کی تعریف کرنی شروع کر دی، کہنے لگی یوسفؑ تمہارے بال کیسے حسین ہیں، آپ نے جواب دیا (مرنے کے بعد) سب سے پہلے یہی میرے بدن سے منتشر ہوں گے۔ زلیخا نے آپ کی آنکھوں کی تعریف کی تو فرمایا چہرے پر بہہ کر یہ سب سے پہلے آئیں گی۔ چہرے کی تعریف سن کر فرمایا اس کو مٹی کھالے گی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ زلیخا نے کہا ریشمین بستر بچھا ہوا ہے اٹھو اور میرا مقصد پورا کرو، آپ نے فرمایا اگر میں ایسا کروں گا تو جنت کے اندر میرا کوئی حصہ نہیں رہے گا۔ غرض اسی طرح زلیخا آپ کو راغب کرتی رہی آپ بھی جوان تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح جوانی کے تقاضے رکھتے تھے، خوب صورت عورت کو دیکھ کر آپ کو بھی طبعی میلان ہو گیا، اسی طبعی میلان کو اگلی آیت میں بیان فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ج وَهَمَّ بِهَا عورت نے تو بلا شبہ یوسفؑ کو مقصد بنا لیا تھا یوسفؑ بھی اس کا ارادہ کر ہی چکے تھے، یعنی زلیخا کی جانب یوسفؑ کے دل میں فطری اور طبعی میلان پیدا ہو گیا مگر آپ نے اس کو اپنے عزم سے روکا اور باز داشت کی عزم اور ارادے کے ساتھ طبعی میلان کو روکنے پر۔ لفظ "مَعَاذَ اللّٰہ" دلالت کر رہا ہے، مراد یہ ہے کہ آپ کا ارادہ اختیاری نہ تھا میلانِ طبعی تھا جس کا پیدا نہ ہونے دینا انسان کے اختیار سے خارج ہے اور اس پر آدمی مکلف بھی نہیں ہے بلکہ میلانِ طبعی کو عزم کے ساتھ روکنے والا مستحق ستائش ہے فرشتوں پر انسان کی برتری صرف اسی وجہ سے ہے کہ فرشتے فطری میلانِ گناہ سے خالی ہیں اور آدمی طبعی میلانِ نفس کو عزم سے روکتا ہے۔

شیخ ابو المنصور ماتریدیؒ نے فرمایا ارادۂ یوسفؑ در حقیقت ایک خود آمدہ خیال تھا جو بے اختیار دل میں آگیا تھا اور یہ قابلِ گرفت نہیں خود رو خیال اور غیر ارادی خطورِ قلبی نا قابلِ مؤاخذہ ہیں اگر آپ کا ارادہ ہمارے ارادے کی طرح ہوتا تو اللہ آپ کی تعریف نہ کرتا۔ اور آپ کی متعلق اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ نہ فرماتا۔

بعض اہلِ حقائق نے کہا ارادہ دو قسم کا ہوتا ہے (۱) ارادۂ محکم، یعنی عزم راسخ اور غیر متزلزل دل پسندی۔ عزیز کی بیوی کا

ارادہ اسی طرح کا تھا یہ ارادہ قابل مؤاخذہ ہے (۲) عارضی ارادہ اور دل میں خیال کا گزر جانا اور غیر ارادی تصور۔ اس قسم کا ارادہ حضرت یوسفؑ کا تھا اور یہ نا قابلِ مؤاخذہ ہے اور ظہورِ قولی و فعلی سے پہلے اس کی پکڑ نہ ہو گی۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا، اللہ نے فرمایا ہے کہ جب میرا بندہ کوئی نیکی کرنے کی بات اپنے دل میں کر لیتا ہے تو کئے بغیر میں اس کی نیکی لکھ لیتا ہوں اور جب وہ نیکی کر بھی لیتا ہے تو اس جیسی دس نیکیاں اس کے لئے لکھ دیتا ہوں اگر میرا بندہ کوئی بدی کرنے کی بات دل میں کرتا ہے تو جب تک اس کا عملی اظہار نہ کرے میں معاف کر دیتا ہوں اور جب عملاً وہ کر ہی لیتا ہے تو میں اتنی ہی بدی (اس کے نامۂ اعمال میں) لکھ دیتا ہوں۔ رواہ البغوی من حدیث ابوہریرہ صحیحین اور جامع ترمذی میں حدیثِ مذکور کے یہ الفاظ ہیں، جب میرا بندہ کسی نیکی کا ارادہ کر لیتا ہے اور کرتا نہیں تو میں اس کے لئے ایک نیکی لکھ دیتا ہوں پھر اگر وہ عملاً نیکی کر بھی لیتا ہے تو میں اسکے لئے دس سے سات سو تک نیکیاں لکھ دیتا ہوں اور اگر کسی بدی کا ارادہ کرتا ہے اور بدی عملاً نہیں کرتا تو میں اس کے لئے کچھ نہیں لکھتا اور اگر وہ بدی کر گزرتا ہے تو اس کا ایک گناہ لکھ دیتا ہوں۔ بعض لوگوں نے کہا (اور اس قول کی نسبت سعید بن جبیرؒ جیسے متقدمین کی طرف کی) کہ حضرت یوسفؑ نے اپنا کمر بند کھول لیا تھا اور بیٹھ گئے تھے جیسے مرد (وقتِ حاجت) بیٹھتے ہیں یا اپنا پاجامہ کھول لیا تھا اور کپڑے سمیٹ رہے تھے، هَمَّ بِهَا کا یہی معنی ہے۔ اس قسم کی غلط توجیہات کلامِ الٰہی کی رفتار کے خلاف ہیں، اللہ نے فرمایا ہے۔ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ۔ ظاہر ہے کہ سُوء سے مراد صغیرہ گناہ ہے جس سے دور رکھنے کی اللہ نے صراحت فرمائی ہے اور قائل مذکور نے جو تفصیل کی اس سے گناہ صغیرہ کا مرتکب ہو جانا ثابت ہوتا ہے اگر حضرت یوسفؑ سے صغیرہ گناہ کا صدور ہو گا تو اللہ ان کی توبہ و استغفار کا تذکرہ فرماتا، جیسے حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ اور حضرت یونسؑ کی توبہ و استغفار کا ذکر فرمایا ہے، حالانکہ ان بزرگوں سے غیر ارادی خطا ہوئی ہے (گناہ کا قصد و ارادہ نہ تھا اجتہادی غلطی تھی) اور یوسفؑ کی توبہ و استغفار کا تذکرہ نہیں فرمایا بلکہ حضرت یوسفؑ نے اپنی بے گناہی کی صراحت فرمائی اور فرمایا هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ اور فرمایا ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ اور فرمایا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ اور اللہ نے بھی آپ کے متعلق فرمایا اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔

لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ط اگر نہ دیکھ لیتے وہ اپنے رب کی دلیل کو۔ شرط کا جواب محذوف ہے یعنی اگر نہ دیکھ لیتے برہانِ رب کو تو جماع کر لیتے۔ بعض کے نزدیک لَوْلَا کا جواب مقدم ہے اور شرط مؤخر ہے۔ اس وقت مطلب اس طرح ہو گا کہ یوسف زلیخا کا ارادہ کر ہی چکے تھے اگر برہانِ رب کو نہ دیکھ لیتے یعنی ارادہ نہ کیا تھا قریب تھا کہ ارادہ کر لیتے۔ مگر لَوْلَا کا جواب پہلے آجانا قانونِ نحو کے خلاف ہے لَوْلَا حروفِ شرط میں سے ہے اس لئے حرفِ شرط پر جواب کا تقدیم ناجائز ہے ہاں یہ ممکن ہے کہ لَوْلَا کا جواب شرط کے بعد محذوف ہو۔ اور جواب اسی مضمون کا جو پہلے ذکر کر دیا گیا چونکہ هَمَّ بِهَا فرما دیا تھا اس لئے لَوْلَا کا دوبارہ جواب ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی طرح کا محاورہ عرب استعمال کرتے ہیں کہا جاتا ہے قَتَلْتُهٗ لَوْلَمْ اَخَفِ اللّٰهَ میں اس کو قتل ہی کر چکا تھا اگر مجھے خدا کا خوف نہ ہوتا۔

بُرہان کیا تھی اور یوسفؑ نے کیا دیکھ پایا تھا اس سلسلے میں علماء کے اقوال مختلف ہیں، حضرت جعفر صادق نے فرمایا برہان وہ نبوت تھی جو اللہ نے یوسفؑ کے سینہ میں ودیعت کر دی تھی، یہ نورِ نبوت اس عمل سے مانع ہو گیا جو اللہ کی ناراضگی کا موجب تھا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ صحیح قول یہی ہے۔ قتادہ اور اکثر اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی صورت دیکھ لی تھی، حضرت یعقوبؑ فرما رہے تھے۔ یوسفؑ نادانوں کا جیسا عمل کر رہا ہے۔ تیرا نام تو بہ زمرہ انبیاء لکھا ہوا ہے۔ حسن اور سعید بن جبیرؒ اور مجاہد اور عکرمہ اور ضحاک نے کہا آپ نے چھت میں ایک شگاف دیکھا جس کے اندر حضرت یعقوبؑ (افسوس کے ساتھ) اپنی انگلی دانت سے کاٹتے نظر آئے۔

سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ مجسّم ہو کر سامنے آگئے اور اپنا ہاتھ یوسفؑ کے سینہ پر مارا جس سے یوسفؑ کا جوشِ ہیجان جاتا رہا۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے محمد بن سیرین کا قول نقل کیا ہے کہ

حضرت یعقوبؑ دانت سے انگلی کاٹتے کھڑے نظر آئے جو فرما رہے تھے یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن ابراہیمؑ خلیل اللہ تیرا نام تو انبیاءؑ میں شامل ہے اور تو نادانوں جیسا کام کر رہا ہے۔

سدی نے کہا یوسفؑ کو (غیبی) نداء آئی، یوسفؑ! تو جب تک اس پر نہیں پڑا ہے تیری حالت اس پرندے کی سی ہے جو ہوا میں اُڑ رہا ہو اور اس کو کوئی پکڑ نہ سکتا ہو اور جب تو اس پر پڑ جائے گا تو تیری حالت اس پرندے کی طرح ہو جائے گی جو مر کر زمین پر گر گیا ہو کہ کسی چیز کو دفع نہ کر سکتا ہو، قبل از وقوع تیری حالت اس سرکش بیل کی طرح ہے جو کسی کے قابو میں نہ آسکتا ہو اور وقوع کے بعد تیری حالت اس بیل کی طرح ہو جائے گی جو مردہ پڑا ہو اور اس کے سینگوں کی جڑوں میں چیونٹیاں گھس رہی ہوں اور وہ کسی کو دفع نہ کر سکتا ہے۔

ابن جریر نے قاسم بن ابی بزہ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو نداء آئی اے یعقوبؑ کے بیٹے اس پرندے کی طرح نہ ہو جا جس کے پَر اچھے خاصے موجود ہیں لیکن زنا کے بعد سب پَر گر جائیں گے۔

حضرت یوسفؑ نے ندا کی کوئی پرواہ نہیں کی پھر اوپر کو سر اٹھایا تو حضرت یعقوبؑ کی شکل نظر آئی جو دانت سے انگلی کاٹ رہے تھے یہ دیکھ کر آپ پر خوف طاری ہو گیا اور باپ سے شرما کر اُٹھ کھڑے ہوئے، مجاہد کا ایک قول بحوالۂ ابن عباسؓ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نیچے اترے اور دانت سے اپنی انگلی کاٹتے نظر آئے جو کہہ رہے تھے یوسفؑ نادانوں جیسا کام کر رہے ہو، تمہارا نام تو اللہ کے نزدیک انبیاء میں لکھا ہوا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے اپنا پَر حضرت یوسفؑ کے بدن سے لگا دیا جس کی وجہ سے سارا جوش انگلیوں کے پوروں سے نکل گیا۔

محمد بن کعب قرظی نے کہا یوسفؑ نے جب ارادہ کیا اور چھت کی طرف سر اٹھایا تو کسی دیوار پر لکھا ہوا دیکھا لَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا زنا کے قریب بھی نہ جاؤ، یہ بے حیائی کا کام ہے اور بُرا راستہ ہے۔

عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول برہانِ رب کے متعلق نقل کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرشتے کی صورت دیکھ لی تھی۔

حضرت علی (زین العابدین) بن امام حسینؓ کا قول منقول ہے کہ وہاں گھر کے اندر ایک بُت تھا عورت اس پر پردہ ڈالنے کے لئے گئی، حضرت یوسفؑ نے پوچھا تم نے ایسا کیوں کیا اس نے جواب دیا مجھے شرم آئی کہ یہ مجھے اس گناہ میں مبتلا دیکھے گا حضرت نے فرمایا تم کو تو ایسی چیز سے شرم آئی جو نہ سنتی ہے نہ دیکھتی ہے نہ سمجھتی ہے پھر مجھے تو بدرجۂ اولیٰ اپنے رب سے شرمانا چاہیئے۔ (جو دانا بینا ہے) یہ کہہ کر آپ بھاگ نکلے۔

كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ ایسا ہی ہم نے کیا اور اس لئے کیا کہ یوسفؑ سے چھوٹے بڑے گناہ کو پھیر دیں (گناہ کا رُخ ان کی طرف سے موڑ دیں) اَلسُّوْٓء چھوٹا گناہ اَلْفَحْشَآء بڑا گناہ یعنی زنا۔

اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۲۴﴾ بلاشبہ وہ ہمارے منتخب بندوں میں سے تھا یعنی ان بندوں میں سے تھا جن کو نبوت کے لئے چُن لیا گیا تھا اور اللہ نے اپنے لئے ان کو خالص کر لیا تھا اور ایک قرأت میں اَلْمُخْلِصِيْنَ بکسرِ لام بصیغہ اسم فاعل آیا ہے۔ یعنی یوسفؑ ان بندوں میں شامل تھا جو اللہ کے لئے خالص طور پر عبادت اور طاعت کرتے ہیں۔

وَاسْتَبَقَا الْبَابَ اور دونوں (یوسفؑ و زلیخا) دروازے کو دوڑے یوسفؑ آگے اور زلیخا پکڑنے کے لئے ان کے پیچھے جب یوسفؑ باہر نکلنے کے لئے بھاگے تو زلیخا ان کو روکنے کے لئے پیچھے سے دوڑی اور پیچھے سے کرتہ پکڑ کر کھینچا۔ الباب سے مراد ہے آخری دروازہ جہاں سے بالکل گھر سے باہر آسکتے تھے۔ یوسفؑ جب بھاگے تھے تو دروازوں کے قفل ٹوٹ کر خود گر رہے تھے آخری دروازہ پر پہنچے تو زلیخا نے کرتہ پکڑ کر کھینچا۔

وَقَدَّتْ قَمِيْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ اور عورت نے یوسفؑ کا کرتہ پیچھے سے چیر دیا۔ قَدٌّ لمبائی میں پھاڑنا قَطٌّ چوڑائی میں کاٹنا یا پھاڑنا۔

وَّ اَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَا الْبَابِ　اور دروازہ کے بعد دونوں نے عورت کے شوہر کو پایا (جو آرہا تھا) بغوی نے لکھا ہے کہ زلیخا کے چچا کے بیٹے کے ساتھ قطفیر کو بیٹھا پایا۔ بعض نے کہا آتا پایا جو اپنے گھر میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ زلیخا یہ دیکھ کر ڈر گئی۔

قَالَتْ مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

شوہر کی نظر میں اپنے کو پاک دامن ظاہر کرنے اور جذبۂ انتقام کے زیر اثر یوسفؑ کے خلاف اس کو بھڑکانے کے لئے عورت نے کہا جس شخص نے آپ کی بیوی سے بُرے کام کا ارادہ کیا ہو آپ کی بیوی پر بُری نیت کی ہو اس کی سزا اس کے سوا نہیں کہ اس کو قید میں ڈال دیا جائے یا دکھ کا عذاب دیا جائے یعنی کوڑے مارے جائیں۔

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِيْ عَنْ نَّفْسِيْ　یوسفؑ نے کہا اسی نے مجھے پھسلایا تھا۔ یعنی یہی مجھ سے بدکاری کی طلب گار تھی۔ چونکہ عورت نے جھوٹ باندھا تھا اور شوہر کو ترغیب دی تھی کہ یوسفؑ کو سزائے تازیانہ دی جائے یا قید میں ڈال دیا جائے۔ اس لئے بطورِ مدافعت حضرت نے یہ راز فاش کیا۔ اگر زلیخا ایسا نہ کرتی تو آپ بھی پردہ دری نہ کرتے۔

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ　اور عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے شہادت دی۔ بعض نے کہا یہ زلیخا کا چچا کا بیٹا تھا۔ بعض نے کہا ماموں کا بیٹا تھا۔ سعید بن جبیرؒ اور ضحاک نے کہا شیر خوار بچہ تھا جس کو اللہ نے گویا کر دیا تھا۔

بغوی نے لکھا ہے عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان بھی آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا چار بچے بچپن میں بولے (۱) بنت فرعون کے بال بنانے والی خادمہ کا بچہ (۲) شاہد یوسفؑ (۳) جریج والا بچہ (۴) عیسیٰ بن مریمؑ۔ محمد بن محمد سعاف نے تخریج بیضاوی میں لکھا ہے کہ یہ حدیث امام احمد نے مسند میں اور ابن حبان نے صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں بیان کی ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے، حاکم نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے اور شرطِ شیخین کے موافق قرار دیا ہے لیکن طیبی کو اس حدیث کی صحت کی اطلاع نہیں ملی۔ انہوں نے اس کی تردید میں وہ حدیث پیش کی ہے جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے کہا پالنے کے اندر تین بچوں کے علاوہ کسی نے بات نہیں کی عیسیٰ بن مریمؑ اور جریج والا بچہ اور ایک بچہ جس کو اس کی ماں دودھ پلا رہی تھی ایک خوبصورت سوار ادھر سے گزرا عورت نے کہا اے اللہ! میرے بیٹے کو اس کی طرح کر دے۔ بچہ بولا مجھے اس کی طرح نہ کرنا اگر اس مؤخر الذکر بچے کو بھی مذکورۃ الصدر چار بچوں کے ساتھ ملا دیا جائے تو پالنے میں بولنے والے پانچ بچے ہو جائیں گے۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی کی حالت میں بولنے والے اس سے زیادہ بچے ہوئے ہیں۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ اصحابُ الاخدود (یوسف ذونواس شاہِ یمن اور اس کے ساتھی جنہوں نے ایک بڑا گڑھا کھدوا کر آگ سے بھروا کر اہلِ ایمان کو اس میں ڈلوایا تھا اور شیر خوار بچے کو جب اس کی مؤمنہ ماں کی گود سے چھین کر آگ میں ڈالا تو ماں بے تاب ہو گئی اور قریب تھا کہ کلمۂ کفر زبان پر لے آئے کہ بچے نے ماں کو آگ کے اندر سے آواز دی، ماں یہ پھولوں کا چمن ہے تو بھی چلی آ۔ مترجم) کے قصے میں بھی آتا ہے کہ ایک شیر خوار بچہ بولا تھا۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ شیر خوارگی میں بولنے والے گیارہ بچے ہوئے جن کو میں نے ان اشعار میں جمع کر دیا ہے۔

تکلّم فی المهد النبیُّ محمّدٌ　　ویحییٰ وعیسیٰ و الخلیل و مریم
وسبری جریح ثمّ شاهد یوسف　　وطفل لذی الاخدودیرویه مسلم
و طفل علیه مبریا لِاُمّه　　التی یقال لها تزنی ولا تتکلّم
وماشطة فی عهد فرعون طفلها　　وفی زمن الهادی المبارک یختم

اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۲۶﴾

اگر یوسفؑ کا کرتہ آگے سے پھٹا ہے تو زلیخا سچی ہے اور یوسف جھوٹا ہے۔ کرتہ کا آگے سے پھٹنا اس بات کی دلیل ہے کہ یوسفؑ

نے دست درازی کی تھی اور زلیخا نے آگے سے اس کا کرتہ اس کو دفع کرنے کے لئے پکڑا جس سے کرتہ چر گیا۔ یا یہ کہ زلیخا کے پیچھے یوسفؑ دوڑ اور تیز دوڑنے کی وجہ سے کرتے کے دامن میں الجھ کر گرا، اور کرتا کا گریباں پھٹ گیا۔

وَإِنْ كَانَ قَمِيصُهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِينَ ﴿۲۷﴾

اور اگر کرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو عورت نے جھوٹ کہا اور یوسفؑ سچا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت یوسفؑ کے پیچھے اس کو پکڑنے دوڑی اور کرتہ پکڑ کر کھینچ لیا جس کی وجہ سے کرتہ پھٹ گیا۔

حقیقت میں یہ شہادت نہ تھی (بلکہ سچ جھوٹ معلوم کرنے کی ایک تدبیر تھی) مگر مفہوم شہادت کو چونکہ یہ قول ادا کر رہا تھا اس لئے اس کو شہادت قرار دیا۔

فَلَمَّا رَاٰ قَمِيصَهُ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهُ مِنْ كَيْدِكُنَّ ط پس جب اس نے یوسفؑ کا کرتہ پیچھے سے پھٹا دیکھا (تو سمجھ گیا کہ یوسفؑ پاک دامن اور سچا ہے اور بیوی مکار قصوروار ہے) بولا بلاشبہ (بدی یا یہ کام یا تیرا یہ قول مَاجَزَاءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ الخ) تم عورتوں کی مکاری کی وجہ سے ہے۔ خطاب بصیغہ جمع زلیخا اور اس جیسی عورتوں کو ہے یا تمام عورتوں کو۔

اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ ﴿۲۸﴾ یقیناً تم عورتوں کا مکر بڑا ہے۔ عورتوں کا ظاہر تو کمزور نظر آتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سچی ہیں (بھولی بھالی صورت پر کون جھوٹا ہونے کا احتمال کر سکتا ہے) لیکن ان کا باطن ٹیڑھا اور گندا ہے ان کی تخلیق آدم کی (ٹیڑھی) پسلی سے ہوئی ہے ان کی عقلوں میں کمزوری اور دینداری میں نقصان ہے ان کے ساتھ شیطان ہوتا ہے جو مکر کا جال لے کر مردوں کے سامنے سے آتا ہے اور شیطان تو پھر چھپ کر چوری سے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا عورتیں شیطان کا جال ہیں یہ بھی حضور ﷺ نے فرمایا تم عورتوں میں سے کسی ایک سے بھی زیادہ کوئی ناقص العقل والدین شخص دانشمند مرد کی عقل و دانش کو زائل کرنے والا میں نے نہیں دیکھا۔ بعض علماء کا قول ہے شیطان سے زیادہ مجھے عورتوں سے ڈر لگتا ہے۔ اللہ نے شیطان کے مکر کو تو ضعیف فرمایا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيفًا اور عورتوں کے متعلق فرمایا ہے اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيمٌ تمہارا مکر بڑا ہے۔

يُوسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا سكتة اے یوسفؑ اس قصہ سے درگزر کرو۔ کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا۔ کہیں یہ واقعہ پھیل نہ جائے۔

وَاسْتَغْفِرِي لِذَنْبِكِ ۖ اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِئِينَ ﴿۲۹﴾ ع اور (اے زلیخا) تو اپنے گناہ کی معافی طلب کر یقیناً تو ہی قصور وار ہے۔ یعنی قصوروار لوگوں میں سے ہے۔ الخاطئین: خطأ سے اسم فاعل جمع مذکر ہے خطا کا معنی ہے قصداً گناہ کیا۔ الخاطئین مذکر کا صیغہ ہے بظاہر مؤنث کا صیغہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ زلیخا عورتوں میں سے تھی مگر یہاں صرف خطاوار عورتوں کی جماعت مراد نہیں ہے بلکہ مرد خطاوار ہو یا عورت سب کی جماعت مراد ہے اور مذکر کو مؤنث پر تغلیب دے کر مذکر کا صیغہ استعمال کیا ہے، جیسے دوسری آیت ہے وَكَانَتْ مِنَ الْقٰنِتِينَ وَاِنَّهَا كَانَتْ مِنْ قَوْمٍ كٰفِرِينَ۔ عزیز بردبار آدمی تھا غیرت کم تھی اسی لئے زبانی سرزنش پر اکتفا کی۔

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ اور شہر میں عورتوں نے کہا۔ نسوۃ اسم جمع ہے۔ یعنی جب زلیخا کی سازش اور مکاری کا قصہ شہر میں پھیلا اور یوسفؑ کے واقعہ کی عورتوں کو اطلاع ہوئی تو عورتوں نے کہا، مقاتل نے کہا کہ کہنے والی پانچ عورتیں تھیں۔ کمیدان کی بیوی، منصرم آبدار خانہ کی بیوی، مہتمم باورچیخانہ کی بیوی، جیلر کی بیوی اور منصرم اصطبل کی بیوی۔

امْرَاَتُ الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتٰهَا عزیز کی بیوی اپنے (کنعانی) غلام کو پھسلانے اور بہکانے لگی۔

عَنْ نَّفْسِهٖ ج اس کے نفس کی طرف سے۔ یعنی اس سے وصال کی طلب گار ہو گئی۔

قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ط اس غلام کا عشق اس کے دل میں گھر کر گیا ہے۔ یعنی یوسفؑ عزیز کی بیوی کے دل کے

غلاف کو پھاڑ کر اس کے دل کے اندر گھس گیا۔ مطلب یہ کہ یوسفؑ کی محبت زلیخا کے دل میں رچ گئی۔ سدی نے کہا شغاف دل کے اوپر کی باریک جھلی۔

کلبی نے شَغَفَ کا ترجمہ کیا حَجَبَ یعنی زلیخا کے دل پر یوسفؑ کی محبت چھاگئی، محبت نے عقل پر پردہ ڈال دیا کہ سوائے یوسفؑ کے اور کسی بات کو سمجھنے کا اس کو ہوش نہیں رہا۔

اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۰﴾ ہم اس کو کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں۔ سیدھے اور صحیح راستے سے بھٹک گئی ہے، پاک دامنی کو چھوڑ دیا۔

فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ جب زلیخا نے ان کے غیبت کرنے کی خبر سنی تو ان کے پاس (دعوت کا پیام دے کر) کسی کو بھیجا۔ مکر سے مراد ہے خفیہ بات مکر بھی مکار چھپاتا ہے اور غیبت بھی پسِ پشت چھپا کر کی جاتی ہے۔

ابن اسحاق نے کہا مکر سے مکر ہی مراد ہے عورتوں نے زلیخا کے متعلق یہ بات اس لئے کہی تھی کہ زلیخا ان کو بُلوا کر یوسفؑ کا نظارہ کرادے کیونکہ یوسفؑ کے حسن و جمال کا تذکرہ زلیخا ان سے کرتی تھی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ زلیخا نے اپنا راز ان سے کہہ دیا تھا اور ان سے چھپانے کی تاکید کردی تھی مگر وعدۂ اخفاء کرنے کے بعد انہوں نے راز فاش کردیا اسی لئے اس کو مکر کہا۔ اَرْسَلَتْ کا مفعول محذوف ہے یعنی اَرْسَلَتْ رَسُوْلًا ایک قاصد بھیجا۔

وہب نے کہا زلیخا نے کھانے پر چالیس عورتوں کو بُلایا تھا جن میں یہ غیبت کرنے والی عورتیں بھی تھیں، جنہوں نے زلیخا کو غلام سے محبت کرنے کی عار دلائی تھی۔

وَاَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً اور ان کے واسطے مسند (تکیہ) لگادیا۔ حضرت ابن عباسؓ، سعید بن جبیرؒ، حسن بصریؒ، قتادہ اور مجاہد نے مُتَّكَاً کا ترجمہ طعام کیا ہے کھانے والے کھانے بیٹھتے ہیں تو تکیہ مسند لگاتے ہیں اس لئے مجازاً مُتَّكَاً کا ترجمہ ہوگیا طعام۔ اِتَّكَأْنَا عِنْدَ فُلَانٍ ہم نے فلاں شخص کے پاس کھانا کھایا تکیہ لگاکر۔ کھانے کی عادت چونکہ عیش پسندوں کی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اُلٹے ہاتھ سے کھانے اور تکیہ لگاکر کھانے کی ممانعت فرمادی۔ رواہ ابن ابی خیبۃ فی المصنف عن جابر بعض لوگوں نے کہ مُتَّكَاً وہ کھانا ہے جو کاٹ کر کھایا جائے گویا کاٹنے والا چھُری سے اُس پر دباؤ ڈالتا ہے حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد کا قول ہے کہ وہ ترنج تھا۔ بعض علماء نے کہا حبشی زبان میں مُتَّكَاً ترنج کو کہتے ہیں ہیں۔ عکرمہ اور ابوزید انصاری نے کہا جو چیز چھری سے کاٹی جائے عرب اس کو متک کہتے ہیں متک اور بتک کا لغوی معنی ہے کاٹنا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ عزیز کی بیوی نے ایک کمرہ میں طرح طرح کے پھل اور کھانے سجاکر رکھوائے اور تکیے بھی لگادیئے اور عورتوں کو بُلوایا۔

وَّاٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا اور ان میں سے ہر عورت کو ایک چھری (کاٹنے کے لئے دے دی ان عورتوں کا قاعدہ تھا کہ گوشت چھری سے کاٹ کر کھاتی تھیں۔

وَّقَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ اور (یوسفؑ سے) کہا ان عورتوں کے سامنے سے نکلو۔

زلیخا نے یوسفؑ کو ایک اور جگہ بٹھادیا تھا وہاں سے آپ عورتوں کے سامنے برآمد ہوئے۔ عکرمہ کا قول ہے کہ حُسن میں یوسفؑ کی دوسرے لوگوں پر برتری ایسی تھی جیسی ستاروں پر چودھویں رات کے چاند کی۔ ابن جریر حاکم اور ابن مردویہ نے حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس رات مجھے آسمان کی طرف لے جایا گیا (یعنی شبِ معراج میں) میں نے دیکھا کہ یوسفؑ چودھویں کے چاند کی طرح تھے۔

ابوالشیخ نے اپنی تفسیر میں اسحاق بن عبد اللہ ابی فروہ کا قول بیان کیا ہے یوسفؑ مصر کے گلی کوچوں سے گزرتے تو دیواریں آپ کے چہرے کی چمک سے جگمگا جاتیں جیسے سورج کی دھوپ جب دیواروں پڑ رہی ہو تو اس کے عکس سے پانی جگمگا جاتا ہے۔

فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ ابو العالیہ نے کہا عورتیں آپ کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئیں، مبہوت ہوگئیں۔ بعض

علماء نے اَكْبَرْنَ کا ترجمہ کیا ان کو (ہیجانی کیفیت کی وجہ سے) حیض چھوٹ گیا، عرب کہتے ہیں اکبرتِ المرأۃُ عورت بڑی ہوگئی، یعنی حائضہ ہوگئی۔ اس صورت میں ضمیر مصدری ہوگی یعنی یوسفؑ کی وجہ سے۔

وَقَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ　اور (چھریوں سے) اپنے ہاتھ کاٹ لئے کاٹنا چاہتی تھیں پھل، اور یوسف کو دیکھتے ہی ہوش اُڑ گئے تو کاٹ لئے ہاتھ اور تکلیف کا بھی احساس نہیں ہوا مجاہد نے کہا ان کو خون بہنے کا بھی احساس نہ ہوا۔ قتادہ نے کہا ہاتھ کاٹ کر الگ کردیئے، صحیح یہ ہے کہ ہاتھ تو کاٹ لئے مگر الگ کرکے نہیں پھینکے۔ وہب نے کہا ان میں سے کچھ عورتیں مر گئیں۔

وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ　یعنی اللہ ضعفِ قدرت سے پاک ہے اللہ کی قدرت پر انہوں نے تعجب کیا حَاشَ اصل میں حاشا تھا حاشا کلمۂ استثناء ہے تخفیفِ الف کے بعد تنزیہ کے مقام میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

مَا هٰذَا بَشَرًا　یہ آدمی نہیں ہے۔ مَا اور لَيْسَ دونوں نفیِ حال کے لئے مستعمل ہیں اس لئے اہلِ حجاز کے استعمال میں مَا کی خبر بھی لَيْسَ کی خبر کی طرح منصوب ہوتی ہے، بغوی نے لکھا ہے اصل میں یہ خبر مجرور تھی یعنی مَا هٰذَا بِبَشَرٍ تھا حرف جر کو حذف کرنے کے بعد خبر کو منصوب کردیا۔

اِنْ هٰذَا اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ﴿۳۱﴾　یہ تو بس معزز فرشتہ ہے یعنی اللہ کی نظر میں بڑی عزت والا فرشتہ ہے۔ انسانوں میں تو ایسا حسن ہوتا نہیں اور انسانوں سے اونچا حسن فرشتوں ہی میں ہو سکتا ہے۔ یا اس وجہ سے انہوں نے یوسفؑ کو فرشتہ کہا کہ ایسا جمال ایسا کمال اور ایسی پاکدامنی تو فرشتوں میں ہی ہو سکتی ہے انسان تو ان سب کا مجموعہ ہو نہیں سکتا۔

قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِيْ لُمْتُنَّنِيْ فِيْهِ　زلیخا نے کہا یہی وہ (کنعانی غلام) ہے (جس کی صورت تم نے اپنے ذہنوں میں بنا رکھی تھی اور) جس کی محبت کے بارے میں تم نے مجھے بُرا کہا تھا یعنی تم نے اس کے جمال کی صحیح تصویر کشی اپنے خیال میں کی ہی نہ تھی اس کے حسن کا اندازہ کیا ہی نہ تھا ورنہ مجھے اس کے عشق میں معذور سمجھتیں۔

وَلَقَدْ رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ فَاسْتَعْصَمَ　اور میں نے ہی اس کو (اپنی طرف مائل کرنے کے لئے) پھسلایا تھا مگر یہ بچا رہا اس نے اپنی عصمت کو بچانے کے لئے میری درخواست قبول کرنے سے انکار کردیا۔

زلیخا نے ان عورتوں کے سامنے اس وقت اپنی حرکت کا اقرار کیا جب اس کو معلوم ہوگیا کہ میری مجبوری ان کی نظر میں ثابت ہوگئی اور آئندہ یوسفؑ کے دل کو نرم کرنے میں یہ میری مدد کریں گی چنانچہ عورتوں نے یوسفؑ سے سفارش کی کہ جیسا تمہاری مالکہ چاہتی ہے ویسا کرو اس کا کہا مانو۔

وَلَئِنْ لَّمْ يَفْعَلْ مَآ اٰمُرُهٗ لَيُسْجَنَنَّ وَلَيَكُوْنًا مِّنَ الصّٰغِرِيْنَ ﴿۳۲﴾　اور اگر اس نے میرے کہنے کے مطابق نہیں کیا تو اس کو یقیناً قید کردیا جائے گا اور یہ ضرور ذلیل و خوار ہوگا۔

لَيَكُوْنًا اصل میں لَيَكُوْنَنْ بنونِ خفیفہ تھا حالتِ وقف میں نون کو تنوین سے مشابہت رکھنے کی وجہ سے بشکلِ الف لکھ دیا گیا جیسے لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ۔ الصَّاغرین "ذلیل لوگ" یہ باب سمع سے ہے اس کا مصدر صَغَر اور صِغار ہے۔

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ　یوسفؑ نے کہا اے میرے رب جس چیز کی طرف وہ مجھے بُلا رہی ہیں اس سے تو مجھے جیل خانہ زیادہ پسند ہے۔ یعنی زنا سے تو جیل اچھی۔ دعوتِ گناہ صراحتاً اگرچہ صرف زلیخا نے دی تھی لیکن اشارہ دوسری عورتوں کی طرف سے بھی تھا کہ یوسفؑ مان لیں اس لئے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کردی یا اس وجہ سے دعوت کی نسبت سب عورتوں کی طرف کی کہ نافرمانی کے نتیجۂ بد سے ان عورتوں نے یوسفؑ کو ڈرایا تھا اور فرمان پذیری ہی کو یوسفؑ کے حق میں بہتر قرار دیا تھا۔ بعض علماء کا قول ہے کہ ہر عورت نے یوسفؑ کو اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا۔

بض علماء نے کہا اگر یوسفؑ قید خانہ کو پسند نہ کرتے اور اَلسِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ نہ کہتے تو قید خانہ کی مصیبت میں مبتلا نہ

ہوتے، آدمی کو چاہئے کہ عافیت کا طلبگار ہو اور اللہ سے عافیت ہی کی دعا کرے۔ ترمذی نے حضرت معاذؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا الٰہی میں تجھ سے صبر کی درخواست کرتا ہوں (کہ مجھے مصائب پر صبر عطا کر) فرمایا تو مصیبت کا طلبگار ہوا عافیت کی دعا کر۔ طبرانی نے حضرت عباسؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت عباسؓ کا بیان ہے کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی بات بتائیے جس کی دعا میں اللہ سے کروں فرمایا اپنے رب سے عافیت کی دعا کرو۔ کچھ مدت کے بعد میں پھر خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیے جو میں اللہ سے مانگوں، فرمایا چچا اللہ سے دنیا اور آخرت میں عافیت کی طلب کرو۔

وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ إِلَيْهِنَّ وَأَكُن مِّنَ الْجَاهِلِينَ ﴿٣٣﴾ اور اگر تو ان کی مکاری کا رخ میری طرف سے نہیں پھیر دے گا (اور مجھے عصمت پر ثابت قدم نہیں رکھے گا) تو میں ان کی (خواہش کو قبول کرنے کی) طرف جھک جاؤں گا اور (ارتکاب گناہ کی وجہ سے) نادانوں میں سے ہو جاؤں گا۔ یعنی طبعی میلان مجھ پر غالب آجائے گا، صَبْوَۃٌ خواہشِ نفس کی طرف جھکاؤ۔ بے حیائی کا کام کرنا نادانوں کا کام ہے، دانش مند برا کام نہیں کرتا یا جاہلوں سے مراد ہیں وہ جاننے والے جو جاننے کے باوجود علم کے مطابق عمل نہیں کرتے، ایسے لوگ جاہلوں کے حکم میں ہیں بغوی نے کہا اس فقرہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ مؤمن اگر کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو محض جہالت اور نادانی کی وجہ سے کرتا ہے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ پس اللہ نے یوسفؑ کی دعا قبول کرلی۔ یوسفؑ نے کہا تھا وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ یہ لفظ درپردہ دعا کو متضمن تھا۔

فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٤﴾ پس اس کی طرف سے ان عورتوں کے مکر کو پلٹ دیا (عصمت پر یوسفؑ کو ثابت قدم رکھا کہ انہوں نے لذت آگیں گناہ پر قید خانہ کو ترجیح دی) بلاشبہ وہ اہلِ التجا کی دعاؤں کو) سننے والا اور (ان کے احوال و مصالح کو) بخوبی جاننے والا ہے۔

ع ۱۴
ثُمَّ بَدَا لَهُم مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ ﴿٣٥﴾ پھر مختلف نشانیاں دیکھنے کے بعد ان لوگوں کی یہی رائے ہوئی کہ یوسفؑ کو ایک مدت کے لئے قید میں رکھیں۔

لَهُم یعنی عزیز اور اس کے ساتھیوں کی پھر یہ رائے ہوئی۔ مِّن بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ یعنی یوسفؑ کی پاک دامنی اور برأت کی نشانیاں دیکھنے کے بعد۔ بچہ کا کلام اور قمیص کا پیچھے سے پھٹنا اور عورتوں کا ہاتھ کو کاٹنا اور یوسفؑ کا ان سے باعصمت رہنا، جب انہوں نے دیکھ لیا تو یہ رائے قرار پائی کہ کچھ مدت کے لئے یوسفؑ کو قید کر دیا جائے، زلیخا کا شوہر زن پرست تھا، شوہر کی لگام زلیخا کے ہاتھ میں تھی وہ جس طرف چاہتی موڑ دیتی، اس نے شوہر کو بازیچہ بنا رکھا تھا اس کو خیال تھا کہ یوسفؑ قید کی سختی سے تنگ ہو کر میرا ہو جائے گا۔ پھر راز فاش ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگوں سے شرمندہ بھی ہو گی اور بدنامی کا دھبہ دھونا چاہتی ہو گی اس لئے اس نے یوسفؑ کو قید کر دینا ہی مناسب سمجھا جب دیدار اور وصال سے وہ محروم ہو گئی تو سماعِ احوال پر ہی اس کو قناعت کرنی پڑی۔ مجبوراً اس نے شوہر سے کہا کہ اس عبرانی غلام نے مجھے لوگوں میں رُسوا کر دیا دنیا سے کہتا پھرتا ہے کہ میں نے اس کو ورغلا کر اپنی طرف کھینچنا چاہا تھا اب یا تو آپ مجھے اجازت دیں کہ میں گھر سے نکلوں اور لوگوں سے جا کر اپنی بے گناہی ظاہر کروں یا اس کو آپ قید کر دیں کہ لوگوں میں یہ چرچے ختم ہو جائیں اور لوگ اسی کو مجرم قرار دے دیں۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ یوسفؑ سے تین لغزشیں ہوئیں جن کی پاداش ان کو اٹھانی پڑی۔

(۱) انہوں نے اس عورت (کی طرف بڑھنے) کا ارادہ کیا تو قید بھگتنی پڑی۔

(۲) انہوں نے اللہ کے سوا اپنے ساتھی سے کہا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو چند سال (مزید) قید میں رہنا پڑا۔

(۳) انہوں نے بھائیوں سے کہا کہ تم بلاشبہ چور ہو تو بھائیوں نے کہا اگر اس نے (بنیامین نے) چوری کی تو تعجب نہیں کیونکہ اس کے بھائی یوسفؑ نے بھی اس سے پہلے چوری کی تھی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ اور یوسفؑ کے ساتھ قید خانہ میں دو جوان اور بھی داخل ہوئے تھے ان کو بھی قید کر دیا گیا تھا یہ دونوں ریان بن ولید بن ثروان شاہِ مصر کے غلام تھے ایک باورچی یعنی منصرم باورچی خانہ تھا اور دوسرا ساقی یعنی منصرم آبدار خانہ۔ بادشاہ نے ناراض ہو کر ان کو بھی قید کر دیا تھا۔ اور اتفاقاً ان کی قید بھی یوسفؑ ہی کے ساتھ ہوئی تھی "مع" کے لفظ سے یہی معلوم ہو رہا ہے

بغوی نے لکھا ہے کہ کچھ لوگوں نے بادشاہ کو ہلاک کرنے کی سازش کی اور بادشاہ کو زہر دینے کے لئے شاہی باورچی کو مالی لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا اقرار کے بعد ساقی نے تو سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور باورچی نے رشوت لے کر کھانے میں زہر ملا دیا کھانا بادشاہ کے سامنے آیا تو ساقی نے بادشاہ سے کہہ دیا کہ یہ کھانا زہر آمیز ہے اس کو نہ کھائیے باورچی نے (ضد میں آکر) کہا حضور پانی میں زہر ملا ہوا ہے اس کو نہ پیجئے۔ بادشاہ نے ساقی کو حکم دیا، یہ پانی تجھے پینا ہوگا ساقی نے پی لیا اس کو کوئی ضرر نہ پہنچا اور باورچی کو حکم دیا یہ کھانا تجھے کھانا پڑے گا۔ اس کو کھا تو اس نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے کھانا کسی جانور کے سامنے ڈلوا دیا۔ جانور نے کھایا تو وہ مر گیا۔ بادشاہ نے دونوں کو جیل خانہ بھیج دینے کا حکم دے دیا (باورچی کو زہر دینے کی کوشش کی وجہ سے اور ساقی کو راز دار ہونے کی وجہ سے) یوسفؑ جیل خانے میں پہنچے تو ان کے علم کی شہرت ہو گئی۔ آپ نے خود بھی اعلان کر دیا کہ میں خواب کی تعبیر دینا جانتا ہوں۔ غرض ساتھ داخل ہونے والے دونوں قیدیوں نے مشورہ کیا ہم اس عبرانی غلام کے دعوے کی جانچ کرنا چاہتے ہیں، چلو تجربہ کریں خواب تو انہوں نے کوئی دیکھا نہ تھا جھوٹ موٹ خواب بنا کر تجربہ کرنا چاہا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے یہی فرمایا۔ بعض علماء نے کہا انہوں نے واقعی خواب دیکھے تھے، حضرت یوسفؑ نے ان کو غمگین پا کر وجہ دریافت کی تو انہوں نے کہا ہم دونوں بادشاہ کے مصاحب تھے۔ ہم نے خواب دیکھے ہیں جن کی وجہ سے پریشان ہیں۔ یوسفؑ نے کہا جو کچھ دیکھا ہے بیان کرو تو

قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ ایک نے یعنی ساقی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں (انگور نچوڑ رہا ہوں اور ان کو (نچوڑ کر شراب بنا رہا ہوں، انگور سے شراب بنتی ہے انگور مآل کار شراب ہو جاتے ہیں اس لئے انگور کی جگہ لفظ خمر ذکر کیا، خمر سے مراد انگور ہیں۔ فلاں شخص کھانا پکاتا ہے یعنی وہ چیز پکاتا ہے جو پک کر کھانا بن جاتی ہے۔ بعض نے کہا اہلِ عمان کے محاورہ میں خمر انگوروں کو کہتے ہیں۔ تفصیلی خواب اس نے اس طرح بیان کیا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک باغ میں درختِ انگور کی جڑ کے پاس ہوں درخت میں تین خوشے لگے ہیں، میرے ہاتھ میں بادشاہ کا پیالہ ہے میں نے وہ انگور نچوڑ کر پیالے میں عرق بھرا اور بادشاہ کو پلایا۔ بادشاہ نے اس کو پی لیا۔

وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ

اور دوسرے نے یعنی باورچی نے کہا میں نے دیکھا کہ میں اپنے سر پر روٹیاں اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے (اوپر سے جھپٹ کر) ان میں سے کھا رہے ہیں۔ اس نے خواب کی تفصیل اس طرح بیان کی تھی کہ میں نے دیکھا میرے سر پر تین ٹوکریاں ہیں جن میں روٹیاں اور طرح طرح کے کھانے ہیں اور شکاری پرندے ان کو نوچ کر لئے جا رہے ہیں۔

نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ آپ ہم کو ہر ایک کے خواب کی تعبیر بتا دیجئے۔ ہمارے خیال میں آپ صحیح تعبیر دینے والوں میں سے ہیں یا آپ اہلِ علم میں سے ہیں، اس صورت میں احسان سے مراد ہوگا علم اور اول ترجمہ پر محسن سے مراد ہوگا اچھی تعبیر دینے والا۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ قیدیوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ ہم پر بھی احسان کیجئے اور صحیح تعبیر بتا دیجئے۔

ضحاک بن مزاحم سے پوچھا گیا کہ آیت "اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ" میں کس احسان کا اظہار ہے یوسفؑ کیا بھلائی کرتے تھے۔ ضحاک نے جواب دیا کوئی قیدی بیمار ہو جاتا تو آپ اس کی عیادت اور نگہداشت کرتے تھے۔ اگر کسی قیدی کی جگہ تنگ ہوتی تو آپ اس کو کشادہ جگہ دے دیتے اگر کسی کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ چیز فراہم کر دیتے اور ان تمام باتوں کے باوجود

عبادت کی بہت زیادہ کوشش کرتے اور راتوں کو نماز میں کھڑے رہتے۔
یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب آپ قید خانہ میں داخل ہوئے تو لوگوں کو دیکھا کہ مصیبت میں مبتلا ہیں، غمگین ہیں، ہر قسم کا سہارا ٹوٹ چکا ہے۔ آپ ان کو تسلی دینے لگے، فرمایا لوگو پریشان نہ ہو، صبر کرو اللہ اجر دے گا۔ قیدیوں نے کہا نوجوان اللہ تجھے برکت عطا فرمائے تیرا چہرہ کیسا حسین ہے، اخلاق کتنے اعلیٰ ہیں اور باتیں کتنی پیاری ہیں، تیرے ساتھ رہنے سے ہم کو برکت حاصل ہوگی۔ تیرا کیا نام ہے تو کون ہے۔ آپ نے کہا میں یوسف بن یعقوب صفی اللہ بن اسحٰق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ ہوں (اس روایت میں اسحٰق کا خطاب ذبیح اللہ قرار دیا گیا ہے، مگر جمہور علماء کے نزدیک ذبیح اللہ حضرت اسمٰعیلؑ کا لقب تھا۔ احادیث سے اسی کی تائید ہوتی ہے اور قرآنی آیات بھی شہادت دے رہی ہیں کہ حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے کا حکم حضرت ابراہیمؑ کو خواب میں دیا گیا تھا۔ مترجم)

جیلر نے کہا نوجوان اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تجھے آزاد کر دیتا (مگر میرا اختیار نہیں ہے) پھر بھی میں تیرا حقِ مصاحبت اچھی طرح ادا کروں گا تیرے ساتھ اچھا سلوک کروں گا جیل خانہ کی کوٹھڑیوں میں سے تو جہاں رہنا پسند کرے رہ سکتا ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ دونوں (خواب دیکھنے والے) جوانوں نے یوسفؑ کو دیکھ کر کہا، یوسفؑ ہم کو تو اسی وقت سے تم سے محبت ہو گئی تھی جب ہم نے تم کو دیکھا تھا آپ نے فرمایا، میں تم کو خدا کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ مجھ سے محبت نہ کرنا، خدا کی قسم جس نے بھی مجھ سے محبت کی اس کی محبت سے مجھ پر مصیبت ہی آئی۔ میری پھوپھی نے مجھ سے محبت کی تو مجھ پر مصیبت آئی، پھر میرے باپ نے مجھ سے محبت کی تو مجھے کنوئیں میں ڈالا گیا پھر عزیز کی بیوی نے مجھ سے محبت کی تو مجھے قید ہونا پڑا۔

غرض جب دونوں قیدیوں نے اپنا اپنا خواب یوسفؑ سے بیان کیا تو حضرت کو تعبیر دینا مناسب معلوم نہیں ہوا کیونکہ ایک کی تعبیر تکلیف دہ تھی اس پر مصیبت آنے والی تھی اس لئے آپ نے تعبیر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور بعض دوسرے معجزے ظاہر کرنے اور توحید کی دعوت دینے لگے اور

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ إِلَّا نَبَّأْتُكُمَا بِتَأْوِيلِهِ قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَكُمَا ط
یوسفؑ نے کہا جو کھانا تمہارے کھانے کے لئے (تمہارے گھروں سے یا جیل خانہ کے مطبخ سے) آتا ہے وہ آنے نہیں پاتا اس کے آنے سے پہلے ہی میں اس کی حقیقت اور کیفیت تم کو بتا دیا کرتا ہوں۔

بعض کا قول ہے کہ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهِ سے مراد ہے خواب میں کھانے کا آنا اور تَاوِيْلِهٖ سے مراد ہے بیداری میں اس کی تعبیر دینا اور نَبَّأْتُ أَنْ يَّأْتِيَكُمَا سے مراد ہے خواب میں نظر آنے والے واقعہ کا بیداری میں ظہور پذیر ہونا۔ یعنی خواب میں تمہارے کھانے کے لئے آتا ہوا جو کھانا تم کو نظر آتا ہے خارج میں ایسا واقعہ ہونے سے پہلے میں اس کی تعبیر اور تشریح تم کو بتا دیتا ہوں۔

(اکثر علماء کے نزدیک آیت کا مطلب اس طرح) بیان کیا گیا ہے کہ تمہارے گھروں سے جو کھانا کھانے کے لئے تمہارے پاس آتا ہے میں اس کے آنے سے پہلے اس کی مقدار، رنگ، قسم، وقت اور دوسری کیفیت بتا دیتا ہوں گویا آپ کا یہ معجزہ حضرت عیسیٰؑ کے معجزے کی طرح تھا، حضرت عیسیٰؑ نے بھی فرمایا تھا۔ وَأُنَبِّئُكُم بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدَّخِرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ کہنے لگے یہ کام تو غیبی خبریں بتانے والوں اور کاہنوں کا ہے تم کو یہ علم کہاں سے حاصل ہوا۔ حضرت نے فرمایا، میں کاہن نہیں ہوں بلکہ

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِي رَبِّي ط
یہ بتا دینا اس علم کی وجہ سے ہے جو میرے رب نے مجھے عطا فرمایا ہے یعنی میرے رب نے قطعی، یقینی وحی کے ذریعے سے مجھے یہ باتیں بتا دی ہیں یہ علم عطا فرما دیا ہے۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا کہ جو خواب تم دونوں نے مجھ سے بیان کئے ان کی تعبیر میں تمہارے

گھروں سے مقررہ کھانا آنے سے پہلے بتادوں گا اور یہ تعبیر الہام اور وحی کے ذریعے سے اللہ نے مجھے بتادی ہے نہ اس کا تعلق نجوم سے ہے اور نہ کہانت سے۔

بیضاوی نے لکھا ہے دونوں قیدیوں کے سوال کا جواب دینے سے پہلے حضرت یوسفؑ نے ان کو توحید کی صراطِ مستقیم اختیار کرنے کی دعوت دینی چاہی۔ انبیاء اور انبیاء کے جانشینوں کی ہدایت و دعوت کا طریقہ ہی یہ ہے، آپ نے پہلے کچھ غیبی اطلاع بطورِ معجزہ دی تاکہ دعوتِ توحید اور تعبیر خواب کی سچائی ان کے دلوں میں جم جائے۔

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

جو لوگ اللہ کو واحد نہیں مانتے اور آخرت کا انکار خصوصیت کے ساتھ کرتے ہیں ان کا دین تو میں نے قطعاً اختیار ہی نہیں کیا ہے۔ یہ مذکورہ جملہ کی علّت ہے یعنی میرے رب نے مجھے یہ علم عطا فرمایا ہے کیونکہ میں نے کافروں کا دین اختیار ہی نہیں کیا ہے۔

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ اور اپنے باپ دادا ابراہیمؑ اور اسحٰقؑ اور یعقوبؑ کے دین کی پیروی اختیار کی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اِنِّیْ تَرَكْتُ سے الگ مستقل کلام ہو۔ جو دعوت کی تمہید اور خانوادۂ نبوّت سے اپنے کو ظاہر کرنے کے لئے آپ نے فرمایا ہو تاکہ وہ دونوں قیدی رغبت سے سنیں اور آپ کے بیان کا اعتبار کریں۔ اسی جگہ سے یہ بات نکلتی ہے کہ اگر کسی جگہ کسی عالم کے مرتبے سے لوگ واقف نہ ہوں اور وہ اپنی دعوت پھیلانی چاہے تو اگر وہ اپنے اوصاف کسی قدر بیان کر دے تاکہ اس کی بات کی وقعت پیدا ہو جائے تو ناجائز نہیں اس تدبیر سے لوگوں کو اس کے علم سے فائدہ اندوز ہونے کا موقع مل جائے گا۔ یہ بات خودستائی کے ذیل میں نہیں آتی۔ اعمال کا مدار نیت پر ہے انبیاء کو تو تحدیثِ نعمت کا حکم دیا گیا ہے، فرمایا ہے وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ۔

جن اولیاء نے اپنے مراتبِ قُرب اور مدارجِ فوز کا کسی قدر ذکر کیا ہے مثلاً حضرت مجدّد الف ثانی شیخ احمد سرہندی یا حضرت شیخ عالم سیّد الاولیاء محی الدین عبد القادر جیلانی افسوس بعض لوگ نادانی یا حسد کی وجہ سے ان پر طعن کرتے ہیں اور نہیں جانتے کہ یہ بات خودستائی میں داخل نہیں (بلکہ تحدیثِ نعمت ہے)۔

مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ہمارے (گروہ انبیاء) کے لئے جائز اور ممکن نہیں کہ اللہ کے ساتھ (اس کی ذات و صفات میں) کسی چیز کو شریک کریں۔ کیونکہ توحید ہماری فطرت ہے اور اللہ نے شرک سے ہماری حفاظت کی ہے۔

ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

یہ (نعمت توحید و علم) ہم پر اور دوسرے لوگوں پر اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے۔ (ہم پر براہِ راست وحی کے ذریعے سے اور دوسرے لوگوں پر ہماری بعثت ورسالت کے ذریعے سے اور توفیقِ ثبات ادا کرنے کے سبب سے) لیکن اکثر لوگ (یعنی امتِ دعوت) اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے اور متنبّہ نہیں ہوتے کتراتے ہیں۔

یا یہ مطلب ہے کہ یہ (توحید و علم) اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے جو ہم پر بھی ہے اور دوسرے لوگوں پر بھی۔ کہ اس نے روشن دلائل اور کھلی نشانیاں قائم کر دیں مگر اکثر لوگ ان آیاتِ قدرت کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھتے اور اللہ کی قائم کردہ نشانیوں سے استدلال نہیں کرتے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس نعمت کی کوئی قدر ہی نہیں اور وہ کافر نعمت ہیں شکر گزار نہیں ہیں۔ آئندہ آیت میں حضرت نے جیل خانہ والوں کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا۔

یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾

اے جیل کے ساتھیو! کیا متعدّد متفرق رب بہتر ہیں یا ایک اللہ جو سب پر غالب ہے۔ مُتَفَرِّقُوْنَ مختلف، متعدّد جو عاجز اور ممکن ہونے میں ایک جیسے ہیں (سب عاجز اور سب ممکن، معدوم الاصل، فناپذیر ہیں) خواہ سونے چاندی لوہے پتھر وغیرہ کی مورتیاں

ہوں یا ملائکہ جن انسان وغیرہ ہوں۔ الواحد اپنی ذات و صفات میں اکیلا، بے ہمتا، بے مثال، نہ اس کی ذات و صفات میں کوئی اس جیسا ہے نہ افعال میں۔ القہار سب پر غالب جس کا کوئی مقابل اور مقادم نہیں۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ

تم لوگ خدا کو چھوڑ کر چند بے حقیقت ناموں کی ہی پوجا کرتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔

اسماء سے مراد ہے وہ چیز جو الوہیت کے معنی سے خالی ہیں۔ سَمَّيْتُم کا دوسرا مفعول محذوف ہے یعنی جن کا نام تم نے اور تمہارے باپ دادا نے اللہ اور رب رکھ چھوڑا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم ایسے اسماء کی پوجا کرتے ہو جن کا کوئی واقعی وجود نہیں۔ تم خیال کرتے ہو کہ وہ بتوں میں حلول کئے ہوئے ہیں یا مجرد اور (مادی دنیا سے) الگ ہیں۔

مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اللہ نے ان کی کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی یعنی ان کے وجود یا ان کے مستحق الوہیت ہونے کی کوئی دلیل کہیں موجود نہیں۔ جب کہ اللہ کی ہستی اور اس کے استحقاقِ الوہیت کے بکثرت دلائل و براہین موجود ہیں اور اللہ نے اپنے انبیاء اور پیغمبروں پر آیاتِ توحید و معبودیت نازل کر دی ہیں۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۭ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ۭ اور حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے اور اس نے حکم دیا ہے کہ سوائے اس کے کسی کی عبادت نہ کرو، یعنی عبادت کرنے کا حکم تو صرف اللہ کے لئے ہے وہ واجب الوجود بالذات ہے ہر چیز کا خالق اور مُوجِد (عدم سے وجود میں لانے والا) ہے وہی منعم، مالک، ہر چیز پر غالب اور نفع ضرر پہنچانے والا ہے اس کے سوا نہ کوئی مالک اور قاہر ہے نہ کسی کے ہاتھ میں حقیقۃً کسی کا نفع و ضرر ہے لہٰذا وہی بالذات مستحق عبادت ہے اگر کسی دوسرے کی پوجا جائز ہوتی تو اسی کے حکم سے اس کا جواز ہو سکتا تھا مگر اس نے پیغمبروں کی زبانی حکم دے دیا ہے کہ اس کی ذات کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ یہی (توحید کا) سیدھا (ثابت شدہ) طریقہ ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی یہی ثابت شدہ دین ہے دلائل اور براہین اسی کو ثابت کر رہے ہیں۔ لیکن اکثر لوگ حق و باطل میں امتیاز نہیں کرتے اور جہالت میں بھٹکے پھرتے ہیں۔

بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ کا یہ بیان ترتیبی دعوتِ توحید اور تدریجی اظہارِ ثبوت ہے اول آپ نے قیدیوں کو مخاطب کر کے توحید اللہ کی تعددِ آلہہ پر برتری ظاہر فرمائی پھر دلیل کے ساتھ بیان کیا کہ جن کو تم الٰہ کہتے ہو اور جن کی تم پوجا کرتے ہو وہ معبود ہونے کے مستحق نہیں کیونکہ استحقاقِ عبادت یا ذاتی ہو گا یا بالغیر اور اللہ کے سوا کسی اور کو نہ معبودیت کا استحقاق بالذات ہے نہ خدا کا عطا کردہ اس کی آپ نے پُرزور صراحت کر دی کہ دینِ مستقیم اور واقعی حق بات یہی ہے، یہی تقاضۂ عقل و علم ہے اس کے سوا ہر بات فہم و دانش کے خلاف ہے۔ اس سے آگے آپ نے خواب کی تعبیر دی اور فرمایا

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ

اے جیل خانہ کے دونوں ساتھیو! تم میں سے ایک (یعنی ساقی) تو اپنے آقا (یعنی بادشاہ) کو شراب پلائے گا اور دوسرے (یعنی باورچی) کو صلیب دی جائے گی اور پرندے اس کے سر کو (نوچ نوچ کر) کھائیں گے۔ انگور کے تین خوشوں سے تین روز کی طرف اشارہ ہے یعنی جیل خانہ کے اندر تین روز رہے گا، تین روز کے بعد بادشاہ اس کو طلب کرے گا اور سابق عہد پر دوبارہ مقرر کر دے گا اور تین ٹوکریوں سے بھی تین دن کی طرف اشارہ ہے یعنی باورچی جیل خانہ میں تین روز رہے گا۔ تین روز کے بعد جیل خانہ سے نکلوا کر اس کو صلیب پر چڑھا دیا جائے گا۔

میں کہتا ہوں اس تعبیر کا قرینہ شاید یہ ہو کہ باورچی نے کھانے میں واقعی زہر ملا دیا تھا اور ساقی بے قصور تھا (اس لئے بادشاہ کا صحیح فیصلہ یہی ہو سکتا تھا کہ باورچی کو صلیب دے دے اور ساقی کو رہا کر کے سابق عہدے پر فائز کر دے)۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا حضرت یوسفؑ کا بیان سن کر دونوں قیدی کہنے لگے ہم نے تو کوئی خواب نہیں دیکھا

تھا، محض دل لگی کر رہے تھے اس پر حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔

قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ ﴿۴۱﴾ جس بارے میں تم پوچھتے تھے وہ اسی طرح مقرر ہو چکا۔

یعنی جس بات کو تم دریافت کرنا چاہتے تھے اس کے متعلق اللہ کا فیصلہ ہو چکا۔ تم نے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو۔ قضائے خداوندی ویسی ہی ہو چکی ہے جیسا میں نے بیان کر دیا تم دونوں کا انجام یہی ہونا ہے۔

وَقَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ز اور جس شخص کے رہا ہو جانے کا یوسفؑ کو یقین تھا اس سے یوسفؑ نے کہا کہ اپنے آقا کے سامنے میرا تذکرہ کر دینا۔ اور کہہ دینا کہ جیل خانہ کے اندر ایک غلام قیدی ہے جس کو بلا قصور ظلم سے قید کر دیا گیا ہے اور اس کے احوال اس طرح ہیں۔

ظَنَّ کا فاعل اگر یوسفؑ کو قرار دیا جائے تو ظن کا معنی یقین ہوگا کیونکہ ساقی کے رہا ہونے کا آپ کو یقین تھا آپ کا قول قُضِیَ الْاَمْرُ الَّذِیْ فِیْهِ تَسْتَفْتِیٰنِ اس پر دلالت کر رہا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ظَنَّ کی ضمیر ساقی کی طرف لوٹ رہی ہے اس وقت ظَنَّ کا معنی ہوگا غالب گمان یعنی یوسفؑ نے اس شخص سے جس کو اپنی رہائی کا غالب گمان ہو گیا تھا کہا

فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ پھر اس کو شیطان نے اپنے آقا کا ذکر یعنی آقا کے سامنے یوسفؑ کا تذکرہ کرنا بھلا دیا۔ رَبّ سے مراد ہے بادشاہ، حضرت ابن عباسؓ اور اکثر اہل تفسیر نے لکھا ہے (اِنْسَاہ میں ہٗ ضمیر اور رَبّہٖ میں ہٖ ضمیر یوسفؑ کی طرف راجع ہے یعنی) یوسفؑ کو شیطان نے اللہ کی یاد بھلا دی کہ انہوں نے مخلوق سے مدد کی خواہش کی، اللہ کو چھوڑ کر دوسرے سے مصیبت دور کرنے کی درخواست کی اور یوسفؑ کی یہ غفلت شیطان کی اثر اندازی سے پیدا ہوئی (ان کے مقام کا تقاضہ تھا کہ وہ کسی شخص سے سفارش کی بھی تمنا نہ کرتے مقام نبوت و معرفت غیر اللہ سے ظاہری اور مجازی مدد لینے سے بھی انکار کرتا ہے۔ مترجم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحم کرے اگر وہ ایک انسان سے اُذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ نہ کہتے تو جیل کے اندر اتنی طویل مدت نہ رہنا پڑتا، رواہ ابن المنذر و ابن ابی حاتم و ابن مردویہ ع ۵ ۷ ۱۵

فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ﴿۴۲﴾ؑ پس وہ جیل خانہ میں چند سال رہے قتادہ نے کہا بِضْعَ کا اطلاق تین سے نو تک ہوتا ہے۔ بِضْعَ کا معنی ہے کاٹنا۔ مجاہد نے تین سے سات تک کی مدت بیان کیا ہے۔ اکثر مفسرین کا قول ہے یوسفؑ قید خانہ میں سات سال رہے۔ کلبی نے کہا پانچ برس پہلے رہ چکے تھے اور مزید سات برس اُذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ کہنے کے بعد رہے، کل بارہ سال رہے۔

میں کہتا ہوں آیت "دَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَیٰنِ" بتا رہی ہے کہ ساقی اور باورچی آپ کے ساتھ ہی قید ہوئے تھے اور جب وہ دونوں قید خانہ میں تین روز رہے تو یوسفؑ کا ان سے پہلے قید خانہ میں پانچ سال رہنا کیسے ہو سکتا ہے (شاید حضرت مفسر قدس سرہ نے غور نہیں فرمایا کہ باورچی اور ساقی کی کل مدتِ قید تین روز نہیں ہوئی بلکہ عرض خواب اور تعبیر کے بعد تین روز رہے ممکن ہے کہ عرضِ خواب سے پہلے پانچ سال قید میں گزر گئے ہوں فوراً جیل خانہ میں داخل ہوتے ہی تو دعوتی تقریریں اور تبلیغ ایمانی اور عام قیدیوں سے موانست اور ہر ایک کی خدمت اور اخلاقِ کریمہ کا اظہار ممکن نہیں جیسا کہ حضرت مفسرؒ نے سابق روایات کی روشنی میں بیان کیا ہے نہ داخل ہوتے ہی عرضِ خواب کا امکان ہے اس لئے کلبی کا قول ضعفِ روایت کی بنا پر خواہ ضعیف ہو مگر درایت کے خلاف نہیں۔ مترجم)

مالک بن دینار نے کہا جب یوسفؑ نے ساقی سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا تذکرہ کر دینا تو (اللہ کی طرف سے) کہا گیا یوسفؑ مجھے چھوڑ کر تو نے دوسرے کو اپنا وکیل (ذمہ دار) بنایا اب میں ضرور تیری قید طویل کر دوں گا، حضرت یوسفؑ رونے لگے اور عرض کیا میرے رب! مصائب کی کثرت نے میرے دل پر فراموشی طاری کر دی اور میں نے بے سمجھے ایک بات کہہ دی آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔

حسن بصریؒ نے کہا حضرت جبرئیلؑ قید خانہ کے اندر حضرت یوسفؑ کے پاس آئے آپ نے ان کو پہچان لیا اور فرمایا

اخا المُنذِرین (اللہ کے عذاب سے ہلاک ہو جانے سے ڈرانے والوں کے سردار) میں آپ کو آج ان گناہ گاروں میں کیسے دیکھ رہا ہوں، حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اے پاک باپ دادا کے پاک بیٹے اللہ رب العالمین نے تم کو سلام فرمایا ہے اور فرمایا ہے کیا تم کو شرم نہیں آئی کہ (میرے ہوتے) تم نے آدمیوں سے سفارش کی خواستگاری کی۔ قسم ہے اپنی عزت کی میں تم کو مزید چند سال جیل خانہ میں رکھوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کیا اللہ اس حالت میں مجھ سے راضی بھی ہوگا؟ حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا ہاں، حضرت یوسفؑ نے فرمایا تو پھر مجھے قید میں رہنے کی پرواہ نہیں۔

کعب کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یوسفؑ سے کہا اللہ فرماتا ہے کہ تجھے کس نے پیدا کیا؟ حضرت نے جواب دیا اللہ نے، جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے تجھے کنویں کی تکلیف سے کس نے نجات دی یوسفؑ نے کہا اللہ نے۔ جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے تجھے خواب کی تعبیر کس نے سکھائی۔ یوسفؑ نے کہا اللہ نے، جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے چھوٹے بڑے گناہ کا رُخ کس نے تیری طرف سے پھیر دیا، یوسفؑ نے کہا اللہ نے جبرئیلؑ نے کہا اللہ فرماتا ہے پھر تو نے اپنے جیسے آدمی سے کیسے سفارش کی درخواست کی۔

آئندہ وہ حدیث آئے گی جو طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ایک بات یوسفؑ سے نہ ہو جاتی کہ اللہ کے سوا دوسرے سے انہوں نے ازالۂ مصیبت کی درخواست کی تو قید خانہ میں مزید رہنا نہ پڑتا۔

غرض جب سات سال گزرے اور حضرت یوسفؑ کی کشائش کا وقت قریب آگیا تو مصر کے شاہِ اعظم یعنی ریان بن ولید نے ایک عجیب خواب دیکھا جس سے وہ دہشت زدہ ہو گیا اس نے دیکھا کہ سات موٹی گائیں دریا سے برآمد ہوئیں اور ان کے پیچھے سات گائیں اور دریا سے نکلیں جو نہایت دُبلی تھیں، پھر دُبلی گائیں موٹی گایوں کو نگل گئیں اور موٹی گائیں دبلی گایوں کے پیٹ میں گھس گئیں ان کا کوئی نشان بھی نہیں رہا۔ پھر (غلہ کی) سات سبز بالیاں دیکھیں جن میں دانہ پڑ چکا تھا اور سات خشک بالیاں دیکھیں جو کاٹنے کے قابل ہو گئی تھیں خشک بالیاں سبز بالیوں سے لپٹیں اور ان پر غالب آگئیں یہاں تک کہ ان کی سبزی بالکل جاتی رہی۔ بادشاہ نے جادوگروں کو، کاہنوں کو، اہلِ دانش و فہم کو اور خواب کی تعبیر دینے والوں کو جمع کیا اور ان سے اپنا خواب بیان کیا، یہی تذکرہ آیاتِ ذیل میں اللہ نے فرمایا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ إِنِّي أَرَىٰ سَبْعَ بَقَرَاتٍ سِمَانٍ يَأْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَسَبْعَ سُنبُلَاتٍ خُضْرٍ وَأُخَرَ يَابِسَاتٍ ۖ يَا أَيُّهَا الْمَلَأُ أَفْتُونِي فِي رُؤْيَايَ إِن كُنتُمْ لِلرُّؤْيَا تَعْبُرُونَ ﴿٤٣﴾

اور بادشاہ نے کہا میں نے خواب میں دیکھا کہ سات موٹی گائیں ہیں جن کو سات دُبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں سبز ہیں اور ان کے علاوہ سات اور خشک بالیں ہیں اے درباری سردار! اگر تم خواب کی تعبیر دے سکتے ہو تو میرے اس خواب کے بارے میں کچھ دقیق جواب دو۔

عِجاف: عَجفاء کی جمع نہیں ہے عَجفاء کی جمع عُجف آتی ہے لیکن سِمان کی لفظی اور وزنی مناسبت کی وجہ سے لفظ عِجاف ذکر کیا۔

تعبیر کا معنی ہے مثالی صورتوں سے ان معانی کی طرف انتقال جن کی عالم مثال (عالم اشباح) میں یہی شکلیں ہیں۔ تعبیر عبور سے بنا ہے جس کا معنی ہے گزر جانا، عبرت الرؤیا عبارۃً عبّرت الرؤیا تعبیراً سے زیادہ ثابت ہے۔

قَالُوا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ ۖ وَمَا نَحْنُ بِتَأْوِيلِ الْأَحْلَامِ بِعَالِمِينَ ﴿٤٤﴾ وہ کہنے لگے کہ یہ تو پریشان خیالات ہیں اور ایسے خوابوں کی تعبیر سے واقف نہیں، اضغاث احلام گڑبڑ جھوٹے خواب۔ اضغاث: ضِغث کی جمع ہے۔ ضغث کا معنی ہے گھاس وغیرہ کا گٹھا، مجازاً جھوٹا خواب مراد لیا گیا ہے۔ حلم خواب۔ اس کا فعل باب نصر سے آتا ہے۔ چونکہ خواب میں مختلف چیزیں جمع تھیں اس لئے اضغاث کو بصیغہ جمع ذکر کیا، بتأویل الاحلام میں اَحلام سے

مراد ہیں جھوٹے خواب۔ یعنی ان خوابوں کی ہماری پاس کوئی تعبیر نہیں، تعبیر تو سچے خوابوں کی ہوتی ہے۔ تعبیر نہ جاننے کا دوسرا عذر انہوں نے پیش کیا (اول عذر اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ کا لفظ کہہ کر انہوں نے پیش کیا)

وَقَالَ الَّذِیْ نَجَا مِنْهُمَا وَادَّكَرَ بَعْدَ اُمَّةٍ اَنَا اُنَبِّئُكُمْ بِتَاْوِیْلِهٖ فَاَرْسِلُوْنِ ﴿۴۵﴾

دونوں قیدیوں میں سے جس شخص نے (قید اور الزام قتل سے) رہائی پائی تھی اور ایک مدت کے بعد یوسفؑ کی یاد اس کو ہوئی اس نے کہا میں اس کی تعبیر تم کو بتاؤں گا مجھے جیل خانہ میں یوسفؑ کے پاس بھیج دو۔ یعنی ساقی نے کہا جس کو یوسفؑ کی اور آپ کے قول اذکرنی عِنْدَ رَبِّکَ کی یاد مدت کے بعد ہوئی۔ امت بمعنی جماعت اس جگہ مراد مجموعہ ایام یعنی ایک طویل مدت سات برس کا زمانہ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ ساقی نے بادشاہ کے سامنے دوزانوں ہو کر کہا جیل خانہ میں ایک آدمی ہے جو خواب کی تعبیر دیا کرتا ہے۔ مجھے اس کے پاس جانے کی اجازت دے دیجئے۔ بادشاہ نے اس کو یوسفؑ کے پاس بھیج دیا، حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قید خانہ شہر کے اندر نہیں تھا۔ جب ساقی یوسفؑ کے پاس پہنچا تو اس نے کہا۔

یُوْسُفُ اَیُّهَا الصِّدِّیْقُ اے یوسفؑ! اے بڑے سچے (آدمی) ساقی نے یوسفؑ اس لئے کہا کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھی کے بارے میں آپ کی سچی تعبیر کا تجربہ کر چکا تھا اور آپ کی صداقت کو جان چکا تھا۔

اَفْتِنَا فِیْ سَبْعِ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاْكُلُهُنَّ سَبْعٌ عِجَافٌ وَّسَبْعِ سُنْۢبُلٰتٍ خُضْرٍ وَّاُخَرَ یٰبِسٰتٍ

آپ ہم لوگوں کو اس خواب کا (جواب) یعنی تعبیر دیجئے کہ سات گائیں موٹی ہیں ان کو سات دبلی گائیں کھا گئیں اور سات بالیں ہری ہیں اور دوسری سات بالیں خشک ہیں اور خشک بالوں نے لپٹ کر ہری بالوں کو بھی خشک کر دیا مطلب یہ کہ یہ خواب بادشاہ نے دیکھا ہے اور آپ کے پاس بھیجا ہے اس کی تعبیر دیجئے۔

لَّعَلِّیْٓ اَرْجِعُ اِلَى النَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۶﴾ تاکہ میں ان لوگوں کے (یعنی بادشاہ اور اہلِ دربار) کے پاس لوٹ کر جاؤں (اور خواب کی تعبیر بتادوں) تاکہ ان کو علم ہو جائے۔

اس شخص نے لَعَلِّیْ شاید کلمہ شک کا استعمال کیا اور قطعی یقین کا لفظ نہیں کہا کیوں کہ خواب ہی ایسا تھا کہ لوگ اس کی تعبیر سے عاجز ہو گئے تھے اور بادشاہ دہشت زدہ ہو گیا تھا گویا بڑا خوفناک خواب تھا نتیجہ پر پہنچنے کا یقین نہ تھا۔ لعلّھم یَعْلمون کا مطلب یہ ہے کہ خواب کی تعبیر سن کر شاید لوگوں کو آپ کا مرتبہ معلوم ہو جائے اور وہ آپ کے کمالِ علمی کے متعارف ہو جائیں۔ اس جگہ بھی لَعَلَّ کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ اس کو اس بات میں تردّد تھا کہ لوگ مانیں گے بھی یا نہیں۔ اہلِ فضل کے فضائل کو دیکھ کر بھی متنبہ ہوتے ہیں یا نہیں حضرت یوسفؑ کے کمالات اور طہارت و عفّت کو دیکھ کر بھی عزیزِ مصر نے آپ کی فضیلت کا اعتراف نہیں کیا اور جیل میں ڈال دیا۔

قَالَ یوسفؑ نے کہا سات موٹی گائیں اور سبز بالیں تو ارزانی اور کثرتِ پیداوار کے سات سال ہیں اور سات دبلی گائیں اور خشک بالیں قحط کے سات برس ہیں۔

تَزْرَعُوْنَ سَبْعَ سِنِیْنَ دَاَبًا تم سات سال متواتر غلّہ بونا۔ دَاْب معمول، عادت بعض علماء کے نزدیک دَاْب سے مراد ہے انتہائی محنت اور کوشش۔ بعض اہلِ تفسیر نے لکھا یہ جملہ اگرچہ خبریہ ہے مگر مقصد حکم دینا ہے (امر بصورتِ خبر بھی کبھی آتا ہے)۔

فَمَا حَصَدْتُّمْ فَذَرُوْهُ فِیْ سُنْۢبُلِهٖٓ پھر جو (فصل) کاٹو اس کو بالیوں میں ہی رہنے دینا (تاکہ گھن نہ لگ جائے)

اِلَّا قَلِیْلًا مِّمَّا تَاْكُلُوْنَ ﴿۴۷﴾ مگر تھوڑا سا جو تمہارے کھانے میں آئے (اس کو بالیوں سے نکال لینا) یعنی پیداوار کے سات سالوں میں جتنا غلہ کھانے میں صرف ہو وہ نکال لینا۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ سَبْعٌ شِدَادٌ يَّأْكُلْنَ مَا قَدَّمْتُمْ لَهُنَّ
پھر اس کے بعد سات برس بہت سخت آئیں گے کہ جو تم نے ان کے لئے پہلے سے جمع کرر کھا ہوگا اس کو کھاجائیں گے یعنی ان سالوں میں لوگ پچھلا اندوختہ کھاجائیں گے خواب کے ساتھ تعبیر کو مطابق بنانے کے لئے کھانے کی نسبت قحط کے سالوں کی طرف کی، ورنہ کھانے والے لوگ ہوتے ہیں سال نہیں کھایا کرتے۔

اِلَّا قَلِيْلًا مِّمَّا تُحْصِنُوْنَ ﴿۴۸﴾ مگر تھوڑا سا حصہ (کھانے سے محفوظ رکھا) جو بیج کے لئے تو بچا رکھو گے۔

ثُمَّ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَامٌ فِيْهِ يُغَاثُ النَّاسُ وَفِيْهِ يَعْصِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ ع۷ پھر اس کال کے بعد ایک برس ایسا آئے گا جس میں لوگوں کے لئے خوب بارش ہوگی اس میں لوگ پھلوں کے عرق نچوڑیں گے اور شرابیں بنائیں گے۔

یُغَاثُ، غَیث سے مشتق ہے غیث کا معنی بارش ہوگی یا غَوث سے مشتق ہے غوث فریاد رسی یعنی لوگوں کی واویلا اور فریاد قبول کی جائے گی) اور اللہ ان پر رحم فرمائے گا۔ مترجم (یَعْصِرُوْنَ وہ نچوڑیں گے یعنی انگور زیتون طرح طرح کے پھل اور تل (سرسوں اور دوسرے روغن دانہ سے) نچوڑیں گے مطلب یہ کہ سرسبزی پیداوار اور آسائش کا سال ہوگا۔

ابو عبیدہ نے تعصُرون بصیغۂ خطاب بضم صاد پڑھا ہے اس کا مصدر عصر ہے جس کا معنی ہے نجات پانا یعنی تم تکلیف اور کال سے نجات پالو گے۔

حضرت یوسف نے اول سات موٹی اور دبلی گایوں اور سات سبز اور سات خشک بالیوں کی مراد بیان کی اور دبلی گایوں کے موٹی گایوں کو کھاجانے اور خشک بالیوں کے سبز بالوں سے لپٹ کر ان کو بھی خشک کر دینے کا تعبیری مطلب بیان کیا پھر کال کے ختم ہونے اور ارزانی کا سال آنے کی بشارت دی (بشارت کا تعلق اگرچہ خواب کی تعبیر سے نہ تھا مگر آپ نے بشارت اس لئے دی) کہ قحط کے سالوں کی تعداد پیداوار کے سالوں سے نہ بڑھ جائے۔ (اور اس طرح تعبیر میں غلطی ہو جائے کیونکہ دبلی گایوں اور خشک بالوں کی تعداد بھی سات ہی تھی اگر پندرھواں سال بھی قحط کا ہوتا تو سات سے ایک عدد بڑھ جاتا) بیضاوی نے لکھا ہے شاید آپ کو پیداوار اور ارزانی کا سال آنے کی اطلاع وحی سے ہوگئی ہو یا اپنی فراستِ ایمانی سے سمجھ لیا ہو کہ اللہ کی دستور اور ضابطہ یہی ہے کہ تنگی کے بعد فراخی عطا فرماتا ہے اور اس لئے کال کے بعد پیداوار کا سال ضرور آئے گا۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖ ۚ اور بادشاہ نے کہا میرے پاس اس کو لاؤ یعنی ساقی خواب کی تعبیر لے کر جب بادشاہ کے پاس پہنچا اور وہ سمجھ گیا کہ تعبیر یقیناً صحیح ہے اور ایسا ضرور ہوگا اور اس بات سے اس نے یوسف کی بزرگی کا اندازہ کر لیا تو آپ کو بلوایا۔

فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ ۔ پس جب بادشاہ کا قاصد یوسف کے پاس پہنچا اور اس نے کہا بادشاہ نے آپ کو طلب کیا ہے تو حضرت نے اس وقت تک اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا جب تک آپ پر سے بدچلنی کی تہمت دور نہ ہو جائے اور سب لوگ آپ کی پاک دامنی کا اقرار نہ کر لیں۔

قَالَ ارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَسْئَلْهُ مَا بَالُ النِّسْوَةِ الّٰتِيْ قَطَّعْنَ اَيْدِيَهُنَّ ؕ کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اور اس سے پوچھو کہ جن عورتوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے ان کا کیا حال ہے کچھ تم کو بھی پتہ ہے کیا واقعہ ہوا تھا۔

اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی کو اپنے اوپر سے تہمت کو دفع کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ خصوصاً اگر پیشوا اور مقتدا ہو (تو اس کے لئے تو بہت ہی ضروری ہے کہ لگائی گئی تہمت سے اپنی برائت ثابت کرے۔

آپ نے عزیز کی بیوی کا نام لے کر ذکر نہیں کیا ایسا محض ادب اور احترام کے پیش نظر کیا ورنہ اصل مجرم تو وہی تھی۔

اسحاق بن راہویہ نے مسند میں اور طبرانی نے معجم میں نیز ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس کی روایت سے بیان کیا ہے

کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے اپنے بھائی یوسفؑ کے صبر اور کرم پر تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس خواب کی تعبیر لینے آدمی پہنچا (اور انہوں نے تعبیر دے دی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک جیل خانے سے باہر نہ آجاتا ایسا نہ کرتا۔ اور ان کے صبر اور کرم پر مجھے (اس لئے بھی) تعجب ہے اللہ ان کی مغفرت کرے کہ ان کے پاس رہائی کا حکم لے کر آدمی پہنچا اور انہوں نے باہر نکلنے سے انکار کر دیا اور اپنا عذر بیان کر دیا اگر (میں ان کی جگہ) ہوتا تو فوراً دروازے کی طرف دوڑ پڑتا۔ اگر ایک بات یوسفؑ کے منہ سے نہ نکل جاتی تو وہ قید خانہ میں مزید سالوں کے لئے نہ رہتے انہوں نے اللہ کے علاوہ دوسروں سے مصیبت دور کرنے کی خواہش کی۔

عبد الرزاق اور ابن جریر نے اپنی تفسیروں میں عکرمہ کی روایت سے مرسلاً نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے یوسف اور ان کے کرم و صبر پر تعجب ہے اللہ ان کو بخشے، جب ان سے موٹی اور دبلی گایوں کی تعبیر پوچھی گئی (تو انہوں نے بغیر شرط پیش کئے تعبیر دے دی) اگر میں ان کی جگہ ہوتا تو جب تک قید سے باہر نکلنے کی شرط نہ کر لیتا تعبیر نہ بتاتا اور مجھے تعجب ہے کہ جب قاصد بادشاہ کا پیام طلب لے کر ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے کہا اپنے آقا کے پاس لوٹ کر جاؤ اگر میں ان کی جگہ ہوتا اور اتنی مدت مجھے جیل خانہ کے اندر رہنا پڑتا جتنی مدت وہ رہے تو میں فوراً طلب کو قبول کر لیتا اور آگے آگے دروازے پر پہنچ جاتا اور عذر معذرت کا طلب گار نہ ہوتا۔ بلاشبہ وہ صاحب حلم اور بڑے بردبار تھے۔ اصل حدیث صحیحین میں مختصر آئی ہے۔

فائدہ:- رسول اللہ ﷺ نے حضرت یوسفؑ کے حال پر تعجب کیا اور فرمایا میں فوراً طلب کو قبول کر لیتا۔ حقیقت میں یہ قول آپ کے کمال نزول پر دلالت کر رہا ہے۔ (بہت پیغمبروں کو بلکہ سبھی کو کمالِ عروج تو حاصل تھا مگر کمالِ نزول کے مرتبے پر فائز کم ہی پیغمبر ہوئے ہیں جن میں سے حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور حضرت رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی کو شمار کیا جاسکتا ہے۔ مترجم) کمالِ نزول پر ہی دین کی عمومی اشاعت و قبول اور تاثیر و تکمیل (اور تبعین کی کثرت) موقوف ہے، حضرت مجدد قدس سرہ نے اس بحث کی پوری تنقیح اپنے مکتوبات میں کی ہے یہ اتنا باریک نکتہ ہے کہ اکثر کاملین کی رسائی فہم سے بھی خارج ہے ناقصوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔

اِنَّ رَبِّیْ بِکَیْدِهِنَّ عَلِیْمٌ ﴿۵۰﴾　بلاشبہ میرا رب ان کے مکر سے خوب واقف ہے جب کہ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی مالکہ کا کہنا مان لو یا مجھے اپنی طرف بہکا کر مائل کرنا چاہا تھا۔ اس جملہ میں ان عورتوں کے مکر کی بڑائی کا اظہار کیا ہے اور علم الٰہی کو بطورِ شہادت پیش کیا ہے اور عورتوں کی تہمت سے اپنی پاک دامنی کا اظہار کیا ہے اور عورتوں کو ان کی مکاری پر انجامِ بد کی دھمکی بھی دی ہے یہ سارا مضمون اس ایک فقرہ سے مترشح ہو رہا ہے یوسفؑ کے پاس سے جواب لے کر قاصد بادشاہ کے پاس پہنچا اور بادشاہ نے ان عورتوں کو اور عزیز کی بیوی کو بلوایا اور

قَالَ مَا خَطْبُکُنَّ　کہا تمہارا کیا واقعہ ہے جواب دو۔ خطب اس امر کو کہتے ہیں جس کا خطاب کیا جاسکے۔ یعنی صاحبِ واقعہ سے پوچھا جاسکے۔ بادشاہ نے سب عورتوں سے خطاب کیا، اس سے مراد یا تو صرف عزیز کی بیوی سے خطاب کرنا تھا یا سب عورتیں مخاطب تھیں کیونکہ سب نے یوسفؑ کو مکر کے ساتھ اپنی طرف مائل کرنا چاہا سب نے زلیخا کا کہا ماننے کا مشورہ دیا تھا۔

اِذْ رَاوَدْتُّنَّ یُوْسُفَ عَنْ نَّفْسِهٖ　جب کہ یوسفؑ کو تم نے پھسلایا تھا یعنی تم میں سے کسی نے یوسفؑ کو اپنی طرف مائل ہوتے پایا جب کہ تم نے ان کو بہکانے کی سازش کی تھی۔

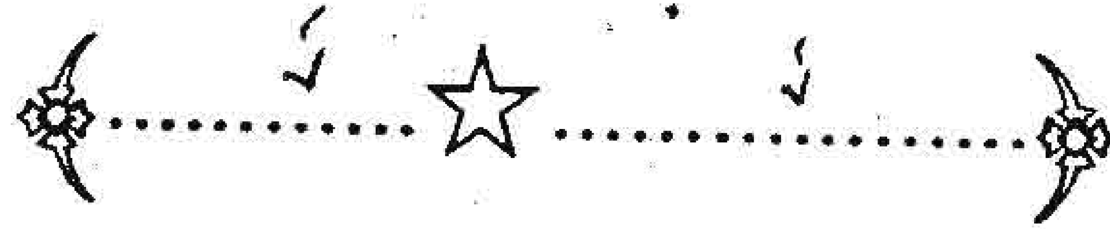
قُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ　انہوں نے کہا پاکی ہے اللہ کے لئے اور تعجب ہے کہ اللہ نے یوسفؑ کو کیسا پاک دامن پیدا کیا ہے۔

مَا عَلِمْنَا عَلَیْهِ مِنْ سُوْٓءٍ ط　ہم کو ان میں ذرا بھی تو برائی کی بات نہیں معلوم ہوئی۔ سُوء سے مراد ہے گناہ اور خیانت۔ کہا گیا ہے کہ ان عورتوں نے عزیز کی بیوی کو سخت سست کہا یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ عزیز کی بیوی کو جب اندیشہ ہوا کہ یہ عورتیں میرے خلاف شہادت دیں گی تو اس نے خود اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور

قَالَتِ امْرَاَتُ الْعَزِيْزِ الْـٰٔنَ حَصْحَصَ الْحَقُّ ۫ اَنَا رَاوَدْتُّهٗ عَنْ نَّفْسِهٖ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿۵۱﴾
عزیز کی بیوی نے کہا اب تو حق بات سب پر ظاہر ہو ہی گئی میں نے ہی اپنے مطلب کے لئے ان کو پھسلایا تھا اور بلا شبہ وہ ہی سچے ہیں۔ حَصْحَصَ ظاہر ہو گیا، حصحص الشّعر بال گر گئے اور جلد ظاہر ہو گئی۔ یا حصحص کا معنی ہے ثابت ہو گیا، ٹھہر گیا، حصحص البعیر اونٹ اپنی جگہ جم کر بیٹھ گیا۔ وَاِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ یعنی وہ اس بات میں سچے ہیں کہ میں نے ان کو پھسلایا تھا۔

ذٰلِكَ لِيَعْلَمَ اَنِّيْ لَمْ اَخُنْهُ بِالْغَيْبِ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ كَيْدَ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۲﴾
یہ (باتیں یعنی قاصد کو جواب دے دینا اس کے ساتھ نہ جانا میں نے) اس لئے کیں کہ اس کو (یعنی عزیز کو) یقین کے ساتھ معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کے پسِ پشت اس کی غیر موجودگی میں (اس کی آبرو میں) کوئی خیانت نہیں کی اور یہ بھی (معلوم ہو جائے) کہ اللہ خیانت کرنے والوں کے فریب کو چلنے نہیں دیتا۔

بالغیب پسِ پشت جب کہ میں اس کے اور وہ میرے سامنے موجود نہ تھا۔ یا غَیب سے مراد ہے پوشیدہ مقام، بند کمروں کے اندر۔ لَا يَهْدِیْ نافذ نہیں کرتا، درست نہیں ہونے دیتا بلکہ حق کو ظاہر کرتا ہے خواہ کچھ مدّت کے بعد ہی ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ خیانت کرنے والوں کو ان کے مکر کے سببِ ہدایت نہیں کرتا۔ اَلْخَآئِنِيْنَ اصل میں لَا يَهْدِیْ کا مفعول تھا مگر اس کی جگہ کَیْد کو مفعول قرار دینے سے کلام میں زور آگیا۔ اس میں زلیخا کی خیانت کاری پر طنز اور اپنی امانت کا قوّت کے ساتھ اظہار ہے۔ اسی لئے آگے فرمایا۔



تیرھواں پارہ شروع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ　اور میں (بذاتِ خود) اپنے نفس کو پاک نہیں قرار دیتا۔ اس کلام میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ اس سے میری مراد اپنی پاکیزگی کا اظہار اور بر خود غرور نہیں بلکہ اللہ کے انعام کو ظاہر کرنا مقصود ہے کہ اس نے مجھے محفوظ رکھا اور عصمت کی توفیق دی اور بادشاہ کو میرا پیرو بنایا۔ ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی مرفوع روایت نقل کی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جب یوسفؑ نے کہا میرے اس جواب کی وجہ یہ ہے کہ عزیز کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی آبرو میں اس کی غیر موجودگی میں کوئی دست درازی نہیں کی تو جبرئیلؑ نے کہا (کیا اس وقت بھی آپ نے خیانت نہ کی تھی) جب گناہ کا ارادہ کیا تھا اس پر یوسفؑ نے کہا وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِیْ۔ بیضاوی نے حدیث حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً نقل کی ہے۔

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ　کیونکہ نفس تو (از خود) بُری ہی بات بتاتا ہے۔ نفس سے مراد ہے نفسِ حیوانی جو عناصر اربعہ (مادّیہ) سے پیدا ہوتا ہے عالم امر کے لطائف میں سے قلب اور روح ہے قلب اور روح کا حامل یہی نفس ہے۔ چونکہ اس نفس کا تولیدی مرکز عناصر اربعہ مادّیہ ہیں اس لئے اس کا بالطبع میلان (حیوانی) خواہشات اور اخلاق رذیلہ کی جانب ہے غضب اور غرور عنصر نار کا مقتضی ہے۔ کمینگی اور دنائت کا اقتضاء زمین کا ہے۔ تیز نگی اور صبر کا فقدان پانی کی خصوصیت ہے دل لگی اور لہو لعب ہوا کا خاص کرشمہ ہے۔

اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ط　سوائے اس کے جس پر میرا رب رحم کرے۔

مَا رَحِمَ میں مَا بمعنی مَنْ ہے جیسے آیت مَا طَابَ لَکُمْ مِنَ النِّسَآءِ میں مَا بمعنی مَنْ ہے۔ یعنی جس پر میرا رب رحم کرے اور اس کو بچالے تو وہ نفس کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اس کا مقابلہ کرتا ہے اسی جہادِ نفس کی وجہ سے اس کو ملائکہ پر برتری حاصل ہو جاتی ہے۔

یا وقت رَحْمَۃِ رَبِّیْ مراد ہے اس وقت ما مصدریہ ہو گا یعنی جس وقت انسان اللہ کی رحمت کو پالیتا ہے خواہ اللہ کی طرف سے براہ راست انتخاب کی وجہ سے یا انبیاء کی پیروی کے ذریعے سے تو اللہ کی طرف سے پاکیزگی عطا ہونے کی وجہ سے اس کا نفس پاک ہو جاتا ہے اللہ نے فرمایا ہے فَلَا تُزَکُّوْٓا اَنْفُسَکُمْ تم اپنے نفوس کو پاک نہ قرار دو۔ دوسری آیت ہے بَلِ اللّٰہُ یُزَکِّیْ مَنْ یَّشَآءُ بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے ایسا نفس اللہ کی رضامندی پر راضی ہو جاتا ہے۔ اللہ کی طرف سے اس کو خطاب ہوتا ہے ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ اے نفسِ مطمئنہ اپنے رب کی طرف لوٹ تو اللہ سے خوش اللہ تجھ سے خوش اور میرے نیک بندوں میں شامل ہو جا۔ اس حالت میں اللہ نفس کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے اور نیکیوں اور بھلائیوں میں تمام لطائفِ امر کا امام بنا دیتا ہے اور جن صفات کی تجلی کو عالم امر کے خالص لطائف برداشت کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان صفات کی تجلی کا حامل یہ نفس ہو جاتا ہے۔

بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اِلَّا مَا رَحِمَ میں استثناء منقطع ہے اِلَّا کا معنی ہے لٰکِنْ یعنی نفس بدی کا راستہ بتاتا ہے لیکن میرے رب کی رحمت بدی کو اس کی طرف سے پھیر دیتی ہے اور بدی کو نیکی سے بدل دیتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ دونوں آیتیں زلیخا کا مقولہ ہیں اور مَنْ رَحِمَ سے مراد ہیں "حضرت یوسفؑ اور ان جیسے دوسرے لوگ" اس قول پر آیات کا مطلب اس طرح ہو گا زلیخا نے کہا میں نے یوسفؑ کی بے گناہی کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ اس لئے کہا کہ یوسفؑ کو معلوم ہو جائے کہ میں نے اس کی خیانت نہیں کی، یعنی اس کے غیر حاضر ہونے کی حالت میں بھی اس پر دروغ تراشی نہیں کی اور جب مجھ سے اس کے

متعلق پوچھا گیا میں نے سچی بات ہی کہہ دی اور میں خیانت سے اپنے نفس کو بالکل پاک نہیں کہتی کیونکہ اتنی خیانت میں نے ضرور کی کہ اس کو متہم کیا اور عزیز سے کہا مَا جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّآ اَنْ يُّسْجَنَ۔ پھر میں نے ہی اس کو قید بھی کرا دیا۔ گویا اس قول سے اس نے اپنی پچھلی حرکت کا عذر پیش کرنا چاہا اور کہا نفس تو برائی کا راستہ بتانے والا ہے سوائے ان لوگوں کے جن پر میرا رب رحم کرے جیسے یوسفؑ اور اس کی طرح دوسرے لوگ کہ اللہ نے اپنی رحمت سے اس کو گناہ سے بچالیا۔

اِنَّ رَبِّيْ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵۳　بے شک میرا رب بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ نفس کے ارادے اور تصورات کے بخشنے والا ہے اور جس پر چاہتا ہے رحم فرماتا ہے گناہ سے محفوظ رکھتا ہے یا یہ مطلب ہے کہ جو گناہگار اس سے معافی طلب کرے اس کو معاف کر دیتا ہے اور طالب رحم و مغفرت پر رحم کرتا ہے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُوْنِيْ بِهٖٓ اَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِيْ ۚ　اور بادشاہ نے اہلِ دربار سے کہا ان کو میرے پاس لے آؤ میں ان کو خاص اپنے کام کے لئے رکھوں گا۔

جب یوسفؑ کی بے گناہی بادشاہ پر ظاہر ہو گئی اور آپ کے علم و امانت کا مرتبہ بھی اس کو معلوم ہو گیا تو اس نے یوسفؑ کو طلب کیا اور کہا میں براہِ راست اپنے لئے ان کو رکھنا چاہتا ہوں (یعنی عزیزِ مصر یا کسی اور کی ماتحتی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ مترجم) حسب الحکم قاصد آپ کے پاس پہنچا اور کہا چلئے بادشاہ نے طلب کیا۔ عبدالحکم نے فتوح مصر میں بطریق کلبی بوساطت ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ قاصد نے یوسفؑ کے پاس پہنچ کر گزارش کی اب قید خانہ کے کپڑے اتار کر نئے کپڑے پہن لیجئے اور بادشاہ کے پاس چلئے ابن ابی شیبہ اور ابن المنذر نے فرید عمی کی روایت سے بیان کیا کہ یوسفؑ نے جب عزیزِ مصر کو دیکھا تو دعا کی الٰہی میں تجھ سے اس کی خیر کے بجائے تیری خیر کا طلب گار ہوں۔ اور اس کے شر سے تیرے غلبہ کی پناہ پکڑتا ہوں۔ بغوی کا بیان ہے آپ کھڑے ہو گئے اور قیدیوں کے لئے دعا کی اے اللہ! نیکوں کے دلوں کو ان پر مہربان کر دے اور (شہر و ملک کی) خبریں ان پر پوشیدہ نہ کر۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شہر کی خبروں سے وہاں کے قیدی بہت زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔ قید خانہ سے نکلے تو قید خانہ کے دروازہ پر یہ بات لکھ دی یہ زندوں کا قبرستان ہے، غموں کا گھر ہے، دوستوں کی آزمائش اور دشمنوں کی خوشی کا مقام ہے، پھر آپ نے قید خانہ کا میل کچیل دھویا، بدن صاف پاک کیا اور خوبصورت کپڑے پہن کر بادشاہ کے پاس جانے کے ارادے سے چل دیئے۔

وہب نے بیان کیا جب شاہی دروازے پر پہنچے تو فرمایا میرا رب میرے لئے کافی ہے دنیا سے بے نیاز کرنے والا ہے۔ میرا رب میرے لئے کافی ہے، اپنی مخلوق سے بے احتیاج کر دینے والا ہے اس کی پناہ لینے والا غالب رہتا ہے اس کی ثنا بڑی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس کے بعد گھر کے اندر داخل ہوئے اور بادشاہ کے سامنے پہنچے تو دعا کی اے اللہ میں اس کی خیر کی بجائے تیری خیر کا تجھ سے طالب ہوں اور اس کے اور دوسروں کے شر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں، بادشاہ نے جب آپ کی طرف دیکھا تو آپ نے اس کو عربی میں سلام کیا بادشاہ نے کہا یہ کیا زبان ہے، فرمایا میرے چچا اسماعیلؑ کی زبان ہے، پھر آپ نے بادشاہ کو عبرانی زبان میں دعا دی، بادشاہ نے پوچھا یہ کونسی زبان ہے فرمایا یہ میرے باپ دادا کی زبان ہے۔ بادشاہ ان دونوں زبانوں سے ناواقف تھا اگرچہ ستر زبانوں میں گفتگو کر سکتا تھا جس زبان میں بات کرتا تھا آپ اسی زبان میں جواب دیتے تھے، مگر عبرانی اور عربی مزید جانتے تھے جن سے بادشاہ واقف نہ تھا۔ حضرت یوسفؑ کی اس وقت عمر تیس سال کی تھی اس نوجوانی میں آپ کے یہ کمالات دیکھ کر متحیر ہو گیا اور اپنے قریب بٹھایا۔

فَلَمَّا كَلَّمَهٗ قَالَ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ۝۵۴　جب بادشاہ نے ان سے باتیں کیں تو ان سے کہا کہ آپ ہمارے نزدیک آج (سے) بڑے معزز اور معتبر ہیں، بغوی نے لکھا ہے بادشاہ نے حضرت نے یوسفؑ سے کہا میں اپنا خواب آپ کے منہ سے اپنے سامنے سننا چاہتا ہوں، فرمایا بہت اچھا سینئے۔ اے بادشاہ! آپ نے خواب میں دیکھا سات سفید رنگ کی خوبصورت گائیں نیل میں سے برآمد ہوئیں اور ساحلِ نیل سے نکل کر آپ کے سامنے آئیں ان کے تھن دودھ سے بھرے

ہوئے تھے اس کے بعد نیل کی کیچڑ سے سات دبلی گائیں برآمد ہوئیں جو بھوکی تھیں ان کے پیٹ لگے ہوئے تھے ان کے پاس نہ دودھ تھا نہ تھن، ان کی داڑھیں تھیں اور کیلے (جیسے نوکیلے دانت) تھے، اور کتوں کے پنجوں کی طرح پنجے تھے اور درندوں کی ناک کی طرح ان کی ناکیں تھیں، درندوں کی طرح انہوں نے موٹی گایوں کو چیر پھاڑ ڈالا، کھال کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا، گوشت کھا لیا، ہڈیوں کو ریزہ ریزہ کر دیا اور مینگنی کو چوس لیا۔ آپ یہ منظر دیکھ کر تعجب ہی کر رہے تھے کہ ایک ہی جڑ سے اناج کی سات سبز بالیں اور سات سیاہ (خشک) بالیں نمودار ہوئیں جڑ کے سوتے سب کے کیچڑ اور پانی کے اندر تھے آپ یہ تماشا دیکھ ہی رہے تھے اور تعجب کر رہے تھے کہ جب جڑ ایک ہے اور سوتے سب کے پانی میں ہیں تو یہ سبز خوشہ دار اور وہ سوکھی سیاہ بالیں کہاں سے پیدا ہو گئیں یکایک ایک ہوا چلی جس کی وجہ سے خشک بالیوں کے پتے جھڑ کر سبز خوشہ دار بالیوں پر گرے اور سبز بالیوں میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر سیاہ ہو گئیں یہ خواب دیکھ کر آپ بیدار ہو گئے اور دہشت زدہ ہو گئے۔ بادشاہ نے کہا خدا کی قسم یہ خواب اگرچہ عجیب تھا مگر اس کی تعجب آفرینی اس بیان سے زیادہ نہیں جو میں نے آپ سے سنا۔ اے سچے انسان اب اس خواب کے متعلق آپ کیا مشورہ دیتے ہیں، آپ نے فرمایا میری رائے یہ ہے کہ ان پیداوار کے سالوں میں آپ کاشت بہت زیادہ کرائیں اور پیدا شدہ غلہ کو مع ان کے درختوں اور بالیوں کے ذخیرہ کر لیں تاکہ (قحط کے سالوں میں) درخت اور بالیں (یعنی سب کا بھوسہ) جانوروں کی خوراک بن جائے اور لوگوں کو آپ یہ بھی حکم دے دیں کہ وہ اپنے غلہ کا پانچواں حصہ اٹھا کر الگ رکھ دیا کریں (اور اس طرح ہر سال کی پیداوار کا پانچواں حصہ ان کے پاس جمع ہو جائے) جو غلہ آپ اسٹاک کر لیں گے وہ تو مصر اور اطرافِ مصر کے لئے کافی ہو جائے گا اور جب دور کے اطراف سے لوگ آپ کے پاس غلہ کی طلب میں آئیں گے تو آپ کے پاس ان سے وصول کیا ہوا روپیہ اتنا جمع ہو جائے گا کہ آپ سے پہلے مصر کے بادشاہوں میں سے کسی کے پاس جمع نہ ہوا ہو گا۔ بادشاہ نے کہا اس کام کی سرانجام دہی کون کرے گا کون غلہ جمع کرے گا کون فروخت کرے گا یہ دھندا میری طرف سے کون کرے گا۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلَى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ﴿۵۵﴾ یوسفؑ نے کہا مجھے ملکِ (مصر) کی پیداوار اور مال پر مقرر کر دو میں اس کام کی بخوبی نگہداشت کرنے والا اور جاننے والا ہوں۔ حضرت یوسفؑ نے اپنی امانت داری اور کارگزاری کا خود اظہار کیا اور خود عہدہ طلب کیا تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے احکام مخلوق میں جاری کر سکیں، حق کو قائم کریں اور عدل کو دنیا میں پھیلائیں اسی کام کے لئے انبیاء آتے ہیں اور ان کی بعثت کی غرض یہی ہوتی ہے آپ کو معلوم تھا کہ میرے سوا اور کوئی اس کام کو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا پس آپ نے عہدۂ حکومت کی طلب اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کی تھی جاہ واقتدار کی طلب نہ تھی، خلفاء راشدین کی خلافت کا مقصد بھی یہی تھا اور حضرت علیؓ کا حضرت معاویہؓ سے جھگڑا بھی اسی بنیاد پر تھا کیوں کہ آپ اس کام کے زیادہ اہل تھے حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں آپ کو اپنے نفس پر زیادہ قابو تھا اور احکامِ الٰہی کو جاری کرنے کی صلاحیت آپ میں حضرت معاویہؓ سے زیادہ تھی۔

بیضاوی نے کہا طلبِ عہدہ کی شاید یہ وجہ ہو کہ آپ نے یہ تو محسوس کر لیا تھا کہ بادشاہ مجھے کوئی کام سپرد کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے آپ نے عہدہ کی تعیین کر دی اور ایسے کام کی ذمہ داری طلب کی جس کا فائدہ عمومی تھا اور سب لوگ اس سے مستفید ہو سکتے تھے۔

اس آیت سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اگر انسان کو اپنی ذات پر اطمینان اور بھروسہ ہو تو حکومت کا کوئی عہدہ اور قضاء کی طلب جائز ہے اور اپنی اہلیتِ کار کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ہے ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ بادشاہ کافر ہو یا ظالم اس کی طرف سے کسی کام پر مامور ہونا (بشرطیکہ وہ کام افادیتِ عامہ رکھتا ہو اور جاہ طلبی کا داعیہ نہ ہو) جائز ہے، ظالموں اور فاسقوں کی طرف سے ہمارے محترم اسلاف محکمۂ قضاء کی خدمت اسی غرض سے قبول کرتے رہے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ (حاکم یوسفؑ نہ تھے صرف مشیر تھے) بادشاہ آپ سے مشورہ لے کر خود حکم جاری کرتا تھا اور آپ کی رائے میں دخل نہ دیتا تھا، گویا اجراء احکام میں آپ کا تابع تھا۔ بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ میرے بھائی یوسفؑ پر رحم فرمائے اگر وہ اِجۡعَلۡنِیۡ عَلٰی خَزَآئِنِ الۡاَرۡضِ نہ کہتے تو بادشاہ ان کو فوراً حاکم بنادیتا مگر (اس لفظ کو کہنے کی وجہ سے) بادشاہ نے وہ سال ٹال دیا اس مدّت میں یوسفؑ بادشاہ کے پاس اس کے گھر میں رہتے رہے۔

بغوی نے دوسری سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جس روز حضرت یوسفؑ نے درخواستِ حکومت کی تھی اس دن سے جب ایک سال کی مدّت گزر گئی تو بادشاہ نے آپ کو بُلا کر تاج پہنایا اور شاہی تلوار باندھی اور جواہر سے جڑا ہوا تخت آپ کے لئے بچھوایا اور تخت کے گرد ریشمی پردہ لٹکا دیا تخت تیس ہاتھ لمبا اور دس ہاتھ چوڑا تھا اس پر دس بستر بچھے ہوئے تھے اور ساٹھ باریک پردے تھے پھر تاج پہن کر آپ کو بر آمد ہونے کا حکم دیا، آپ سر پر تاج رکھے بر آمد ہوئے برف کی طرح آپ کا رنگ گورا اور چاند کی طرح روشن تھا، بدن کی صفائی کی وجہ سے چہرے کا رنگ (یعنی عکس) بدن پر نظر آتا تھا آپ اس شان کے ساتھ جا کر تخت پر بیٹھ گئے۔ تمام حُکّام آپ کے فرماں بردار ہوگئے بادشاہ مصر کی پوری حکومت آپ کو سپرد کر کے اپنے گھر میں چلا گیا۔ بادشاہ نے قطفیر کو اس کے عہدے سے معزول کر دیا اور یوسفؑ کو اس کی جگہ مقرر کر دیا۔ یہ قول ابن اسحاق کا ہے۔

ابن زید کا بیان ہے کہ ریّان شاہِ مصر کے پاس خزانے بہت تھے تمام خزانے اس نے یوسفؑ کے تصرّف میں دے دیئے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن اسحاق کی روایت سے بیان کیا ہے اہلِ روایت نے ذکر کیا ہے کہ اسی زمانہ میں قطفیر کا انتقال ہو گیا اور بادشاہ نے اس کی بیوی زلیخا سے یوسفؑ کا نکاح کرا دیا۔ نکاح کے بعد یوسفؑ زلیخا کے پاس پہنچے تو ان سے فرمایا کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے جو تم چاہتی تھیں زلیخا نے جواب دیا۔ اے صدّیق! مجھے آپ ملامت نہ کریں آپ کو معلوم ہے کہ میں خوبصورتی میں ایک ہی عورت تھی اور یہ بھی جانتے ہی ہیں کہ حکومت اور دنیا کے لحاظ سے میں کتنے عیش میں تھی اور میرا شوہر عورتوں کے قابل نہ تھا اور آپ کے حسن و صورت کی جو حالت تھی وہ بھی خداداد تھی اس لئے آپ کو دیکھ کر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ اہلِ روایت کا خیال ہے کہ یوسفؑ نے زلیخا کو دوشیزہ پایا اور زلیخا کے بطن سے آپ کے دو لڑکے پیدا ہوئے افرائیم اور میشا۔

غرض مصر کی حکومت یوسفؑ کے لئے مستقل ہوگئی آپ وہیں مقیم ہوگئے، مرد اور عورت سب آپ کو پسند کرتے تھے آیتِ ذیل اس کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ؕ　اور ہم نے ایسے عجیب طور سے یوسفؑ کو اس سرزمین میں جماؤ عطا کر دیا کہ وہاں جس جگہ چاہیں رہیں۔ یعنی بادشاہ کی مجلس میں جس طرح ہم نے یوسفؑ کو جگہ دی اسی طرح سرزمینِ مصر میں ہر جگہ اس کو رہنے کا اختیار دیا وہ جہاں چاہتا رہ سکتا تھا۔

نُصِيْبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَّشَآءُ وَلَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾　ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نعمت عطا کرتے ہیں اور نیکو کاروں کے اجر کو ضائع نہیں کرتے۔

''رحمت'' سے مراد ہے نعمت اور ''اجر'' سے مراد ہے فوراً یا کچھ مدّت کے بعد نکلنے والا اچھا نتیجہ۔ اَلْمُحْسِنِيْنَ سے حضرت ابن عباسؓ اور وہب کے نزدیک صبر کرنے والے مراد ہیں۔ مجاہد وغیرہ نے کہا، حضرت یوسفؑ برابر بادشاہ کو اسلام کی دعوت دیتے رہے، آخر بادشاہ مسلمان ہو ہی گیا اور بہت سے لوگ بھی مشرّف باسلام ہوگئے اس طرح حضرت یوسفؑ کو دُنیوی اجر مل گیا۔

وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۷﴾ ع　اور بلاشبہ ثواب آخرت دنیوی اجر سے ان لوگوں کے لئے بہتر ہے جو ایمان لائے اور نافرمانی سے بچتے رہے۔

جب حضرت یوسفؑ اطمینان کے ساتھ حکومت پر جم گئے تو انہوں نے غلہ جمع کرنے کی تدبیر کی بڑی بڑی حفاظت گاہیں اور غلہ رکھنے کے گھر بنوائے اور قحط سالی کے لئے وہاں غلہ جمع کیا اور معمول کے مطابق بقدرِ ضرورت خرچ بھی کیا یہاں تک کہ پیداوار کی کثرت کے سال گزر گئے اور قحط سالی کا دور آگیا اور ایسا ہولناک قحط پڑا جس کی نظیر کبھی سننے میں آئی تھی نہ دیکھنے میں۔

روایت میں ہے کہ حضرت یوسفؑ نے بادشاہ اور بادشاہ کے مُصاحبین کے لئے ہر روز صرف ایک بار دوپہر کے وقت کھانا مقرر کیا تھا قحط سالی کے دور میں سب سے پہلے آدھی رات کے وقت بادشاہ ہی کو بھوک نے ستایا اور وہ بھوک بھوک کہہ کر چلا

اٹھا، حضرت یوسفؑ نے فرمایا یہ کال کا زمانہ ہے۔ کال کے اول سال پبلک کا سارا اندوختہ ختم ہو گیا اور لوگ یوسفؑ سے غلہ خریدنے لگے، حضرت نے نقد روپیہ لے کر غلہ دے دیا اور اس طرح مصر کا ہر سکہ اور درہم و دینار آپ کے پاس آگیا، دوسرے سال زیور اور جواہر لے کر اناج فروخت کیا، تیسرے سال چوپائے اور مویشی دے کر لوگوں نے غلہ لیا، چوتھے سال غلام اور باندیاں دے کر غلہ حاصل کیا، پانچویں سال جائیدادیں، زمینیں اور گھر بھی غلے کے عوض بیچ ڈالے، چھٹے سال بچے فروخت کر دیئے اور ساتویں سال خود اپنی جانوں کا بیعنامہ کر دیا، یہاں تک کہ نقد جنس، زیور، جانور، باندی غلام سب کچھ یوسفؑ کا ہو گیا، اہلِ مصر کی کوئی چیز نہیں رہی اور آخر میں اولاد بھی اپنی نہیں رہی، بلکہ ہر شخص یوسفؑ کا غلام ہو گیا۔

میں کہتا ہوں اگر یہ روایت صحیح ہو تو شاید شریعتِ یوسفی میں جائز ہو کہ کوئی شخص اپنی جان و اولاد کو فروخت کر دے، چور کو غلام بنا لینا تو آپ کی شریعت میں جائز ہی تھا۔ بعض علماء نے فتویٰ بھی دیا ہے کہ کال کی وجہ سے روٹی کے لئے آدمی اپنی جان اور اپنی اولاد کو بھی فروخت کر سکتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہماری شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

غرض یہ حالت دیکھ کر رعایا بول اٹھی کہ ایسا عالی قدر مالکِ کل بادشاہ اور کوئی نہیں ہوا جو ساری رعایا کے جان مال اور اولاد کا مالک ہو گیا ہو۔ یوسفؑ نے بادشاہ سے کہا اب آپ کی کیا رائے ہے؟ بادشاہ نے کہا جو آپ کی رائے وہی میری رائے۔ ہم تو آپ کے تابع ہیں۔ حضرت نے فرمایا تو میں اللہ کو اور آپ کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ تمام اہلِ مصر کو میں نے آزاد کر دیا، ان کی ساری املاک (زر و جواہر، مویشی و جانور) ان کو واپس کرتا ہوں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت کال کے زمانے میں خود بھی بھوکے رہتے تھے، لوگوں نے کہا سارا غلہ ملکِ مصر کا تو آپ کے قبضے میں ہے اور آپ بھوکے رہتے ہیں، فرمایا میرا پیٹ بھرا ہو گا تو اندیشہ ہے کہ میں بھوکے کو بھول جاؤں گا، بادشاہ کے باورچیوں کو بھی آپ نے حکم دے دیا تھا کہ بادشاہ کے لئے صرف دوپہر کو ہی کھانا تیار کریں، کہیں پیٹ بھرنے کے بعد بادشاہ بھوکوں کو بھول نہ جائے۔ اسی بنا پر بادشاہ ناشتہ دوپہر کو کرتے ہیں (کہ صبح سے دوپہر تک بھوکے رہیں اور بھوکوں کو بھولنے نہ پائیں)۔

اہلِ مصر کے علاوہ چاروں طرف سے لوگ حضرت یوسفؑ کے پاس غلہ لینے آتے تھے مگر آپ کسی کو خواہ وہ کتنا بڑا آدمی ہو بارِ شتر سے زیادہ اناج نہیں دیتے تاکہ تھوڑا تھوڑا سب لوگوں کو پہنچ جائے لوگوں کے آپ کے پاس ٹھٹ لگے رہتے تھے اور آپ سب کو دیتے تھے۔ کنعان اور شام کے باشندے بھی قحط میں مبتلا ہو گئے، عمومی کال سے وہ بھی محفوظ نہیں رہے۔ حضرت یعقوبؑ اور آپ کے اہل و عیال مقامِ غرمات علاقہءِ فلسطین سرحدِ شام میں رہتے تھے ان لوگوں کی زندگی صحرائی زندگی تھی اونٹ اور بکریاں پالتے تھے، حضرت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو غلہ لینے کے لئے مصر بھیجا اور فرمایا مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہاں کا بادشاہ مردِ صالح ہے لوگوں کے ہاتھ غلہ فروخت کرتا ہے۔ تم بھی تیار ہو جاؤ اور مصر جا کر غلہ لاؤ آپ نے یوسفؑ کے بھائی بینامین کو اپنے پاس روک لیا اور دوسرے بیٹوں کو روانہ ہو جانے کا حکم دے دیا۔

وَجَآءَ اِخْوَةُ يُوْسُفَ فَدَخَلُوْا عَلَيْهِ فَعَرَفَهُمْ وَهُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ ۝۵۸

اور یوسفؑ کے بھائی آئے اور یوسفؑ کے پاس پہنچے تو یوسفؑ نے ان کو پہچان لیا اور وہ یوسفؑ کو نہ پہچان سکے۔ یعنی دس بھائی یوسف کے پاس پہنچے۔ حضرت ابن عباسؓ اور مجاہد نے فرمایا حضرت یوسفؑ نے پہلی ہی نظر میں بھائیوں کو پہچان لیا، حسن نے کہا اول نظر میں نہیں پہچانا جب انہوں نے اپنا تعارف کرایا تو پہچانا۔

حضرت ابن عباسؓ سے بھائیوں کے یوسفؑ کو نہ پہچاننے کی یہ وجہ بیان کی کہ کنویں میں ڈالنے اور اب سامنے آنے کے درمیان چالیس برس کی مدت گزر گئی تھی۔ طولِ زمانہ شناخت سے مانع ہوا۔ عطا نے کہا حضرت یوسفؑ اس وقت شاہانہ تاج پہنے شاہی تخت پر رونق افروز تھے اس لئے بھائی نہ پہچان سکے۔ بعض نے کہا اس وقت آپ شاہی ریشمی لباس پہنے تھے اور گردن میں سونے کا ہار تھا۔

میں کہتا ہوں اس قول کی بنیاد اس مسلّمہ پر ہو سکتی ہے کہ شریعتِ یوسفی میں مرد کے لئے سونا اور ریشمی لباس کا پہننا

درست تھا۔

حضرت یوسفؑ نے بھائیوں کو دیکھا تو انہوں نے عبرانی زبان میں کلام کیا آپ نے فرمایا مجھے بتاؤ تم کون لوگ ہو اور تمہارا کیا کام ہے میں تم کو نہیں جانتا، بھائیوں نے کہا ہم ملک شام کے چرواہے ہیں، قحط کی تکلیف میں مبتلا ہو کر آپ کے پاس غلہ لینے آئے ہیں حضرت نے فرمایا شاید آپ لوگ ہمارے ملک میں یہاں کے احوال کی جستجو میں آئے ہیں، کہنے لگے خدا کی قسم ہم جاسوس نہیں ہیں سب ایک باپ کی اولاد ہیں ہمارا باپ پیرِ صادق ہے اس کو اللہ کے پیغمبروں میں شمار کیا جاتا ہے حضرت یوسفؑ نے کہا آپ لوگ کتنے ہیں بولے ہم بارہ بھائی تھے، ہمارا ایک بھائی جاتا رہا وہ ہم سب میں چھوٹا تھا، جنگل کو گیا تھا وہاں مر گیا۔ باپ کی نظر میں وہ سب سے پیارا تھا، آپ نے پوچھا یہاں تم کتنے ہو، بولے دس ہیں فرمایا ایک اور کہاں ہے بولے باپ کے پاس رہ گیا ہے جب سے اس کا ماں جایا بھائی مرا ہے باپ کو اسی سے تسکینِ خاطر ہوتی ہے، فرمایا کون جانے کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو وہ سچ بھی ہے یا نہیں، کہنے لگے بادشاہ سلامت ہم تو اجنبی ملک میں ہیں یہاں تو ہم کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ آخر حضرت یوسفؑ نے ہر ایک کو ان کی تعداد کے مطابق ایک ایک اونٹ غلے کا دے دیا اور سب کا سامانِ سفر درست کرا دیا۔ "جہاز" سامانِ سفر کو کہتے ہیں۔

وَلَمَّا جَهَّزَهُم بِجَهَازِهِمْ قَالَ ائْتُونِي بِأَخٍ لَّكُم مِّنْ أَبِيكُمْ ۚ اور جب ان کا سامانِ سفر درست کرا دیا تو یوسفؑ نے ان سے کہا (اب کی مرتبہ) اپنے علاتی بھائی کو میرے پاس لے کر آنا، اگر تم سچے ہو۔ اگر تم اپنے بھائی کو لے آؤ گے تو ایک بارِ شتر میں تم کو اور دوں گا اور تمہاری عزت بڑھاؤں گا۔

أَلَا تَرَوْنَ أَنِّي أُوفِي الْكَيْلَ وَأَنَا خَيْرُ الْمُنزِلِينَ ﴿٥٩﴾ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میں غلہ کا ناپ پورا دیتا ہوں (کسی کو کم نہیں دیتا) اور میں بہترین میزبان ہوں، مجاہد نے کہا یعنی تمہاری مہمانی اچھی طرح کرتا ہوں۔

فَإِن لَّمْ تَأْتُونِي بِهِ فَلَا كَيْلَ لَكُمْ عِندِي وَلَا تَقْرَبُونِ ﴿٦٠﴾ اور تم اس کو میرے پاس لے کر نہ آئے تو میرے پاس نہ آنا تم کو ایک ناپ غلہ بھی میرے پاس سے نہیں ملے گا اور میرے ملک میں بھی داخل نہ ہونا۔

لا تقربون یا نہی کا صیغہ ہے یا نفی ہے جس کا عطف جزا پر ہے (میرے پاس نہ آنا، یا قریب بھی نہ آؤ گے)۔

قَالُوا سَنُرَاوِدُ عَنْهُ أَبَاهُ وَإِنَّا لَفَاعِلُونَ ﴿٦١﴾ بولے اس کی طرف سے باپ کو پھسلانے کی ہم کوئی تدبیر ضرور کریں گے اور (جو کچھ آپ نے حکم دیا اس کی) بلاشبہ تعمیل کریں گے۔ یعنی اس کی جدائی کا غم باپ کو ضرور ہو گا مگر ہم کوئی چال چلیں گے اور باپ کے پاس سے لانے کی کوئی تدبیر کریں گے اور اس کی طرف سے باپ کو پھسلائیں گے، حضرت یوسفؑ نے فرمایا تو اپنے میں سے کسی بھائی کو میرے پاس بطورِ ضمانت چھوڑ جاؤ تاکہ اس کو لا سکو، یہ سن کر بھائیوں نے آپس میں قرعہ اندازی کی قرعہ میں شمعون کا نام نکل آیا، شمعون وہی شخص تھا جس کی یوسفؑ کے متعلق سب بھائیوں سے زیادہ اچھی رائے تھی (اور اسی نے مشورہ دیا تھا کہ یوسفؑ کو قتل نہ کرو) چنانچہ شمعون کو یوسفؑ کے پاس چھوڑ دیا، باقی سب چلے گئے۔

وَقَالَ لِفِتْيَانِهِ اجْعَلُوا بِضَاعَتَهُمْ فِي رِحَالِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَعْرِفُونَهَا إِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمْ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿٦٢﴾

اور یوسفؑ نے اپنے (غلہ ناپنے والے) خادموں سے کہا ان کا سرمایہ (یعنی غلہ کی قیمت جو انہوں نے دی ہے) انہیں کے سامان میں رکھ دو تاکہ گھر لوٹ کر جب وہ (لوٹایا ہوا) سرمایہ دیکھیں گے تو واپسی کا حق پہچان کر امید ہے لوٹ آئیں گے۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے بیان کیا کہ ان کا سرمایہ جو انہوں نے غلہ کی قیمت میں دیا تھا جوتے اور کھالیں تھیں۔ بعض نے کہا کہ آٹھ بورے کسی قسم کے ستو تھے۔ اول قول حسبِ رائے بغوی زیادہ صحیح ہے۔

بعض علماء نے کہا کہ حضرت یوسفؑ نے تکمیلِ احسان اور اتمامِ نوازش کے جذبہ کے زیرِ اثر بھائیوں کا سامان واپس رکھوا دیا تھا کہ وہ جانیں کہ بادشاہ کی ہم پر بڑی عنایت ہے کہ اس نے سامان بھی واپس کر دیا اور اسی خیال کے تحت دوبارہ مصر کو لوٹ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسفؑ نے باپ اور بھائیوں سے غلہ کی قیمت وصول کرنا اچھا نہ سمجھا اور ایسی حالت میں کہ باپ

بھائی محتاج تھے، قیمت لینے کو کمینہ پن خیال کیا۔ کلبی نے کہا یوسفؑ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں باپ کے پاس اور روپیہ نہ ہو اور روپیہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ لوٹ کر نہ آئیں۔ بعض نے کہا حضرت یوسفؑ کو معلوم تھا کہ یہ امانت دار لوگ ہیں ان کی دیانت ان کو آمادہ کرے گی کہ یہ سرمایہ لوٹا کر لائیں یہ اس پونجی کو اپنے لئے حلال نہ سمجھیں گے۔

فَلَمَّا رَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْهِمْ قَالُوْا جب لوٹ کر باپ کے پاس پہنچے تو بولے ابا! ہم ایک ایسے شخص کے پاس پہنچے کہ اس نے ہماری بڑی مہمانی کی اور ایسی عزت کی کہ اگر نسلِ یعقوبؑ کا بھی کوئی آدمی ہوتا تو ہماری اتنی عزت نہ کرتا، حضرت یعقوبؑ نے یہ بات سن کر فرمایا جب تم شاہِ مصر کے پاس لوٹ کر جاؤ تو اس سے میر اسلام کہنا اور کہنا کہ آپ نے جو ہمارے ساتھ احسان کیا ہے اس کے عوض ہم آپ کے لئے دعا کرتے ہیں اللہ آپ پر رحمت نازل فرمائے۔ پھر فرمایا شمعون کہاں ہے۔ بیٹوں نے جواب دیا اس کو شاہِ مصر نے بطورِ ضمانت اپنے پاس روک لیا ہے اس کے بعد پورا قصہ بیان کر دیا، حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اس کو یہ بات بتائی ہی کیوں۔ بیٹوں نے جواب دیا اس نے ہم سے عبرانی زبان میں گفتگو کی اور کہا تم جاسوس ہو اور پورا قصہ بیان کر کے کہا۔

يٰٓاَبَانَا مُنِعَ مِنَّا الْكَيْلُ ہم کو غلہ دینے کی ممانعت کر دی گئی ہے یعنی اگر ہم بنیامین کو لے کر نہ جائیں گے تو آئندہ ہم کو غلہ نہیں ملے گا۔ کیل (ناپ۔ پیمانہ) سے مراد ہے غلہ۔ کذا قال الحسن۔ بعض اہل تفسیر نے اس جملہ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ شاہِ مصر نے ہم میں سے ہر ایک کے نام بنام تو غلہ دے دیا اور بنیامین کے نام کا غلہ نہیں دیا۔

فَاَرْسِلْ مَعَنَآ اَخَانَا نَكْتَلْ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴿۶۳﴾ لہٰذا آپ ہمارے ساتھ ہمارے بھائی کو بھیج دیں تاکہ ہم کو غلہ مل جائے (اور کوئی مانع نہ رہے یا یہ مطلب ہے کہ اس کے حصہ کا غلہ بھی مل جائے) اور ہم یقیناً اس کی حفاظت کریں گے۔ کوئی تکلیف اور دکھ نہ ہونے دیں گے۔

قَالَ هَلْ اٰمَنُكُمْ عَلَيْهِ اِلَّا كَمَآ اَمِنْتُكُمْ عَلٰٓى اَخِيْهِ مِنْ قَبْلُ ۭ فَاللّٰهُ خَيْرٌ حٰفِظًا ۠ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۶۴﴾

(یعقوبؑ نے) کہا کیا میں اس کے بارے میں تمہارا ویسا ہی اعتبار کروں جیسا اس کے بھائی کے بارے میں اس سے پہلے کیا تھا (تم کیا حفاظت کرو گے) اللہ ہی سب سے بڑھ کر محافظ ہے اور وہی سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے امید ہے کہ اللہ اس کی حفاظت کرے گا اور مجھ پر رحم فرمائے گا۔

وَلَمَّا فَتَحُوْا مَتَاعَهُمْ وَجَدُوْا بِضَاعَتَهُمْ رُدَّتْ اِلَيْهِمْ ۭ اور جب انہوں نے اپنا سامان کھولا تو اپنا سرمایہ (یعنی وہ سرمایہ جو غلہ کی قیمت میں انہوں نے شاہِ مصر کو دیا تھا) اس کے اندر پایا جو ان کو واپس کر دیا گیا تھا۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا مَا نَبْغِيْ ۭ کہنے لگے ابا (لیجئے) اور ہم کو کیا چاہیے..... یعنی اس سے بڑھ کر اور کیا احسان و کرم ہو گا کہ شاہِ مصر نے ہماری مہمان نوازی کی، خاطر و مدارات کی اچھی طرح سے رکھا پھر غلہ ہمارے ہاتھ فروخت کیا اور پھر ہماری دی ہوئی قیمت بھی ہم کو لوٹا دی۔

یا یہ مطلب ہے کہ اس سے بڑھ کر ہم بھلائی کے طالب نہیں، یا یہ مطلب ہے کہ بادشاہ کے احسان کے متعلق کلام کرنے میں ہم اور کیا چیز طلب کریں یا یہ مطلب ہے کہ ہم اپنے بیان میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے ہماری سچائی کی دلیل آپ کے سامنے آگئی، یا یہ مطلب ہے کہ ہم مزید سرمایہ آپ سے طلب نہیں کرتے۔

هٰذِهٖ بِضَاعَتُنَا رُدَّتْ اِلَيْنَا ۚ یہ ہمارا سرمایہ موجود ہے جو ہم کو لوٹا دیا گیا ہے۔

وَنَمِيْرُ اَهْلَنَا وَنَحْفَظُ اَخَانَا وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ۭ اور اپنے گھر والوں کے واسطے رسد لائیں گے اور اپنے بھائی کی حفاظت کریں گے اور ایک بار شتر غلہ زیادہ لائیں گے...... نَمِیْر کا عطف فعل محذوف پر ہے، یعنی ہمارا یہ سامان واپس کر دیا گیا تاکہ ہم اس سے قوت حاصل کریں اور گھر والوں کے لئے رسد خریدنے کے واسطے بادشاہ کے پاس لوٹ کر جائیں اور وہاں سے غلہ لائیں۔ اس صورت میں مانبغی میں مَا استفہامیہ ہو گا۔

مَارَ، يَمِيْرُ مَيْرًا (مجرد) اِمْتَارَ، يَمْتَارُ، اِمْتِيَارًا (ثلاثی مزید باب افتعال) دوسرے شہر سے غلہ لے کر آیا۔ یہ بھی

ممکن ہے کہ اس کا عطف مَا نَبْغِی پر ہو اور مَا نافیہ ہو یعنی ہم اور کسی چیز کے طلبگار نہیں اور گھر والوں کے لئے غلہ لائیں گے۔
نحفظ آخانا یعنی آمدورفت میں ہر خطرہ سے اس کی حفاظت کریں گے۔ نَزْدَادُ کَیْلَ بَعِیْرٍ یعنی اس کے حصہ کا ایک بار شتر غلہ ہم مزید حاصل کریں گے فی کس ایک اونٹ غلہ ملتا تھا۔
ذٰلِکَ کَیْلٌ یَّسِیْرٌ ﴿۶۵﴾ یہ غلہ (جو ہم لائے ہیں) تھوڑا ہے گھر والوں کے لئے کافی نہیں۔ یا یہ (مزید) غلہ آسان ہے بادشاہ سخی ہے اس کو کوئی دُشواری نہیں نہ اس سے ملنے میں دُشواری ہے۔
قَالَ لَنْ اُرْسِلَهٗ مَعَكُمْ حَتّٰى تُؤْتُوْنِ مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ لَتَاْتُنَّنِیْ بِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ
(یعقوبؑ نے) کہا اس کو اُس وقت تک ہرگز تمہارے ساتھ نہیں بھیجوں گا جب تک اللہ کی قسم کھا کر مجھے پکا وعدہ نہ دو گے کہ تم اس کو ضرور میرے پاس لے ہی آؤ گے ہاں اگر کہیں گھر ہی جاؤ تو مجبوری ہے۔
مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ یعنی ایسا عہد جس کو اللہ کی قسم کھا کر پختہ کیا گیا ہو یا اس پر اللہ کو گواہ بنایا گیا ہو۔
اِلَّاۤ اَنْ یُّحَاطَ بِكُمْ کا مطلب مجاہد نے بیان کیا مگر یہ کہ تم سب ہلاک ہو جاؤ۔ قتادہ نے کہا مگر یہ کہ تم بے بس اور مغلوب ہو جاؤ اور تم میں حفاظت کی طاقت ہی نہ رہے۔
یہ استثناء مفرّغ ہے یعنی ہر حال میں تم اس کی حفاظت کرو گے ہاں اگر ایسی حالت ہو جائے کہ تم بے بس ہو جاؤ یا یہ مطلب ہے کہ اس کو واپس لانے سے کسی وجہ سے تم باز نہ رہو گے مگر یہ کہ تم مغلوب ہو جاؤ۔
فَلَمَّاۤ اٰتَوْهُ مَوْثِقَهُمْ پس جب انہوں نے باپ کو مضبوط عہد دے دیا، کہا گیا ہے کہ انہوں نے کہا اللہ، ربّ محمد کی قسم۔ غرض یہ کہ انہوں نے جب انتہائی کوشش کی اور قسمیں کھالیں اور بنیامین کو بھیجے بغیر حضرت یعقوبؑ کو کوئی چارہ نہ رہا تو
قَالَ اللّٰهُ عَلٰى مَا نَقُوْلُ وَكِیْلٌ ﴿۶۶﴾ (یعقوبؑ نے) کہا جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں اس پر اللہ گواہ (یا نگراں) ہے۔ کعب نے کہا جب حضرت یعقوبؑ نے فَاللّٰهُ خَیْرٌ حَافِظًا کہا تو اللہ نے فرمایا اپنی عزت کی قسم تو نے مجھ پر بھروسہ کیا ہے تو میں دونوں کو لوٹا کر تیرے پاس پہنچا دوں گا۔
وَقَالَ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ
(بیٹے جب حضرت یعقوبؑ کے پاس سے جانے لگے تو) یعقوب نے کہا میرے بیٹو! شہر کے ایک دروازے سے یعنی ساتھ ساتھ داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازہ سے گھُسنا۔ حضرت یعقوبؑ کے بیٹے بڑے حسین و جمیل، سرو قامت، گل رخسار، صحت مند اور طاقت ور جوان تھا اور شاہِ مصر کے نزدیک ان کی عزت زباں زد خلائق تھی اس وجہ سے حضرت یعقوب کو خیال ہوا کہ کہیں (اجتماعی ہیئت میں داخل ہوتے دیکھ کر) کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ حدیث میں آیا ہے نظر حق ہے۔ نظر لگنے کے متعلق جو احادیث آئی ہیں۔ سورہ نون کی وَاِنْ یَّكَادُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ الخ کی تفسیر میں ہم نے ذکر کر دی ہیں۔
پہلی مرتبہ روانگی کے وقت حضرت یعقوبؑ نے بیٹوں کو یہ نصیحت نہیں کی تھی شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس وقت ان سے کوئی مصر میں واقف نہ تھا پھر بنیامین بھی ان کے ساتھ نہ تھا اور اس مرتبہ (کوئی بیٹا پاس نہیں رہا تھا) بنیامین بھی روانہ ہو رہا تھا۔ ابراہیم نخعی نے کہا کہ یوسفؑ کے سامنے جُدا جُدا جانا مقصود تھا۔ اول تشریح زیادہ صحیح ہے۔
وَمَاۤ اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اور میں اللہ کی طرف سے آئی ہوئی کسی بات کو بھی اس کے مقابلہ میں دفع نہیں کر سکتا۔ یعنی جو ہونے والی چیز ہے وہ ہو کر رہے گی اللہ کا جو حکم ہو چکا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احتیاط تقدیر سے نہیں بچاتی۔ رواہ الحاکم امام احمد نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے اور بزاز نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے یہ حدیث بیان کی ہے۔
اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے۔ اللہ کے سوا اور کسی کا حکم نہیں چلتا۔ جو حکم خدا ہو چکا ہے وہ برابر تم

کو پہنچے گا اس کے مقابلہ میں کوئی چیز تم کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی اس سے آگے حضرت یعقوبؑ نے اللہ ہی پر اپنے اعتماد و توکل کا اظہار کیا اور فرمایا

عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ﴿۶۷﴾ اسی پر میرا بھروسہ ہے اور اسی پر بھروسہ کرنے والوں کو توکل کرنا چاہئے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا مِنْ حَيْثُ أَمَرَهُمْ أَبُوهُمْ ۖ مَا كَانَ يُغْنِي عَنْهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا حَاجَةً فِي نَفْسِ يَعْقُوبَ قَضَاهَا ۚ اور جب وہ (مصر پہنچ کر شہر کے اندر) اس طور پر داخل ہوئے جس طرح باپ نے ان کو حکم دیا تھا تو یہ (داخلہ) اس چیز کو بالکل دفع نہ کر سکتا تھا جو اللہ کی طرف سے آنے والی تھی مگر یعقوبؑ کے دل میں خواہش تھی جس کو انہوں نے پورا کر لیا (اور ہمارے سکھا دینے کی وجہ سے وہ تھے بلا شبہ جاننے والے، اسی لئے انہوں نے وَمَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ کہہ دیا تھا لیکن اکثر لوگ اس کا علم نہیں رکھتے) روایت میں آیا ہے کہ شہر کے چار دروازے تھے چاروں دروازوں سے یہ لوگ داخل ہوئے تھے۔ مَا كَانَ يُغْنِي: یعنی دفع نہیں کر سکتا۔ مِنَ اللَّهِ: اللہ کے طے شدہ فیصلے سے کچھ بھی۔ چنانچہ بنیامین پکڑے گئے اور حضرت یعقوبؑ پر دوہری مصیبت پڑ گئی إِلَّا حَاجَةً یعنی یہ فقط یعقوبؑ کا ارمان تھا فقط شفقت پدرانہ تھی کہ کہیں ان کو نظر نہ لگ جائے۔ قضاها یعنی اپنی خواہش کو یعقوبؑ نے ظاہر کر دیا اور بیٹوں کو نصیحت کر دی۔

وَإِنَّهُ لَذُو عِلْمٍ لِمَا عَلَّمْنَاهُ اور وہ بلا شبہ جاننے والے تھے ہمارے سکھا دینے کی وجہ سے۔ تعلیم دینے سے مراد ہے وحی کے ذریعہ سے واقف بنانا یا عقلی دلائل بتانا۔

مَا عَلَّمْنَا (میں اگر مَا موصولہ ہو تو اس) سے مراد ہو گا مَا أُغْنِي عَنْكُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ شَيْءٍ کہنا یا مَا مصدریہ ہو گا اور مَا عَلَّمْنَا کا معنی ہو گا ہمارا سکھانا، تعلیم دینا۔ بعض نے کہا ذُو علم سے مراد ہے باعمل یعنی جو علم ہم نے یعقوبؑ کو عطا کیا تھا اس پر وہ عامل بھی تھے۔ سفیان کا قول ہے جو عالم علم کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ عالم ہی نہیں ہے۔ بعض نے کہا ذُو علم سے مراد ہے نگہداشت رکھنے والا۔

ع ۱۱ ۸ ۲ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿۶۸﴾ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی یعقوبؑ کی بات کو، یا تقدیر کو نہیں جانتے اور اس سے واقف نہیں کہ تدبیر تقدیر کو دفع نہیں کر سکتی۔ یا اس بات سے ناواقف ہیں کہ اللہ اپنے دوستوں کو الہام کر دیتا ہے۔

وَلَمَّا دَخَلُوا عَلَىٰ يُوسُفَ اور جب برادرانِ یوسف۔ یوسفؑ کے پاس پہنچے۔ تو کہا آپ نے جو بھائی کو لانے کا حکم دیا تھا ہم اس کو لے آئے حضرت یوسفؑ نے کہا تم نے بہت اچھا کیا، ٹھیک کیا اور تم کو عنقریب اس کا اچھا بدلہ ملے گا پھر آپ نے ان کو عزت اور آرام کے ساتھ ٹھہرا لیا اور ان کی مہمانی کی اور دستر خوان بچھوایا اور حکم دیا کہ آمنے سامنے دو دو بیٹھیں (یعنی دو دو شریک ہو جائیں حکم کی تعمیل کی گئی اور دو دو بیٹھ گئے) بنیامین تنہا رہ گئے اور رو پڑے اور کہنے لگے اگر میرا بھائی یوسفؑ زندہ ہوتا تو مجھے اپنے ساتھ بٹھا لیتا حضرت یوسفؑ نے فرمایا تمہارا یہ بھائی اکیلا رہ گیا ہے میں اس کو اپنے ساتھ بٹھا لیتا ہوں، چنانچہ آپ نے بنیامین کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھا کر کھلایا۔ پھر رات ہوئی تو آپ نے بستر کرانے کا حکم دے دیا اور فرمایا دو دو بھائی ایک بستر پر ساتھ سو جائیں۔ بنیامین اس وقت بھی تنہا رہ گئے تو حضرت نے فرمایا یہ میرے ساتھ میرے بستر پر سو جائے گا۔ سوتے میں بنیامین کو یوسفؑ چمٹا لیتے تھے اور ان کی خوشبو سونگھتے تھے صبح تک یوں ہی کرتے رہے۔ روبیل کہنے لگا (بھائیو) ہم نے تو کبھی ایسا واقعہ دیکھا نہیں (کہاں بادشاہِ مصر اور کہاں ہم اور ہم پر بادشاہ کی یہ مہربانی اور بنیامین پر یہ خصوصی عنایت) صبح کو حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے فرمایا میں دیکھ رہا ہوں کہ (یہ شخص اکیلا ہے) اس کا کوئی دوسرا رفیق نہیں ہے اس لئے اس کو میں اپنے ساتھ اپنے گھر میں رکھوں گا۔ اس کے بعد آپ نے ایک مکان میں قیام کرنے کا حکم دیا اور کھانا جاری کر دیا۔

آوَىٰ إِلَيْهِ أَخَاهُ ۖ اور اپنے ساتھ اپنے بھائی بنیامین کو جمع کر لیا۔ اور اپنے ہی ساتھ اس کو ٹھہرا لیا۔ جب محفل

چھٹ گئی اور تنہائی کا وقت آیا تو بنیامین سے پوچھا تمہارا کیا نام ہے بنیامین نے کہا، بنیامین، یوسف نے پوچھا بنیامین کا کیا معنی بنیامین نے کہا مردہ کا بیٹا (وضع حمل کی حالت میں بنیامین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا) حضرت یوسفؑ نے کہا کیا تم پسند کرو گے کہ تمہارے مرحوم بھائی کی جگہ میں تمہارا بھائی بن جاؤں، بنیامین نے کہا بادشاہ کی طرح بھائی کس کو نصیب ہے، لیکن آپ یعقوبؑ اور راحیل کے بیٹے نہیں ہیں یوسف یہ سن کر رو دیئے اور کھڑے ہو کر ان کو گلے لگا لیا اور

قَالَ اِنِّیْٓ اَنَا اَخُوْكَ کہا میں حقیقت میں تمہارا بھائی ہوں یعنی یوسفؑ ہوں۔

فَلَا تَبْتَىٕسْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۶۹﴾ اب تم ان کی ان حرکات سے رنجیدہ نہ ہو جو ہمارے ساتھ یہ لوگ کرتے رہے ہیں۔ اللہ نے ہم پر اپنا کرم کر دیا جو اطلاع میں نے تم کو دی ہے اس کی خبر ان کو نہ دینا۔ اس کے بعد آپ نے ہر بھائی کو ایک ایک بار شتر غلہ دے دیا اور بنیامین کو بھی اس کے نام کا ایک اونٹ بھر اناج دے دیا۔

فَلَمَّا جَهَّزَهُمْ بِجَهَازِهِمْ جَعَلَ السِّقَایَةَ فِیْ رَحْلِ اَخِیْهِ پھر جب ان کو سامانِ سفر دے کر تیار کر دیا تو پانی پینے کا کٹورا اپنے بھائی بنیامین کے سامان میں رکھ دیا۔ یعنی خادموں کو حکم دے دیا کہ کٹورا بنیامین کے سامان میں چھپا دو۔ خادموں نے چھپا دیا۔

سِقَایَة اور صُوَاع دونوں سے مراد ایک ہی چیز ہے۔ سقایہ پانی پینے کا برتن جس میں بادشاہ پانی پیتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا وہ برتن زبرجد کا تھا ابن اسحاق نے کہا چاندی کا تھا۔ کسی نے کہا سونے کا تھا۔ عکرمہ نے کہا چاندی کا تھا مگر مُرصّع تھا غلّے کے احترام میں حضرت یوسفؑ نے اس کو غلہ ناپنے کا پیمانہ مقرر کر دیا تھا اور اس میں آپ پانی بھی پیتے تھے۔ سدی نے کہا بھائی کے سامان میں وہ پیمانہ پوشیدہ کرا دیا اور بھائی کو بتایا بھی نہیں۔ اس کو معلوم ہی نہ ہوا۔ کعب نے کہا جب حضرت یوسفؑ نے بنیامین سے کہا میں تمہارا بھائی ہوں تو بنیامین نے کہا اب تو میں تم کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا، آپ نے فرمایا تم واقف ہو کہ میری وجہ سے باپ پر کیسا غم پڑا تھا اب اگر میں تم کو روک لوں گا تو ان کا غم اور بڑھ جائے گا اور جب تک میں تم کو بدنام کر کے مشہور نہ کر دوں اور کسی نازیبا فعل کی تمہاری طرف نسبت نہ کر دوں اور ناروا حرکت کا مرتکب نہ قرار دے دوں اس وقت تک میں تم کو روک بھی نہیں سکتا (روکنے کا کوئی قانون نہیں اور جھوٹی وجہ جنس قائم کرنے میں تمہاری بدنامی ہو گی) بنیامین نے کہا کچھ بھی ہو مجھے پرواہ نہیں جو بات آپ چاہیں کریں، میں آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ حضرت یوسفؑ نے کہا تو میں اپنا ناپ تمہارے سامان میں پوشیدہ کرائے دیتا ہوں پھر تمہارے اوپر چوری کا الزام قائم کروں گا، تاکہ تم کو چھوڑ دینے (اور روانہ کر دینے) کے بعد پھر تم کو لوٹا لینا میرے لئے ممکن ہو سکے۔ بنیامین نے کہا آپ جو چاہے کریں۔

ثُمَّ اَذَّنَ مُؤَذِّنٌ اَیَّتُهَا الْعِیْرُ اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ ﴿۷۰﴾ پھر ایک اعلانچی نے پکارا اے قافلے والو تم یقیناً چور ہو۔

موذّن منادی۔ لفظ ثُمَّ بتا رہا ہے کہ قافلے والوں کی روانگی سے کچھ وقت کے بعد اعلانچی نے اعلان کیا تھا (کیونکہ ثُمَّ فعل دوئم کی تاخیر اور کچھ مدّت پہلے فعل سے پیچھے آنے کو ظاہر کرتا ہے جَاءَ زَیْدٌ ثُمَّ بَكْرٌ زید آیا کچھ مدّت کے بعد بکر آیا۔ مترجم) اور واقعہ بھی اسی طرح ہوا تھا، قافلہ روانہ ہو گیا اور حضرت یوسفؑ نے اتنی تاخیر کی کہ قافلہ ایک منزل پہنچ گیا یا گھروں کی آبادی سے نکل گیا پھر ان کے پیچھے آدمی دوڑا یا جس نے پیچھے سے پہنچ کر ندا دی۔ اَلْعِیْر لدے ہوئے اونٹ، مجاز اً مراد اونٹوں والے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا یا خیلَ اللہ ارکبوا اے اللہ کے سوارو سوار ہو جاؤ۔ رواہ ابوداؤد من حدیث سمرۃ بن جندبؓ (گھوڑوں کو خیل کہتے ہیں مگر حدیث میں گھوڑوں کے سوار مراد ہیں) آمد و رفت رکھنے کی وجہ سے اونٹوں کو عِیر کہا جاتا ہے۔ بعض نے کہا عِیر جمع ہے عَیَر کی۔ سَقَفٌ کی طرح۔ عین پر ضمہ تھا پھر یاء کی مناسبت کی وجہ کسرہ دے دیا گیا اور عِیر کا معنی ہے گدھا مجاز اً مراد ہوتا ہے گدھوں والا قافلہ پھر اس لفظ کے استعمال میں مزید توسیع کر لی گئی اور پھر قافلہ پر اس کا اطلاق ہونے لگا۔ مجاہد نے کہا وہ قافلہ گدھے سواروں ہی کا تھا۔ فراء نے کہا وہ اونٹ والے تھے (برادرانِ یوسفؑ چور نہ تھے پھر ان کو چور کیوں کہا اور

چوری کی تہمت ان پر کیوں لگائی۔ اس سوال کے جواب میں) کہا جاسکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کے حکم کے بغیر منادی نے یہ لفظ از خود کہہ دیا تھا یا یہ کہ حضرت یوسفؑ نے حکم دیا تھا اور بے ساختہ یہ لفظ ان کی زبان سے نکل گیا تھا یا یوں کہا جائے کہ واقعی وہ چور تھے حضرت یوسفؑ کو انہوں نے چرا لیا تھا۔ میرے نزدیک صحیح یہ ہے کہ اللہ ہی نے ایسا کہنے کا حکم دیا تھا اور اس سے کسی بات کی وجہ نہیں دریافت کی جاسکتی لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ اس میں حکمت حضرت حضرت یعقوبؑ کا امتحان تھا آئندہ ہم اس کا ذکر کریں گے۔

قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَیْھِمْ مَّاذَا تَفْقِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ قافلے والے تلاش کرنے والوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے تمہاری کیا چیز گم ہو گئی (تم کس چیز کو ڈھونڈھ رہے ہو) فَقَدَ کسی چیز کا کھو جانا کہ یہ بھی معلوم نہ ہو وہ کہاں گئی اور کہاں ہے۔

قَالُوْا نَفْقِدُ صُوَاعَ الْمَلِكِ تلاش کرنے والوں نے کہا بادشاہ کا پانی پینے کا کٹورا ہم کو نہیں ملتا ہم اس کو تلاش کر رہے ہیں اور تمہارے سوا ہمارا خیال کسی اور پر نہیں ہے۔

وَلِمَنْ جَآءَ بِهٖ حِمْلُ بَعِیْرٍ وَّاَنَا بِهٖ زَعِیْمٌ ﴿۷۲﴾ اور جو شخص اس کو لا کر حاضر کرے گا اس کو ایک بار شتر غلہ ملے گا اور میں اس کے دلوانے کا ذمہ دار ہوں..... یعنی بطور مزدوری اس کو ایک بارِ شتر غلہ ملے گا اور میں ذمّہ دار ہوں اس کو مزدوری دوں گا (مزدوری سے مراد ہے اُجرت، معاوضہ، انعام۔ مترجم) اس آیت سے مزدوری اور کفالت اور کام سے پہلے مزدوری مقرر کر دینے کا جواز ثابت ہو رہا ہے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِی الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِیْنَ ﴿۷۳﴾

بولے خدا کی قسم تم یہ یقیناً جانتے ہو کہ ہم اس سرزمین میں فساد کرنے نہیں آئے اور ہم چور نہیں ہیں۔ یہ لوگ دو مرتبہ مصر آئے تھے اس لئے اہلِ مصر ان کی امانت داری سے واقف ہو چکے تھے جو سرمایہ ان کے سامان میں بندھ کر ان کے ساتھ چلا گیا تھا وہ بھی انہوں نے واپس لا کر دے دیا تھا اور اپنے جانوروں کے منہ پر انہوں نے جالیاں بھی چڑھا دی تھیں کہ کسی کی کھیتی باڑی پر منہ نہ ڈال دیں یہ تمام باتیں ان کی امانت داری پر دلالت کرتی تھیں اور لوگ ان باتوں سے واقف تھے، اسی لئے اہلِ مصر کے علم کو ان لوگوں نے اپنی شہادت میں پیش کیا۔

قَالُوْا فَمَا جَزَآؤُهٗۤ اِنْ كُنْتُمْ كٰذِبِیْنَ ﴿۷۴﴾ (منادی اور اس کے ساتھیوں نے) کہا اگر تم لوگ بے گناہی کے دعوئ میں جھوٹے ہو تو چور یا چوری کی سزا تمہارے نزدیک کیا ہونی چاہیئے۔

قَالُوْا جَزَآؤُهٗ مَنْ وُّجِدَ فِیْ رَحْلِهٖ فَهُوَ جَزَآؤُهٗ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِیْنَ ﴿۷۵﴾

انہوں نے جواب دیا اس چور کی سزا یہ ہے کہ جس کے سامان میں پیمانہ نکلے تو سامان والا ہی اس کا عوض ہے (یعنی اسی کو غلام بنا لیا جائے) اور ہم ظالموں یعنی چوروں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں۔

حضرت یعقوبؑ کی شریعت میں چور کی یہی سزا تھی کہ جب چوری ثابت ہو جائے تو چور کو صاحبِ مال کے سپرد کر دیا جائے اور وہ چور کو اپنا غلام بنا لے۔ اس پر منادی نے کہا اچھا تو تمہارے سامان کی تلاشی لی جائے گی۔

روایت میں آیا ہے کہ سرکاری آدمی ان سب کو لوٹا کر لے گئے اور حضرت یوسفؑ نے سامان کی تفتیش کا حکم دیا۔

فَبَدَاَ بِاَوْعِیَتِهِمْ قَبْلَ وِعَآءِ اَخِیْهِ پس اپنے بھائی کے تھیلے سے پہلے (دوسرے) بھائیوں کے تھیلوں کی تلاشی شروع کی، یعنی بنیامین کے سامان کی تلاشی سے پہلے ایک ایک کر کے بھائیوں کے سامان کی تلاشی لی اور انہیں کی تلاشی سے آغاز کیا تاکہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ قتادہ نے کہا ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی کسی کے سامان کو کھولتے اور اس کے تھیلے کے اندر دیکھتے تھے تو تہمت لگانے کے گناہ کے خوف سے استغفر اللہ کہتے تھے (کیونکہ جانتے تھے کہ میں تلاشی غلط لے رہا ہوں یہ شخص چور نہیں ہے) جب سب کی تلاشی ہو چکی اور صرف بنیامین رہ گیا تو خود ہی بولے میرے خیال میں اس نے نہیں لیا ہے (اس کی تلاشی لینے کی ضرورت نہیں) بھائیوں نے کہا خدا کی قسم جب تک اس کی بھی تلاشی نہ لی جائے گی ہم نہیں چھوڑیں

گے، اس سے آپ کے دل کو بھی پورا اطمینان ہو جائے گا اور ہمارے دلوں کو بھی۔

ثُمَّ اسْتَخْرَجَهَا مِنْ وِّعَآءِ اَخِيْهِ ؕ آخر (بنیامین کا سامان کھولا اور) اپنے بھائی بنیامین کے تھیلے سے پیمانہ بر آمد کر لیا۔ یہ دیکھ کر بھائیوں نے شرم کے مارے سر جھکا لئے اور بنیامین کی طرف رُخ کر کے کہنے لگے تو نے یہ کیا حرکت کی ہمارے منہ کالے کر دیئے ہم کو رُسوا کر دیا تو نے یہ لیا کب؟ اے اولادِ راحیل! تمہارے ہاتھوں ہمیشہ ہم پر مصیبت ہی آئی ہے، بنیامین نے کہا، اولادِ راحیل کو ہمیشہ تمہارے ہاتھوں مصائب اٹھانے پڑے ہیں تم نے ہی میرے بھائی کو لے جا کر جنگل میں ہلاک کیا (رہا یہ معاملہ تو) یہ پیمانہ اسی نے میرے سامان میں رکھا جس نے تمہارے سامانوں میں تمہارا سرمایہ رکھا تھا۔ غرض (بنیامین) غلامی میں پکڑ لیا۔ گیا اسی آدمی (یعنی تلاشی لینے والے) نے بنیامین کی گردن پکڑ کر یوسفؑ کے روبرو پیش کر دیا جیسے چوروں کو لے جایا جاتا تھا۔

كَذٰلِكَ كِدْنَا لِيُوْسُفَ ؕ ایسی تدبیر ہم نے یوسفؑ کی خاطر کی تھی۔ کہ ہم نے یہ تدبیر اس کو سکھائی اور وحی بھیجی اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ منادی نے جو اِنَّكُمْ لَسٰرِقُوْنَ کہا تھا وہ کلام از خود نہ تھا بلکہ حضرت یوسفؑ کے حکم سے تھا اور آپ کا حکم بھی وحی پر مبنی تھا اس لئے گناہ نہیں تھا۔

بغوی نے لکھا ہے اس جگہ کَید سے مراد ہے کَید کا بدلہ یعنی جس طرح برادرانِ یوسف نے یوسفؑ کے ساتھ پہلے فریب کیا تھا اسی طرح اس وقت ہم نے ان کے ساتھ کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے تو حضرت یوسفؑ سے پہلے ہی فرما دیا تھا فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا کہ وہ تم سے فریب کریں گے۔ پس جب انہوں نے فریب کیا تو ان کے معاملہ میں یوسفؑ کے لئے ہم نے بھی ویسا ہی کیا۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ مخلوق کی طرف سے کَید کا معنی ہے سازش، فریب اور اللہ کی طرف سے کَید کا معنی ہے صحیح (مخفی) تدبیر۔

مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (ہم نے یہ تدبیر اس لئے کی) کہ یوسف بادشاہ (مصر) کے مذہب (اور قانون) کے اعتبار سے اپنے بھائی کو لے نہیں سکتے تھے (اور اپنے پاس روک نہیں سکتے تھے) بادشاہ کے قانون و مذہب میں تو چور کو مارا جاتا تھا اور چوری کے مال سے دوگنا جرمانہ کیا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس جگہ دین کا ترجمہ کیا سلطان، عملداری اور قتادہ نے کہا حکم اور قانون۔

اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ ہاں اللہ کو منظور ہوتا تو وہ اس حکم کو بادشاہ کا حکم کر سکتا تھا (استثناء منقطع ہے) چنانچہ ایسا ہی ہوا حضرت یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے دریافت کیا کہ تمہارے نزدیک چور کی سزا کیا ہونی چاہئے تو اللہ نے ان سے کہلوا دیا کہ چوری کی سزا یہ ہے کہ چور کو مالک مال کا غلام بن جانا ہو گا اس طرح مشیتِ الٰہی حضرت یوسفؑ کا مقصد حاصل ہو گیا۔

نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ ؕ (علم عطا فرما کر) ہم جس کو چاہتے اونچے درجے عنایت کرتے ہیں۔

وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اور ہر جاننے والے سے اوپر دوسرا جاننے والا ہے یعنی ہر ذی علم مخلوق سے زیادہ اللہ علیم ہے۔ علیم کا معنی ہے بہت زیادہ علم رکھنے والا (مراد اللہ) یا ہر ذی علم مخلوق سے اوپر دوسری ذی علم مخلوق ہے۔ خواہ یہ فوقیتِ علمی بعض لحاظ سے ہو جیسے حضرت خضر کو بعض اعتبار سے حضرت موسیٰؑ پر علمی فوقیت حاصل تھی (اگرچہ حضرت موسیٰؑ نبی مرسَل ہونے کی وجہ سے صاحبِ شریعت تھے اور حضرت خضرؑ پر علمی برتری رکھتے تھے مگر بعض کائناتی واقعات کا انکشاف حضرت خضرؑ کو تھا حضرت موسیٰؑ کو نہ تھا) اسی بناء پر حضرت خضرؑ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا موسیٰؑ جو علم مجھے اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے تم ناواقف ہو اور جو علم تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس کو میں نہیں جانتا۔ یہ حدیث بخاری نے حضرت خضرؑ و موسیٰؑ کے طویل قصہ کے ذیل میں نقل کی ہے۔ یہ بھی رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا تم اپنی دنیا کے کاموں کو خود ہی مجھ سے زیادہ جانتے ہو۔ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص ہر اعتبار اور ہر حیثیت سے دوسرے سے برتر ہے ورنہ تسلسلِ علمی لازم آئے گا (اگر علم کی انتہا اللہ کی ذات پر نہ مانی جائے اور یوں ہی مخلوق میں باہم علمی برتری اور کامل برتری کا سلسلہ قائم کیا

جائے تو یہ برتری کہیں جاکر نہیں ٹھیرے گی۔ علمی تسلسل کا یہی معنی ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہر عالم کے اوپر دوسرا عالم ہے اور یہ سلسلہ اللہ کی ذات پر جاکر ختم ہوتا ہے پس اللہ ہر عالم سے بڑھ کر علم رکھنے والا ہے۔

قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ۚ برادرانِ یوسفؑ نے کہا اگر یہ بنیامین چوری کرتا ہے تو کوئی تعجب نہیں اس سے پہلے اس کے ایک بھائی نے بھی چوری کی تھی۔ یعنی یوسفؑ نے بھی چوری کی تھی جو اس کا مال جایا تھا۔ سعید بن جبیرؒ اور قتادہ نے کہا حضرت یوسفؑ کے نانا کا ایک بت تھا وہ اس کی پوجا کرتا تھا حضرت یوسفؑ نے خفیہ طور پر اس کو لے لیا اور توڑ کر راستہ میں پھینک دیا تاکہ نانا اس کی پوجا نہ کرسکے۔ کذا اخرج ابن مردویہ عن ابن عباسؓ مرفوعاً۔ ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے سعید جبیرؒ کی روایت سے بھی اسی طرح یہ حدیث نقل کی ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد نے بیان کیا ایک روز ایک سائل آیا حضرت یوسفؑ دستر خوان سے (چھپا کر) کچھ کھانا اٹھا لیتے تھے اور فقیروں کو دے دیتے تھے اس روز بھی ایسا ہی کیا۔

میں کہتا ہوں حضرت یوسفؑ سخی گھرانے کے ایک فرد تھے اور فقیروں کو دینے پر حضرت یعقوبؑ راضی تھے اس لئے یہ چوری نہ تھی بھائیوں نے یوسفؑ کی جلن کی وجہ سے اس کو چوری کہا۔

محمد بن اسحاق نے مجاہد کے حوالہ سے بیان کیا کہ حضرت یوسفؑ کی والدہ راحیل کا انتقال ہو گیا تو آپ اپنی پھوپھی بنت اسحاق کے پاس رہنے لگے پھوپھی کو آپ سے بڑی محبت تھی اور پھوپھی نے ہی آپ کو پرورش کیا جب آپ بڑے ہو گئے تو حضرت یعقوبؑ کو آپ سے حد سے زیادہ محبت ہو گئی اور آپ نے اپنی بہن سے کہا بہن اب تم یوسفؑ کو مجھے دے دو۔ خدا کی قسم یوسفؑ کا ایک ساعت بھی میری نظر سے غائب ہونا میرے لئے ناقابلِ برداشت ہو گیا ہے، بہن نے کہا ایسا نہیں ہو سکتا حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں اس کو چھوڑنے والا نہیں۔ بہن نے کہا اچھا تو چند روز کے لئے میرے پاس رہنے دو شاید چند روز کے بعد اللہ مجھے اس کی طرف سے صبر عطا کر دے۔ حضرت یعقوبؑ نے یہ بات مان لی حضرت اسحاق کی کمر کا ایک پٹکا تھا اور بطورِ وراثت بڑی اولاد کو ملتا تھا حضرت یعقوبؑ کی بہن آپ سے بڑی تھیں اس لئے وہ پٹکا بہن کو ملا تھا اور اس کے پاس تھا۔ بہن نے یہی پٹکا حضرت یوسفؑ کی کمر سے کپڑوں کے اندر لپیٹ دیا، پھر خود ہی کہا حضرت اسحاق کا پٹکا گم ہو گیا ہے، گھر والوں کی تلاشی لی جائے گی، چنانچہ سب کی تلاشی لی گئی تو حضرت یوسفؑ کے پاس برآمد ہو گیا، حضرت یعقوبؑ کی بہن نے کہا کہ اب تو یہ میری سپردگی میں رہے گا، حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اس نے اگر ایسا کیا ہے تو تمہاری ہی سپردگی میں رہے گا (حضرت اسحاقؑ کی شریعت میں چور کا مالک مال والا ہو جاتا تھا) غرض اس تدبیر سے حضرت یعقوبؑ کی بہن نے حضرت یوسفؑ کو مرتے دم تک اپنے پاس روکے رکھا۔ یہی بات آپ کے بھائیوں نے آپ کے متعلق کہی اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ ط

فَاَسَرَّهَا يُوْسُفُ فِيْ نَفْسِهٖ وَلَمْ يُبْدِهَا لَهُمْ ۚ بھائیوں کی یہ بات یوسفؑ نے اپنے دل میں چھپالی گویا سنی ان سنی کر دی اور ان پر ظاہر بھی نہیں کیا کہ میں نے تمہاری یہ بات سن لی ہے یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جو بات دل میں چھپالی تھی اور بھائیوں سے نہیں کہی تھی وہ بات وہی تھی جس کا ذکر اگلی آیت میں ہے یعنی

قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ یوسفؑ نے کہا یعنی دل میں کہا کہ اس چوری کے درجہ میں تو تم اور بھی برے ہو۔ یعنی یوسفؑ نے اپنے دل میں کہا کہ تم نے تو اپنے بھائی کو چرا لیا تو تم یوسفؑ سے زیادہ برے ہو یا یہ مطلب ہے کہ تم نے چوری کی نسبت یوسفؑ کی طرف کی اس سے زیادہ بری تو تمہاری حرکت ہے۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ ۝ اور جو کچھ تم بیان کر رہے ہو اس سے بخوبی اللہ واقف ہے۔ یعنی اللہ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ تم بیان کر رہے ہو وہ غلط ہے۔

جب حضرت یوسفؑ نے بنیامین پر قبضہ کر لیا تو بھائی غضب ناک ہو گئے۔ اولادِ یعقوب کو غصہ آتا تھا تو ان کے غصہ کو برداشت کرنے کی تاب کسی میں نہیں رہتی تھی۔ روبیل کی تو یہ حالت تھی کہ اس کے غصہ کے سامنے کوئی چیز ٹھہری نہیں

رہتی تھی جب وہ غصہ سے چیختا تھا تو حاملہ عورتوں کے حمل وحشت کی وجہ سے گر جاتے تھے لیکن یہ بھی ان کی خصوصیت تھی کہ غصہ کی حالت میں اگر نسلِ یعقوبؑ میں سے کوئی شخص ان کو ہاتھ سے چھو دیتا تھا تو غصہ فرو ہو جاتا تھا۔ بعض روایت میں آیا ہے کہ یہ خصوصیت اور حالت شمعون کی تھی۔

غرض سب بھائی یوسفؑ کے پاس پہنچے روبیل نے کہا یا تو ہمارے بھائی کو واپس دو ورنہ میں ایسی چیخ ماروں گا کہ مصر کی ہر حاملہ عورت کا حمل گر جائے گا غصہ سے روبیل کے بدن کے بال کھڑے ہو گئے اور کپڑوں سے باہر نکل آئے حضرت یوسفؑ کا ایک چھوٹا بچہ تھا آپ نے بچہ سے فرمایا روبیل کے برابر جا کر اس کو ہاتھ سے چھو دو، دوسری روایت میں آیا ہے آپ نے بچے سے فرمایا اس کا ہاتھ پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔ بچے نے جا کر روبیل کو ہاتھ لگا دیا۔ بچے کا ہاتھ لگانا تھا کہ روبیل کا غصہ جاتا رہا، کہنے لگا یہاں یعقوبؑ کے تخم کا کوئی تخم ضرور موجود ہے۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا (یعقوبؑ کے تخم کا تخم کیا) یعقوب کا بیٹا موجود ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ روبیل کو دوبارہ غصہ آیا تو حضرت یوسفؑ نے اس کے ایک ٹھوکر ماری اور گریبان سے پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور فرمایا عبرانیو! تم گمان کرتے ہو کہ تم سے زیادہ طاقتور دنیا میں کوئی اور نہیں ہے۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا اور بھائی سمجھ گئے کہ بنیامین کو کسی طرح چھڑا نہیں سکتے تو عاجزی کرنے لگے اور نرم پڑ گئے اور

قَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ اِنَّ لَهٗٓ اَبًا شَيْخًا كَبِيْرًا فَخُذْ اَحَدَنَا مَكَانَهٗ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۷۸

کہنے لگے اے عزیز اس کا بوڑھا باپ ہے (جو اس سے بڑی محبت کرتا ہے اس کا بھائی تو مر چکا ہے یہی باپ کے دل کا بہلاوا ہے مہربانی کیجئے) اور ہم میں سے کسی ایک کو اس کی جگہ پکڑ لیجئے ہم جانتے ہیں کہ آپ بھلائی کرنے والوں میں سے ہیں (بھلائی اور مہربانی کرنے کی آپ کی عادت ہی ہے آپ اپنے اخلاق کو نہ بدلیں آپ نے ہم پر کرم کیا ہے ہم کو پورا پورا غلہ دیا اچھی طرح مہمان رکھا، ہمارا سرمایہ بھی ہم کو لوٹا دیا پس یہ بھی کرم کیجئے کہ اس کی جگہ ہم میں سے کسی اور کو پکڑ لیجئے۔

قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اَنْ نَّاْخُذَ اِلَّا مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗٓ ۙ یوسفؑ نے کہا جس کے پاس ہم نے اپنا سامان پایا ہے اس کی جگہ دوسرے کو پکڑ لیں اس ناانصافی سے اللہ کی پناہ (ایسا نہیں کر سکتے مجرم کی جگہ دوسرے کو پکڑنا تو تمہارے فتوے کے لحاظ سے بھی ظلم ہے)

حضرت نے مَنْ وَّجَدْنَا مَتَاعَنَا عِنْدَهٗ فرمایا مَنْ سَرَقَ نہیں فرمایا کیونکہ بنیامین نے چوری نہیں کی تھی، اس کے سامان میں شاہی پیمانہ ملا تھا۔

ع ۹ / ۱۱ / ۳ اِنَّآ اِذًا لَّظٰلِمُوْنَ ۝۷۹ اگر ہم ایسا کریں گے تو (تمہارے ہی قانون اور فتوے کی رو سے اس وقت) ہم ظالم ہوں گے۔ حضرت یوسفؑ کے کلام کا مفہوم اور مقصد یہ تھا کہ اللہ نے حکم دیا ہے کہ جس کے سامان میں پیمانہ برآمد ہو اس کو پکڑ لیا جائے ہم اللہ کی رضامندی کے لئے ایسا کریں گے اس کے خلاف کریں گے تو ظلم ہو گا اور ہم ظالم قرار پائیں گے۔

فَلَمَّا اسْتَيْــَٔسُوْا مِنْهُ خَلَصُوْا نَجِيًّا ۭ جب بھائی کی طرف سے نااُمید ہو گئے تو الگ جا کر باہم مشورہ کیا۔ ابو عبیدہ نے ترجمہ کیا جب انہوں نے یقین کر لیا کہ بنیامین کی واپسی نہیں ہو سکتی۔

نجیًّا بمعنی جمع ہے اگرچہ لفظ مفرد ہے یعنی الگ جا کر ایک نے دوسرے سے مشورہ کیا اور سب مشورہ کرنے لگے۔

قَالَ كَبِيْرُهُمْ بڑے نے کہا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا عمر میں بڑا ہونا مراد نہیں، بلکہ علم و فضل میں بڑا ہونا مراد ہے، اور یہ یہودا تھا، کلبی کا بھی یہی قول ہے۔ قتادہ، سدی اور ضحاک کے نزدیک عمر میں بڑا مراد ہے یہ روبیل تھا، اسی نے حضرت یوسفؑ کو قتل کرنے سے بھائیوں کو روکا تھا، مجاہد نے کہا وہ شمعون تھا بھائیوں کا سفر میں وہی سردار تھا۔

اَلَمْ تَعْلَمُوْٓا اَنَّ اَبَاكُمْ قَدْ اَخَذَ عَلَيْكُمْ مَّوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ کیا تم ناواقف ہو کہ تمہارے باپ نے تم سے اللہ کی قسم کے ساتھ مضبوط عہد لے لیا تھا۔

وَمِنْ قَبْلُ مَا فَرَّطْتُّمْ فِيْ يُوْسُفَ ۚ اور یوسفؑ کے معاملہ میں بھی جو تم قصور کر چکے ہو کیا تم اس سے

ناواقف ہو۔ مَا فَرَّطْتُم میں مَا زیادہ ہے یا مصدری یا صولہ۔ بیضاوی کے نزدیک مَا محلِّ رفع میں نہیں ہو سکتا۔ یعنی اس کو متبدا نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ مِنْ قَبْلُ اس وقت خبر ہوگا تو قَبْلُ کا مضاف الیہ مذکور ہونا ضروری ہے۔

فَلَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰى يَاْذَنَ لِيْٓ اَبِيْٓ اس لئے میں اس سر زمین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا تاوقتیکہ میرا باپ مجھے اجازت نہ دے۔

اَوْ يَحْكُمَ اللّٰهُ لِيْ ۚ یا اللہ حکم دے دے یعنی یعقوبؑ کی معرفت اللہ مجھے یہاں سے جانے اور بھائی کو چھوڑ جانے کا حکم بھیج دے یا میری موت کا حکم بھیج دے یا میرے بھائی کو رہا کرنے کا حکم دے دے یا بھائی کو چھڑانے کے لئے اہلِ مصر سے لڑنے کا حکم دے دے۔

وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ﴿٨٠﴾ اور وہ سب حاکموں سے اعلیٰ اور بالا ہے اس کا حکم غلط نہیں ہوتا۔

اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ تم لوگ اپنے والد کے پاس لوٹ جاؤ اور جاکر کہہ دو ابّا آپ کے بیٹے بنیامین نے چوری کی۔ یعنی بظاہرِ امر ہم نے اس کے سامان سے چوری کا مال بر آمد ہوتے دیکھا (جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی نے چوری کی)

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا اور ہم تو وہی بیان کرتے ہیں جو مشاہدہ سے ہم کو معلوم ہوا۔ یعنی ہم جو کہہ رہے ہیں کہ اس نے چوری کی اس وجہ سے کہہ رہے ہیں کہ ہم کو یقین ہو چکا اور ہم نے خود دیکھ لیا کہ بادشاہ کا پیمانہ اس کے تھیلے سے بر آمد ہوا۔ بعض اہلِ تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہم نے کوئی شہادت کبھی بغیر ذاتی علم کے نہیں دی اس لئے ہماری طرف سے شہادت نہیں ہے (ہم کو حقیقت کا کیا علم ہمارے سامنے تو اس نے چرایا نہیں۔ مترجم) بلکہ آپ کے بیٹے کی حرکت کی اطلاع ہے۔ بعض علماء نے کہا کہ حضرت یعقوبؑ نے ان سے فرمایا عزیزِ مصر کو تو معلوم نہ تھا کہ چور کو چوری کی سزا میں غلام بنالیا جاتا ہے یہ بات اس کو تمہارے قول سے معلوم ہوئی اس کے جواب میں بیٹوں نے کہا ہم نے تو عزیزِ مصر سے وہی بات کہی جو ہم کو (اپنے مذہب سے) معلوم تھی۔ حضرت یعقوبؑ اور آپ کی اولاد کا چور کے متعلق شرعی فیصلہ یہی ہوتا تھا۔

وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ﴿٨١﴾ اور غیب کی باتوں کے تو ہم حافظ تھے نہیں (یا یہ ترجمہ ہے کہ باطنی احوال کے تو ہم نگراں تھے نہیں) حضرت ابن عباسؓ نے ترجمہ کیا ہم رات دن اس کے اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کے تو نگراں تھے نہیں، ممکن ہے رات کو اس کے سامان میں پیمانہ چھپا دیا گیا ہو (اور واقع میں اس نے نہ چرایا ہو) مجاہد اور قتادہ نے یوں مطلب بیان کیا کہ جب قسم کھا کر ہم نے عہد کیا تھا تو ہم کو معلوم نہ تھا کہ آپ کا بیٹا آئندہ چوری کرے گا (اور پکڑا جائے گا) اور آپ پر ویسی ہی بپتا پڑے گی، جیسی یوسفؑ کی پڑی تھی ہم نے جو اس کی حفاظت کا وعدہ کیا تھا تو انہی چیزوں سے کیا تھا جن سے حفاظت ممکن تھی۔

وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا اور اس بستی سے جہاں ہم تھے آپ دریافت کرلیں۔ قریہ سے مراد ہے مصر۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مصر کا وہ گاؤں مراد ہے جہاں منادی نے آکر روکا تھا اور اسی جگہ سے ان کو مصر واپس لوٹنا پڑا تھا۔

وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ اور جس قافلے میں ہم آئے ہیں اس سے بھی آپ دریافت کرلیں۔ حضرت یعقوبؑ کے ہم وطن کچھ کنعانی باشندے بھی اسی قافلے میں آئے تھے ابن اسحاق نے کہا جو بھائی مصر میں رُک گیا تھا وہ جانتا تھا کہ یوسف کے سابق واقعہ کی وجہ سے میں اور میرے بھائی باپ کی نظر میں متہم ہیں اس لئے اس نے بھائیوں سے کہا کہ باپ سے یہ بات کہنا۔

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٨٢﴾ اور ہم بلاشک و شبہ یقیناً سچے ہیں۔

بقولِ بغوی ایک شبہ

حضرت یوسفؑ نے باپ کو اپنی موجودگی کی اطلاع نہیں دی بلکہ اپنے بھائی بنیامین کو بھی ہمیشہ کے لئے روک لیا اور باپ

سے جدا کر دیا حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ میری جدائی میں باپ کا کیا حال ہوا اور بنیامین کے چھوٹنے سے کیا حال ہوگا، آپ کے اس کردار سے تو قطع رحم، عقوق اور سنگ دلی کا مظاہرہ ہو رہا ہے آپ نے ایسا کیوں کیا۔

حضرت مفسرؒ کی صراحت کے موافق شبہ کا ازالہ

لوگوں نے اس کردار اور سلوک پر بہت لے دے کی ہے، صحیح بات یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ نے اپنے قلبی تقاضوں کے خلاف یہ سب کچھ اللہ کے حکم کی تعمیل میں کیا۔ اللہ کو یعقوبؑ کا پے در پے کڑا امتحان لینا تھا تاکہ ان کے درجات میں ترقی کی جائے اور اسلاف کی صف میں ان کو شامل کر دیا جائے (حضرت ابراہیمؑ کا بھی تو بار بار بہت سخت امتحان لیا گیا ہے یہاں تک کہ بیٹے کو خود ذبح کر دینے کا حکم دیا گیا ہے اور اس سے پہلے بے آب و گیاہ، ویران ریگستان میں شیر خوار بچہ اور اس کی ماں کو ڈال دینے کا حکم ہو چکا تھا مگر یہ تمام امتحان درجاتِ نبوّت تھے جس میں حضرت ابراہیم پورے اترے اس سے کم درجے کا امتحان حضرت یعقوبؑ کا لیا گیا اور فقط بیٹوں کو باپ سے جدا کر دیا گیا۔ مترجم)

بعض نے کہا حضرت یوسفؑ نے بھائیوں سے اپنا یوسفؑ ہونا ظاہر نہیں کیا کیونکہ آپ کو اندیشہ تھا کہ بھائی کوئی اور سازش نہ کریں اور باپ کو جا کر اطلاع نہ دیں، باپ سے چھپالیں (آپ چاہتے تھے کہ اس تدبیر سے باپ مصر میں آجائیں اور آکر اپنی آنکھوں سے یوسفؑ کی حالت دیکھیں۔ مترجم) اول جواب ہی صحیح ہے دوسرا جواب کچھ نہیں ہے۔

یہ فقیر مترجم کہتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کو پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج ان کو سجدہ کر رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس خواب کی تعبیر پوری ہونی تھی جس کی ظہوری صورت اللہ نے یہ پیدا کر دی گویا جو کچھ ہوا اس سب کا اہتمام اللہ نے ظہورِ واقعہ سے پہلے کر دیا تھا ترتیبِ ظہوری تو بعد کو ہوئی اس لئے شبہ کی کوئی گنجائش نہیں اور حضرت مفسرؒ قدس سرّہ کا جواب ہی صحیح جواب ہے۔

غرض بڑے بھائی کو مصر میں چھوڑ کر دوسرے نو بھائی کنعان کو لوٹ آئے اور بڑے بھائی نے جو کچھ کہا تھا وہ باپ سے عرض کر دیا۔

قَالَ یعقوبؑ نے کہا۔ بات یوں نہیں جیسی تم نے بیان کی۔

بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ بلکہ تم نے خود اپنے دل سے اپنے لئے ایک بات بنالی ہے بادشاہ کو کب معلوم تھا کہ (شریعتِ اسرائیلی میں) چور کو پکڑ کر غلام بنا لینے کا حکم ہے تم خود اس غرض کے لئے بھائی کو مصر لے گئے تاکہ تم کو کچھ فوری فائدہ مل جائے۔

فَصَبْرٌ جَمِیْلٌ ؕ سو صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا (یعنی لوگوں سے شکایت نہ ہوگی)

عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّاْتِیَنِیْ بِهِمْ جَمِیْعًا ؕ اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو مجھ تک پہنچا دے گا یعنی یوسفؑ کو بنیامین کو اور جو بھائی مصر میں رہ گیا ہے ان کو سب کو۔

اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۸۳﴾ (میرے اور ان کے احوال سے) وہی خوب واقف ہے (اور اپنے انتظام اور تدبیر میں) حکمت والا ہے۔ اس نے مجھے اس دکھ میں بھی کسی مصلحت ہی سے ڈالا ہے۔ بنیامین کے قید اور غلام ہو جانے کی اطلاع جب حضرت یعقوبؑ کو پہنچی تو اس وقت آپ کا غم واندوہ آخری حد پر پہنچ گیا اور خیال کر لیا کہ ان بیٹوں کی سازش سے مجھے یہ پیہم دکھ پہنچے ہیں۔

وَتَوَلّٰى عَنْهُمْ اور سب کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

وَقَالَ یٰۤاَسَفٰى عَلٰى یُوْسُفَ اور افسوس و حسرت سے کہنے لگے ہائے یوسفؑ۔ اَسَف کا معنی ہے انتہائی حزن و اندوہ۔ اَسَف اصل میں اَسَفِی بیاء متکلم تھا۔ عبدالرزاق اور ابن جریر نے موقوفاً سعید بن جبیر کا قول نقل کیا ہے کہ سوائے امتِ محمدیہ کے کسی اور امت کو مصیبت کے وقت اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ کہنے کی تعلیم نہیں دی گئی۔ حضرت یعقوبؑ پر

بھی پڑی تو انہوں نے اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَیْهِ رَاجِعُوْنَ نہیں کہا بلکہ حسرت وافسوس کا اظہار کیا۔ بیہقی نے بھی یہ روایت شعب الایمان میں نقل کی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ضعیف سند میں بوساطت حضرت ابن عباسؓ اس کو مرفوعاً بیان کیا گیا ہے۔ ثعلبی نے سعید بن جبیرؓ کے طریق سے اس کو مرفوعاً بیان کیا ہے۔

وَابْیَضَّتْ عَیْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِیْمٌ ﴿۸۴﴾ اور روتے روتے ان کی آنکھیں سفید پڑ گئیں اور وہ غم سے جی ہی جی میں گھٹا کرتے۔

یعنی روتے روتے آنکھوں کی سیاہی جاتی رہی اور نابینا ہو گئے۔ مقاتل نے کہا چھ برس نابینا رہے۔ بعض اہل تفسیر نے تشریح کی کہ نگاہ کمزور ہوگئی (یعنی آنکھوں کے سفید ہونے سے مراد ہے نگاہ کا ضعف)

کَظْم سانس کا مخرج اَخَذَ بِکَظْمِه اس نے فلاں شخص کے سانس باہر آنے کے راستے کو پکڑ لیا۔ کظوم سانس رک جانا، سانس بند ہو جانا، مجازی معنی خاموش ہو جانا۔ کظیم بمعنی کاظم جس کا سانس رک گیا ہو، بند ہو گیا ہو۔ مطلب یہ کہ یعقوبؑ اپنے غم وغصے کو ضبط کرنے والے تھے لوگوں سے کہتے نہ تھے۔ اسی سے ہے کظم البعیر اونٹ نے جگالی کرنی چھوڑ دی اور کھائی ہوئی غذا پیٹ میں روک لی۔

کظم السقاء بھرنے کے بعد مشک کا منہ باندھ دیا۔ کظیم کا معنی کبھی پُر (بھرا ہوا) بھی آتا ہے۔ بھری ہوئی مشک کا منہ باندھ دیا جاتا ہے اور جو کچھ اس کے اندر ہوتا ہے بند کر دیا جاتا ہے۔ مؤخر الذکر معنی کے لحاظ سے کظیم بمعنی مکظوم ہو سکتا ہے یعنی غم وغصہ سے بھرا ہوا۔

قتادہ نے کہا حضرت یعقوبؑ کے سینے میں غم گھومتا تھا مگر زبان سے کلمۂ خیر کے سوا کچھ نہیں کہتے تھے۔ حسن نے کہا جس روز سے یوسفؑ باپ کی گود سے جدا ہوئے اس روز سے یوم ملاقات تک اسی ۸۰ سال گزر گئے اور اس مدت میں یعقوبؑ کا آنسو خشک نہیں ہوا باوجودیہ کہ آپ کے زمانے میں روئے زمین پر آپ سے زیادہ اللہ کے نزدیک کسی کی عزت نہ تھی اور اللہ کو آپ سے زیادہ پیارا کوئی نہ تھا۔

تنقیح مبحث

علماء تصوف اور اصحاب معرفت کہتے ہیں کہ فناء قلب کے بعد صوفی کے دل کا لگاؤ اللہ کے سوا کسی سے نہیں رہتا اور سوائے محبوب حقیقی کے کسی مخلوق کی محبت کی گنجائش ہی نہیں رہتی، حضرت یعقوبؑ تو جلیل القدر پیغمبر اور صاحب بصیرت مقرب ولی اللہ تھے، یوسفؑ کی محبت آپ کے دل میں کیسے سما گئی اور فراق یوسف میں اتنے کیوں روئے کہ نور نظر جاتا رہا۔ اگر اس کی یہ توجیہ کی جائے کہ سارا عالم جلوہ گاہ الوہیت اور آئینۂ حقیقت ہے یوسفؑ سے حضرت یعقوبؑ کے دل کی وابستگی حقیقت ہے دوسروں سے دل کا لگاؤ نہ ہونے کی کیا وجہ۔ اس کے علاوہ یہ کہ عالم کو جلوہ گاہ حقیقت سمجھ کر غیر اللہ سے دل کی وابستگی تو علم تصوف کی ابتداء یا توسط کا درجہ ہے، حضرت یعقوبؑ تو کاملین میں سے تھے معرفت کی آخری چوٹی پر پہنچے ہوئے تھے ان کے دل کا یوسفؑ سے لگاؤ اور وابستگی کس طرح ممکن تھی۔ اس شبہ کو دور کرنے کے لئے مندرجہ ذیل تنقیح پر غور کرو۔

تنقیح:۔ فناء کے بعد صوفی کے دل کا لگاؤ کسی دنیوی چیز سے نہیں رہتا آخرت سے تعلق رکھنے والی چیزوں کی حالت اس سے جدا ہے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے دنیا ملعون ہے اور جو کچھ دنیا میں ہے وہ ملعون ہے، مگر اللہ کی یاد اور اللہ کی یاد پیدا کرنے والی چیزیں اور عالم اور طالب علم (ملعون نہیں ہے) یہ حدیث ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور طبرانی سے صحیح سند سے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے بزار نے بھی حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ایسا ہی نقل کیا ہے اور طبرانی نے صحیح سند سے حضرت ابودرداءؓ کی روایت سے بھی اس کو بیان کیا ہے۔

آخرت اللہ کو پسند ہے اور اس سے دل کا تعلق بھی پسند ہے ارشاد خداوندی ہے وَاذْكُرْ عِبَادَنَآ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ

یَعْقُوبَ أُولِي الْاَيْدِي وَالْاَبْصَارِ میرے خاص بندوں ابراہیمؑ، اسحاقؑ، اور یعقوبؑ کا ذکر کرو جو طاقت والے اور صاحبانِ بصیرت تھے۔ یعنی اللہ کی اطاعت میں قوی اور اللہ کی معرفت وبصیرت رکھنے والے تھے۔

اِنَّآ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ہم نے ان کو ایک خصلت خالص طور پر عطا کی تھی جس میں کوئی کدورت اور آمیزش نہ تھی یعنی دارِ آخرت کی یاد کیلئے مخصوص کر دیا تھا۔ مالک بن دینار نے فرمایا مراد یہ ہے کہ ہم نے دنیا کی محبت اور یاد اُن کے دلوں سے نکال لی تھی اور آخرت کی محبت اور یاد کیلئے ان کو مخصوص کر دیا تھا ہر عمل و ترک عمل میں آخرت ہی ان کے پیشِ نظر رہتی تھی۔ آخرت ہی کو دارِ مکان کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ دنیا مکان نہیں گزر گاہ ہے اور مکان صرف آخرت ہے۔ یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ آخرت اور آخرت کی یاد ہی اللہ کو پسند ہے اور آخرت کی ہر چیز قابل پسندیدگی اور مستحقِ ستائش ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھ سے خواب میں کہا گیا کہ ایک سردار نے ایک مکان بنوایا (مکان کے اندر) دستر خوان لگوایا اور کھانے والوں کو بلانے کے لئے ایک بلانے والے کو بھیجا بلانے والے نے جا کر لوگوں کو کھانے کی دعوت دی داعی کی دعوت کو جس نے قبول کر لیا اس نے گھر کے اندر آ کر دستر خوان سے کھانا کھا لیا۔ اور سردار اس سے خوش ہو گیا اور جس نے داعی کی دعوت کو قبول نہیں کیا وہ گھر میں داخل نہ ہوا اور نہ کھانا کھایا اور سردار اس سے ناراض ہو گیا۔ پس اللہ سردار ہے محمدؐ داعی ہے اور گھر اسلام ہے اور دستر خوان جنت ہے رواہ الدارمی عن ربیعۃ الجرشی۔

یہ معرفت کی وہ چوٹی ہے جس پر کاملین ہی کی رسائی ہے، عوام اور ابتدائی زینے پر قدم رکھنے والوں کا تو ذکر ہی کیا ہے درمیانی درجہ والوں کی بھی وہاں تک پہنچ نہیں ہے۔ رابعہ بصری کو اگر معرفت کی یہ رفعت حاصل ہوتی تو وہ نہ کہتیں کہ میں جنت کو جلا دینا چاہتی ہوں تاکہ جنت کے لالچ میں لوگ اللہ کی عبادت نہ کریں۔ خالص اللہ کے لئے اس کی عبادت کریں، کیا ان کو یہ آیت معلوم نہ تھی، اللہ تو فرماتا ہے۔ مَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ اللّٰهِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ لَاٰتٍ یعنی جو شخص اللہ سے ملنے کا امیدوار ہے تو اللہ کی ملاقات کا وقت آخرت میں ضرور آنے والا ہے اور جنت اس کی ملاقات کا نام ہے۔

ایک اور حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جنت کی مٹی پاکیزہ (خوشبودار) اور اس کا پانی شیریں ہے اور وہاں بڑے میدان ہیں (جہاں سرسبز درخت ہیں) اور اس کے درخت یہ (تنزیہی کلمات) ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ۔ رواہ الترمذی عن ابن مسعودؓ۔ شیخین نے صحیحین میں اور حاکم و طبرانی نے یہ الفاظ نقل کئے ہیں تمہارے لئے ہر ایک لفظ کے بدلہ میں جنت کے اندر ایک درخت لگایا جائے گا۔

حضرت مجدد قدس سرّہ نے فرمایا تنزیہی معنی کا دنیوی لباس تو یہی (سبحان اللہ وغیرہ) حروف والفاظ ہیں آخرت میں ان کا پیرایۂ ظہور جنت کے پھل و درخت ہیں (دنیا میں ان کلمات کے ساتھ اور آخرت میں جنت کے ساتھ) محبت کا تعلق گویا تنزیہی معنی سے وابستگی (کی شکل) ہے۔

حضرت مجددؒ نے فرمایا میں کہتا ہوں کہ ہر شخص کی جنت یہ ہے کہ اللہ کے اسماء و صفات میں سے جو اسم بھی اس شخص کے تعین اور تشخص کا مبداء ہے اس کا ظہور ہو جائے اور یہ ظہور اس شخص کے لئے درختوں، نہروں، شاندار مکانوں اور حور و غلمان کی شکل میں ہو گا اور چونکہ اللہ کے اسماء و صفات میں تفاوت ہے کوئی صفت جامع ہے کوئی غیر جامع۔ کسی کا قرب ذات سے زیادہ ہے کسی کا کم پس جیسی صفت کسی کا مبدءِ تعین ہو گی ویسی جنت اس کے لئے ہو گی، جنتوں کے تفاوت اور اونچ نیچ کا فرق اسماء و صفات کے تفاوت کی وجہ سے ہو گا۔[1] جنت کے بعض درخت بلوری اور آبگینی اجسام کی شکل و کیفیت کے بھی ہو جائیں گے۔

[1] اللہ کی صفات متعدد ہیں رحمانیت میں بھی اس کی صفت ہے اور رحمٰن و رحیم اس کا وصفی نام ہے اسی طرح قدرت، علم، ارادہ، مشیت وغیرہ اس کی صفات ہیں اور قدیر، علیم، مرید وغیرہ اس کے نام ہیں اب جس شخص کی تعیینِ ذات جس اسم کی پر تو اندازی سے ہوئی ہے ویسی ہی جنت اس کے لئے ہو گی کیونکہ جنت ایک شکل ہے صفتِ خداوندی کی۔ ان صفات میں بعض جامع ہیں اور بعض کا درجہ ذات کے قریب ہے جیسے صفتِ الوہیت یا قدرت یا علم پس جس شخص کا مبدءِ تعین یہ صفات ہوں گی اس کو ایسی جنت ملے گی جو جامع نعم اور ذات کی جلوہ پاشی کے قریب ہو گی۔ (مترجم)

پس ایسے ہی درخت اس حالت میں ذاتِ بے کیف کے دیدار کے ذرائع بن جائیں گے اور رؤیتِ ذاتِ بے کیف ہو جائے گی۔ پھر ان درختوں کی بلّوریت ختم ہو جائے گی تو وہ آئینۂ ذات بھی نہیں رہیں گے اور اس حالت میں رؤیت نہ ہو گی۔ چکا چوند کی یہ حالت اور درختوں کی بلّوریت وعدمِ بلّوریت ہمیشہ ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

ایک شبہ

تمام ممکنات (خواہ ان کا ظہور دنیا میں ہو یا آخرت میں۔ مترجم) اپنی ذات کے لحاظ سے معدوم ہیں ناقص ہیں شر ہی شر ہیں، حسنِ ذاتی سے محروم ہیں ان میں جو حسن و جمال آیا ہے اور جس خیر و کمال کا ظہور ہو رہا ہے وہ واجب تعالیٰ کا عطیہ ہے اسی کا فیض ہے پھر دنیوی و اخروی چیزوں میں کیا فرق ہے اور کیوں دنیوی چیزوں سے دل کی وابستگی جرم ہے اور اخروی چیزوں سے دل کا لگاؤ قابلِ ستائش ہے۔

ازالہ

ہم کہتے ہیں تمام ممکنات اللہ کے اسماء و صفات کا مظہر ہیں اور اللہ کی صفات بھی بجائے خود اور بذات خود ممکن ہیں کیونکہ ذات کی محتاج ہیں (اور ہر محتاج کا ممکن ہونا ظاہر ہے) لیکن ذاتِ خداوندی کے لئے ان کا ثبوت لازم ہے (کیونکہ ذات صفات سے خالی نہیں ہو سکتی اور بغیر صفات کے ذات کا نہ تحقق ہو سکتا ہے نہ تعقل) پس یہ واجب بالغیر ہو گئیں یعنی ذات کی وجہ سے یہ بھی واجب ہو گئیں لیکن صفاتِ الٰہی پر امکان اور وجود بالغیر کا اطلاق اس لئے نہیں کیا جاتا کہ ان کے حدوث کا وہم نہ ہو جائے اور ذات سے منفک ہو سکنے کا خیال نہ پیدا ہو جائے ورنہ واقعہ میں صفاتِ خداوندی ممکن ہیں اور چونکہ ذات سے ان کا انفکاک محال ہے اس لئے واجب بالغیر بھی ہیں، اہلِ معرفت کیلئے ان صفات کا انکشاف ہوتا ہے تو ان کے دو رخ نظر آتے ہیں ایک رخ ان کے امکانِ ذاتی کا ہوتا ہے جسکی وجہ سے ان میں عدم کا احتمال ہوتا ہے اور دوسرا رخ وجوب بالغیر کا ہے جو سراسر وجود ہی وجود ہے۔ وجود کا رخ تو سر تا پا حسن و جمال اور خیر و کمال ہے اور عدم کا رخ بھی اگرچہ امکانِ ذاتی کی وجہ سے قبیح، شر، ناقص اور ہر کمال سے بے بہرہ ہے مگر وجود کے ساتھ ہر وقت ہم آغوش رہنے اور غیر منفک ہونے کی وجہ سے فی الجملہ حسن سے خالی نہیں ہے خواہ یہ حسن و جمال وہمی ہی ہو۔ پس صوفی کی نظر میں صفاتِ الٰہیہ کی جلوہ پاشی اور پرتو اندازی دو شکلوں میں دکھائی دیتی ہے دنیوی چیزوں میں تو اس کو صفات کا عدمی رخ (یعنی ذاتی امکان) پرتو انداز نظر آتا ہے اور آخرت کی چیزوں میں ان کا وجودی رخ (یعنی وجوب بالغیر کا رخ) عکس ریز دکھائی دیتا ہے اسی وجہ سے دنیوی اشیاء سے وابستگی اللہ کے نزدیک بری ہے اور اخروی چیزوں سے دل کی آویختگی اللہ کو پسند ہے ان سے محبت اللہ سے محبت ہے جو لوگ اللہ کی محبت میں کامل ہیں وہی دار آخرت سے بھی کامل محبت رکھتے ہیں۔

دنیوی اور اخروی اشیاء میں یہی فرق ہے اور ایک سے محبت کے عدم جواز اور دوسری سے محبت کے وجوب کی یہی علت ہے۔[1]

تمہید مذکور کے بعد ہم کہتے ہیں کہ حضرت مجددؒ قدس سرہ نے مکتوب ۱۰۰ جلد سوئم میں بیان کیا ہے کہ حضرت یوسفؑ کا

---

[1] فقیر مترجم کی ناقص سمجھ میں حضرت محقق کی تشریح صفات نہیں آئی۔ خلاصۂ تنقیح اور تشریح کا سنگِ بنیاد یہ ہے۔ کہ صفاتِ الٰہیہ بالکل ذات کے علاوہ ہیں اور ممکن الذات ہیں۔ البتہ ان کا ثبوت ذات کے لئے واجب ہے اس لئے واجب بالغیر ہیں پس ان کا عدم ذاتی ہے اور وجوب و وجود عارضی یا لحوقی۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو پھر ان غلط گو مشائیہ فلاسفہ کے قول کو کیوں تسلیم نہ کیا جائے جو اس سارے عالم کو ممکن الذات محتاج الی الواجب اور قدیم بالغیر یعنی ازلی ابدی کہتے ہیں اور قائل ہیں کہ یہ عالم اپنی ذات کے اعتبار سے واجب کا محتاج ہے اس کا عدم ذاتی ہے لیکن معلول کا تخلف علتِ تامہ سے نہیں ہوتا۔ اس لئے قدیم بالواجب ہے یعنی اس میں قدامت واجب کی وجہ سے آئی ہے پس یہ ساری کائنات قدیم بالنوع ہے اگرچہ ظہور تشخصی اور تعیناتِ شخصیہ کے اعتبار سے اس میں تغیرات ہر وقت رُونما ہوتے رہتے ہیں۔ رئیس الفلاسفہ شیخ ابن سینا نے بھی تو اس عالم کے متعلق وہی بات کہی ہے جو حضرت مفسرؒ نے صفات کے متعلق فرمائی۔ شیخ بھی ہر مادہ کو قدیم بالغیر اور ممکن الذات کہتا ہے۔ خواہ مادہ عنصری ہو یا فلکی اور صورتِ جسمیہ کو طبیعتِ نوعیہ کہتا ہے جو قدیم ہے اگرچہ اس کے افراد حادث ہیں۔ افراد کا حدوث نوع کے حدوث کو مستلزم نہیں۔ اثبات ہیولیٰ کے خاتمہ پر شیخ نے اشارات میں ایک مجمل جملہ لکھ دیا اور یہ کہہ دیا کہ ومن ھھنا ظھر ثلث نکات۔ محقق طوسی اور امام رازی نے اس جملہ کی تشریح میں ایک نکتہ یہ بیان کیا کہ اس سے قدم عالم ثابت ہو جاتا ہے (لیکن یاد رکھو کہ یہ قدم ذاتی نہیں قدم بالغیر ہے۔ قدم ذاتی کا تو کوئی فلسفی قائل نہیں)

انتہیٰ

وجود اور آپ کا حسن وجمال اگرچہ اسی دارِ دنیا میں پیدا ہوا لیکن دوسری مخلوق کی طرح نہ تھا بلکہ در حقیقت وہ موجوداتِ آخرت کی جنس میں سے تھا دُنیوی اشیاء کا مربّی تو صفات کا عدمی (ذاتی) رخ ہوتا ہے اور جنت اور اس کی موجودات کی تربیت صفات کا وجودی رخ کرتا ہے پس جس طرح اہلِ کمال کی قلبی وابستگی آخرت کی چیزوں سے درست ہے اسی طرح حضرت یوسفؑ سے حضرت یعقوبؑ کی شیفتگی بھی نامناسب نہیں۔

حضرت مجدّد کا یہ صحیح انکشاف اور واضح بصیرت ہے نظر اور کشف نے ہی آپ کو حسنِ یوسفؑ کی اس تنقیح تک پہنچایا ہے۔ اگر اس تحقیق کو مان لیا جائے تو دو شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

پہلا شبہ

حضرت مجدّد قدس سرہ نے ایک اور جگہ صراحت کی ہے کہ انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ باقی ممکنات ظلالِ اسماء و صفات (اسماء و صفات کے عکس اور پرتو) کے جولان گاہ اور مقاماتِ ظہور ہیں۔ نفسِ اسماء و صفات کے مظہر و جلوہ گاہ نہیں ہیں (یعنی انبیاء وملائکہ کے علاوہ دوسری مخلوق پر براہِ راست صفات واسماء کا پرتو نہیں پڑتا بلکہ ظِلالِ صفات کا عکس پڑتا ہے) اور (جس طرح انبیاء وملائکہ کا مبدءِ تعیّنات اسماء و صفات ہیں اسی طرح ظلالِ صفات دوسری مخلوق کے تعیّن کا مبدء ہیں نفسِ صفات اس کے لئے مبدءِ تعیّن نہیں۔ لیکن اس جگہ فرمایا کہ تمام ممکنات (مجرّدہ ہوں یا مادّیہ انبیاء ہوں یا اولیا خواص ہوں یا عوام) کے مبادیِ تعیّن اصلِ اسماء اور نفسِ صفات ہیں۔ یہ بیان میں تضاد اور اختلاف کیوں ہے۔ اور کیسے ممکن ہے کہ دنیوی اشیاء بھی جلوہ گاہِ صفات ہوں اور اخروی اشیاء بھی پرتوگاہِ اسماء، لیکن اول الذکر کی طرف سے صفات کا عدمی اور امکانی رخ ہو اور مؤخر الذکر کی مظہریتِ صفات کے وجودی رخ کی ممنون کرم۔

ازالہ

انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ باقی ممکنات اگر ظلالِ صفات کی جولان گاہ اور مظاہر ہوں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نفسِ صفات کے مظاہر اور جلوہ گاہ نہ ہوں کیونکہ ظل کا ظل اصل کا ظل ہوتا ہے، پس یہ ممکنات ظلالِ صفات کے ظل ہیں تو نفسِ صفات کے بھی ظل ہوں گے (اول ظلّیت براہِ راست ہوگی اور دوسری ظلّیت بالواسطہ) پس اسماء و صفات انبیاء اور ملائکہ پر جلوہ انداز ہوں گے بالواسطہ اور باقی ممکنات پر ان کی جلوہ پاشی ظلال کی وساطت سے ہوگی۔ اس کے بعد دنیوی اشیاء پر صفات کی جو جلوہ پاشی بواسطۂ ظلال ہو رہی ہے اس جلوہ پاشی میں صفات کا عدمی رخ (یعنی ذاتی امکان) ملحوظ ہے۔ اور اخروی اشیاء پر جلوہ ریزی میں ان کا وجودی اور اضافی یعنی ذات خداوندی کے لئے ثبوت وجوبی کا رخ معتبر ہے۔

دوسرا شبہ

کلام سابق سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمام مخلوق خواہ انبیاء ہوں یا عوام علاوہ حضرت یوسفؑ کے جلوہ گاہِ صفات اور جولان گاہِ اسماء ہیں لیکن صفات کا عدمی رخ ملحوظ ہے (یعنی صفات کے ذاتی امکانی عدمی رخ کی جلوہ گاہ تمام مخلوق ہے) اور حضرت یوسفؑ بھی صفاتِ خداوندی کا مظہر ہیں مگر اس میں صفات کا اضافی وجودی رخ ملحوظ ہے (یعنی صفات کے وجودی اور نسبت الی الذّات کا پرتو حضرت یوسفؑ پر پڑا تھا اسی لئے آپ آخرت کی چیزوں کے ہم جنس ہو گئے تھے) اس سے حضرت یوسفؑ کی تمام انبیاء بلکہ سید الانبیاء پر فضیلت لازم آتی ہے۔

ازالہ

آخرت کی جنس سے تو تمام ہی انبیاء تھے حسنِ آخرت تو سب ہی کے اندر پوشیدہ تھا کہیں یوسفی لقب پا کر ظاہر ہو گیا کہیں ظاہر نہیں ہوا لقب کا مفہوم کوئی اہمیت نہیں رکھتا حق بات یہی ہے کہ تمام انبیاء صفات کے وجودی رخ کے اعتبار سے مظہرِ صفات ہیں۔ ان پر صفات کی نور پاشی ذاتی اعتبار سے نہیں بلکہ نسبت الی اللّٰہی کے اعتبار سے ہے۔ رہا حسنِ آخرت کا علاوہ یوسفؑ کے اوروں سے عدمِ ظہور تو اس کی وجہ اللہ ہی کے علم میں ہے ہم واقف نہیں بہرحال یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ انبیاءؑ کا مظہرِ

صفات ہونا دوسرے انسانوں کے مظہرِ صفات ہونے سے الگ نوعیت کا ہے عدمی رخ کے اعتبار سے نہیں بلکہ صفات کے وجودی رُخ کے لحاظ سے ہے۔

حضرت مجددؒ رحمۃ اللہ علیہ نے حضور ختم المرسلین ﷺ کے حسن کے متعلق لکھا ہے کہ محمد ﷺ کی تربیت کرنے والا اور آپ ﷺ کا مبدءِ تعین اللہ کا علم اجمالی ہے صفت علمِ اجمالی تمام صفات سے زیادہ ذات سے قُرب رکھتی ہے۔ علم حضوری اور عالم و معلوم تو متحد الذات ہی ہوتے ہیں باقی صفاتِ قدرت، ارادہ، کلام، سمع و بصر کا درجہ علم کے برابر نہیں ان صفات کی تفصیلات سے بھی علمِ اجمالی کا مرتبہ بلند اور ذات سے قریب ترین ہے۔ علم کا وہ حسن ذاتی ہے جو دوسری صفات کو حاصل نہیں۔ علم کی یہ نسبت دوسری صفات کے ذاتِ خداوندی کو زیادہ پسند ہے علم کا حسن و جمال بے کیف ہے۔ علم کا حسن و جمال اتنا لطیف ہے کہ ختم المرسلین میں جب یہ جلوہ پاش ہوا تو بصارت کے ضعف اور نارسائی کی وجہ سے حسنِ محمد ﷺ کو بھی اسی طرح آنکھیں نہیں پاسکتیں اور نہیں دیکھ سکتیں جیسے ذاتِ خداوندی کو دیکھنے اور پانے سے اس دنیا میں عاجز ہیں۔ آخرت میں آپ کا جمال باکمال نمودار ہوگا اور آنکھوں کو نظر آئے گا۔

یہ تسلیم ہے کہ یوسفؑ کو ۲/۳ حسن عطا کیا گیا تھا لیکن وہ اس دنیا میں تھا اور آخرت میں تو حسنِ محمدی ﷺ ہوگا (کسی پیغمبر کو وہ حسن حاصل نہ ہوگا) دیکھو رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا ہے میرے بھائی یوسفؑ زیادہ شگفتہ رنگ کے تھے اور میں زیادہ ملیح ہوں اہلِ نظر کو صباحت و ملاحت کے درمیان ایسا فرق نظر آتا ہے جو چاند اور سورج یا چاندی اور سونے کے درمیان ہے، حسنِ یوسف پر فریفتہ حضرت یعقوبؑ اور دوسرے انسان تھے اور حسنِ محمدی ﷺ سے محبت رکھنے والا یعقوبؑ کا رب ہے۔ مٹی کس طرح خالق کائنات کی ہمسری کر سکتی ہے اس ساری تقریر سے واضح ہو گیا کہ فناءِ قلب کے بعد صوفی کو اللہ کے سوا کسی مخلوق سے دل بستگی نہیں رہتی اس کے دل میں ماسوا اللہ کی گنجائش ہی باقی نہیں رہتی لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انبیاء کی محبت سے بھی صوفی کا دل خالی ہو جاتا ہے انبیاء کی محبت تو بعینہٖ اللہ کی محبت ہے۔ متفق علیہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے کوئی ایماندار نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ مجھ سے اس کو محبت اپنے باپ، اولاد اور تمام لوگوں کی محبت سے زیادہ نہ ہو۔ یہ حدیث حضرت انسؓ کی روایت سے آئی ہے۔ حضرت انسؓ کی دوسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس میں تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کی شیرینی ان خصائل کی وجہ سے پالے گا۔ تین میں سے ایک یہ ہے کہ جس کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ان کے ماسوا سے زیادہ محبت ہو وہ حلاوتِ ایمان پالے گا۔[1]

حضرت رابعہ بصری نے فرمایا تھا میرے دل کے اندر اللہ کی محبت اتنی بھر گئی ہے کہ محمد ﷺ کی محبت کی اس میں گنجائش ہی نہیں ہے۔ آپ کا یہ کلام حالتِ سُکر کا ہے۔

حضرت مجددؒ نے بھی اپنی ابتدائی حالت میں غلبۂ سکر ہی کے زیر اثر فرمایا تھا میں اللہ سے محبت اس لئے کرتا ہوں کہ اس نے محمدؐ کو پیدا کیا ہے۔ یہ کلام بھی حالتِ جذب کا ہے اگرچہ اس میں کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔

مسئلہ

یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ مصیبت پر رونا اور اظہارِ افسوس کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں نوحہ اور اس جیسی کوئی دوسری چیز شامل نہ ہو۔ منہ پیٹنا، گریبان پھاڑنا وغیرہ بھی نوحہ کی صف میں آتا ہے جو ناجائز ہے، ہاں غم واندوہ اور افسوس و حسرت کا اظہار غیر اختیاری چیز ہے اور غیر اختیاری چیز سے بچنے کا آدمی مکلف نہیں۔

صحیحین میں حضرت انسؓ کا بیان آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم سکرات کی حالت میں تھے

---

[1] از مفسر قدس سرہ

یوسف از شمۂ جمال او | خوشہ چیں شد قسم بحال او
دل از عشق محمد ریش دارم | رقابت باخدائے خویش دارم

حضور ﷺ نے یہ حالت دیکھی تو دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ حضرت عبد الرحمن بن عوف ؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ اور آپ (رو رہے ہیں) فرمایا اے ابن عوف یہ دل کی رِقّت ہے۔ اس کے بعد ایک اور حالت ہوئی تو فرمایا آنکھ روتی ہے دل غمزدہ ہے اور ہم زبان سے کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے ہمارا رب ناراض ہو اے ابراہیم ہم تیری جدائی سے غمگین ہیں۔

صحیحین میں حضرت اُسامہ بن زید ؓ کی روایت سے مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ایک نواسے کی نزع کی حالت تھی خرّاٹا شروع ہو گیا تھا اسی حالت میں حضور ﷺ پہنچ گئے اور یہ حالت دیکھ کر آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، حضرت سعد ؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ یہ کیا تو آپ نے فرمایا یہ دل کی رِقّت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دی ہے اللہ اپنے رحم دل بندوں پر بھی رحم فرماتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابن عمر ؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اللہ آنکھ سے رونے اور دل سے غمگین ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ اس کی وجہ سے عذاب دیتا ہے گویا رحم فرما دیتا ہے (یعنی معاف کر دیتا ہے) "اس کی" کے لفظ سے حضور ﷺ نے زبان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور میت کو عذاب دیا جاتا ہے اس پر اس کے گھر والوں کے رونے کی وجہ سے اس حدیث کا یہ ترجمہ مشہور ہے لیکن اس فقیر کے نزدیک اگر بِبُکاء اھلہ علیہ کا ترجمہ اس طرح کیا جائے تو بہتر ہے کہ میت پر عذاب ہوتا ہے باوجود یہ کہ اس کے گھر والے (اس کی اچھائیوں کا ذکر کر کے) اس پر روتے ہیں واللہ اعلم۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعود ؓ کی روایت سے آیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنے رخسار پیٹے، گریبان پھاڑے اور جاہلیت کی ایسی پکار مچائے وہ ہم سے متعلق نہیں۔

حضرت ابوہریرہ ؓ کی روایت سے صحیحین میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں بیزار ہوں اس شخص سے جو مونڈن کرائے، منہ پیٹے اور کپڑے پھاڑے۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ حَتّٰى تَكُوْنَ حَرَضًا اَوْ تَكُوْنَ مِنَ الْهٰلِكِيْنَ ﴿۸۵﴾

بیٹے کہنے لگے آپ تو ہمیشہ یوسف ؑ ہی کو یاد کرتے رہیں گے یہاں تک کہ گھل گھل کر جاں بلب ہو جائیں یا مر ہی جائیں۔

حَرَضًا بیماری یا پیرانہ سالی کی وجہ سے ہلاکت کے قریب پہنچا ہوا شخص۔ حَرَض اصل میں مصدر ہے اس لئے نہ اس کی جمع آتی ہے نہ مؤنث کا صیغہ، اس جگہ مصدر بمعنی صفت ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے حرض کا معنی ہے غم یا عشق یا پیرانہ سالی کی وجہ سے بدن کا یا مذہب کا یا عقل کا بگاڑ اور خرابی اور جس کے بدن یا مذہب یا عقل میں خرابی پیدا ہو گئی ہو یا جان بلب ہو اس کو بھی حرض کہا جاتا ہے۔

قَالَ اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ یعقوب ؑ نے کہا میں تو بس اللہ ہی سے اپنے رنج و غم کا شکوہ کرتا ہوں۔ بثّ: سخت ترین غم جس کو ضبط کرنے کی تاب نہ رہے اور آدمی اس کو ظاہر کرنے اور پھیلانے پر مجبور ہو جائے (لغت میں بثّ کا معنی ہے پھیلانا) حسن بصری ؒ نے بثّ کا ترجمہ کیا ہے حال۔ مقصد یہ ہے کہ میں تم سے کسی سے شکایت نہیں کرتا اللہ ہی سے شکوہ کرتا ہوں تم مجھے چھوڑ دو مجھے شکایت سے نہ روکو۔

بغوی کا بیان ہے کہ حضرت یعقوب ؑ کے پاس ان کا ایک ہمسایہ آیا اور اس نے کہا یعقوب ؑ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی صحت بدن تباہ ہو گئی اور آپ فنا ہو چکے حالانکہ اپنے باپ کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں، فرمایا یوسف ؑ کے غم میں جو اللہ نے مجھے مبتلا کر دیا اس سے میری قوت ٹوٹ گئی اور اسی نے مجھے فنا کر دیا۔

اللہ نے یعقوب ؑ کے پاس وحی بھیجی یعقوب ؑ تو میرا شکوہ میری مخلوق سے کرتا ہے۔ یعقوب ؑ نے کہا اے میرے رب مجھ سے خطا ہو گئی تو میری خطا معاف فرما دے، اللہ نے فرمایا میں نے تجھے معاف کر دیا اس کے بعد حضرت یعقوب ؑ سے جب کیفیت اور حالت پوچھی جاتی تو فرماتے اِنَّمَآ اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوب ؑ سے دریافت کیا گیا آپ کی نظر کیوں جاتی رہی اور کمر کیوں کمان ہو گئی۔ فرمایا یوسف ؑ پر روتے روتے میری نظر جاتی رہی اور یوسف ؑ کے

بھائی کے غم میں میری کمر کمان ہو گئی اس پر اللہ نے یعقوبؑ کے پاس وحی بھیجی، تو میری شکایت کرتا ہے قسم ہے اپنی عزت کی جب تک تو مجھ سے دعا نہیں کرے گا میں تیرا یہ دکھ دور نہیں کروں گا اس وقت حضرت یعقوبؑ نے کہا اِنَّمَا اَشْكُوا بَثِّي وَ حُزْنِيٓ اِلَى اللّٰهِ اللہ نے وحی بھیجی قسم ہے اپنی عزت کی اب اگر وہ دونوں مردہ بھی ہوئے ہوتے تو تیرے لئے میں ان کو زندہ کر دیتا تجھ سے میری ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ ایک بار تم لوگوں نے ایک بکری ذبح کی تھی اور تمہارے دروازہ پر ایک مسکین آکر کھڑا ہو گیا مگر تم نے اس کو اس میں سے کچھ کھانے کو نہیں دیا۔ تمام مخلوق میں مجھے سب سے زیادہ پیارے انبیاء ہیں اور ان کے بعد مساکین۔ اب تم کھانا تیار کرو اور مسکینوں کی دعوت کرو۔ حسب ہدایت حضرت نے کھانا بنوایا پھر فرمایا جو روزہ دار ہو وہ آج رات کو یعقوبؑ کے گھر والوں کے پاس کھانا کھائے۔

روایت ہے کہ اس کے بعد حضرت یعقوبؑ جب دن کا کھانا کھاتے تو ندا کرا دیتے کہ جو شخص دن کا کھانا کھانا چاہے وہ یعقوبؑ کے پاس آجائے اور جب شام کو افطار کرتے (یعنی رات کا کھانا کھاتے) تو ندا کرا دیتے جو شخص شام کا کھانا کھانا چاہے وہ یعقوبؑ کے پاس آجائے اس طرح صبح شام آپ مسکینوں کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔

وہب بن منبہ نے بیان کیا اللہ نے حضرت یعقوبؑ کے پاس وحی بھیجی (اور فرمایا) کیا تجھے معلوم ہے کہ میں نے کس وجہ سے تجھے سزا دی اور اسّی برس یوسفؑ کو تجھ سے الگ رکھا، حضرت یعقوبؑ نے کہا میرے اللہ مجھے نہیں معلوم فرمایا وجہ یہ تھی کہ تو نے ایک مرتبہ ایک بکری کا بچہ بھونا اور پڑوسی سے کنجوسی کی خود کھا لیا اور اس کو کچھ نہیں دیا۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کی مبتلاء مصیبت ہونے کا سبب یہ ہوا کہ آپ نے ایک مرتبہ ایک بچھڑے کو اس کی ماں کے سامنے ذبح کیا اور وہ بیچاری چیختی رہی۔

وہب اور سدی وغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت جبرئیلؑ جیل خانہ کے اندر حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے اور پوچھا صدّیق کیا آپ نے مجھے پہچانا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا میں ایک پاک صورت دیکھ رہا ہوں اور پاکیزہ خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا میں روح الامین ہوں، رب العالمین کا قاصد ہوں حضرت یوسفؑ نے فرمایا آپ تو سب سے بڑھ کر پاکیزہ، مقرّبین کے سردار اور رب العالمین کے امین ہیں اور یہ گناہگاروں کے داخل ہونے کی جگہ ہے یہاں آپ کے آنے کا کیا سبب ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا یوسفؑ کیا آپ واقف نہیں کہ انبیاء کی پاکی کی وجہ سے اللہ ناپاک گھروں کو پاک کر دیتا ہے اور جس زمین میں پیغمبر داخل ہوتے ہیں وہ ہر زمین سے زیادہ پاک ہو جاتی ہے۔ اے اطہر الطاہرین اور اے منتخب نیک بندوں کی اولاد آپ کی وجہ سے اللہ نے قید خانہ کو اور اس کے ماحول کو پاک کر دیا۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا آپ نے مجھے صدّیق کے نام سے کیوں پکارا اور منتخب پاک لوگوں میں میرا شمار کیوں کیا، مجھے تو گناہگاروں کے مقام میں داخل کیا گیا ہے اور بد چلن لوگوں کے ناموں میں میرا نام بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اللہ نے آپ کا نام صدّیقوں میں شامل کیا، مخلص منتخب بندوں میں آپ کا شمار کیا اور آپ کے صالح اسلاف کی فہرست میں آپ کو بھی داخل کر دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اپنے دل کو فتنہ میں نہ پڑنے دیا اور اپنی مالکہ کے کہے کو نہیں مانا حضرت یوسفؑ نے پوچھا روح الامین کیا آپ کو یعقوبؑ کی بھی کوئی اطلاع ہے حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا جی ہاں اللہ نے ان کو صبرِ جمیل عطا فرمایا وہ آپ کے غم میں مبتلا ہوئے اور غم سے جی ہی جی میں گھٹتے رہے۔ حضرت یوسفؑ نے پوچھا ان کے غم کا کچھ اندازہ بھی ہے۔ حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا ان ستّر عورتوں کے غم کے برابر جن کے بچے مر گئے ہوں حضرت یوسفؑ نے فرمایا کیا آپ کو کچھ معلوم ہے کہ میری ان سے ملاقات بھی ہو گی حضرت جبرئیلؑ نے جواب دیا جی ہاں یہ سن کر حضرت یوسفؑ کا دل خوش ہو گیا اور فرمایا جو کچھ مجھے پیش آیا اس کی مجھے کوئی پرواہ نہیں اگر میں یعقوبؑ کو دیکھ لوں۔

وَاَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۶﴾ اور اللہ کی باتوں کو جتنا میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے یعنی اللہ کی حکمت و رحمت کو جتنا میں جانتا ہوں کہ وہ پکارنے والے کو نامراد نہیں چھوڑتا اور جو بے قراری کے ساتھ اس کی طرف لوٹتا ہے اس کو رد نہیں کرتا یا یہ مطلب ہے کہ از روئے الہام یوسفؑ کے زندہ ہونے سے جو میں واقف ہوں تم واقف نہیں۔

روایت میں آیا ہے کہ حضرت عزرائیلؑ حضرت یعقوبؑ کی ملاقات کو گئے حضرت یعقوبؑ نے پوچھا اے پاکیزہ خوشبو اور حسین صورت والے فرشتے کیا آپ نے میرے بچہ کی روح قبض کی ہے حضرت عزرائیلؑ نے جواب دیا، نہیں۔ یہ سُن کر حضرت یعقوبؑ کو کچھ سکون ہو گیا اور آپ کو یوسفؑ کے دیکھنے کی تمنا ہوئی۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے میں جانتا ہوں کہ یوسفؑ کا خواب سچا ہے میں اور تم سب آئندہ اس کو ضرور سجدہ کریں گے۔ سدی نے بیان کیا جب بیٹوں نے باپ کو بادشاہ کے حسنِ سلوک کی اطلاع دی تو آپ کو یوسفؑ کے زندہ ہونے کا خیال پیدا ہو گیا اور ملنے کی خواہش بھی اور فرمایا شاید وہ یوسفؑ ہو۔ ابن ابی حاتم نے نصر بن عربی کا بیان نقل کیا ہے نصر نے کہا مجھے اطلاع ملی ہے کہ حضرت یعقوبؑ کو ۲۴ سال حضرت یوسفؑ کے زندہ یا مردہ ہونے کی کوئی خبر نہیں ہوئی آخر ایک روز موت کا فرشتہ انسانی شکل میں آپ کے سامنے آکھڑا ہوا، حضرت نے دریافت کیا آپ کون ہیں، ملک الموت نے کہا میں موت کا فرشتہ ہوں حضرت یعقوبؑ نے فرمایا میں تم کو یعقوبؑ کے معبود کی قسم دیتا ہوں مجھے بتاؤ کیا تم نے یوسفؑ کی جان قبض کر لی، ملک الموت نے جواب دیا نہیں۔ یہ جواب سُن کر حضرت نے فرمایا

یٰبَنِیَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ یُّوْسُفَ وَاَخِیْهِ وَلَا تَایْــٴَـسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِؕ اِنَّهٗ لَا یَایْــٴَـسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۷﴾ میرے بیٹو! جاؤ یوسفؑ کی اور اس کے بھائی کی تلاش کرو اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو اللہ کی رحمت سے آس کافر لوگ توڑا کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے تَحَسَّسُوْا کا ترجمہ کیا تلاش کرو، ڈھونڈو۔ لغت میں تَحَسَّس کا معنی ہے کسی کی سن گن، تلاش کرنا۔ "رَوح" سے مراد ہے رحمت بعض کے نزدیک مراد ہے مصیبت سے نجات اور خدا کی عطا کردہ خوشی۔

الکافرون یعنی وہ لوگ جو اللہ کی ذات و صفات کو نہیں جانتے اور انکار کرتے ہیں۔ اللہ کو پہچاننے والا اس کی رحمت سے کبھی بے آس نہیں ہوتا۔

غرض سب بھائی لوٹ کر مصر کو گئے اور حضرت یوسفؑ کے پاس پہنچے۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلَیْهِ قَالُوْا یٰۤاَیُّهَا الْعَزِیْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰىةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَیْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَیْنَاؕ اِنَّ اللّٰهَ یَجْزِی الْمُتَصَدِّقِیْنَ ﴿۸۸﴾

پھر جب یوسفؑ کے پاس پہنچے تو کہنے لگے اے عزیز ہم کو اور ہمارے گھر والوں کو قحط کی وجہ سے بڑی تکلیف پہنچی ہے اور ہم کچھ نکمی چیز لائے ہیں سو آپ پورا غلہ دے دیجئے اور ہم کو خیرات سمجھ کر دے دیجئے بے شک اللہ خیرات دینے والوں کو جزاء خیر دیتا ہے۔

الضُّر بھوک کی شدت مُزجاۃ: کا مرادی ترجمہ حضرت ابن عباسؓ نے کیا کھوٹے، ردی، نہ چلنے والے درہم۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ابو عبید اور ابن ابی شیبہ اور ابن جریر اور ابن المنذر اور ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ کی روایت میں آیا ہے۔ ابن ابی حاتم نے عکرمہ کا بھی یہی قول نقل کیا ہے لیکن سعید بن منصور اور ابن المنذر اور ابوالشیخ نے کہا کہ عکرمہ نے اس کا ترجمہ کیا تھوڑے درہم۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ کی روایت ہے کہ عبداللہ بن حارث نے کہا (بضاعتِ مزجاۃ سے مراد ہے) صحرائی لوگوں کا مال یعنی اون اور گھی روایت میں گھی کی جگہ پنیر آیا ہے۔

ابن جریر ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے ابو صالح کے حوالہ سے لکھا ہے حبۃ الخضراء اور صنوبر کی لکڑی۔

ابن النجار نے کہا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مقل کے ستو تھے۔ بعض علماء نے کہا کچے چمڑے اور جوتے تھے۔ اِزجاء (مصدر باب افعال۔ مُزجاۃ اسم مفعول مؤنث) کا اصل لغوی معنی ہے دھکا دینا اور ہنکانا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ اللّٰهَ یُزْجِیْ سَحَابًا کہ اللہ بادل کو ہنکاتا ہے چلاتا ہے۔ ردی درہموں کو بھی مزجاۃ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ کوئی ان کو لیتا نہیں ان کو پھینکا جاتا ہے اسی طرح اگر بیش قیمت سامان کے عوض تھوڑے درہم دیئے جائیں تو ان کو بھی نہیں لیا جاتا رد کر دیئے جاتے ہیں یہی

حالت دوسری ردّی چیزوں کی ہے کہ ان کو بطورِ قیمت کوئی شخص نہیں لیتا اگر بائع خود چشم پوشی کرے اور قبول کرلے تو دوسری بات ہے۔

فاوف لنا یعنی ان قلیل یا کھوٹے درہموں میں غلہ ہم کو اتنا ہی پورا پورا دے دیجئے جتنا اس سے پہلے آپ نے کھرے درہموں میں دیا تھا۔ اور جو قیمت کم رہ جائے وہ بطورِ خیرات آپ چھوڑ دیجئے۔ اکثر مفسّرون نے تصدق علینا کا تفسیری مطلب یہی بیان کیا ہے لیکن ابن جریج اور ضحاک نے کہا کہ درخواستِ تصدق کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی خیرات میں ہمارے بھائی کو واپس کر دیجئے۔ جزا دینے سے مراد ہے دنیا اور آخرت میں اچھا بدلہ دینا۔ اجزاء اور تصدق دونوں کا معنی ہے مہربانی کرنا حالتِ سفر میں صلوٰۃ کے متعلق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ (اللہ کی طرف سے) صدقہ (مہربانی) ہے جو اللہ نے تم پر کیا ہے تم اللہ کی مہربانی کو قبول کرو۔ رواہ البخاری۔ لیکن عرف شرع میں تصدق ایسی مہربانی کرنے کو کہتے ہیں جس کا مقصد ثواب کی طلب اور اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو اور یہ تصدق اسی شرعی عُرف پر مبنی ہے۔

حسن بصریؒ کا یہ قول کہ جب آپ نے ایک آدمی کو ان الفاظ میں دعا کرتے سنا اے اللہ مجھ پر صدقہ کر تو فرمایا اللہ تصدق نہیں کرتا تصدق تو وہ کرتا ہے جو ثواب کا طلب گار ہو تم یوں دعا کرو اے اللہ! مجھے عطا فرما مجھ پر مہربانی کر۔ حسن بصری نے جو اللہ کی طرف صدقہ دینے کی نسبت سے انکار کیا اور ممانعت فرمائی تو آپ کی مراد اس سے شرعی صدقہ و خیرات تھی جو طلبِ ثواب کے لئے ہوتی ہے (لغوی اعتبار سے اس کا معنی صحیح ہے لغت میں تصدق کا معنی ہے مہربانی کرنا پس اللہ سے مہربانی کی درخواست کرنا صحیح ہے)

ضحاک نے کہا بادشاہ سے برادرانِ یوسفؑ نے یہ نہیں کہا اللہ آپ کو جزا دے گا کیونکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ شاہ مصر مؤمن ہے یا نہیں (اور اللہ کی طرف سے آخرت میں جزاء خیر صرف مؤمن کے لئے مخصوص ہے) اصل میں ان کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ شاہِ مصر خیرات بھی دے گا یا نہیں۔

فائدہ

سفیان بن عیینہ سے کسی نے پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی اور پیغمبر کے لئے بھی صدقہ حرام تھا فرمایا نہیں کیا تم نے آیت وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا إِنَّ اللَّهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِينَ نہیں سنی۔ کذا اخرج ابن جریر۔ میں کہتا ہوں سفیان نے اس آیت سے استدلال کیا کہ دوسرے پیغمبروں کے لئے صدقہ لینا جائز تھا۔ مگر یہ استدلال اس وقت صحیح ہوگا جب حضرت یوسفؑ کے بھائیوں کا نبی ہونا ثابت ہو جائے۔

(یہ فقیر کہتا ہے کہ تَصَدَّقْ عَلَيْنَا کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر اور ہمارے گھر والوں پر جن میں حضرت یعقوبؑ بھی شامل تھے کچھ صدقہ کیجئے حضرت یعقوبؑ عَلَيْنَا کی ضمیر سے مستثنیٰ نہیں۔ اس صورت میں سب بھائیوں کی نبوت ثابت ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حضرت یعقوبؑ تو مسلم الثبوت نبی تھے۔ مترجم)

بھائیوں کا یہ دردناک کلام سن کر حضرت یوسفؑ کے دل میں رقت آگئی آنسو ٹپک پڑے اور پوشیدہ راز ظاہر ہو گیا اس لئے

قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنتُمْ جَاهِلُونَ ﴿٨٩﴾ بولے کیا وہ بھی تم کو یاد ہے جو تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا تھا جبکہ تمہاری جہالت کا زمانہ تھا، یعنی جو ظلم تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کہ یوسفؑ کو لے جا کر اس کے بھائی کو اکیلا کر دیا اور طرح طرح سے اس کو ذلیل کیا کہ وہ بے چارا اب اپنی ذلت کو زبان پر بھی نہیں لا سکتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ جو بُرا سلوک اور بے جا حرکت تم نے کی وہ بھی تم کو یاد ہے اس سے توبہ کرو۔ اِذْ اَنتُمْ جَاهِلُونَ کا یہ مطلب ہے کہ اس وقت اپنے فعل کی بُرائی سے تم ناواقف تھے یا اس کے نتیجے سے ناواقف تھے۔ حضرت یوسفؑ کا مقصد تھا توبہ کی ترغیب دینا اور بھائیوں پر مہربانی کا اظہار کرنا، ڈانٹنا اور ملامت کرنا مقصود نہیں تھا۔ آیت لَا تَثْرِيبَ

عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ میں صراحت ہے کہ ملامت کرنا مقصود نہ تھا۔ کلبی نے حضرت یوسفؑ کے اس قول کی یہ وجہ بیان کی کہ آپ کے بھائیوں سے جب مالک بن دعر کا یہ قول نقل کیا گیا کہ میں نے کنویں کے اندر ایک ایسا غلام پایا تھا جس کو اتنے درہم میں میں نے خرید لیا تو بھائیوں نے حضرت یوسفؑ سے کہا اے بادشاہ ہم نے ہی وہ غلام بیچا تھا، حضرت یوسفؑ کو یہ بات سن کر غصہ آیا اور آپ نے سب بھائیوں کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا، شاہی آدمی ان کو قتل کرنے لے چلے یہودا نے منہ پھیر کر دیکھا اور کہا یعقوب پر ہم میں سے ایک کے نہ ہونے کا اتنا غم پڑا اور اتنا روئے کہ نظر جاتی رہی جب سب بیٹوں کے مارے جانے کی ان کو اطلاع ملے تو ان کا کیا حال ہوگا، پھر سب بھائیوں نے کہا اگر آپ ایسا ہی کر رہے ہیں تو ہمارے والد کو ہمارا یہ سامان بھیج دینا وہ فلاں مقام پر رہتے ہیں اس وقت حضرت یوسفؑ کو رحم آگیا اور آپ رونے لگے اور قولِ مذکور کہا۔

عبداللہ بن یزید بن ابی فروہ کا قول روایت میں آیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے جب سنا کر بنیامین کو روک لیا گیا تو ایک خط لکھ کر بیٹوں کے ہاتھ حضرت یوسفؑ کو بھجوایا یہ بیٹوں کے تیسرے پھیرے کا ذکر ہے۔ یعقوب اسرائیل اللہ (عبداللہ) بن اسحاق ذبیح اللہ بن ابراہیم خلیل اللہ کی طرف سے شاہِ مصر کے نام۔

حمد و ستائش کے بعد واضح ہو کہ ہم ایسے گھرانے والے ہیں جو ہمیشہ سپردِ مصائب رہے ہیں میرے دادا ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کو آگ میں ڈالا گیا پھر اللہ نے اس آگ کو ان کے لئے ٹھنڈک اور سلامتی بنا دیا، میرے باپ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ان کی گردن پر چھری رکھ دی گئی تاکہ ان کو ذبح کر دیا جائے مگر اللہ نے ان کا فدیہ (جنت سے مینڈھے کی شکل میں) بھیج دیا (اور ان کو محفوظ رکھا) اب رہا میں تو میرا ایک بیٹا تھا جو سب اولاد سے مجھے پیارا تھا اس کے بھائی اس کو جنگل کو لے گئے پھر شام کو اس کا خون آلودہ کرتہ لا کر مجھے دے دیا اور کہا اس کو بھیڑیے نے کھا لیا۔ اس پر روتے روتے میری آنکھیں جاتی رہیں پھر میرا ایک بیٹا اور تھا جو مرحوم کا ماں جایا بھائی تھا میں اس کو دیکھ کر تسلّی حاصل کر لیتا تھا اب آپ نے اس کو روک لیا اور یہ خیال کیا کہ اس نے چوری کی ہے ہم ایسے خاندان والے ہیں جو چوری نہیں کرتے نہ چور ہمارے ہاں پیدا ہوتا ہے اگر آپ میرے بیٹے کو مجھے واپس کر دیں تو بہتر ہے ورنہ آپ کو ایسی بددعا دوں گا کہ اس کا اثر آپ کی ساتویں نسل تک پڑے گا۔ حضرت یوسفؑ نے خط پڑھا تو آنسوؤں کو روک نہ سکے اور سامنے آکر فرمایا هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَأَخِيهِ إِذْ أَنْتُمْ جَاهِلُونَ یعنی جب کہ تم کو معلوم نہ تھا کہ یوسفؑ آخر میں کس مرتبہ تک پہنچے گا اس وقت تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا کچھ معلوم بھی ہے۔ بعض لوگوں نے جَاهِلُونَ کا ترجمہ کیا ہے قصوروار گنہگار۔ حسن بصریؒ نے ترجمہ کیا جب کہ تم جوان تھے اور جوانی کی جہالت میں مبتلا تھے۔ اس وقت تم نے کیا کیا تھا۔

قَالُوا أَإِنَّكَ لَأَنْتَ يُوسُفُ ط کہنے لگے کیا سچ مچ آپ ہی یوسفؑ ہیں۔ یہ استفہام تقریری ہے (کیا واقعی آپ ہی یوسفؑ ہیں) ابن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلے حضرت یوسفؑ پردے کے پیچھے سے کلام کرتے تھے پھر جب هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ فرمایا تو پردہ ہٹا دیا اور نقاب اٹھا دیا اس وقت بھائیوں نے پہچان لیا۔

میں کہتا ہوں قصہ مذکورہ کا تفصیلی بیان ابن اسحاق کے اس قول سے انکار کر رہا ہے اور ہے بھی بعید از فہم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس بات کو کہتے وقت آپ مسکرا دیئے مسکرانے سے موتیوں کے ہار کی طرح اگلے دانت سامنے آگئے اور بھائیوں نے دیکھ کر ان کو یوسفؑ کے دانتوں کی طرح قرار دیا۔

عطاء کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ بھائی یوسفؑ کو اس وقت تک نہ پہچان سکے جب تک آپ نے سر سے تاج نہ اتار دیا، آپ کے سر کے اوپر ایک جانب لسن تھا جو موروثی تھا۔ حضرت یعقوبؑ کے بھی تھا حضرت اسحٰقؑ کے بھی تھا اور (حضرت اسحٰق کی والدہ) حضرت سارہ کے بھی تھا، علامت کو پہچان کر بھائی بول اٹھے بلاشبہ آپ یوسفؑ ہیں۔ بعض اہلِ تفسیر نے کہا کہ بھائیوں نے (یقین کے ساتھ نہیں بلکہ) یونہی گمان سے کہا تھا۔

قَالَ أَنَا يُوسُفُ وَهَٰذَا أَخِي ز یوسفؑ نے کہا میں یوسفؑ ہوں اور یہ میرا ماں جایا بھائی ہے۔ بھائیوں نے تو

صرف آپ کو دریافت کیا تھا۔ مگر آپ نے اپنے مزید تعارف اور بھائی کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے بھائی کا بھی ذکر کر دیا اور واضح کر دیا کہ اللہ نے جو احسان کیا وہ ہم دونوں پر کیا۔

قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا ۖ بلاشبہ اللہ نے ہم دونوں پر کرم فرمایا کہ سلامتی اور عزم کے ساتھ دونوں کو یکجا کر دیا اور ملا دیا۔

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٩٠﴾ واقعی جو شخص گناہوں سے بچتا اور مصائب وطاعات پر صبر کرتا ہے تو اللہ ایسے نیک کام کرنے والوں کا اجر نہیں کھوتا۔

یعنی جو اللہ سے ڈرتا ہے ادائے فرائض کرتا ہے اور معاصی سے اجتناب کرتا ہے اور مصائب پر صبر کرتا ہے اور ادائے طاعات پر پابند کرتا ہے اور گناہوں سے اپنے آپ کو روکے رکھتا ہے تو ایسے لوگوں کا اجر اللہ ضائع نہیں کرتا نہ دنیا میں نہ آخرت میں، وہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے۔ بجائے اَجْرَهُمْ کے اَلْمُحْسِنِيْنَ کا لفظ ذکر کرتا بتا رہا ہے کہ نیکو کار وہی ہے جو متقی بھی ہو اور صابر بھی۔

قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ اٰثَرَكَ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَاِنْ كُنَّا لَخٰطِــِٕيْنَ ﴿٩١﴾ بولے بخدا بلاشبہ اللہ نے آپ کو ہم پر برتری عطا فرمائی اور ہم یقیناً خطاوار تھے۔ یعنی معذرت پیش کرتے ہوئے انہوں نے قسم کھا کر کہا کہ جمالِ صورت اور کمالِ سیرت اور تمام دُنیوی واخروی فضائل کے لحاظ سے اللہ نے آپ کو ہم پر برتری عطا فرمائی اور ہم نے جو کچھ آپ کے ساتھ کیا اس کے ہم خطاوار ہیں۔ خٰطِئِيْنَ قصداً خطا کرنے والے) خَطِئَ قصداً خطا کی اور اَخْطَأَ (باب افعال) نادانستہ خطا کی۔

قَالَ لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ۖ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ ۖ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿٩٢﴾ یوسف نے کہا آج تم پر کوئی الزام نہیں (یعنی میں نے معاف کیا) اللہ تمہارا قصور معاف کرے وہ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہے۔ (امید ہے معاف کر دے گا)

تَثْرِيْبَ: آنکھوں کی چربی چھیل دینا ثرب آنکھوں پر چھائی ہوئی چربی، مجازاً کسی کو لعنت ملامت کرنا جس سے مجرم کی آبروریزی اور توہین ہو رہی ہو، مطلب یہ ہے کہ آج جبکہ میں تم لوگوں کو لعنت ملامت کر سکتا ہوں لیکن کچھ نہیں کہتا تو پھر آئندہ کچھ برا بھلا کہنے کا تو احتمال ہی نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ تمہارے اقرار کے بعد میں نے تم کو معاف کر دیا اللہ تم کو معاف کرے وہ ارحم الرّاحمین ہے اور میں نادار محتاج ہوں جب میں نے معاف کر دیا تو اللہ تو بے نیاز اور غفور ہے وہ ضرور معاف کر دے گا اور توبہ کرنے والے پر مہربانی فرمائے گا۔

بیضاوی نے لکھا ہے جب بھائیوں نے یوسفؑ کو پہچان لیا تو کہا آپ صبح شام ہم کو کھانے پر بلواتے ہیں اور ہم سے جو آپ کے معاملے میں قصور ہو گیا تھا اس کی وجہ سے ہم کو آپ سے شرم آتی ہے، حضرت یوسفؑ نے کیسا کریمانہ جواب دیا، فرمایا، مصر والے مجھے گزشتہ نظر ہی سے دیکھتے تھے لوگ کہتے تھے سبحان اللہ ایک غلام جو بیس درہم میں بیچا گیا تھا، اللہ نے اس کو کہاں پہنچایا اب جو لوگوں کو معلوم ہوا کہ میں غلام نہیں تھا تمہارا بھائی ہوں اور حضرت ابراہیمؑ کا پوتا ہوں تو تمہاری وجہ سے مجھے عزّت مل گئی اور مصر والوں کی آنکھوں میں میری عظمت پیدا ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے جب حضرت یوسفؑ نے اپنا تعارف کرا دیا تو پھر باپ کا حال پوچھا اور فرمایا میرے بعد میرے باپ کی کیا حالت ہوئی، بھائیوں نے بتایا کہ باپ کی آنکھیں روتے روتے جاتی رہیں۔ حضرت یوسفؑ نے اپنا کرتہ ان کو دیا اور باپ کو بلو لیا اور فرمایا

اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا ۚ میرا یہ کرتہ لے جا کر میرے باپ کے منہ پر ڈال دو (اس سے) وہ بینا ہو جائیں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ میرے پاس بینا ہو کر آجائیں گے۔ حسن نے کہا حضرت یوسفؑ کو اللہ نے اطلاع دے دی ہو گی جب ہی تو آپ نے فرمایا کہ وہ بینا ہو جائیں گے اللہ کی طرف سے اطلاع پانے کے بغیر وہ ایسی بات نہیں کہہ سکتے تھے۔ مجاہد نے کہا حضرت جبرئیلؑ نے حضرت یوسفؑ کو اللہ کی طرف سے حکم دیا تھا کہ

حضرت یعقوبؑ کو اپنا کرتہ بھیج دیجئے۔ یہ قمیص حضرت ابراہیمؑ کا تھا جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو کپڑے اتار لئے گئے تھے اس وجہ سے جبرئیلؑ نے جنت سے ایک ریشمی قمیص لاکر آپ کو پہنا دیا تھا یہ کرتہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس رہا پھر آپ کی وفات کے بعد حضرت اسحٰقؑ کو میراث میں ملا اور حضرت اسحٰقؑ کے بعد حضرت یعقوبؑ کو پہنچا۔ یوسفؑ جب جوان ہو گئے تو حضرت یعقوبؑ نے وہ کرتہ ایک نلکی میں سر بند کر کے بطورِ تعویذ حضرت یوسفؑ کے گلے میں ڈال دیا تاکہ آپ کو نظر نہ لگے ہر وقت وہ یوسفؑ کے گلے میں رہتا تھا، جب آپ کو کرتہ اتار کر کنویں میں ڈالا گیا تو حضرت جبرئیلؑ نے آکر تعویذ کھول کر اس میں سے کرتہ نکال کر حضرت یوسفؑ کو پہنا دیا پھر حضرت یوسفؑ جب بھائیوں سے مذکورہ بالا گفتگو کر رہے تھے تو حضرت جبرئیلؑ نے آکر کہا وہ قمیص بھیج دیجئے اس کے اندر جنت کی خوشبو ہے جس دکھی اور بیمار پر اس کو ڈالا جائے گا وہ تندرست ہو جائے گا اس اطلاع کے بعد آپ نے وہ کرتہ اپنے بھائیوں کے سپرد کر دیا اور فرمایا اس کو میرے باپ کے چہرے پر ڈال دینا وہ بینا ہو جائیں گے۔

میں کہتا ہوں حضرت مجدد قدس سرہٗ کے کشف سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ حسنِ یوسفؑ دنیوی چیزوں سے نہ تھا بلکہ آپ کا حسن اور وجود جنت کی چیزوں کی جنس سے تھا تو اب کوئی ضرورت نہیں کہ ہم اس کرتے کو جنت سے آیا ہوا مانیں بلکہ اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حضرت یوسفؑ کا پہنا ہوا تھا وجودِ یوسفؑ تو خود جنت کی چیزوں کی جنس میں سے تھا (آپ کی ہستی اس عدمی دنیا کی چیز ہی نہ تھی)۔

وَأْتُونِي بِأَهْلِكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٣﴾ اور آپ (سب بھائی اور باپ) اپنے سب گھر والوں کو (عورتوں کو، بچوں کو، خادموں کو) میرے پاس لے آئیں۔

ع ۴

وَلَمَّا فَصَلَتِ الْعِيرُ قَالَ أَبُوهُمْ إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ لَوْلَا أَنْ تُفَنِّدُونِ ﴿٩٤﴾

اور جب قافلہ چلا تو ان کے باپ نے کہنا شروع کیا کہ اگر تم مجھ کو بوڑھاپے کی وجہ سے بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو ایک بات کہوں کہ مجھ کو تو یوسفؑ کی خوشبو آرہی ہے۔

یعنی جب وہ قافلہ جس میں حضرت یوسفؑ کا قمیص تھا اور مصر سے کنعان جانے کے لئے چلا تھا شہر کی آبادی سے نکلا تو حضرت یعقوبؑ نے حاضرین سے کہا مجھے یوسفؑ کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے اگر تم سٹھیایا ہوا نہ قرار دو تو میں کہتا ہوں کہ یوسفؑ کی ملاقات ہونے والی ہے۔ رِیحَ یُوسُف فرمایا ریح قمیص یوسف نہیں فرمایا، اس سے مترشح ہو رہا ہے کہ جنت کی خوشبو یوسفؑ کی ہی خوشبو تھی، قمیص یوسفؑ کی نہ تھی۔

بغوی نے لکھا ہے بادِ صبا نے اپنے رب سے اجازت طلب کی کہ بشارت دینے والے کے پہنچنے سے پہلے یوسفؑ کی خوشبو کو پہنچا دے۔

مجاہد نے کہا تین روز کی مسافت سے یوسفؑ کی خوشبو یعقوبؑ کو پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول میں آٹھ رات کی مسافت کا ذکر آیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہوا قمیص یوسفؑ کی خوشبو لے کر یعقوبؑ تک پہنچی جس سے آپ کو جنت کی خوشبو محسوس ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر سوائے قمیص کی خوشبو کے جنت کی اور کوئی خوشبو نہیں تھی اسی لئے آپ نے إِنِّي لَأَجِدُ رِيحَ يُوسُفَ فرمایا۔ فَنَدٌ کا معنی ہے بڑھاپے کی وجہ سے عقل میں نقصان آجانا اور تفنید (باب تفعیل) کا معنی ہے کسی کو سٹھیایا ہوا قرار دینا۔ اس لئے "عجوز مفندہ" نہیں کہا جاتا کیونکہ عورت کا نقصان عقل ذاتی ہوتا ہے صرف بڑھاپے کی وجہ سے نہیں ہوتا عورت ناقص العقل فطرتاً ہوتی ہے۔

لَوْلَا کا جواب محذوف ہے یعنی اگر تم مجھے سٹھیایا ہوا نہ سمجھو تو مجھے سچا جانو یا میں کہتا ہوں کہ یوسفؑ کی ملاقات عنقریب ہو گی۔

قَالُوا تَاللَّهِ إِنَّكَ لَفِي ضَلَالِكَ الْقَدِيمِ ﴿٩٥﴾ وہ کہنے لگے آپ تو اپنے اسی پرانے غلط خیال میں مبتلا ہیں۔

ضلال سے مراد یہ ہے کہ یوسفؑ کی محبت اس کی یاد کی کثرت اور امید وصال رکھنے کی وجہ سے آپ کی عقل صحیح راستہ سے ہٹ

گئی ہے اور آپ پرانی غلطی میں مبتلا ہیں۔

فَلَمَّآ اَنْ جَآءَ الْبَشِيْرُ اَلْقٰىهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَارْتَدَّ بَصِيْرًا ۚ پھر جب بشارت دینے والا (یوسف ؑ کے پاس سے) یعقوب ؑ کے پاس پہنچا تو کرتہ یعقوب ؑ کے چہرے پر ڈال دیا جس سے فوراً یعقوب ؑ لوٹ کر بینا ہو گئے۔

حضرت ابن مسعود ؓ نے فرمایا قافلے کے پہنچنے سے پہلے بشارت دہندہ پہنچا حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا وہ یہودا تھا۔ سدی کا بیان ہے یہودا نے کہا جب میں خون آلودہ کرتہ لے کر باپ کے پاس گیا تھا اور ان کو اطلاع دی تھی کہ یوسف ؑ کو بھیڑیا کھا گیا تو اب میں ہی یہ کرتہ لے کر جاؤں گا اور اطلاع دوں گا کہ یوسف ؑ زندہ ہیں جیسے ان کو غم دیا تھا ویسے ہی ان کو خوش بھی کروں گا۔ حضرت ابن عباس ؓ نے فرمایا کرتہ لے کر یہودا ننگے سر دوڑتا ہوا نکل چلا صرف سات روٹیاں ساتھ لی تھیں وہ بھی پوری نہ کھا سکا اور اسّی فرسخ کی مسافت طے کر کے باپ کے پاس پہنچا۔ بعض نے کہا خوش خبری دینے والا مالک بن وعر تھا فَارْتَدَّ بَصِيْرًا کا معنی یہ ہے کہ یعقوب ؑ دوبارہ بینا ہو گئے، کمزور سے طاقتور اور بڑھاپے کے بعد جوان ہو گئے۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ ۚ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۹۶﴾ یعقوب نے کہا کیا میں نے تم لوگوں سے نہیں کہہ دیا تھا کہ اللہ کی جو باتیں میں جانتا ہوں تو نہیں جانتے۔ یعنی یوسف ؑ کے زندہ ہونے اور اس سے ملاقات ہونے کی اطلاع میں نے تم کو پہلے ہی دے دی تھی یا میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو اور مجھے یوسف ؑ کی خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔

بغوی کا بیان ہے، روایت میں آیا ہے حضرت یعقوب ؑ نے پوچھا یوسف ؑ کس حال میں ہے بشارت دینے والے نے جواب دیا وہ مصر کے بادشاہ ہیں حضرت نے فرمایا بادشاہ ہے تو میں کیا کروں میں پوچھتا ہوں تم نے کس مذہب پر ان کو چھوڑا البشیر نے کہا اسلام پر، فرمایا اب نعمت کامل ہو گئی۔

قَالُوْا يٰٓاَبَانَا اسْتَغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَآ اِنَّا كُنَّا خٰطِـِٕيْنَ ﴿۹۷﴾ بیٹوں نے کہا ابا ہمارے گناہوں کو معاف کر دینے کی اللہ سے دعا کر دیجئے کوئی شک نہیں کہ ہم خطاوار تھے یعنی ہم اپنی خطا کا اقرار کرتے ہیں آپ کے اور یوسف ؑ کے حق میں ہم نے جو قصور کیا اس کی معافی کی دعا اللہ سے کر دیجئے۔

قَالَ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۹۸﴾ یعقوب ؑ نے کہا میں اپنے رب سے تمہارے قصور کے معاف کر دینے کی ضرور درخواست کروں گا وہی بلاشبہ بڑا غفور و رحیم ہے (معاف فرما دے گا)۔

اکثر اہل تفسیر کا قول ہے حضرت یعقوب ؑ نے سحر پر دعا کو موقوف رکھا کیونکہ ہر رات کو تہائی رات رہے ہمارا رب دنیوی آسمان پر خصوصی نزول تجلی فرماتا ہے اور ارشاد فرماتا ہے کون ہے جو مجھے پکارے اور میں اس کی دعا قبول کروں، کون ہے جو مجھ سے سوال کرے اور میں اس کو عطا کروں اور کون ہے جو مجھ سے عفو گناہ کی درخواست کرے اور میں اسے معاف کروں۔ رواہ البخاری و مسلم عن ابی ہریرۃ فی الصحیحیں۔ غرض جب مقررہ وقت آیا تو حضرت یعقوب ؑ سحر کو نماز پڑھنے کھڑے ہو گئے اور نماز سے فارغ ہو کر دونوں ہاتھ اٹھا کر اللہ سے دعا کی، اے اللہ! مجھ سے جو بے صبری یوسف ؑ کے معاملے میں ہوئی تھی اس کو معاف فرما دے اور میرے بیٹوں نے جو برا سلوک میرے اور یوسف ؑ کے ساتھ کیا اس کو بھی بخش دے۔ اللہ نے وحی بھیجی تمہارا اور تمہارے لڑکوں کا قصور میں نے معاف کر دیا۔

عکرمہ ؒ کی روایت میں حضرت ابن عباس ؓ کا قول آیا ہے کہ سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّيْ سے یہ مراد ہے کہ شب جمعہ میں، میں تمہارے لئے دعا کروں گا۔ وہب نے کہا کچھ اوپر بیس برس تک ہر شب جمعہ میں حضرت یعقوب ؑ لڑکوں کے لئے استغفار کرتے رہے۔ طاؤس نے کہا شب جمعہ کی سحر پر حضرت یعقوب ؑ نے دعا کو موقوف رکھا تھا اور اتفاق سے وہ رات ۱۰ محرم کی بھی پڑ گئی تھی۔ شعبی نے کہا سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ کا یہ مطلب ہے کہ میں یوسف ؑ سے معاف کر دینے کو کہوں گا وہ معاف کر دیں گے تو پھر اللہ سے تمہارے لئے استغفار کروں گا۔ اللہ اسی وقت معاف کرتا ہے جب مظلوم بھی اپنا حق معاف کر دے۔

بعض علماء نے کہا حضرت یعقوبؑ جاننا چاہتے تھے کہ بیٹوں نے سچے دل سے توبہ کی ہے یا نہیں یا بات معلوم ہونے تک آپ نے دعا کو مؤخر کر دیا۔

نووی نے لکھا ہے روایت میں آیا کہ بشارت دینے والے قاصد کے ساتھ حضرت یوسفؑ نے دو سو اونٹنیاں اور بکثرت سامان بھی بھیجا تھا۔ تاکہ حضرت تمام اہل و عیال و متعلقین کو لے کر مصر آ جائیں چنانچہ آپ مصر جانے کو تیار ہو گئے اور زن و مرد بہتر اور مسروق کے بقول ۳۹۰ شخص روانہ ہو گئے جب یہ قافلہ مصر کے قریب پہنچا تو حضرت یوسفؑ اور بادشاہ چار ہزار فوج کے ساتھ استقبال کے لئے روانہ ہو گئے۔ مصر کے اور لوگ بھی حضرت یوسفؑ کی معیت میں استقبال میں شریک تھے، حضرت یعقوبؑ یہودا پر سہارا دیئے پیدل آ رہے تھے، سواروں اور دوسرے لوگوں کو ملاحظہ فرمایا تو دریافت کیا یہودا کیا یہ فرعونِ مصر ہے، یہودا نے جواب دیا نہیں ابا یہ تو آپ کے صاحبزادے ہیں۔

فَلَمَّا دَخَلُوْا عَلٰى يُوْسُفَ اٰوٰٓى اِلَيْهِ اَبَوَيْهِ جب یعقوبؑ اور ان کے گھر والے یوسفؑ کے پاس پہنچ گئے تو انہوں نے ماں باپ کو اپنے پاس جگہ دی۔

میں کہتا ہوں شاید حضرت یوسفؑ مصر سے روانہ ہو کر کسی خاص مقام تک پہنچ گئے اور وہاں کسی خیمہ یا محل میں اتر کر رک گئے تاکہ قافلہ وہاں پہنچ جائے تو اس کا استقبال کریں اور حضرت یعقوبؑ اپنے متعلقین کے ساتھ اسی مقام پر پہنچ کر حضرت یوسفؑ کے پاس (قصر یا خیمہ کے اندر) داخل ہوئے ہوں۔

بغوی نے لکھا ہے جب یوسفؑ اور یعقوبؑ ایک دوسرے کے قریب پہنچ گئے تو حضرت یوسفؑ نے سلام کرنا چاہا لیکن حضرت جبرئیلؑ نے روک دیا اور فرمایا پہلے وہ سلام کریں پھر آپ کرنا۔

میں کہتا ہوں شاید یہ اس محبوبیت الٰہیہ کا اثر تھا جو حضرت یوسفؑ میں نمودار ہو گئی تھی آخر حضرت یعقوبؑ نے ہی ابتدائی سلام کیا اور کہا اے غموں کے دُور کرنے والے تجھے سلامتی ہو۔

اکثر اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ ماں باپ سے مراد ہیں حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کی خالہ لیاؔ جس طرح دوسری آیت میں چچا کو اللہ نے باپ فرمایا ہے اور ارشاد فرمایا اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اسی طرح اس آیت میں خالہ کو ماں قرار دیا ہے یا یہ وجہ ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کی والدہ کے بعد لیاؔ سے نکاح کر لیا تھا اور لیاؔ ہی نے آپ کی پرورش کی تھی اور پرورش کرنے والی کو اماں کہا ہی جاتا ہے حضرت یوسفؑ کی ماں بنیامین کی ولادت کے وقت مر چکی تھیں۔

حسن بصریؒ کا قول ہے کہ ماں زندہ تھیں اور ابوین سے ماں باپ ہی مراد ہیں۔ بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اللہ نے حضرت یوسفؑ کی والدہ کو زندہ کر دیا تھا اور وہ حضرت یعقوبؑ کے ساتھ مصر آئی تھیں۔

بغوی نے لکھا ہے روایت ہے کہ حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اتر کر معانقہ کیا، ثوریؒ نے کہا ہر ایک دوسرے کے گلے سے ملا اور دونوں رونے لگے یوسفؑ نے کہا ابا میری وجہ سے آپ اتنا روئے کہ آپ کی نظر جاتی رہی کیا آپ کو یقین نہ تھا کہ قیامت کے دن ہم دونوں ضرور ملیں گے حضرت یعقوبؑ نے فرمایا بیٹے یقین کیوں نہ تھا مجھے تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں تیرا مذہب نہ بدل گیا ہو اور پھر قیامت کے دن میرے اور تیرے درمیان رکاوٹ حائل ہو جائے۔

وَقَالَ ادْخُلُوْا مِصْرَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ﴿۹۹﴾ اور کہا چلو مصر کے اندر امن کے ساتھ اللہ نے چاہا تو رہو۔

یعنی تم کو شہر کے اندر داخل ہونے کے اجازت نامے کی ضرورت نہیں۔ شاہی اجازت نامہ کے بغیر اس زمانہ میں کوئی مصر میں داخل نہیں ہو سکتا تھا یا یہ مطلب ہے کہ اب کال اور دوسری مصائب کا آپ لوگوں کو کوئی اندیشہ نہیں۔

ایک شبہ

(انشاء اللہ کا تعلق اُدْخُلُوْا سے ہے اور اُدْخُلُوْا امر کا صیغہ ہے اور امر کے ساتھ مشیت کا تعلق بے معنی ہے۔ حکم مفید وجوب ہے اور اِنْ شک کے لئے آتا ہے اور شک وجوب کے منافی ہے۔ مترجم)

شبہ مذکورہ کا ازالہ

اِنْشَاءَ اللّٰہُ کا تعلق باامن دخول سے ہے (مطلق دخول سے نہیں گویا امن کو مشروط بہ مشیت کیا گیا ہے۔ امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ انشاء اللہ۔ یعنی انشاء اللہ باامن رہو گے داخل ہو جاؤ۔ مترجم) جیسے دوسری آیت میں آیا ہے۔ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِیْنَ۔ بعض نے کہا اس جگہ اِنْ (بمعنی شک نہیں بلکہ اِذْ (ظرفیہ) کے معنی میں ہے جیسے آیت وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ میں اِنْ بمعنی اِذْ ہے۔ بعض نے کہا آیت میں کچھ تقدیم و تاخیر ہے انشاء اللہ کا تعلق سَوْفَ اَسْتَغْفِرُ لَكُمْ رَبِّیْ سے ہے یعنی میں انشاء اللہ تمہارے لئے اپنے رب سے استغفار کروں گا۔

وَرَفَعَ اَبَوَیْهِ عَلَى الْعَرْشِ　　اور یوسفؑ نے اپنے ماں باپ کو اٹھا کر تخت پر بٹھالیا۔ رَفَعَ کا معنی ہے نیچے سے اوپر کو اٹھالینا۔

وَخَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ　　اور سب (ماں باپ اور بھائی) یوسفؑ کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے گر پڑے۔ سجدہ سے مراد زمین پر پیشانی رکھنا نہیں بلکہ تواضع سے جھک جانا مراد ہے (لیکن خَرُّوْا کا لفظ تو زمین پر گر پڑنے کا مفہوم ظاہر کر رہا ہے۔ خَرُّوْا کا معنی تو جھکنا نہیں ہے۔ مترجم)

بعض نے کہا زمین پر پیشانی رکھنا ہی مراد ہے مگر یہ سجدۂ عبادت نہ تھا سجدۂ احترام و تعظیم تھا اور اس زمانہ میں احترام و تعظیم کا یہی طریقہ رائج تھا اور گزشتہ امتوں کے لئے بھی غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کرنا جائز تھا۔ ہماری شریعت نے منسوخ کر دیا (اب کسی قسم کا سجدہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں کیا جا سکتا) حضرت ابن عباسؓ کا قول اس آیت کی تفسیر میں اس طرح آیا ہے وہ اللہ کے لئے سجدہ میں گر پڑے یوسفؑ کے سامنے ادائے شکر کے طور پر۔ لَهٗ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے (یوسفؑ کی طرف راجع نہیں ہے) میں کہتا ہوں گویا حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر پر یوسفؑ مسجود لہ نہ تھے قبلۂ سجود اور جہتِ سجدہ تھے اور یوسفؑ کا قبلۂ سجود ہونا اللہ کے حکم سے تھا جیسے ہمارے لئے کعبے کو بحکمِ الٰہی قبلۂ سجود بنا دیا گیا ہے۔ اور جیسے آدم کو فرشتوں کے لئے قبلۂ سجود بنا دیا گیا تھا۔

بعض نے کہا لَهٗ (میں لام اجلیہ ہے اور ضمیر یوسفؑ کی طرف ہی راجع ہے) یعنی یوسفؑ کے مل جانے کی وجہ سے بطورِ شکریہ وہ اللہ کے سامنے سجدہ میں گر پڑے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔

رَفَعَ کا لفظ اگرچہ خَرُّوْا سے پہلے ذکر کیا گیا ہے لیکن مطلب یہ ہے کہ وہ سجدے میں گر پڑے اور پھر یوسفؑ نے ماں باپ کو اٹھا کر تخت پر بٹھالیا۔

وَقَالَ يٰٓاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ؗ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ

اور یوسفؑ نے کہا ابا یہ میرے گزشتہ خواب کی تعبیر ہے میرے رب نے اس کو سچ کر دکھایا۔ یعنی بچپن میں جو میں نے خواب میں گیارہ ستاروں اور چاند سورج کو اپنے لئے سجدہ کرتے دیکھا اس کی تعبیر یہ نکلی۔

وَقَدْ اَحْسَنَ بِیْٓ اِذْ اَخْرَجَنِیْ مِنَ السِّجْنِ وَجَآءَ بِكُمْ مِّنَ الْبَدْوِ مِنْۢ بَعْدِ اَنْ نَّزَغَ الشَّیْطٰنُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ اِخْوَتِیْ ؕ

اور خدا نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا کہ مجھے قید سے نکالا اور تم سب کو

جنگل سے یہاں لے آیا یہ سب کچھ اس کے بعد ہوا کہ شیطان نے میرے اور میرے بھائیوں کے درمیان فساد ڈلوادیا تھا باوجودیہ کہ کنواں شدید ترین قید خانہ تھا لیکن حضرت یوسفؑ نے کرم ذاتی سے کام لے کر اس کا ذکر نہیں کیا تاکہ بھائیوں کو شرمندگی نہ ہو اس کے علاوہ جیل خانہ سے رہائی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی کیا کہ کنویں سے نکل کر تو غلام ہونا پڑا اور عورتوں کے پھندے میں گرفتار ہونے سے سابقہ پڑا اور قید خانہ سے نکل کر بادشاہ بنائے گئے (تو جیل خانہ سے نکالنا اللہ کا عظیم الشان احسان ہوا) البدو: صحرائی میدان جہاں چرواہے اور صحرائی لوگ اپنے جانوروں کو لے کر رہتے ہیں۔ نزغ: یعنی ہمارے درمیان فساد ڈلوادیا۔ یہ لفظ نزغ الرابض الدابۃ سے ماخوذ ہے ایڑ مار کر سوار نے گھوڑا اٹھایا اور چلایا۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۱۰۰﴾ بلاشبہ میرا رب جو چاہتا ہے اس کی عمدہ تدبیر کرتا ہے یقیناً وہی بڑے علم اور حکمت والا ہے۔ یعنی اس کی تدبیر لطیف ہے دشوار ترین امور میں بھی کارفرمائی اور نفوذ اسی کی مشیت کا ہے۔

بغوی نے لطیف کا ترجمہ کیا ہے صاحب لطف یعنی مہربانی۔ حقیقت میں لطیف اس محسن کو کہتے ہیں جو دوسروں تک نہایت آہستگی کے ساتھ اپنا احسان پہنچادے۔ ھُوَ العَلیم یعنی اپنی مصلحتوں اور تدبیروں کی حقیقت سے وہی واقف ہے اور وہی حکیم ہے۔ یعنی اس کا ہر کام اسی وقت اور اسی طرح پر ہوتا ہے جیسا حکمت کا تقاضہ ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے حضرت یوسفؑ نے اپنے ہر چیز کے ذخیرے اور خزانہ کی ماں باپ کو سیر کرائی کاغذ کا ذخیرہ دیکھ کر حضرت یعقوبؑ نے فرمایا اتنا کثیر انبار کاغذ کا تیرے پاس پڑا ہے اور تو نے ایک خط صرف آٹھ منزل کے فاصلے پر مجھے نہیں بھیجا۔ حضرت یوسفؑ نے جواب دیا جبرئیلؑ نے مجھے یہی ہدایت کی تھی حضرت یعقوبؑ نے فرمایا تو نے جبرئیلؑ سے اس کی وجہ کیوں دریافت نہیں کی۔ حضرت یوسفؑ نے کہا آپ حضرت جبرئیلؑ سے زیادہ بے تکلف ہیں آپ ہی دریافت فرمالیں حضرت یعقوبؑ نے جبرئیلؑ سے (اطلاعی خط بھیجنے کی ممانعت کی) وجہ دریافت کی حضرت جبرئیلؑ نے کہا مجھے اللہ نے ایسا ہی حکم دیا تھا کیونکہ آپ نے وَاَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ کہا تھا اس پر اللہ نے فرمایا تم کو بھیڑیے کا تو اندیشہ ہوا اور میرا خوف نہیں ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے اہل تاریخ کہتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کے پاس مصر میں ۲۴ سال انتہائی امن چین اور قابل رشک خوشگواری کے ساتھ گزارے پھر مصر ہی میں آپ کی وفات ہوگئی وفات کے وقت حضرت یوسفؑ کو وصیت کی کہ مجھے لے جاکر میرے باپ اسحٰقؑ کے پاس دفن کرنا۔ یوسفؑ نے وصیت کی تعمیل کی اور لے جاکر شام میں دفن کردیا پھر مصر لوٹ آئے۔

امام احمد نے الزہد میں مالک کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت یعقوبؑ جب بہت کمزور اور اٹھنے بیٹھنے سے بھی معذور ہوگئے تو اپنے بیٹے یوسفؑ سے فرمایا کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈال کر میری پشت پر ہاتھ رکھ کر رب یعقوبؑ کی قسم کھا کر اقرار کرو کہ مجھے میرے باپ دادا کے ساتھ دفن کروگے میں زندگی کے کام میں ان کا شریک رہا تو مرنے کے بعد مجھے انہی کے قبرستان کے ساتھ دفن کرنا۔ جب آپ کی وفات ہوگئی تو حضرت یوسفؑ نے ایسا ہی کیا کنعان میں لے جاکر آباؤ اجداد کے ساتھ دفن کردیا۔ سعید بن جبیرؓ نے فرمایا ساگر کے تابوت میں حضرت یعقوبؑ کی میت کو بیت المقدس لے گئے اتفاق ایسا ہوا کہ اسی روز عیص کا بھی انتقال ہوگیا دونوں کو ایک ہی مقبرے میں (یا ایک ہی قبر میں) دفن کیا گیا دونوں کی عمر ۱۴۷ برس ہوئی عیص اور یعقوبؑ ساتھ ہی ایک بطن سے پیدا ہوئے تھے۔ (اگرچہ توائم نہ تھے) جب حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی امور کامل طور پر درست ہوگئے تو آپ نے خیال کیا یہ راحت اور نعمت باقی رہنے والی تو ہے نہیں۔ دنیا کی کسی نعمت کو بقا نہیں اس لئے حسن خاتمہ کی دعا کی اور کہا۔

رَبِّ قَدْ اٰتَیْتَنِیْ مِنَ الْمُلْكِ وَعَلَّمْتَنِیْ مِنْ تَاْوِیْلِ الْاَحَادِیْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۫ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۰۱﴾

اے میرے رب تو نے مجھے سلطنت کا ایک بڑا حصہ عطا فرمایا اور خوابوں کی تعبیر دینا سکھائی اے آسمانوں اور زمین

کے پیدا کرنے والے تو میرا کارساز ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، مجھ کو پوری فرماں برداری کی حالت میں دنیا سے اٹھا لے اور نیک بندوں کے ساتھ شامل کر دے۔

مِنَ الْمُلْكِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی سلطنت کا حصہ، مراد مصر کی حکومت۔ جس شخص کے ہاتھ میں نظم و نسق ہو اس کے اقتدار کی ہمہ گیری کو ملک کہتے ہیں۔ مِنْ تَاْوِيْلِ (میں) بھی مِنْ تبعیضیہ ہے) یعنی کچھ کسی قدر تعبیر دینی، مکمل تعبیری علم تو حضرت یوسفؑ کو دیا نہیں گیا تھا (اللہ کا علم کامل ہے) وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ۔ فَاطِرِ: پیدا کرنے والا ایجاد کرنے والا۔ وَلِيٌّ: ذمہ دار، کارساز مددگار، یا وہ ذات جو دونوں جہان میں نعمت عطا فرماتی اور کارسازی کرتی ہے۔ اور ملک فانی کو ملک باقی سے ملاتی ہے۔ الصّٰلِحِيْنَ سے مراد ہے انبیاء کیونکہ صلاحِ کامل اسی وقت حاصل ہوتی ہے جب انسان ہر خطا سے معصوم ہو اور معصوم انبیاء کے سوا کوئی نہیں (یعنی الصالحین سے مراد ہیں کامل صالحین اور کامل صالحین صفِ انبیاء ہیں)۔

قتادہ نے کہا سوائے یوسفؑ کے اور کسی نبی نے اپنی موت کی دعا نہیں کی۔ میرے نزدیک یہ قول محلِّ تأمل ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی تھی۔ اَللّٰهُمَّ الرَّفِيْقَ الْاَعْلٰى۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں سنا کرتی تھی کہ کسی نبی کی وفات اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک اس کو دنیا و آخرت (میں سے ایک کو انتخاب کر لینے) کا اختیار نہیں دے دیا جاتا (اور وہ آخرت کو پسند نہیں کر لیتا) چنانچہ حضور ﷺ کی بیماری میں جب سخت بحرانی کیفیت پیدا ہو گئی تو میں نے خود سنا، حضور ﷺ فرما رہے تھے۔ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا یہ سن کر میں نے یقین کر لیا کہ حضور ﷺ کو دنیا اور آخرت میں سے ایک کو پسند کر لینے کا اختیار دے دیا گیا۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین وابن سعد۔

قصہ کا تکملہ

حضرت یوسفؑ کے تمام دنیوی احوال جب درست ہو گئے اور ماں باپ اور دوسرے متعلقین بھی مل گئے تو اس وقت اپنے رب سے ملنے کا شوق غالب آیا اور مذکورہ دعا کی۔ حسن بصریؒ نے فرمایا اس کے بعد آپ چند سال زندہ رہے۔ دوسرے علماء کا خیال ہے ایک ہفتہ بھی گزرنے نہ پایا کہ آپؑ کی وفات ہو گئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت یوسفؑ، حضرت یعقوبؑ سے کتنی مدت جدا رہے علماء کے اس سلسلہ میں مختلف اقوال ہیں کلبی نے کہا ۲۲ سال جدا رہے بعض نے ۴۰ سال مدتِ جدائی بیان کی۔ حسن بصریؒ نے کہا ۱۷ سال کی عمر میں کنویں میں ڈالے گئے اور باپ سے اسّی برس غائب رہے اور حضرت یعقوبؑ کی ملاقات کے بعد ۲۳ سال جئے اور ۱۲۰ برس کی عمر میں وفات پائی۔ توریت میں آپ کی عمر ۱۱۰ سال ذکر کی گئی ہے۔

عزیز کی بیوی کے بطن سے حضرت یوسفؑ کے تین بچے ہوئے افرائیم منشا اور (تیسری لڑکی) رحمت۔ افرائیم کی نسل میں سے یوشع بن نون، خادم موسیٰؑ ہوئے ''رحمت'' حضرت ایوبؑ صابر کی بیوی تھیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ کے بعد حضرت یوسفؑ ساٹھ سال یا اس سے بھی زیادہ زندہ رہے بہر حال وفات کے وقت (بر قولِ صحیح) آپ کی عمر ۱۲۰ برس تھی۔

اہلِ مصر نے سنگِ مرمر کے ایک تابوت میں بند کر کے نیل میں آپ کو دفن کر دیا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آپ کی وفات کے بعد ہر محلے والوں نے اپنے محلہ میں آپ کو دفن کرنا چاہا تا کہ اس محلے والوں کو برکت حاصل ہو اختلاف اتنا بڑھا کہ باہم جنگ ہونے اور لڑنے مرنے کا اندیشہ ہو گیا آخر سب نے یہی مناسب سمجھا کہ آپ کو نیل کے اندر دفن کر دیا جائے۔ نیل کا پانی پورے شہر میں پھیلتا تھا اس طرح آپ کی برکت سے پورا شہر بہرہ اندوز ہوگا۔

عکرمہؒ نے کہا نیل کے دائیں جانب آپ کو دفن کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جانب بہت سرسبز اور غلہ آفریں ہو گیا اور دوسرا جانب خشک ہو گیا پھر آپ کو دائیں جانب سے نیل کے بائیں جانب منتقل کیا گیا تو دایاں جانب سوکھ گیا اور بایاں جانب سر

سبز ہو گیا آخر نیل کے وسط میں دفن کر دیا۔ اس طرح نیل کے دونوں رُخ سرسبز ہو گئے۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ تک آپ کی قبر نیل ہی میں رہی پھر حضرت موسیٰؑ نے آپ کا تابوت نیل سے نکلوا کر ملکِ شام کو منتقل کیا اور باپ دادا کے قبرستان میں دفن کر دیا۔ ابن اسحاق اور ابن ابی حاتم نے بحوالہ عروہ بن زبیرؓ بیان کیا کہ اللہ نے جب حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر شام کو لے جاؤ تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم دیا تھا کہ یوسفؑ کی ہڈیاں بھی ساتھ لے جانا مصر کی زمین میں نہ چھوڑنا بلکہ ارضِ مقدسہ میں لے جا کر دفن کر دینا۔ حضرت موسیٰؑ نے تلاش کی کہ کوئی یوسفؑ کی قبر کا نشان جاننے والا مل جائے تلاش کے بعد صرف ایک بڑھیا اسرائیلی ملی جس نے کہا کہ اے اللہ کے نبی میں یوسفؑ کی قبر کا مقام جانتی ہوں اگر آپ مجھے اپنے ساتھ یہاں سے نکال کر لے جائیں اور سرزمین مصر میں چھوڑ کر نہ جائیں تو میں آپ کو قبر بتا دوں گی۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا، میں تیری خواہش کے مطابق کر دوں گا حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل سے وعدہ کیا تھا کہ جس وقت چاند نکلے گا اس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے، چاند نکلنے کا وقت آ گیا اور حضرت یوسفؑ کا تابوت اس وقت تک آپ برآمد نہ کر سکے اس لئے آپ نے اللہ سے دعا کی کہ چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو جائے تاکہ وعدہ خلافی نہ ہو دعا قبول ہو گئی اور چاند کے طلوع میں کچھ تاخیر ہو گئی پھر بڑھیا آپ کو اپنے ساتھ لے گئی اور نیل کے پانی کے اندر ایک طرف کو حضرت یوسفؑ کی قبر دکھا دی۔ جس کے اندر سے ایک مرمر کا صندوق حضرت موسیٰؑ نے نکلوا لیا اور اس کو اٹھا کر لے گئے۔

حضرت یوسفؑ کے بعد عمالقہ کے خاندان میں پے در پے مصر کے فرعون ہوتے رہے اور بنی اسرائیل ان کے زیرِ حکم رہے مگر حضرت یوسفؑ کے مذہب پر قائم رہے یہاں تک کہ حضرت موسیٰؑ پیغمبر بنا کر بھیجے گئے اور آپ کے ہاتھ سے اللہ نے فرعون کو ہلاک کر لیا۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْٓا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

یہ (قصۂ یوسفؑ) غیب کی خبروں میں سے ہے جو وحی کے ذریعہ سے ہم آپ کو بتا رہے ہیں اور آپ ان (برادرانِ یوسفؑ) کے پاس اس وقت موجود نہ تھے جبکہ انہوں نے اپنا ارادہ پختہ کر لیا تھا اور وہ تدبیریں کر رہے تھے۔

یعنی کنویں کے گڑھے میں یوسفؑ کو ڈالنے کا پختہ ارادہ کر لیا تھا مقصد یہ ہے کہ قصۂ یوسفؑ کا وحی کے ذریعے سے آپ کے پاس آنا اور آپ کا بذریعۂ وحی اس پر مطلع ہونا ثابت ہو رہا ہے کیونکہ اولادِ یعقوبؑ میں سے کسی سے آپ کی ملاقات نہیں ہوئی کہ آپ نے ان کی زبانی سن لیا ہو اور خود وہاں موجود نہ تھے اور نہ آپ کی قوم والوں کو یہ قصہ معلوم تھا کہ کسی سے پوچھ کر آپ نے بیان کر دیا ہو۔ یہ مؤخر الذکر آیت مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَآ اَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ میں ذکر دی گئی ہے اس لئے یہاں ذکر نہیں کی گئی۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ یہود و قریش دونوں نے رسول اللہ ﷺ سے حضرت یوسفؑ کا قصہ دریافت کیا تھا۔ جب آپ نے توریت کے موافق ذکر کر دیا تب بھی وہ اسلام نہیں لائے اس پر رسول اللہ ﷺ کو سخت رنج ہوا اس پر آیت نازل ہوئی۔

وَمَآ اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَمَا تَسْـَٔلُهُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۴﴾ ع ۱۱/۵

اور اکثر لوگ ایمان نہیں لاتے گو آپ کی کتنی ہی زیادہ خواہش ہو اور آپ ان سے اس کا کچھ معاوضہ تو طلب نہیں کرتے، یہ تو صرف تمام جہان والوں کے لئے ایک نصیحت ہے۔ یعنی آپ کتنی ہی یعنی آپ کتنی ہی ان کے مؤمن ہو جانے کی خواہش کریں اور کتنے ہی معجزات کا اظہار کریں، لیکن اللہ نے چونکہ ان کے کافر رہنے کا فیصلہ کر دیا ہے اس لئے وہ ایمان نہیں لائیں گے اور آپ ان سے اس قرآن کو پیش کرنے یا خبریں بیان کرنے کی کوئی اُجرت بھی تو نہیں مانگتے (کہ ان پر کچھ مالی بوجھ پڑتا ہو) یہ قرآن تو محض ایک عمومی نصیحت نامہ ہے (جس کو ماننے میں پیسے صرف کرنا نہیں پڑتے) جو اس کو نہ مانے گا تو اتمام حجت ہو جائے گا اور جو ایمان لانے والے ہیں ان کے لئے رحمت و بصیرت ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ اور بہت سی نشانیاں آسمانوں اور زمین میں ہیں جن پر ان کا گزر ہوتا رہتا ہے اور وہ ان کی طرف توجہ نہیں کرتے اور جو لوگ خدا کو مانتے بھی ہیں تو اس طرح کہ ان میں سے اکثر شرک بھی کرتے جاتے ہیں۔ کَاَیِّنْ کے معنی ہیں کثیر یعنی اللہ کی صنعت، حکمت اور کمالِ قدرت و توحید کی کتنی ہی دلیلیں ہیں جو ان کی نظر کے سامنے آتی ہیں اور یہ ان کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ مگر ان کی طرف توجہ نہیں کرتے، منہ پھیر لیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ بہت سی آیاتِ عبرت ان کے سامنے آتی ہیں اور اقوامِ پارینہ کے آثار کا مشاہدہ کرتے ہیں مگر غور و فکر نہیں کرتے اور عبرت اندوز نہیں ہوتے۔ اور اگر اللہ کے وجود و خالقیت کا اقرار کرتے بھی ہیں تو اس کی عبادت میں دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں اللہ کی عبادت کے ساتھ دوسروں کی بھی پوجا کرتے ہیں جب ان سے پوچھا جاتا تھا کہ آسمان و زمین کو کس نے پیدا کیا تو جواب دیتے تھے اللہ نے اور جب دریافت کیا جاتا تھا کہ اوپر سے پانی کون برساتا ہے تو کہتے تھے اللہ۔ مگر اس کے باوجود وہ پتھروں کی پوجا کرتے تھے اور کہتے تھے پُخھتر کی وجہ سے ہم پر بارش ہوئی (یعنی بعض ستاروں کو بارش ہونے میں دخیل سمجھتے تھے فقط مادی اسباب کی حیثیت سے نہیں بلکہ علتِ تامّہ کی حیثیت سے۔ مترجم)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، اس آیت کا نزول عرب کے مشرکوں کے لبّیک کہنے کے سلسلے میں ہوا۔ عرب کے مشرک (احرام یا طوافِ کعبہ کے وقت) ان الفاظ میں لبّیک کہتے تھے، اے اللہ! ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں تیرا کوئی شریک نہیں مگر وہ شریک ہے جس کو تو نے شریک بنا لیا ہے اور تو اس کا مالک ہے وہ مالک نہیں۔

عطا نے کہا مشرکوں کی یہ دعا (یعنی شرک آمیز دعا) آسائش و فراغت کے زمانے میں ہوتی تھی، کہ اپنے رب (کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے، شریکوں کو پکارتے اور رب) کو بھول جاتے تھے۔ لیکن جب مصیبت میں گرفتار ہوتے اور بپتا پڑتی تو اس وقت صرف اللہ کو پکارتے تھے۔ اِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ اِلَى الْبَرِّ اِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ جب جہازوں اور کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو خالص طور پر اللہ کو پکارتے ہیں اور جب اللہ سمندر سے بچا کر خشکی میں پہنچا دیتا ہے تو پھر شرک کرنے لگتے ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف علماء و مشائخ کے احکام پر چلتے اور ان کو رب قرار دیتے ہیں یا اللہ کی طرف والد ہونے کی نسبت کرتے ہیں اور کہتے ہیں اللہ کی اولاد ہیں یا (مجوسی ہیں) نور و ظلمت کی اُلوہیت کے قائل ہیں مجملہ شرک کے قدریہ فرقہ کا یہ قول بھی ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خالق ہے توحیدِ خالص تو اہلِ سنت کا قول ہے کہ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں۔ بلکہ مسبّب کی طرف سے غافل ہو کر اسباب پر نظر رکھنا (اور عملی طور پر اسباب کو ہی کارساز قرار دینا) بھی شرک کی قسم ہے اہلِ توحید صرف صوفیا ہیں (جن کی نظر اسباب پر نہیں بلکہ ہر وقت مسبّب پر ہوتی ہے۔ مترجم)۔

اَفَاَمِنُوْٓا اَنْ تَاْتِيَهُمْ غَاشِيَةٌ مِّنْ عَذَابِ اللّٰهِ اَوْ تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۰۷﴾

سو کیا پھر بھی ان کو اس بات کا خوف نہیں کہ اللہ کے عذاب کی کوئی آفت ان پر آپڑے جو ان کو گھیر لے یا اچانک ان پر قیامت آجائے اور ان کو خبر بھی نہ ہو۔ یعنی کیا یہ اپنے رب کو بھول گئے اور مطمئن ہو گئے کہ کوئی چھا جانے والا عذابِ خداوندی ان پر آجائے۔ قتادہ نے غَاشِيَةٌ کا ترجمہ کیا پڑنے والی آفت" اور ضحاک نے کہا اس سے مراد ہے آسمانی بجلیاں اور غیبی حوادث۔ بَغْتَةً اچانک جس کی پہلے سے نہ کوئی علامت ہو نہ علم نہ وقتِ معیّن ہو۔ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ اور وہ بے خبر ہوں اس کے لئے تیار بھی نہ ہو۔ اَفَاَمِنُوْا میں استفہام انکاری ہے یعنی ان کے لئے یہ خدا فراموشی اور عذاب فراموشی اور عذاب سے بے خوفی مناسب نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوگ بازاروں میں مشغول ہوں گے کہ ایک سخت چیخ لوگوں کو ہیجان میں ڈال دے گی۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو آدمی (بائع اور مشتری) کپڑا پھیلائے ہوئے (سودا کرنے میں مشغول) ہوں گے کہ قیامت آجائے گی نہ خرید و فروخت کر سکیں گے نہ کپڑے کو لپیٹ سکیں گے۔ یہ حدیث اور

قیامت کی تشریح سورہ اعراف کی آیت یَسْــَٔلُوْنَکَ عَنِ السَّاعَةِ اَیَّانَ مُرْسَاهَا الخ کی تفسیر کے ذیل میں کر دی گئی ہے۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ ؔ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۰۸

(اے محمدؐ) آپ کہہ دیجئے کہ یہ توحید اور آخرت کی تیاری کی دعوت میرا راستہ ہے میں لوگوں کو اللہ کی طرف بُلاتا ہوں، میں بھی دلیل پر قائم ہوں اور وہ لوگ بھی جو میرے پیرو ہیں اور اللہ ہر طرح کے نقص اور شرک سے پاک ہے اور میں شرکوں میں سے نہیں ہوں۔

سَبِیْلِیْ میرا طریقہ، میرا راستہ۔ اَدْعُوْٓا اِلَی اللّٰهِ یہ سَبِیْلِیْ کی تشریح ہے یعنی میں اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر ایمان لانے اور ہر نامناسب وصف سے اس کو پاک سمجھنے اور اسی کے قرب کی طلب کرنے کی طرف لوگوں کو بُلاتا ہوں۔ عَلٰی بَصِیْرَةٍ بصیرت سے مراد ہے یقین اور معرفت یعنی میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو خود تراشیدہ خیالات کو مانتے ہیں جن کا ان کو خود کوئی علم نہیں ہوتا۔ یا بصیرت سے مراد ہے بیان اور واضح روشن دلیل۔ وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ یعنی جو لوگ مجھ پر ایمان رکھتے ہیں اور میری تصدیق کرتے ہیں وہ بھی اللہ کی طرف بُلاتے ہیں۔ کلبی اور ابن زید نے کہا رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرنے والوں پر لازم ہے کہ جس راستے کی طرف رسول اللہ ﷺ نے دعوت دی ہے اس کی طرف وہ بھی لوگوں کو بُلائیں اور قرآن کا ذکر کرتے رہیں یا یہ مطلب ہے کہ میں اور میری اتباع کرنے والے بصیرت پر ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَنِ اتَّبَعَنِیْ سے صحابہ کرامؓ مراد ہیں، صحابہؓ راہ ہدایت پر تھے، معدنِ علم تھے، کنزِ ایمان تھے اور اللہ کا لشکر تھے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا جو سنّت پر چلنا چاہے وہ مُردوں کے طریقے پر چلے صحابۂ رسول ﷺ کے راستہ پر چلے صحابہؓ کا گروہ اس امت میں سب سے زیادہ پاک باطن گروہ تھا جن کا علم بہت گہرا تھا اور بناوٹ بالکل نہ تھی، اللہ نے اپنے نبی ﷺ کی رفاقت اور اپنی دین کی اشاعت کے لئے ان کا انتخاب کیا تھا وہ راہِ مستقیم پر گامزن تھے تم لوگ انہیں کے اخلاق اور زندگی کے طریقوں کو اختیار کرو اور انہی سے مشابہت پیدا کرو۔ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ یعنی میں اللہ کی طرف بُلاتا ہوں اور شرک سے اس کے پاک ہونے کا اعتراف و اقرار کرتا ہوں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰی ؕ اور آپ سے پہلے ہم نے مختلف بستیوں والوں میں جتنے رسول بھیجے (اور) جن کو وحی بھیجتے رہے وہ سب آدمی ہی تھے (فرشتے نہیں تھے) یہ تردید ہے کافروں کے اس قول کی کہ ہمارا رب چاہتا تو ملائکہ کو ہدایت کے لئے اتار دیتا۔

نُوْحِیْٓ اِلَیْهِمْ یعنی جس طرح آپ کے پاس وحی بھیجی اسی طرح ان پیغمبروں کے پاس بھی وحی بھیجتے رہے جس کی وجہ سے وہ دوسروں سے ممتاز ہو گئے۔ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰی یعنی وہ قصبوں اور بستیوں کے رہنے والے تھے صحرائی خانہ بدوش نہ تھے۔ صحرائی لوگ بد خُلق اکھڑ اور دُرشت خو ہوتے ہیں اور بستیوں، شہروں والے دانش مند، ذی علم اور حلیم الطبع ہوتے ہیں۔

حسن بصریؒ نے کہا اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اللہ نے نہ کسی جن کو پیغمبر بنایا نہ کسی عورت کو، نہ کسی خانہ بدوش صحرائی کو۔

میں کہتا ہوں اس آیت سے نبوّتِ جن کی نفی نہیں ہوتی (رجال جنّات میں سے بھی ہوتے ہیں) اللہ نے فرمایا کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ اس کے علاوہ اس جگہ انسانوں کی پاس پیغمبر بھیجنے کا ذکر ہے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جنّات کے پاس جن کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا گیا اللہ نے خود فرمایا ہے لَوْ كَانَ فِی الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ یَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّیْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَیْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا۔

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَیْرٌ لِّلَّذِیْنَ اتَّقَوْا ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۹ تو کیا یہ لوگ ملک میں کہیں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ ان لوگوں کا کیسا بُرا انجام ہوا جو اُن سے پہلے کافر ہو گزرے ہیں اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے بہت ہی اچھا ہے جو گناہوں سے بچتے ہیں سو کیا تم اتنا نہیں سمجھتے۔ یعنی آپ کی تکذیب کرنے والے مشرک ملک میں چل پھر کر اتنا نہیں دیکھتے کہ پہلے پیغمبروں کو اور ان کے معجزات کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا برا نتیجہ ہوا ان کے برے انجام کو دیکھ

کر ان کو عبرت حاصل کرنا اور آپ کی تکذیب نہ کرنا چاہئے تھا یا اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ سے مراد وہ لوگ ہیں جو دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں اور آخرت کی طرف سے غافل ہو کر دنیا پر ٹوٹے پڑتے ہیں ان کا انجام کیا ہوا اس کو دیکھنے کے لئے دیدۂ عبرت نگاہ کی ضرورت ہے ان لوگوں کو سمجھنا چاہئے کہ پچھلے دنیا پرستوں کا کیا انجام ہوا اور اللہ نے اپنے دوستوں اور اطاعت شعار بندوں کے لئے کیا سلوک کیا دنیا میں نازل شدہ عذاب سے ان کو بچالیا اور آخرت میں جو کچھ ان کو دیا جائے گا وہ اس دنیا سے کہیں بہتر ہوگا۔ عقل سے کام لینے کی اور یہ بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آخرت ہی بہتر ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَایْـَٔسَ الرُّسُلُ وَ ظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّیَ مَنْ نَّشَآءُ ؕ وَ لَا یُرَدُّ بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ﴿۱۱۰﴾ **یہاں تک کہ جب پیغمبر (اس بات سے) مایوس ہو گئے اور ان پیغمبروں کو گمان غالب ہو گیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی تو ان کو ہماری مدد پہنچی پھر اس عذاب سے ہم نے جس کو چاہا وہ بچالیا گیا اور ہمارا عذاب مجرم لوگوں سے نہیں لوٹایا جاتا۔**

حَتّٰۤى اِذَا اسْتَایْـَٔسَ الرُّسُلُ کا تعلق سابق آیت وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا سے ہے یعنی ہم نے آپ سے پہلے آدمیوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا اور ان کی امتوں نے ان کی تکذیب کی یہاں تک کہ جب وہ ناامید ہو گئے الخ۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ اس کا تعلق محذوف کلام سے ہے اصل کلام یوں تھا کہ ان کافروں کو اس بات سے فریب خوردہ نہ ہونا چاہئے کہ اتنے زمانے تک اُن پر عذاب نہیں آیا اور اب تک تباہی سے بچے ہوئے ہیں کیونکہ ان سے پہلے لوگوں (مثلاً امتِ نوح وغیرہ) کو بڑی طویل مہلتیں دی جاچکی ہیں یہاں تک کہ پیغمبر بھی ان کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ باوجود کفر میں ڈوب جانے کے یہ لوگ عیش و آرام میں ہیں مدتِ دراز سے چین و راحت میں پڑے ہوئے ہیں اور ان کا کچھ نہیں بگڑا۔ قَدْ كُذِبُوْا کا معنی بظاہر یہی ہے کہ پیغمبروں کو گمان ہو گیا کہ اللہ نے جو ہم سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا، وعدہ پورا نہیں کیا چونکہ یہ معنی غلط ہے اسی لئے حضرت عائشہؓ نے كُذِبُوْا کی قرأت کا انکار کر دیا اور كُذِبُوْا کی جگہ كُذِّبُوْا پڑھا۔ مگر كُذِبُوْا کی قرأت متواتر ہے خواہ حضرت عائشہؓ کو اس کا علم نہ ہو البتہ ظاہری معنی نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ پیغمبر قوم کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے خیال کر لیا کہ قوم نے جو ہم سے ایمان کا وعدہ کیا وہ غلط کیا یہ ایمان نہیں لائیں گے یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں نے گمان کر لیا کہ ہمارے فہم نے غلطی کی ہم سمجھتے تھے کہ ہماری مدد بہت جلد کی جائے گی مگر ہمارا یہ فہم غلط تھا۔ یا ظَنُّوْۤا کی ضمیر کافروں کی طرف راجع ہے یعنی یہاں تک نوبت پہنچ گئی کہ کافر خیال کرنے لگے کہ پیغمبروں نے جو ہم کو توحید کی دعوت دی تھی اور بصورتِ خلاف ورزی عذاب کی دھمکی دی تھی وہ غلط تھی ہم سے جھوٹ کہا گیا تھا، یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں پر ایمان لانے والوں کو خیال ہو گیا کہ پیغمبروں نے جو ہم سے فتح و نصرت کا اور کافروں کی ہلاکت کا وعدہ کیا تھا وہ غلط نکلا کچھ معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک آیت کا ظاہری مطلب ہی مراد ہے۔ پیغمبر بھی بشر تھے اور بہ تقاضائے بشریت ان کو گمان ہونے لگا کہ ہم سے جو فتح و نصرت کا وعدہ کیا گیا تھا وہ غلط نکلا یہ گمان پیغمبروں کے ضعفِ قلب اور تقاضائے بشریت کا نتیجہ تھا پھر حضرت ابن عباسؓ نے یہ آیت پڑھی حَتّٰى یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور اس پر ایمان لانے والے لوگ کہنے لگے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی یہ مطلب وہی ہے جس کا حضرت عائشہؓ نے انکار کر دیا اور اسی وجہ سے كُذِبُوْا کی قرأت کا بھی انکار کر دیا۔

بیضاوی نے لکھا ہے اگر صحیح روایت سے حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول ثابت ہو جائے تو اس وقت ظن سے مراد ہوگا وسوسہ اور بے اختیار دل میں پیدا ہونے والا خیال۔ طیبی نے لکھا ہے روایت صحیح ہے بخاری نے بھی اس کو ذکر کیا ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ آیت کا (حقیقی معنی مراد نہیں ہے بلکہ) تمثیلی معنی مراد ہے طولِ مہلت اور نزولِ عذاب میں انتہائی تاخیر کو بطورِ تمثیل بیان کیا گیا ہے كُذِبُوْا بغیر تشدیدِ ذال کے کوفیوں کی قرأت ہے دوسرے لوگوں کی قرأت كُذِّبُوْا تشدیدِ ذال ہے یعنی پیغمبروں کو یقین ہو گیا کہ کافروں نے ان کی ایسی تکذیب کی ہے کہ اس کے بعد ایمان لانے کی امید نہیں رہی، قتادہ نے یہی معنی بیان کیا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ پیغمبر جب تکذیب کرنے والوں کے ایمان لانے سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے

گمان کر لیا کہ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کو بھی جھوٹا کر دیا گیا اور سخت شدائد میں مبتلا ہونے اور امداد میں تاخیر کی وجہ سے ان میں بھی تزلزل پیدا ہو گیا اور وہ بھی ایمان سے پھر جائیں گے مَنْ نَّشَآءُ سے مراد ہیں انبیاء اور ان کے ساتھی اہل ایمان چونکہ انبیاء اور ان کے ساتھی مستحقِ نجات تھے اور کسی دوسرے کے نجات پانے کا گمان بھی نہیں ہو سکتا اس لئے صراحۃً ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور مبہم طور پر مَنْ نَّشَآءُ فرمادیا وَلَا يُرَدُّ بَاْسُنَا۔ بَاْسٌ: عذاب۔ یعنی آیا ہوا اللہ کا عذاب لوٹایا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں ممکن ہے مَنْ نَّشَآءُ سے بعض مؤمن مراد ہوں اور کافروں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے بعض مؤمن عذاب سے ہلاک کر دیئے گئے ہوں، کیونکہ اللہ نے فرمایا ہے وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً اور اس عذاب سے ڈرو جو صرف انہیں لوگوں پر نہیں آئے گا جنہوں نے ظلم کیا ہوگا۔

لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ط　ان (انبیاء اور ان کی امتوں کے یا یوسفؑ اور ان کے بھائیوں) کے قصے میں عقل والوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔ یعنی ان دانش مندوں کے لئے عبرت ہے جن کی عقلیں سلیم اور محسوس پرستی کی طرف میلان سے پاک ہیں سفید چاہ سے مرتبۂ شاہ پر فائز کرنا اور بوریہ سے اٹھا کر تخت شاہی پر پہنچانا بڑا عبرت آفریں ہے، صبر کا انجام سلامتی اور عزت ہے اور فریب کا نتیجہ رُسوائی اور ندامت ہے۔

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (یہ قرآن) نہیں ہے تراشی ہوئی بات (کہ اس سے عبرت و نصیحت نہ ہو) بلکہ اس سے پہلے کی (آسمانی) کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور ہر (ضروری) بات کی تفصیل کرنے والا ہے اور ایمان والوں کے لئے ذریعۂ ہدایت و رحمت ہے۔ ع ۱۲

يُفْتَرٰى: از خود گڑھی ہوئی تراشی ہوئی۔ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ سے مراد ہے توریت و انجیل كُلِّ شَيْءٍ سے مراد ہے ہر ضروری دینی بات جس کی بندوں کو حاجت ہوتی ہے ہر دینی امر کا ثبوت قرآن سے ملتا ہے خواہ براہِ راست یا حدیث یا اجماع اور اجتہاد کے واسطہ سے۔ جو مسئلہ حدیث سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ہم نے ہر پیغمبر کو اس لئے بھیجا کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول اللہ ﷺ جو کچھ تم کو حکم دے دیں لے لو اور جس چیز سے روک دیں رک جاؤ جو مسئلہ اجماع سے ثابت ہے وہی قرآن سے بھی ثابت ہے اللہ نے فرمایا ہے وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى ہدایت ظاہر ہونے کے بعد جو شخص رسول ﷺ سے کٹ جائے گا اور اہلِ ایمان کے راستہ کو چھوڑ کر دوسرے راستہ پر چلے گا تو ہم اس کو اُسی کے اختیار کردہ راستہ پر چلنے دیں گے۔ اور جو مسئلہ قیاس سے ثابت ہے، وہ بھی قرآن سے ہی ثابت ہے۔

اللہ نے فرمایا ہے فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ اے عقل والو نصیحت حاصل کرو عبرت پکڑو۔

چونکہ اہلِ ایمان ہی قرآن سے نفع اندوز ہوتے ہیں اس لئے انہی کا خاص طور پر ذکر کیا (اگرچہ قرآن کی راہنمائی ہر شخص کے لئے عام ہے)

شیخ ابو منصور ماتریدیؒ نے فرمایا حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کے قصہ میں رسول اللہ ﷺ کے لئے صبر کی تلقین ہے۔ یوسفؑ کے بھائی تو یوسفؑ کے ساتھ دین میں موافق تھے اور سب ایک باپ کے بیٹے تھے یوسفؑ کے ساتھ انہوں نے بدسلوکی کی اور یوسفؑ نے صبر کیا اور دانستہ ان کی خطاؤں سے درگزر کی اور معاف کر دیا، پس آپ کو تو اپنی قوم کی ایذاء رسانیوں پر زیادہ صبر کرنا چاہئے آپ کی قوم تو کافر اور جاہل ہے۔

وہب کا قول ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل کی اس میں قرآن کی طرح پوری سورتِ یوسفؑ نازل فرمائی۔

الحمد للہ یکم صفر ۱۲۰۲ھ کو سورۂ یوسفؑ کی تفسیر ختم ہوئی۔ بحمد اللہ ۱۵ ر مضان ۱۳۸۶ھ کو تفسیر سورۂ یوسف کا ترجمہ ختم ہوا۔

سُورَةُ الرَّعد

سورۂ رعد مکی ہے اس میں تینتالیس آیتیں ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓمّٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ یہ قرآن کی (یا کامل سورت کی) آیات ہیں، الکتاب سے مراد ہے قرآن مجید یا پوری سورت اور تلک سے آیات کی طرف اشارہ ہے اور آیاتِ الکتاب میں اضافت بتقدیر مِنْ ہے یعنی یہ آیات قرآن یا سورت کا ایک حصہ ہیں۔

وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ① اور جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے وہ بالکل سچ ہے لیکن بہت سے آدمی ایمان نہیں لاتے۔ (یہ ترجمہ اس صورت میں ہوگا کہ واو کو استینافیہ قرار دے کر اَلذِیْ کو مبتدا اور اَلحق کو خبر مان کر جملہ کو بالکل علیحدہ مستقل تسلیم کیا جائے لیکن حضرت مفسرؒ نے لکھا ہے کہ) اگر الکتاب سے مراد سورت ہو تو اَلذی سے مراد قرآن ہوگا اور اس کا الکِتاب پر عطف بحالتِ جر ایسا ہی ہوگا جیسا عام کا عطف خاص پر ہوتا ہے۔ یعنی یہ آیات سورت کی اور قرآن کی آیات ہیں اور اگر الکتاب سے مراد قرآن ہو اور اَلذی سے مراد بھی قرآن ہی ہے تو ایک صفت کا دوسری صفت پر عطف ہوگا اور اَلحق خبر ہے جس کا مبتدا محذوف ہے یعنی وہی حق ہے۔

ایک شبہ

اَلحق پر الف لام لانا بتا رہا ہے کہ قرآن ہی حق ہے تو کیا حدیثِ رسول اللہ ﷺ اور اجماع اور قیاس حق نہیں ہے۔

جواب

مَآ اُنْزِلَ سے مراد عام ہے جو کچھ نازل کیا گیا خواہ صریحاً یا ضمناً قیاس، اجماع اور حدیث کے اتباع کرنے کا حکم چونکہ قرآن میں صریحاً ہے اس لئے ارکانِ ثلثہ بھی ضمناً حق ہیں۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ الخ یعنی اکثر لوگ چونکہ غور و نظر کی غلطی اور فکر و نظر کے اختلال میں مبتلا ہیں۔ اس لئے وہ قرآن کی حقانیت سے واقف نہیں۔ مقاتل نے کہا اس آیت کا نزول مشرکینِ مکہ کے حق میں ہوا تھا مشرکوں نے کہا کہ محمد ﷺ نے قرآن خود بنا لیا ہے اللہ نے اس قول کی تردید فرما دی اور اگلی آیات میں اپنی توحید کے دلائل بیان فرمائیں۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَاۗءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ②

اللہ ایسا قادر ہے جس نے بغیر ستونوں کے آسمانوں کو اونچا کھڑا کر دیا جو تم کو نظر آرہے ہیں پھر وہ عرش پر قائم ہو گیا اور سورج و چاند کو کام پر لگا دیا ہر ایک ایک وقتِ معیّن میں چلتا رہتا ہے وہی ہر کام کی تدبیر کرتا ہے وہی صاف صاف طریقے سے دلائل بیان کرتا ہے تاکہ تم اپنے رب کی پیشی کا یقین کر لو۔

عَمَدٌ ستون، یہ عِمَاد کی یا عُمُود کی جمع ہے جیسے اَھَبٌ اِھَاب کی اور اَدَمٌ اَدِیْم کی جمع ہے۔ تَرَوْنَہَا جملہ علیحدہ ہے (اسی کے مطابق ہم نے ترجمہ کیا ہے) یا عَمَد کی صفت ہے یعنی اللہ نے بغیر محسوس اور مرئی ستونوں کے اونچا آسمان قائم کیا ہے۔ اس میں صانع حکیم کی ہستی کی دلیل ہے تمام اجسام جسمانیت میں برابر ہیں (صورتِ جسمیہ طبیعتِ نوعیہ ہے جس کا تحقق تمام اجسامِ علویہ وسفلیہ میں برابر ہے شیخ بو علی ابن سینا کا بھی یہی قول ہے۔ مترجم) پھر خصوصیات میں اختلاف (کہ کسی کو پست رکھا کسی کو بلند کیا اور دوسرے نوعی خواص کا تفاوت) چاہتا ہے کہ مختلف خواص عطا کرنے والا کوئی پس پردہ ہے جو نہ جسم ہے نہ جسمانی اسی نے بعض خواص میں دوسرے ممکنات پر اپنے ارادہ واختیار سے ترجیح دی ہے۔ دوسری دلائلِ توحید و وجود جو ذیل میں بیان کی گئی ہیں ان سے بھی اللہ کی ہستی اور اس کی توحید پر اسی طرح استدلال کیا جا سکتا ہے۔

اِسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ کی پوری تحقیق سورۂ یونس میں ذکر کر دی گئی ہے۔ تسخیرِ شمس وقمر سے مراد ہے ان کو کام پر لگا دینا کہ ایک مخصوص مقدار و اندازہ کے مطابق یہ رواں دواں ہیں جس سے حوادثِ یومیہ پیدا ہوتے ہیں۔

کُلٌّ یَّجْرِیْ یعنی ان میں سے ہر ایک دنیوی آسمان میں چلتا ہے۔

لِاَجَلٍ مُّسَمًّی یعنی معیّن وقت میں جس میں وہ اپنا دورہ پورا کر لیتے ہیں یا ایک وقتِ معیّن تک چلتے رہیں گے یعنی دنیا کے فنا ہونے تک۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ یعنی ہست ونیست کرنا اور زندگی وموت دینا اور پورے اُمورِ حکومت کا انتظام کرنا اس کا کام ہے۔

یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ وہی دلائل اُتارتا یا کھول کھول کر علیحدہ علیحدہ بیان کرتا ہے، یا ایک کے بعد ایک دلیل پیدا کرتا رہتا ہے۔

لَعَلَّکُمْ تاکہ تم ان پر غور کرو اور اللہ کے کمالِ قدرت کو جان لو اور سمجھ لو کہ جو خدا ان چیزوں کو پیدا کر سکتا اور ان کا انتظام رکھ سکتا ہے وہ ان کو فنا کر کے دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے اور تم کو سزا وجزا بھی دے سکتا ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ مَدَّ الْاَرْضَ اور وہی تو ہے جس نے زمین کو بچھایا تاکہ اس پر قدم جم سکیں اور جاندار چل پھر سکیں۔

وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ اور زمین میں پہاڑ بنائے رواسی سے مراد پہاڑ ہیں۔ رَسَی الشَّیْئُ وہ چیز جم گئی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کوہِ ابو قبیس زمین پر سب سے پہلے قائم کیا گیا۔

وَاَنْهٰرًا اور دریا بنائے پہاڑوں سے دریا نکلتے ہیں اس لئے ایک ہی فعل (جعل) کے تحت دونوں کو ذکر کیا۔

وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ جَعَلَ فِیْهَا زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ اور زمین میں ہر طرح کے پھلوں کی دو دو قسمیں پیدا کیں عمدہ اور ردی (اچھے بُرے) یا یہ مراد ہے کہ طرح طرح کے پھل پیدا کئے جن کی مختلف قسمیں ہیں اور کم سے کم دو قسمیں تو ضرور ہی ہیں (ممکن ہے کہ زَوْجَیْنِ اثْنَیْنِ سے نرومادہ مراد ہوں۔ واللہ اعلم بمُرادِہ۔ مترجم)

یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ چھا دیتا ہے رات کو دن پر یعنی رات کی تاریکی سے دن کی روشنی کو چھپا دیتا ہے جس کی وجہ سے روشن فضا تاریک ہو جاتی ہے اور جو چیز تاریک تھی وہ روشن ہو جاتی ہے۔ (شاید حضرت مفسرؒ کی اس سے مراد یہ ہے کہ طرفین سے چھا جانا مراد ہے رات دن پر چھا جاتی اور دن کی روشنی رات کی تاریکی کو چھپا لیتی ہے۔ مترجم)

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۳ بیشک ان اُمور میں سوچنے والوں کے لئے (توحید اور قدرت و حکمت کے) دلائل موجود ہیں ان کی رنگینی اور خواص کا تنوع بتا رہا ہے کہ اس کا صانع کوئی یکتا مدبر، حکیم ہے جو اُن کا انتظام کر رہا

ہے اور تمام اسباب کو فراہم کر رہا ہے۔

وَفِي الْأَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ اور زمین میں پاس پاس ملے ہوئے مختلف قطعات ہیں کوئی عمدہ اور پیداواری ہے اور کوئی شور یلا نمکین، کوئی نرم کوئی سخت، کوئی کھیتی کرنے کے قابل ہے درخت بونے کے قابل نہیں، کوئی درختوں کی سرزمین ہے کھیتی کے ناقابل، کسی میں سبزہ کم ہے (یا بجز ہے) اور کوئی سبزہ زار ہے اگر یہ فعل قادرِ مختار اور صانع حکیم کا نہیں تو پھر یہ اختلاف کیوں ہے اور کیوں خواص میں تفاوت ہے زمین کی طبیعت ایک ہی ہے، لوازمِ طبیعت بھی یکساں ہیں، سماوی اسباب کی تاثیر بھی ایک ہی جیسی ہے وضع اور نسبت میں بھی کوئی فرق نہیں پھر سوائے اس کے کہ ایک قادرِ مختار کی مشیت کی کارفرمائی قرار دی جائے اور کیا سببِ اختلاف بتایا جاسکتا ہے۔

وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِيْلٌ صِنْوَانٌ وَّغَيْرُ صِنْوَانٍ يُّسْقٰى بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ بَعْضَهَا عَلٰى بَعْضٍ فِي الْاُكُلِ اور انگوروں کے باغ ہیں اور کھیتیاں ہیں اور کھجوروں کے درخت ہیں کچھ تو ایک تنہ سے اوپر دو شاخہ ہو گئے ہیں اور کچھ دو تنے نہیں ہوئے ان میں سے ہر ایک کو ایک ہی طرح کے پانی سے سینچا جاتا ہے اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فوقیت دیتے ہیں۔

زَرْعٌ اصل میں مصدر ہے اس لئے اس کو جمع لانے کی ضرورت نہیں۔

صِنْوَانٌ: صِنْوٌ کی جمع ہے جیسے قِنْوَانٍ (خوشے) قِنْوٌ کی جمع ہے اس کے تثنیہ کا نون مکسور ہوتا ہے اور بغیر تنوین کے ہوتا ہے اور جمع کے نون پر ہر حرکت مع تنوین کے آتی ہے ایک جڑ سے دو تنے برآمد ہوں تو ان کو صِنْوٌ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے حضرت عباسؓ کے متعلق فرمایا آدمی کا چچا اس کے باپ کا صِنْوٌ ہوتا ہے۔

غَيْرُ صِنْوَانٍ یعنی الگ الگ ہوئے ہیں جڑیں جدا جدا ہوتی ہیں۔

الْاُكُلِ پھل یعنی مقدار میں، مزہ .... میں رنگ میں، خوشبو میں اللہ نے ایک کو دوسرے پر فوقیت دی ہے۔ ترمذی نے بروایتِ حسن اور حاکم نے بسند صحیح حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وقل اور فارسی اور میٹھا اور کھٹا۔

ان سب میں بھی صانع حکیم کی قدرت کی جھلک ہے اصول کے ایک اسباب ایک جیسے پھر ان کا باہمی اختلاف کسی قادرِ مختار کی خصوصی عطا ہے۔ مجاہد نے کہا اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باپ سے سب آدمی پیدا ہوئے لیکن کوئی اچھا ہے کوئی بُرا، حسن نے اس کی تشبیہ انسانوں کے دلوں سے دی ہے۔ زمین کا ایک خمیر تھا اللہ نے اپنے دستِ قدرت سے اس کو پھیلایا بچھایا اور پاس پاس اس کے جدا جدا ٹکڑے کر دیئے پھر اس پر آسمان سے پانی برسایا جس کی وجہ سے ایک ٹکڑے سے پھل پھول اور کھیتیاں درخت پیدا کئے اور دوسرے کو شور یلا نمکین کلر اور بنجر کر دیا، باوجودیکہ سب پر ایک طرح کا پانی برسایا، آدمیوں کی حالت بھی اسی طرح ہے سب کو آدمؑ سے پیدا کیا اور سب کے لئے ہدایت نامہ کا پانی آسمان سے اُتارا کچھ دل تو اس کی وجہ سے نرم پڑ گئے اور ان کے اندر خشوع پیدا ہو گیا اور کچھ سخت ہو گئے اور غافل بن گئے۔

حسن نے کہا خدا کی قسم جو شخص بھی قرآن کا جلیس (ہم نشین) ہوا تو اٹھنے کے وقت کچھ زیادتی لے کر اٹھا یا کمی لے کر (فائدہ لے کر یا نقصان لے کر) اللہ نے فرمایا ہے وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا۔

اِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ ان امور میں بھی سمجھ داروں کے لئے توحید کے دلائل موجود ہیں جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں اور غور کرتے ہیں ان کو ان امور کے اندر اللہ کی توحید نظر آتی ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ط اور اے محمدؐ اگر آپ کو تعجب ہو تو واقعی ان کا یہ قول تعجب کے لائق ہے کہ جب ہم خاک ہو گئے تو کیا از سرِ نو پھر (قیامت کے دن) پیدا ہوں گے۔

جملہ استفہامیہ قَوْلُہُمْ کا بدل ہے یا مقولہ یعنی مفعول ہے یعنی ان کا یہ قول حشر کا انکار کر رہا ہے وہ اس بات کا تو اقرار کرتے ہیں کہ اول تخلیق اللہ نے کی لیکن دوبارہ پیدا کئے جانے کے منکر ہیں حالانکہ یہ بات ہر شخص مانتا ہے کہ کسی کام کی ابتدا سے دوبارہ اس کو کرنا آسان ہوتا ہے بشرطیکہ ابتداءً ارادہ واختیار کے ساتھ علم اور اندازہ کے تحت کی گئی ہو بے اختیار بلا ارادہ بغیر جانے بوجھے نہ ہو گئی ہو اور مشرکوں کو اللہ کی با اختیار خلاقیت اور علم وارادہ کے ساتھ موجد ہونے کا تو اقرار تھا۔ وہ فلاسفہ کی طرح خدا کو غیر مختار نہیں جانتے تھے پھر تخلیقِ جدید کا انکار بے عقلی کی بات تھی۔ مترجم)

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ مشرک جو آپ کے دعویٰ رسالت کی تکذیب کر رہے ہیں باوجودیکہ کھلے ہوئے معجزات دیکھ رہے ہیں اور واضح دلائل بھی ان کے سامنے ہیں پھر بھی ایسی چیزوں کی پوجا کرتے ہیں جن میں نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں اور آپ کو ان کی اس حرکت پر تعجب ہو رہا ہے تو ان کا یہ قول بھی تعجب کے لائق ہے کہ ہم خاک ہو جانے کے بعد کیا دوبارہ از سرِ نو پیدا کئے جائیں گے۔ حالانکہ اللہ ہی نے تمام وہ چیزیں جن کی تفصیل ذکر کر دی گئی نیست سے ہست کی ہیں پھر ان کے مرنے کے بعد دوبارہ ان کو پیدا کرنا تو آسان ہے۔

آیات مذکورہ اور دلائلِ واضحہ چاہتے ہیں کہ ان کا ایک (بااختیار) فاعل ہو اسی طرح دوبارہ پیدا ہونے کے امکان پر بھی ان سے استدلال کیا جا سکتا ہے ان سے اللہ کا قادرِ مطلق ہونا اور مختلف قابلیت کی چیزوں میں مختلف تصرفات کرنا ثابت ہو رہا ہے۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ۚ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے رب کا انکار کیا ہے یعنی قیامت کا انکار کرنے والے اپنے رب کے منکر ہیں کیونکہ اس کی قدرت کا انکار کرتے ہیں اور جو قادر نہ ہو عاجز ہو وہ رب ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

وَاُولٰٓئِكَ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ ۚ اور یہی لوگ ہیں جن کی گردنوں میں گمراہی کے طوق ہیں (جن سے خلاصی کی کوئی امید نہیں یا) دوزخ کے اندر ان کے گلے میں آگ کے طوق ہوں گے۔ قیامت کے دن ان کو طوق پہنائے جائیں گے۔

وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ اور یہی (قیامت کے دن) دوزخی ہوں گے۔

هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ جس کے اندر وہ ہمیشہ رہیں گے کبھی نہیں نکالے جائیں گے۔ ضمیرِ فصل (یعنی ہم) کا درمیان میں لانا بتا رہا ہے کہ کفار ہی ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ خلود فی النار کافروں کے لئے مخصوص ہے اہلِ سنت کا یہی قول ہے۔ معتزلہ کا قول اس کے خلاف ہے (وہ مؤمن فاسق کو دوامی دوزخی کہتے ہیں کیونکہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو وہ ایمان سے خارج جانتے ہیں اگرچہ کافر نہیں کہتے۔ مترجم)

وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالسَّيِّئَةِ قَبْلَ الْحَسَنَةِ وَقَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمُ الْمَثُلٰتُ ۭ

اور یہ لوگ بھلائی (عافیت کی میعاد ختم ہونے) سے پہلے آپ سے برائی (یعنی مصیبت کے نزول) کا تقاضا کرتے ہیں حالانکہ ان سے پہلے (اور کفار پر) واقعات عقوبت گزر چکے ہیں۔

اِستعجال وقتِ مقررہ سے پہلے کسی چیز کی طلب کرنا (عجلت طلبی) سیئہ سے مراد ہے عذاب اور سزا اور حسنہ سے مراد ہے نعمت وعافیت۔ مشرکینِ مکہ عافیت کی جگہ عذابِ (خداوندی) کے طالب تھے اور استہزاء کے طور پر کہتے تھے اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب بھیج دے۔

اَلْمَثُلٰتُ ان جیسے دوسرے کافروں پر نازل ہونے والی سزائیں، یعنی سابق کافروں پر نازل ہونے والی عقوبتوں سے کیوں عبرت حاصل نہیں کرتے اور کیوں ان کو اپنے اوپر ویسے ہی عذاب نازل ہونے سے ڈر نہیں لگتا۔ مَثُلَۃٌ مَثَلَۃٌ جیسے صَدُقَۃٌ اور صَدَقَۃٌ ہر سزا کو کہتے ہیں کیونکہ سزا جرم کی مثل ہوتی ہے قصاص کو بھی مثال اسی وجہ سے کہا جاتا ہے اَمْثَلْتُ الرَّجُلَ میں نے اس کا قصاص لے لیا۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ ۚ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے معاف کر دیتا ہے۔

عَلٰى ظُلْمِهِمْ یعنی باوجود یہ کہ وہ اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ آیت منکرین قیامت کے متعلق ہے اور منکرین قیامت کی مغفرت اللہ کبھی نہیں کرے گا تو مغفرت سے مراد ہے ڈھیل دینا فوراً پکڑ نہ کرنا یعنی اللہ حلیم ہے کافروں کو بھی باوجود ان کی بے جا حرکتوں کے ڈھیل دیتا رہتا ہے اور ان کو فی الفور عذاب نہیں دیتا۔ حالانکہ وہ عذاب آنے میں عجلت کے طلب گار ہوتے ہیں۔

وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب سخت عذاب دیتا ہے جب اللہ کی طرف سے عذاب آجاتا ہے تو کوئی اس کو دفع نہیں کر سکتا۔ سدی نے کہا کہ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِّلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ۔ مؤمنوں کے لئے خصوصیت کے ساتھ نازل ہوئی۔ قرآن مجید میں جتنی آیات گناہگار مؤمنوں کو امید مغفرت دلا رہی ہیں اور ان سب سے بڑھ کر امید گاہِ مغفرت یہ آیت ہے اس آیت میں "عَلٰى ظُلْمِهِمْ" کا لفظ امید دلا رہا ہے کہ بغیر توبہ کے بھی مغفرت ہو سکتی ہے کیونکہ توبہ کرنے والا ظلم پر نہیں رہتا۔ گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہو جاتا ہے یہ حدیث حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے ابن ماجہ نے مرفوعاً نقل کی ہے۔

بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت وَاِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ اور آیت وَاِنَّ رَبَّكَ لَشَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ دونوں کا تعلق مؤمنوں سے ہے مگر دونوں مشروط بہ مشیّت ہیں، مطلب یہ ہے کہ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی اور واحدی نے سعید بن مسیبؒ کی روایت سے مرسلاً بیان کیا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر اللہ کی طرف سے معافی اور درگزر نہ ہوتی تو یہاں کوئی زندہ نہ رہتا اور اگر اس کی طرف سے عذاب کی دھمکی نہ ہوتی تو ہر ایک اس کی رحمت پر بھروسہ کر بیٹھتا۔

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اور یہ کفّار کہتے ہیں ان پر کوئی (خاص) معجزہ (جو ہم چاہتے ہیں) کیوں ان کے رب کی طرف سے نہیں نازل کیا گیا۔ اٰیۃ یعنی کوئی خاص نشانی اور معجزہ جو ان کی نبوّت کو ثابت کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر جو معجزات نازل کئے گئے کافروں کے نزدیک درخورِ اعتناء نہیں تھے اور عناد و ضد کی وجہ سے خود پسند معجزات کے طلب گار تھے اس کے جواب میں اللہ نے فرمایا۔

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ آپ صرف (مخالفت کرنے والوں کو اللہ کے عذاب سے) ڈرانے والے نبی ہیں اور ہر قوم کے لئے راہنما ہوتے چلے آئے ہیں۔ یعنی آپ کے ذمے صرف احکامِ الٰہی پہنچا دینا اور نہ ماننے والوں کو عذاب کا خوف دلانا ہے۔ مطلوبہ معجزات کو پیش کرنا اور جبراً ہدایت یافتہ بنا دینا آپ کا کام نہیں۔ راہِ حق کی طرف بلانا آپ کا کام ہے اور ہر قوم کی ہدایت کے لئے کوئی نہ کوئی پیغمبر آتا رہا ہے جو خداداد معجزات پیش کرتا رہا ہے۔ مطلوبہ فرمائشی معجزات کسی نے پیش نہیں کئے۔ ع ۷

سعید بن جبیرؓ کے نزدیک ہادی سے مراد اللہ ہے۔ یعنی ہر قوم کو ہدایت یاب بنانا اور ہدایت پر قدرت دینا تو اللہ کا کام ہے وہی ہدایت پر قادر ہے يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ عکرمہ نے کہا ہادی سے مراد ہیں رسول اللہ ﷺ۔ یعنی آپ تو صرف ڈرانے والے اور ہر قوم کو راستہ دکھانے والے ہیں۔

رافضی کہتے ہیں اصل آیت میں وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ عَلِيٌّ ہر قوم کے ہادی علی ہیں تھا عثمان نے حسد کی وجہ سے علیؓ کا لفظ ساقط کر دیا۔ ان کو اللہ سزا دے، ان کو نہیں معلوم کہ اللہ نے قرآن کے متعلق وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ فرما دیا ہے ہم ہی قرآن کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اگر بفرضِ محال ان کے قول کو مان بھی لیا جائے تو پھر اصل آیت کی رو سے رسول اللہ ﷺ پر بھی

حضرت علیؓ کی فضیلت لازم آتی ہے کیونکہ آیت کا مفہوم اس وقت یہ ہوگا کہ آپ تو صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے ہادی تو علیؓ ہیں (یعنی آپ ہدایت کے درجہ پر فائز نہیں یہ کام تو علیؓ کا ہے)

اللہ کا علم کامل ہے قدرت تام ہے، قضاء و قدر کے دائرہ سے کوئی چیز باہر نہیں وہ ہر فرمائشی معجزہ کو پیدا کرسکتا ہے اور قادرِ مطلق ہے ان کافروں کو ہدایت بھی کرسکتا ہے مگر مطلوبہ معجزات کی درخواست سے طلبِ ہدایت مقصود نہیں بلکہ محض عناد کے زیر اثر ایسی فرمائشیں کی جاتی ہیں اس لئے ان فرمائشوں کو پورا نہیں کرتا اور چونکہ ان کے کافر رہنے کا ازلی فیصلہ پہلے ہی ہوچکا ہے اس لئے ہدایت یاب ہونے کی ان کو توفیق بھی نہیں دیتا۔ ان تمام مضامین پر آیاتِ ذیل دلالت کررہی ہیں۔

اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى وَمَا تَغِيْضُ الْاَرْحَامُ وَمَا تَزْدَادُ ؕ اللہ ہی جانتا ہے جو کچھ کسی مادہ کو حمل رہتا ہے اور جو کچھ رحم میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

مَا تَحْمِلُ (میں مَا مصدری ہے یعنی) حاملہ ہونے کو اللہ جانتا ہے یا (مَا موصولہ ہے یعنی) جس چیز کو مادہ اپنے پیٹ میں اٹھائے ہوتی ہے۔ نر یا مادہ ایک یا متعدد، پورے سالم اعضاء والا بچہ یا ناقص اور اس کی ہر موجودہ اور آئندہ حالت کو اللہ جانتا ہے۔

تَغِيْضُ ،غَاضَ کا مضارع ہے اور غَاضَ لازم بھی ہے بمعنی اِنْغَاضَ (باب انفعال) کے اور متعدی بھی ہے بمعنی اَغَاضَ (باب افعال) کے۔ قاموس میں ہے غَاضَ الْمَاءُ پانی کم ہوگیا گھٹ گیا۔ غَاضَ ثَمَنُ السِّلْعَةِ سامان کی قیمت گھٹ گئی۔ غَاضَ الْمَاءَ وَ ثَمَنَ السِّلْعَةِ اس نے پانی تھوڑا کردیا کم کردیا اور سامان کی قیمت گھٹادی۔

تَزْدَادُ، اِزْدَادَ سے مضارع ہے اِزْدِيَادٌ (افتعال) لازم بھی آتا ہے۔ جیسے اِزْدَادَ الْقَوْمُ عَلٰى عَشَرَةٍ قوم دس افراد سے زیادہ ہوگئی اور متعدی بھی آتا ہے جیسے وَنَزْدَادُ كَيْلَ بَعِيْرٍ ہم ایک بار شتر بڑھادیں گے۔ اگر دونوں فعلوں کو لازم کہا جائے تو مَا مصدری ہوگا یعنی ارحام کے گھٹنے اور بڑھنے کو اللہ جانتا ہے، رحم کے گھٹنے بڑھنے سے مراد ہے رحم کے اندر والی چیز کے جثہ، مدت اور تعداد کا گھٹنا بڑھنا اور اگر دونوں فعل متعدی مانے جائیں تو مَا موصولہ بھی ہوسکتا ہے اور مصدریہ بھی۔

مسئلہ

باتفاقِ علماء حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کیا چھ مہینے میں عورت کا بچہ پیدا ہوگیا، حضرت عثمانؓ نے عورت کو سنگسار کردینے کا حکم دے دیا حضرت ابن عباسؓ (مانع ہوئے اور) فرمایا کتاب اللہ کی روشنی میں اگر میں تم سے اس مسئلہ میں مناظرہ کروں تو تمہارے پاس جواب نہ ہوگا اللہ نے فرمایا وَحَمْلُهٗ وَ فِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا اس کا حالتِ حمل میں رہنا اور دودھ پینا تیس ماہ ہے۔ دوسری آیت میں آیا ہے وَفِصٰلُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اور اس کا دودھ چھڑانا دو سال میں ہوتا ہے دونوں آیتوں کے ملانے سے مدتِ حمل کم سے کم چھ ماہ رہتی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے یہ سن کر تعزیری سزا منسوخ کردی۔ ابن ہمام نے لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سزا ساقط کردی اور کسی نے مخالفت نہیں کی تو یہ اجماع سکوتی ہوگیا (کہ حمل کی مدت کم سے کم چھ ماہ ہے) کبھی چھ ماہہ بچہ پیدا ہوتا اور زندہ بھی رہتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل دو سال ہے۔

دار قطنی اور بیہقی نے سنن میں ابن المبارک کے طریق سے از داؤد بن عبدالرحمٰن از ابن جریج از جمیلہ بنت سعد ایک حدیث بیان کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تکلے کے سایہ کی بقدر بھی کوئی عورت حمل میں دو سال سے آگے نہیں بڑھتی۔ دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے حمل دو سال سے زیادہ نہیں ہوتا خواہ زیادتی تکلے کے سایہ کے برابر ہو۔

ایک قول میں امام شافعیؒ و امام مالکؒ کے نزدیک زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل چار سال ہے دوسری روایت میں امام مالکؒ کا قول آیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ مدتِ حمل پانچ برس ہے حماد بن سلمہ نے کہا ہرم بن سنان کو ہرم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ماں کے پیٹ میں چار برس رہا تھا (ہرم بہت زیادہ بوڑھے آدمی کو کہتے ہیں)

بیہقی کا بیان ہے کہ ولید بن مسلم نے امام مالک بن انس سے کہا مجھ سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا عورت کے حمل کی مدت میں دو سال سے تکلے کے سایہ کے بقدر بھی اضافہ نہیں ہوتا امام مالک نے فرمایا۔ سبحان اللہ یہ کون کہتا ہے میری یہ ہمسائی محمد بن عجلان کی بیوی بہت سچی عورت ہے اور اس کا شوہر بھی بڑا سچا آدمی ہے اس عورت کے تین بطن بارہ سال میں پیدا ہوئے ہر بطن چار سال میں۔

ابن ہمام نے کہا ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں جو مدت آئی ہے وہ (حضرت عائشہؓ کا قیاس نہیں ہے ایسے مسائل میں قیاس کو دخل نہیں) صرف سماعی ہے (رسول اللہ ﷺ سے آپ نے ایسا ہی سنا ہوگا) لہٰذا مرفوع کے حکم میں ہے (یعنی حضرت عائشہؓ کا قول نہیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے) اور حدیثِ مرفوع بہر حال محمد بن عجلان کی بیوی کے قول سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے اگر حدیث کی نسبت شارع کی طرف صحیح ثابت ہو جائے تو پھر حدیث میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہو سکتا اور ولید بن مسلم کی روایت اگر صحیح بھی ہو اور امام مالکؒ نے ایسا ہی فرمایا ہو اور عورت نے بھی ایسا ہی بیان کیا ہو تب بھی اس میں غلطی کا احتمال ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ چار برس تک (حیض کا) خون نہیں آتا اور چار سال کے بعد بچہ پیدا ہوا تو اس سے یہ یقین کیسے کیا جاسکتا ہے کہ وہ عورت پورے چار برس حاملہ رہی ہو سکتا ہے کہ اس کی پاکی کی مدت دو سال یا اس سے زیادہ رہی ہو پھر دو سال یا اس سے کم مدتِ حمل والی ہوئی ہو۔ اگر یہ کہا جائے کہ پیٹ کے اندر حرکت ہوتی ہوئی چار سال تک محسوس ہوتی رہی (لا محالہ بچہ ہی حرکت کرتا ہوگا) تو حرکت سے بچہ کے وجود پر بھی استدلال قطعی نہیں بغیر بچہ کے (صرف ریاحِ منجمد کی) حرکت بھی ممکن ہے ہم سے بیان کیا گیا تھا کہ ایک عورت نے نو ماہ تک پیٹ میں کسی چیز کی حرکت محسوس کی اس عرصہ میں خون بھی بند رہا اور پیٹ بھی بڑا ہو گیا جب وضع حمل کا وقت آیا اور دایہ جا کر بیٹھی اور درد ہوئے تو پانی چھوٹ گیا اور رفتہ رفتہ پیٹ لگ گیا اور کوئی بچہ پیدا نہ ہوا آخر دایہ اٹھ گئی..... شبہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک عورت کا شوہر چند سال گھر سے غائب رہا جب واپس آیا تو بیوی کو حاملہ پایا حضرت عمرؓ نے اس کو سنگسار کرا دینے کا ارادہ کیا حضرت معاذؓ نے فرمایا امیر المؤمنین اگر اس عورت پر آپ کو (شرعی) دست رس ہو بھی تب بھی اس کے پیٹ کے بچہ پر آپ کو کوئی دست رس نہیں ہو سکتی یعنی اس کو آپ قتل نہیں کر سکتے جب بچہ پیدا ہو جائے تو عورت کو سنگسار کرا سکتے ہیں غرض بچہ پیدا ہوا اور ایسا ہوا کہ اس کے دو اگلے دانت بھی نکل آئے تو اس شخص نے بچہ کو دیکھا تو بولا قسم ہے رب کعبہ کی یہ میرا بچہ ہے۔ (حضرت عمرؓ نے عورت کی سزا منسوخ کر دی جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دو سال سے زائد مدتِ حمل حضرت عمرؓ نے تسلیم کر لی)۔

جواب

یہ سزا کی منسوخی تو اس وجہ سے ہوئی کہ مرد نے اس بچہ کو اپنا بیٹا ہونا تسلیم کر لیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اسی کا بیٹا ہے اور جس کا فراش ہوتا ہے بچہ اسی کا شرعاً مانا جاتا ہے (خواہ وہ بچہ زنا کا ہی ہو مگر مانا جائے گا شوہر ہی کا) اسی لئے حضرت عمرؓ نے سزا موقوف کر دی۔

مسئلہ

- ایک بطن میں ایک جھلی کے اندر زیادہ سے زیادہ کتنے بچے ہوتے ہیں اس کی کوئی حد نہیں۔ **بعض** نے کہا کہ چار بچوں کا ہونا تو معلوم ہوا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا یمن میں مجھ سے ایک شیخ نے بیان کیا تھا کہ اس کی بیوی کے پانچ بطن ہوئے اور ہر بطن میں پانچ پانچ بچے ہوئے۔ میں کہتا ہوں ہندوستان میں ایک خبر مشہور ہوئی تھی کہ پورب کی طرف قاضی قدوہ کی بیوی کے ایک بطن میں ایک جھلی میں سو بچے ہوئے اور سب زندہ رہے۔

بغوی نے لکھا ہے اہلِ تفسیر کہتے ہیں کہ غِیۡضَ الۡاَرۡحَام حیض ہے جو بچہ پر اثر انداز ہوتا ہے اگر حاملہ کو حیض آنے لگے

تو بچہ میں نقصان آجاتا ہے۔ رحم کے اندر حیض کا خون بچہ کی غذا ہے جب خون آجاتا ہے تو بچہ کی غذا گھٹ جاتی ہے اور بچے میں نقصان آجاتا ہے اور حمل کی حالت میں حیض بند رہے تو بچہ بڑھتا رہتا ہے اور پورا ہو جاتا ہے۔ پس نقصان سے مراد ہے بچے کی جسمانی بناوٹ کا نقصان جو خون کے نکلنے سے ہو جاتا ہے اور زیادتی سے مراد ہے بچہ کی تخلیقی بناوٹ کا پورا ہو جانا جو خون بند رہنے سے ہوتا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ حاملہ کو حیض ہو جائے تو بچہ کی غذا کم ہو جاتی ہے اور مدتِ حمل بڑھ جاتی ہے یہاں تک کہ پاکی کے نوماہ پورے ہو جائیں (تب بچہ پورا پیدا ہوتا ہے) اگر حمل کی حالت میں پانچ دن خون آگیا تو نوماہ پانچ روز میں بچہ پیدا ہو گا پس غذا کی کمی بیشی سے مدتِ حمل میں کمی بیشی ہو جاتی ہے۔ حسن بصریؒ نے فرمایا غِيضَ الْأَرْحَامُ سے مراد ہے (حمل کی مدت) نوماہ سے کم ہونا اور زیادہ سے مراد ہے نوماہ سے مدتِ حمل کا زیادہ ہو جانا۔

بعض نے کہا نقصان سے مراد ہے، بچہ کا ساقط ہونا اور زیادت کا معنی ہے بناوٹ کا پورا ہونا۔

وَكُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ ۝٨ اور ہر چیز اللہ کے نزدیک ایک خاص انداز سے مقرر ہے۔ یعنی ہر چیز کی اللہ کے علم میں ایک حد معیّن ہے حد مقرر سے کوئی چیز نہ بڑھ سکتی ہے نہ گھٹ سکتی ہے۔

عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ الْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ ۝٩ وہ تمام پوشیدہ اور ظاہر چیزوں کو جاننے والا ہے سب سے بڑا اور عالیشان ہے۔

غیب اور شہادت کی تفسیر سورۂ جن میں ذکر کر دی گئی ہے۔ اَلْكَبِيرُ سے مراد یہ ہے کہ ہر چیز اس سے پست اور کم درجہ ہے اور اَلْمُتَعَالِ کا یہ مطلب ہے کہ وہ اپنی قدرت سے ہر چیز پر غالب ہے یا یہ مراد ہے کہ مخلوق کی تعریف و توصیف سے بالاتر ہے۔

سَوَاءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ ۝١٠

جو شخص تم سے کوئی بات چپکے سے کہے اور جو پکار کر کہے اور جو شخص رات میں کہیں چھپ جائے اور جو دن میں چلے پھرے یہ سب خدا کے علم میں برابر ہیں۔

مَنْ أَسَرَّ جو دل میں بات چھپائے رکھے۔ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ اور جو دوسروں سے اپنی بات کہہ دے۔ مَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ جو اپنے کو دوسروں سے چھپائے رکھنا چاہے۔ سَارِبٌ بِالنَّهَارِ جو دن میں باہر نکلے کہ اس کو ہر شخص دیکھے۔ سَارِبٌ، سَرَبٌ، سُرُوْبًا سے مشتق ہے۔ سروب کا معنی ہے برآمد ہونا باہر نکلنا۔ بعض نے کہا سرب کا معنی ہے راستہ۔ پس سارب کا معنی ہوا، راستہ میں چلتے پھرتے رہنے والا۔ قتیبی نے کہا سَارِبٌ بِالنَّهَارِ یعنی دن میں اپنے کاروبار میں مشغول ہونے والا۔

حضرت ابن عباسؓ نے اس آیت میں فرمایا کہ مُسْتَخْفٍ سے مراد ہے رات کو چھپ کر زنا کرنے والا اور سَارِبٌ بِالنَّهَارِ کا یہ مطلب ہے کہ دن میں باہر نکل کر وہ لوگوں کو دکھاتا ہے کہ میں جرم سے پاک ہوں۔

لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللّٰهِ ط ہر شخص (کی حفاظت یا اعمال کے لکھنے) کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا اس کی حفاظت یا نگرانی رکھتے ہیں۔

مُعَقِّبٰتٌ، مُعَقِّبَةٌ کی جمع ہے یہ لفظ عَقَّبَ سے بنا ہے (اور متعدّی نہیں ہے بلکہ) مبالغہ کے لئے عَقَّبَهٗ اس کے پیچھے آگیا۔ یا اعتقب سے بنا ہے۔ اس صورت میں معقبة کی اصل معتقبہ ہو گی۔ تا کو قاف میں ادغام کر دیا گیا۔ باب افتعال کی تا مبالغہ کے لئے ہے۔

بغوی نے لکھا معقب واحد کا صیغہ ہے اس کی جمع معقبة ہے اور معقبة کی جمع معقبات ہے جیسے انناوات سعد سعد کی عورتیں اور رجالات بکر (قبیلہ بکر کے مرد) کہا جاتا ہے انناوات، اناث کی اور رجالات، رجال کی جمع ہے اور اناث کا واحد انثیٰ ہے اور رجال کا مفرد رجل بہرحال اس سے مراد فرشتے ہیں جو رات دن باری باری سے آتے جاتے رہتے

ہیں، رات کے فرشتے چڑھ جاتے ہیں تو ان کے پیچھے دن کے فرشتے آجاتے ہیں اور دن کے فرشتے چڑھ جاتے ہیں تو ان کے بعد رات کے فرشتے آجاتے ہیں اور بندوں کے اعمال لکھتے ہیں اور آفات سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔[1]

بغوی نے صحیح سند سے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، تم میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں فجر اور عصر کی نماز میں دونوں کا اجتماع ہوتا ہے رات بھی جو فرشتے تم میں رہتے ہیں فجر کو جب وہ چڑھ جاتے ہیں تو ان کا رب باوجودیکہ خود بخوبی واقف ہوتا ہے پھر بھی فرشتوں سے پوچھتا ہے تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا۔ فرشتے عرض کرتے ہیں ان کو ہم نے نماز پڑھتے چھوڑا اور جب ہم پہنچے تھے تب بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ یعنی چھپنے والے اور ظاہر ہونے والوں میں سے ہر ایک کے آگے۔

وَمِنْ خَلْفِهِ یعنی اس کے باقی اطراف میں۔ (حضرت مفسرؒ کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ خَلْف سے مراد صرف پیچھے کا رخ کا نہیں بلکہ دایاں بایاں رُخ بھی اس میں شامل ہے کیونکہ دائیں بائیں رخ سے حفاظت کرنے پر بھی تو فرشتے مقرر ہیں)

يَحْفَظُونَهُ یعنی اگر تقدیری وقت اور حکم نہیں آیا ہے تو حفاظت کرتے ہیں اور تقدیر کا لکھا آچکا ہے تو بندے کو چھوڑ کر الگ ہو جاتے ہیں۔

مجاہد نے کہا ہر بندے پر ایک فرشتہ موکّل (مقرر) ہے جو سوتے جاگتے اس کی حفاظت کرتا ہے اور ہر جن وانس اور کیڑے مکوڑے سے اس کی نگہداشت کرتا ہے جو (ضرر رساں) چیز بھی بندے پر آنا چاہتی ہے فرشتہ اس سے کہتا ہے ہٹ پرے جا۔ ہاں اللہ ہی کا حکم کسی چیز کے آپہنچنے کا ہوتا ہے تو وہ چیز پہنچ جاتی ہے کعب احبار نے کہا اگر اللہ فرشتوں کو تم پر مامور نہ کردیتا جو کھانے پینے اور برہنگی کے وقت تمہارے قریب رہتے ہیں تو جنات تم کو جھپٹ لیتے یا يَحْفَظُونَهُ سے مراد ہے کہ آدمی کے اعمال کی نگرانی کرتے ہیں اس مطلب پر معقبات سے مراد ہوں گے وہ دو فرشتے جو دائیں بائیں ہاتھ پر بیٹھے نیکیاں اور بدیاں لکھتے رہتے ہیں (اور چونکہ یہ فرشتے چار ہیں دو دن کے اور دو رات کے اس لئے معقبات بصیغۂ جمع فرمایا۔ مترجم)

اللہ نے فرمایا ہے اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيَانِ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ۔ ابن جریج نے کہا یعنی آدمی پر اس کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں۔

---

[1] ازالۃ الخفاء میں کنانہ عدوی کی روایت سے آیا ہے کہ حضرت عثمان بن عفانؓ نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ مجھے بتائیے کہ بندے کے ساتھ کتنے فرشتے ہوتے ہیں۔ فرمایا ایک فرشتہ تیرے دائیں ہاتھ کی طرف ہے جو تیری نیکیوں پر مامور ہے اور وہ بائیں ہاتھ والے فرشتے کا سردار ہے جب تو کوئی ایک نیکی کرتا ہے تو وہ دس نیکیاں لکھتا ہے اور جب تو کوئی ایک بدی کرتا ہے تو بائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے میں اس کو لکھ لوں تو دائیں ہاتھ والا کہتا ہے (ابھی ٹھہرو) شاید یہ توبہ واستغفار کرلے جب تین بار ایسا کہہ چکتا ہے تو دائیں ہاتھ والا فرشتہ کہتا ہے اچھا اب لکھ لو اللہ اس سے ہم کو بچائے یہ بُرا ساتھی ہے، نہ اس کو اللہ کا پاس ولحاظ ہے نہ اللہ سے شرم اللہ فرماتا ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ بندہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالتا مگر ایک محافظ تیار اس کے پاس لکھنے کیلئے موجود رہتا ہے جو لکھ لیتا ہے اور دو فرشتے تیرے آگے پیچھے ہیں، اللہ فرماتا ہے لَهُ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اور ایک فرشتہ تیری پیشانی پر مسلط ہے جب تو اللہ کے لئے اس کو نیچے رکھتا ہے تو وہ تجھے سربلند کرتا ہے اور اگر تو غرور کرتا ہے تو وہ تجھے شکستہ کردیتا ہے (ذلیل کردیتا ہے) اور دو فرشتے تیرے لبوں پر مامور ہیں ان کا کام صرف یہ ہے کہ تو نبیؐ پر جو درود پڑھے اس کی نگہداشت کریں اور ایک فرشتہ تیرے منہ کا محافظ ہے کہ سانپ (وغیرہ) کو منہ میں داخل ہونے نہیں دیتا اور دو فرشتے تیری دونوں آنکھوں پر مامور ہیں یہ ہر آدمی کے دس فرشتے ہوئے۔ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں پر اترتے ہیں کیونکہ رات کے فرشتے دن کے فرشتوں سے الگ ہیں۔ پس ہر آدمی کے لئے بیس فرشتے ہیں اور ابلیس دن میں ہے اور اس کی اولاد رات کو آتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہٗ)

مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ کے دونوں ترجمے ہو سکتے ہیں وہ فرشتے آگے پیچھے آتے جاتے رہتے ہیں اللہ کے حکم سے یا بندہ کی حفاظت کرتے ہیں اللہ کے حکم کی وجہ سے۔ اول مطلب پر معقبات کی صفت ہو گی اور دوسرے مطلب پر یَحْفَظُوْنَ سے اس کا تعلق ہوگا۔ یا اَمْرُ اللّٰهِ سے مراد ہے اللہ کا عذاب یعنی اللہ کے عذاب سے بندے کو بچاتے ہیں۔ اس کے لئے دعائے مغفرت کرتے ہیں، مہلت طلب کرتے ہیں۔ بعض علماء نے کہا مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ میں مِنْ بمعنی باء ہے۔ یعنی اللہ کے حکم کے سبب اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

بعض کے نزدیک مُعقّبات سے مراد وہ آدمی ہیں جو بادشاہ کے گرداگرد اس کی حفاظت کے لئے مقرر ہوتے ہیں اور بادشاہ اپنی خام خیالی کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ اللہ کے جاری کردہ فیصلہ سے وہ مجھے بچالیں گے۔

بغوی نے لکھا ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ لہ مُعقّبات میں لَہٗ کی ضمیر محمد ﷺ کی طرف راجع ہے۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے اللہ کی طرف سے کچھ فرشتے مقرر ہیں جو آپ کے آگے پیچھے رہتے ہیں اور شیاطین جن وانس کے شر اور حوادثِ لیل ونہار سے آپ کی حفاظت کرتے ہیں۔

عبدالرحمٰن بن زید نے کہا اس آیت کا نزول عامر بن طفیل اور اربد بن ربیعہ کے سلسلہ میں ہوا۔ کلبی نے بروایتِ ابو صالح حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ عامر بن طفیل عامری اور اربد بن ربیعہ عامری رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے ارادے سے چلے۔ آپ مسجد کے اندر صحابہؓ کی ایک جماعت میں تشریف فرما تھے دونوں مسجد میں داخل ہوئے۔ عامر بن طفیل کانا تھا مگر تھا بہت ہی حسین، خوبصورتی کی وجہ سے لوگ نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک شخص نے عرض کیا یہ عامر بن طفیل آپ کی طرف آرہا ہے فرمایا آنے دو اگر اللہ کو اس کی بھلائی منظور ہو گی تو اس کو ہدایت کردے گا۔ عامر آکر کھڑا ہو گیا اور بولا محمد ﷺ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو مجھے کیا ملے گا۔ فرمایا جو دوسرے مسلمانوں کے حقوق و فرائض ہوں گے وہی تمہارے ہوں گے (یعنی نفع و نقصان میں تم مسلمانوں کے برابر کے شریک ہو جاؤ گے) کہنے لگا اپنے بعد یہ حکومت میرے سپرد (کرنے کا وعدہ) کرو (تو میں مسلمان ہو جاؤں گا) حضور ﷺ نے فرمایا اس کا اختیار مجھے نہیں یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے جس طرح چاہے کرے، کہنے لگا تو آپ صحرائیوں بدویوں اور خانہ بدوشوں پر مجھے حاکم بنا دیں اور شہریوں (گھروں میں رہنے والوں) پر آپ حاکم رہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ بھی نہیں ہو سکتا بولا پھر آپ مجھے کیا دیں گے۔ فرمایا میں گھوڑوں کی لگام تم کو سپرد کردوں گا جن پر سوار ہو کر تم جہاد کرو گے۔ بولا کیا آج تک میرے پاس یہ نہیں ہیں (یعنی گھوڑے تو میرے پاس موجود ہیں جن پر سوار ہو کر میں جنگ کرتا ہوں) اچھا آپ میرے ساتھ اُٹھ کر آئیں میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں، حضور ﷺ اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لئے۔ عامر نے اربد سے کہہ دیا تھا کہ جب تو مجھے محمد ﷺ کے ساتھ باتوں میں مشغول دیکھے تو ان کے پیچھے سے آکر تلوار سے حملہ کر دینا چنانچہ عامر جب رسول اللہ ﷺ سے کچھ جھگڑا اور گفتگو میں لوٹ پلٹ کرنے لگا تو اربد حملہ کرنے کے ارادے سے گھوم کر حضور ﷺ کے پیچھے آگیا اور ایک بالشت تلوار نیام سے کھینچ بھی لی لیکن اللہ نے اس کو روک دیا اور وہ پوری تلوار نہ کھینچ سکا عامر اس کی طرف اشارے بھی کرتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو منہ پھیر کر اربد کو دیکھا اور تلوار نکالنے کی کوشش میں مشغول پایا تو دعا کی اے اللہ جس طرح تو چاہے میری طرف سے ان کا کام تمام کردے (یعنی مجھے ان کا تدارک نہ کرنا پڑے تو غیب سے ان کو ختم کردے) اس روز ابر نام کو نہ تھا دن سخت گرمی کا تھا اور فضا صاف تھی لیکن یکدم اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور اس کو سوختہ کر دیا۔ عامر پیٹھ پھیر کر بھاگا اور کہنے لگا محمد ﷺ تو نے اپنے رب سے دعا کی اس نے اربد کو مار ڈالا خدا کی قسم میں تیرے اوپر اتنے کم مو گھوڑے اور نوجوان (سوار) چڑھا کر لاؤں گا کہ اس سارے میدان کو فوج سے بھر دوں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تجھے ایسا کرنے ہی نہ دے گا اور قیلہ کی دونوں شاخیں یعنی قبائل اوس و خزرج بھی تجھے ایسا نہ کرنے دیں گے (ان کی موجودگی میں تو کچھ نہیں کر سکتا) غرض عامر ایک سلولیہ عورت کے گھر جا کر اترا اور صبح کو اٹھ کر ہتھیار باندھے چہرہ کا رنگ بدلا ہوا تھا گھوڑے پر سوار ہو کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دوڑاتا ہوا صحرا میں پہنچا اور غرور سے کہنے لگا اے موت کے فرشتے میرے سامنے

نکل کر آیا پھر کچھ شعر پڑھنے لگا، اور بولا قسم ہے لات و عزیٰ کی اگر دوپہر تک میں محمد ﷺ اور اس کے ساتھی یعنی ملک الموت تک پہنچ گیا تو اپنا یہ برچھا دونوں کے آرپار کر دوں گا۔ اللہ نے ایک فرشتہ بھیجا جس نے اپنے پر کی ایک جھپٹ اس کے منہ پر رسید کی اور عامر چکرا کر زمین پر گر پڑا، اور اسی وقت اس کی زانوں پر ایک بڑی گلٹی نکل آئی مجبور اُسلولیہ عورت کے گھر لوٹ آیا اور کہنے لگا اونٹ کی گلٹی کی طرح گلٹی اور سلولیہ کے گھر میں موت۔ پھر گھوڑا منگوا کر سوار ہوا اور دوڑاتا ہوا چل دیا آخر گھوڑے کی پشت پر ہی مر گیا۔ اور اس طرح اللہ نے رسول ﷺ کی دعا قبول فرمائی۔

عامر طاعون سے مرا اور اربد بجلی سے ہلاک ہوا اور اسی واقعہ کے سلسلہ میں اللہ نے نازل فرمایا سَوَآءٌ مِّنْكُمْ مَّنْ اَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهٖ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِالَّيْلِ وَسَارِبٌۢ بِالنَّهَارِ لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ یعنی اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت وہ فرشتے کرتے ہیں جو رسول ﷺ کے آگے پیچھے ہیں۔ جیسا کہ ثعلبی نے روایت کیا۔

طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ اربد بن قیس اور عامر بن طفیل مدینہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عامر نے کہا محمد ﷺ اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو آپ مجھے کیا دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا جو مسلمانوں کا فائدہ ہو گا وہ تمہارا بھی ہو گا اور جو مسلمانوں پر فرض ہو گا وہ تم پر بھی ہو گا۔ عامر نے کہا کیا اپنے بعد آپ میرے لئے یہ حکومت مقرر کر دیں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا یہ نہ تم کو ملے گی نہ تمہاری قوم کو یہ سن کر عامر نے اربد سے چپکے سے کہا میں محمد ﷺ کو باتوں میں لگا لوں گا تم تلوار سے ان پر حملہ کر دینا غرض اس کے بعد دونوں لوٹ گئے (چلتے وقت) عامر نے کہا محمد ﷺ ذرا میرے ساتھ اٹھ کر چلو حضور ﷺ اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑے اس سے باتیں کرنے لگے اربد نے تلوار سونت لی اور قبضہ پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ ہاتھ سوکھ گیا رسول اللہ ﷺ نے گردن پھیر کر اس کو دیکھ لیا پھر دونوں کو چھوڑ کر آپ واپس چلے گئے۔ دونوں چلے گئے جب مقام رقم میں پہنچے تو بحکم خدا اربد پر بجلی ٹوٹ پڑی اور بجلی نے اس کو ہلاک کر دیا اس پر اللہ نے آیات اَللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ كُلُّ اُنْثٰى ...... شَدِيْدُ الْمِحَالِ تک نازل فرمائیں۔ (ثعلبی اور طبرانی کی روایت میں فرق یہ ہے کہ ثعلبی کی روایت میں اربد بن ربیعہ آیا ہے اور طبرانی کی روایت میں اربد بن قیس۔ ثعلبی کی روایت میں عامر کا طاعون سے ہلاک ہونا مذکور ہے اور طبرانی کی روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ ثعلبی کی روایت میں بہت زیادہ تفصیل ہے اور طبرانی کی روایت مختصر ہے وغیرہ۔ مترجم)۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا فَلَا مَرَدَّ لَهٗ ۚ وَمَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّالٍ ﴿۱۱﴾ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کی اچھی حالت کو بری حالت سے نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی اچھی حالت کو نہیں بدلتے اور جب اللہ کسی قوم پر مصیبت ڈالنا چاہتا ہے تو پھر اس کے ہٹنے کی کوئی صورت نہیں اور کوئی اللہ کے سوا ان کا مددگار نہیں رہتا۔

مَا بِقَوْمٍ یعنی کسی قوم کی عافیت اور نعمت کو نہیں بدلتا۔ مَا بِاَنْفُسِهِمْ یہاں تک کہ وہ اپنے اچھے احوال کی جگہ برے احوال اختیار نہ کرلیں۔

وَاِذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِقَوْمٍ یعنی اپنے اچھے احوال کو خود اپنے ہاتھوں بگاڑ دینے کے بعد جب اللہ ان پر مصیبت ڈالنا چاہتا ہے، عذاب دینا اور تباہ کرنا چاہتا ہے۔ فَلَا مَرَدَّ لَهٗ تو اس کو کوئی لوٹانے والا نہیں۔ مَرَدٌّ مصدر ہے بمعنی اسم فاعل۔ مِنْ وَّالٍ کارساز مددگار کہ مصیبت کو دفع کر سکے۔ یہ آیت دلالت کر رہی ہے کہ ارادۂ خداوندی کے خلاف ہونا محال ہے (یہی مسلک اہلسنت کا ہے۔ معتزلہ قائل ہیں کہ جس طرح حکم خداوندی کی خلاف ورزی ممکن بلکہ واقع ہے اسی طرح اللہ کے ارادہ و مشیت کی خلاف ورزی بھی ہو سکتی ہے۔ مترجم)

هُوَ الَّذِيْ يُرِيْكُمُ الْبَرْقَ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّيُنْشِئُ السَّحَابَ الثِّقَالَ ﴿۱۲﴾

وہ ہی تو تم کو ڈرانے اور امید دلانے کے لئے بجلی دکھاتا ہے اور بھاری بھاری پانی سے بھرے ہوئے بادل اٹھاتا ہے۔ یعنی کڑک کا خوف، سفر میں بارش کے ضرر کا خوف، بعض وقت کھیتی تباہ ہونے کا خوف اور بعض مکانوں کے گر جانے کا خوف اور گرمی کو دور کرنے اور کھیتی اور پھلوں اور درختوں کو فائدہ پہنچنے کی امید۔ سحاب سحابۃ کی جمع ہے بادل (سَحْبٌ کھینچنا السّحاب کھینچنا) ہوا کے ساتھ فضا میں بادل کھچ کر آتے ہیں اسی لئے ان کو سحاب کہا جاتا ہے کذا فی القاموس۔ بیضاوی نے سحاب کو اسم جمع کہا ہے۔

ثِقَال، ثَقِيْلَة کی جمع بھاری یعنی بارش سے بھرے ہوئے۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت علیؓ نے فرمایا بادل پانی کی چھلنی ہے۔

وَيُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ ۚ اور اس کے خوف سے رعد اور دوسرے فرشتے اس کی پاکی اس کی تعریف کے ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یعنی سبحان اللہ وبحمدہ کہتے ہیں ترمذی اور نسائی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رعد کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا وہ ایک فرشتہ ہے جو بادل پر مامور ہے اسکے پاس آگ کے کوڑے ہوتے ہیں جن سے بادلوں کو ہنکاتا ہے۔[1]

مِنْ خِيْفَتِهٖ اللہ کے خوف سے خِيْفَتِهٖ کی ضمیر اللہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ بعض نے کہا الملائکۃ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو رعد کے مددگار اور اس کے زیر حکم ہیں اس صورت میں مِنْ خِيْفَة کی ضمیر رعد کی طرف لوٹائی جاسکتی ہے یعنی رعد کے خوف سے اس کے مددگار تسبیح کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جو شخص رعد کی آواز سن کر سُبْحَانَ الَّذِي يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ پڑھے اور بالفرض اس پر بجلی گر پڑے تو وہ اپنے دین اسلام پر مرے گا۔ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ رعد کی آواز سن کر باتیں کرنا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے سُبْحَانَ مَنْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ اور فرماتے تھے یہ زمین والوں کے لئے سخت دھمکی ہے۔

جویبر نے ضحاک کی روایت سے بیان کیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رعد (فرشتہ) بادلوں پر مامور ہے جہاں حکم ہوتا ہے بادلوں کو چلاتا ہے اور پانی کے سمندر اس کے انگوٹھے کے گڑھے میں (بھرے ہوئے) ہیں اور وہ اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے اور جب وہ پاکی بیان کرتا ہے تو آسمان کا کوئی فرشتہ ایسا باقی نہیں رہتا جو اس کی تسبیح کے ساتھ خود بھی بلند آواز سے تسبیح نہ کرے اس وقت بارش اترتی ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے رب نے فرمایا اگر میرے بندے میرے حکم پر چلتے تو میں رات میں ان کو بارش سے سیراب کرتا اور دن میں ان پر دھوپ نکال دیتا (تاکہ ان کے کاروبار کا نقصان نہ ہو۔ مترجم) اور ان کو رعد کی آواز بھی نہ سناتا (کہ وہ خوف زدہ ہو جائیں) رواہ احمد بسند صحیح والحاکم۔ بیضاوی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا کہ اس کو سننے والے تسبیح اور تحمید کرتے ہیں اور پکار کر کہتے ہیں سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ۔ یا یہ مطلب ہے کہ رعد تسبیح کرتا ہے یعنی بادل کی گرج اللہ کی وحدانیت اور کمال قدرت پر دلالت کرتی ہے اور اس کے فضل و نزول رحمت کا بھی اظہار کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں یہ مطلب اس وقت ہو گا جب رعد کا فرشتہ ہونا ثابت نہ ہو۔

وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيْبُ بِهَا مَنْ يَّشَآءُ اور وہ بجلیاں بھیجتا اور جس پر چاہتا ہے ان کو گراتا ہے۔ صواعق صَاعِقَة کی جمع ہے، صاعقہ ہلاک کرنے والی بجلی۔ یہاں مراد ہے ٹوٹ کر گرنے والی تجلی کہ جس پر گرتی ہے

[1] ترمذی، احمد اور نسائی نے بیان کیا اور ترمذی نے اس کو صحیح قرار دیا کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہودیوں نے حاضر ہو کر رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا بتائیے رعد کیا ہے۔ فرمایا بادل کے فرشتوں میں سے ایک فرشتہ ہے جس طرف اللہ حکم دیتا ہے وہ بادل کو ہنکاتا ہے بولے یہ آواز کیسی ہوتی ہے جو ہم کو سنائی دیتی ہے۔ فرمایا یہ اس کی آواز ہوتی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک فرشتہ ابر پر مامور ہے جو نافرمان بادلوں کو جمع کرتا ہے اس کے ہاتھ میں کوڑا ہے جب وہ کوڑا اٹھاتا ہے تو چمک پیدا ہو جاتی ہے جب ڈانٹتا ہے تو گرج پیدا ہوتی ہے اور جب مارتا ہے تو بجلی گرتی ہے۔ (از مفسر قدس سرہ)

اس کو سوختہ کر دیتی ہے۔

وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللهِ ۚ اور وہ اللہ کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ سے جھگڑتے ہیں یعنی اللہ کی توحید اللہ کی قدرتِ کاملۂ اللہ کے علم محیط اور لوگوں کے دوبارہ پیدا ہونے اور سزا و جزا دیئے جانے کے متعلق اللہ کے رسول سے جھگڑتے ہیں۔ جِدَال: جھگڑے میں سختی کرنا۔ یہ لفظ جَدْلٌ سے بنا ہے۔ جدل کا معنی ہے قتل کر دینا۔ یعنی اللہ کی صفاتِ کمالیہ کی تو یہ نشانیاں ہیں جو اوپر ذکر کر دی گئیں اور اس حالت میں بھی یہ لوگ جھگڑتے ہیں اور اس کے وجود و کمالِ قدرت کا انکار کرتے ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت محمد بن علی باقر نے فرمایا بجلی مسلم و غیر مسلم سب پر گرتی ہے مگر ذکر کرنے والے مسلم پر نہیں گرتی۔

نسائی اور بزار نے حضرت انسؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک صحابی کو دورِ جاہلیت کے کسی بڑے آدمی کے پاس دعوتِ ایمان دینے کے لئے بھیجا، اس شخص نے کہا جس رب کی طرف تو مجھے بُلا رہا ہے وہ کس چیز کا ہے لوہے کا ہے، تانبے کا ہے، چاندی کا ہے، سونے کا ہے۔ صحابیؓ نے واپس آکر رسول اللہ ﷺ کو جواب سنا دیا آپ ﷺ نے دوسری بار اور تیسری بار بھیجا (اور اس شخص نے وہی جواب دیا) اس کے بعد اللہ نے اس پر ایک بجلی گرا دی جس سے وہ سوختہ ہو کر رہ گیا۔ اور یہ آیت نازل ہوئی وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ الخ۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول اربد بن ربیعہ کے حق میں ہوا تھا۔ اربد نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تھا تمہارا رب کس چیز کا ہے، موتی کا ہے، یاقوت کا ہے یا سونے کا ہے اس پر آسمان سے ایک بجلی گری جس نے اربد کو جلا دیا۔

حسن بصریؒ سے جب آیت وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ الخ کے متعلق دریافت کیا گیا تو فرمایا عرب کے شیطان (بڑے مشرکوں) میں سے ایک شخص تھا رسول اللہ ﷺ نے اس کو اللہ اور رسول ﷺ کی طرف بُلانے کے لئے چند آدمیوں کو بھیجا وہ بولا محمد ﷺ کا رب جس کی طرف تم مجھے بُلا رہے ہو بتاؤ کس چیز کا بنا ہوا ہے، سونے کا ہے، چاندی کا ہے، لوہے کا ہے، تانبے کا ہے۔ ان لوگوں نے اس کے قول کو بڑی گستاخی سمجھا اور واپس آکر خدمتِ گرامی میں عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضور ﷺ نے ہم کو ایسے آدمی کے پاس بھیجا کہ اس سے بڑھ کر کافر دل اور اللہ کا سرکش اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا اس کے پاس پھر جاؤ۔ حسبُ الحکم صحابہؓ دوبارہ گئے اس شخص نے پہلی مرتبہ سے بھی زیادہ گستاخانہ کلام کیا اور بولا کیا محمد ﷺ کے کہنے سے میں ایسے رب کو مان لوں جو نہ مجھے دکھائی دیتا ہے نہ میں اس کو پہچانتا ہوں۔ صحابہؓ لوٹ آئے اور عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اس نے تو پہلی بات سے بھی زیادہ بری بات کہی، فرمایا پھر لوٹ کر جاؤ۔ صحابہؓ پھر لوٹ کر گئے اس سے گفتگو کر ہی رہے تھے اور وہ اپنی سابقہ بات کہہ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک بدلی اٹھی اور سب کے سروں پر آگئی اور اس میں گرج اور چمک پیدا ہوئی اور ایک کڑک اس شخص پر گر پڑی اور سب کے سامنے وہ سوختہ ہو گیا۔ صحابہؓ دوڑتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دینے آئے راستے میں صحابہؓ کی ایک جماعت اور مل گئی اور انہوں نے کہا وہ آدمی جل گیا۔ لوٹ کر آنے والوں نے دریافت کیا تم کو کیسے معلوم ہوا۔ جماعتِ صحابہؓ نے کہا اللہ نے اپنے رسول کے پاس وحی بھیجی اور یہ آیت نازل فرمائی وَيُرْسِلُ الصَّوَاعِقَ فَيُصِيبُ بِهَا مَنْ يَّشَاءُ وَهُمْ يُجَادِلُونَ فِي اللهِ۔

وَهُوَ شَدِيدُ الْمِحَالِ ۝۱۳ حالانکہ وہ بڑی سخت قوت والا ہے۔

بغوی نے لکھا ہے حسن بصریؒ نے اس کا ترجمہ کیا سخت کینہ والا اور مجاہد نے کہا سخت قوت والا اور ابو عبیدہ نے کہا سخت سزا دینے والا۔ بعض نے کہا سخت تدبیر اور مقابلہ والا۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے مِحَال بروزن کتاب۔ مکر، خفیہ تدبیر سے کسی کام کو کرنے کا ارادہ۔ تدبیر، قدرت، جھگڑا، عذاب، سزا، دشمنی، قوت، شدت، ہلاک ہونا، ہلاک کرنا، ان معانی میں سے اکثر اس جگہ مراد لئے جا سکتے ہیں۔ مِحَال کا وزن فِعَال ہے (میم اصلی ہے) مَحْلٌ سے مشتق ہے۔ بعض نے کہا مِحَال کا وزن مفعل ہے (میم اصلی نہیں) اس وقت حَوْل یا حیلہ یا حیلولۃ سے برخلافِ قیاس مشتق ہوگا، اسی بناء پر حضرت ابن عباسؓ

نے اس کا ترجمہ کیا شدیدُ الحَوْل اور حضرت علیؓ نے فرمایا سخت پکڑ والا۔

لَهُ دَعْوَةُ الْحَقِّ ط سچا پکارنا اسی کے لئے خاص ہے، یعنی اسی کی دعوت واجبُ القبول ہے اور دوسرے کی دعوت قابلِ قبول نہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ اسی کی سچی پکار ہے وہی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت کی طرف بلایا جائے اور اسی سے حاجتیں پوری کرنے کی دعا کی جائے۔ یا دعوۃُ الحق سے مراد ہے اخلاص کے ساتھ دعا کرنا۔ یعنی اخلاص کے ساتھ دعا اسی سے کی جاسکتی ہے۔ ان تمام توجیہات پر حق سے مراد ہوگا وہ مفہوم جو باطل کی ضد ہے۔

دَعْوَةٌ موصوف ہے الحق صفت۔ موصوف کو صفت کی طرف مضاف کر دیا گیا ہے جیسے مسجدُ الجامع اور جانبُ الغربی۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ الحق کا موصوف المدعو محذوف ہو۔ یعنی دعوۃ الحق المدعو۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ حق سے مراد اللہ ہے۔ اللہ کی ہر پکار حق کی طرف بلاوا ہے۔

ایک شبہ

اگر حق سے مراد اللہ ہو تو کلام غیر مفید ہوگا۔ اللہ کی پکار تو اللہ کے ساتھ مخصوص ہی ہے جیسے دوسروں کی پکار دوسروں کے ساتھ مخصوص ہے۔

ازالہ

(بے شک اللہ حق ہے لیکن) لفظ حق ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ کی پکار، حق کی پکار ہے۔ دعوتِ حق، حق ہوتی ہے، جیسے باطل کو پکارنا باطل ہوتا ہے۔ گویا یہ جملہ اپنے اندر دعوے کے ساتھ دلیل بھی رکھتا ہے۔ بغوی نے ذکر کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا دعوتِ حق توحید ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا دعوتِ حق لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی شہادت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کے لئے خاص ہے توحید اور شہادت کی دعوت۔

اگر آیت کا نزول عامر اور اربد کے متعلق مانا جائے تو دونوں جملوں کا مقصد یہ ہوگا کہ ان دونوں شخصوں کو اس طور سے ہلاک کرنا کہ ان کو پتہ بھی نہ ہوا اللہ کی خفیہ تدبیر کے زیر اثر تھا اور رسول اللہ ﷺ کی دعا کی وجہ سے تھا یعنی آپ کی دعا قبول ہوگئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ رسولِ برحق ہیں جب ہی تو آپ کی دعا اللہ نے قبول فرمالی۔ اور اگر آیت کو کسی شانِ نزول سے متعلق قرار نہ دیا جائے بلکہ عام مانا جائے تو کافروں کو تہدید کرنی مقصود ہوگی کہ تم اللہ کے رسول سے جھگڑتے ہو، اللہ بڑا طاقت اور خفیہ تدبیر کرنے والا ہے اور رسول کی دعا قبول کرنے والا ہے۔

یا صرف کافروں کی بد عقیدگی اور گمراہی ظاہر کرنا مقصود ہے۔ (تہدید مقصود نہیں)۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۤءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ط اور خدا کے سوا جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ ان کی درخواست کو اس سے زیادہ منظور نہیں کر سکتے جتنا پانی اس شخص کی درخواست کو منظور کرتا ہے جو اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلائے ہوئے ہو کہ پانی خود بخود اس کے منہ تک آجائے حالانکہ وہ پانی از خود آگے بڑھ کر اس کے منہ تک آنے والا نہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ۔ اَلَّذِيْنَ سے مراد یا تو کفار ہیں اور یدعون کا مفعول محذوف ہے، یعنی بت وغیرہ ترجمہ اس طرح ہوگا اور وہ کافر جو اللہ کے علاوہ دوسری چیزوں کو پکارتے ان کی عبادت اور یاد کرتے ہیں اور ان سے مرادیں مانگتے ہیں یا اَلَّذِيْنَ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کی کافر پوجا کرتے ہیں۔ ترجمہ اس طرح ہوگا اور جن بتوں کو یہ کافر پوجتے ہیں۔

لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ وہ بُت ان کافروں کی کوئی درخواست حصولِ نفع کی ہو یا دفعِ ضرر کی قبول نہیں کرتے۔

لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ کا معنی ہے لا يُجِيْبُوْنَ منظور نہیں کرتے۔ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ مستثنیٰ محذوف ہے اور باسط سے پہلے مضاف بھی

محذوف ہے مگر اتنی ہی منظوری جتنی منظوری اس شخص کے لئے ہوتی ہے جو پانی کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے کہ پانی خود اس کے منہ تک پہنچ جائے۔ یعنی ایک پیاسا جو کنویں کی منڈیر پر بیٹھا پانی کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہو اور پانی کو اپنی طرف بُلا رہا ہو خود تو اندر اُتر نہیں سکتا پانی کو بلاتا ہے۔

وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ (ظاہر ہے کہ) پانی اس کے منہ تک اُڑ کر پہنچنے والا نہیں وہ تو بے جان اور بے شعور چیز ہے اس کو معلوم بھی نہیں کہ کون اس کو پکار رہا ہے نہ وہ کسی کے بُلاوے کو قبول کر سکتا اور نہ دعوت پر آسکتا ہے۔ کافروں کے معبودوں کی بھی یہی حالت ہے، کافر بتوں کو پکارتے ہیں بتوں کو ان کی پکار کا پتہ بھی نہیں ہوتا وہ بے شعور و بے جان ہیں وہ ان کی دعا قبول نہیں کر سکتے۔ مطلب کی یہ تشریح مجاہد اور عطا نے کی ہے اور حضرت علیؓ سے بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ لیکن بعض اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ بتوں کی عبادت اور دعا کی عدمِ افادیت کو اس شخص کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو پینے کے لئے چلّو بھر کر پانی لینا چاہتا ہو اور دونوں ہتھیلیاں پانی کی طرف پھیلائے اور پانی کو ہتھیلی میں اٹھانا چاہے ظاہر ہے کہ پانی کو پکڑنے والا پکڑ نہیں سکتا اور اس کے منہ تک پانی پہنچ نہیں سکتا۔ بتوں کے پجاریوں کی بھی یہی حالت ہے۔ بُت نہ ان کو فائدہ پہنچا سکتے نہ ضرر (ان کی عبادت ایسی ہے جیسے پانی کو پکڑنے کی کوشش) یہ تشریح حضرت ابن عباسؓ کے قول میں بھی آئی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا غیر اللہ کی پوجا کرنے والے ایسے ہیں جیسے کوئی پیاسا اپنی دونوں ہتھیلیاں پانی کے اندر پھیلا دے جب تک ہتھیلیاں پھیلائے رکھے گا چلو نہ بنائے گا پانی نہ آئے گا اور منہ تک نہیں پہنچے گا۔ اس صورت میں بت پرستوں کی ناکامی کی ہتھیلیاں پھیلائے رکھنے والے پیاسے کی ناکامی سے تشبیہ ہوگی۔

وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿١٤﴾ اور (ان باطل معبودوں سے) کافروں کا درخواست کرنا محض بے اثر ہے۔ ضلال بے کار، ضائع، سراسر خسارہ۔

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا یہ تشریحی قول نقل کیا ہے کہ کافروں کا اپنے رب کو پکارنا بالکل بے سود ہے، بے کار ہے کفر و معاصی کے پردے خدا تک پہنچنے میں آڑے آتے ہیں ان کی دعائیں رب تک پہنچتی ہی نہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ﴿١٥﴾ السجدة

اور اللہ ہی کے سامنے سب سر خم کئے ہوئے ہیں جتنے آسمانوں میں ہیں اور جتنے زمین میں ہیں خوشی سے اور مجبوری سے اور ان کے سائے بھی صبح اور شام کے اوقات میں۔

مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا یعنی ملائکہ اور اہلِ ایمان بندے خوشی سے اللہ کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔

وَّكَرْهًا اور وہ منافق و کافر جو تلوار کے خوف سے سر خمیدہ ہوتے ہیں، کراہت کے ساتھ سر جھکاتے ہیں یا مصائب کی شدّت اور ضرورت ان کو سر جھکانے پر مجبور کرتی ہے اگرچہ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے۔

وَّظِلٰلُهُمْ اور بالتبع ان کے سائے بھی سر خمیدہ ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سجدہ کرنے سے مراد ہو تابعِ مشیّت ہونا اور ارادۂ خداوندی کے دائرہ میں محصور رہنا خواہ ان کا خود ارادہ ہو یا نہ ہو مشیّت کے تابع سب ہیں اور سایوں کے تابعِ مشیّت ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جس طرح چاہتا ہے سایوں کو پھیلاتا اور سمیٹتا بڑھاتا اور گھٹاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے مراد ہوں حقائق اور ملائکہ و مؤمنین کی ارواح اور ظلال سے مراد ہوں اشخاص و اجسام۔ جیسے رسول اللہ ﷺ نے ظاہر کو سیاہی اور باطن کو خیال سے تشبیہ دی تھی اور دعا کی تھی اور سجدہ میں عرض کیا تھا میری سیاہی (ظاہری جسم) اور میرا خیال (باطنی نور) تجھے سجدہ کرتا ہے (ظلال کی یہ تشریح اول تشریح سے بہتر ہے کیونکہ سایہ اسی سیاہی کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کی آڑ کی وجہ سے دھوپ وہاں نہیں پہنچتی اور سایہ کا یہ مفہوم عدمی ہے۔ سجدہ کرنے کی نسبت اس کی طرف کیسے ہو سکتی ہے۔ وہاں اگر سایہ سے مراد ظاہر اور جسم ہو تو سجدہ کی نسبت اس کی طرف کرنا صحیح ہے۔ مترجم)

غدوّ اور آصال سے مراد ہے ہمہ اوقات ہمیشہ آصال جمع ہے اَصیل اس کا واحد ہے عصر سے مغرب تک درمیانی وقت کو اصیل کہتے ہیں۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط آپ دریافت کیجئے کہ آسمان وزمین کا رب کون ہے یعنی ان کو پیدا کرنے والا ان کا انتظام رکھنے والا اور ان کے تمام امور کا ذمہ دار کون ہے۔ یہ استفہام تقریری ہے (یعنی کیا ایسا ہے کہ اللہ ہی خالق و مدبّر ہے) کیونکہ مشرک بھی قائل تھے اور ان کو بھی یہ امر تسلیم تھا کہ ان کا اور آسمان وزمین کا خالق اللہ ہی ہے۔

قُلِ اللّٰهُ ط آپ خود ہی کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ان کا خالق ہے۔ یعنی اگر وہ کوئی جواب نہ دیں تو ان کی طرف سے آپ جواب دے دیں کہ اللہ ہی آسمان وزمین کا رب ہے کیونکہ وہ بھی اسی کے قائل ہیں اور ان کا بھی یہی جواب ہوگا یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کا خالق ورب ہونا اتنا ظاہر ہے کہ اس کا کوئی منکر ہو ہی نہیں سکتا لہٰذا آپ ہی ان کی طرف سے جواب دے دیجئے۔ یا قُلِ اللّٰهُ کہنے سے مشرکوں کو جواب کی درپردہ تعلیم دینی مقصود ہے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے مشرکوں سے پوچھا کہ آسمان وزمین کا خالق کون ہے تو انہوں نے جواب دیا آپ ہی بتائیے اس پر اللہ نے فرمایا قُلِ اللّٰهُ آپ جواب دے دیجئے کہ اللہ ہی ان کا رب ہے اس طرزِ کلام سے یہ جواب ان پر لازم کر دیا۔

قُلْ اَفَاتَّخَذْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ آپ کہہ دیجئے تو پھر بھی کیا تم اس کے سوا دوسروں کو کارساز و مددگار قرار دیتے ہو۔ اس کلام کا عطف محذوف جملہ پر ہے یعنی کیا تم اللہ کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہو اور پھر دوسروں کو اپنا کارساز بناتے ہو یہ بات تقاضائے عقل کے خلاف ہے کیونکہ جن کو تم کارساز بناتے ہو ان کی حالت تو یہ ہے کہ

لَا يَمْلِكُوْنَ لِاَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا ط ان کا اپنا نفع وضرر بھی ان کے بس میں نہیں۔ اپنے لئے وہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں نہ آئے ہوئے ضرر کو اپنے اوپر سے دفع کر سکتے ہیں جب ان کی خود اپنے لئے یہ حالت ہے تو تمہاری کارسازی کیا کر سکتے ہیں اور کس طرح تم کو فائدہ پہنچا سکتے اور تم پر آنے والے ضرر کو دفع کر سکتے ہیں۔ مشرکوں کے گمراہ ہونے اور بتوں کو اپنا کارساز بنانے کی یہ دوسری تردید ہے کہ تم جو ان کی شفاعت کے امیدوار ہو وہ تمہاری شفاعت تو کیا اپنے لئے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ڵا آپ پوچھے کہ کیا نابینا اور بینا برابر ہو سکتے ہیں نابینا سے مراد ہے بے عقل، بے بصیرت یا وہ شخص جو اپنی بصیرت سے کام نہ لے۔ اور بصیر سے مراد وہ بصیرت مند آدمی جو اپنی بصیرت سے عبادت کی حقیقت اور تقاضوں کو سمجھتا ہو اور جانتا ہو کہ عبادت وکارسازی کا مستحق کون ہے کس کی عبادت کی جائے اور کس کو کارساز سمجھا جائے۔ بعض علماء نے کہا اَعْمٰی سے مراد وہ معبود ہے جو تمہاری طرف سے لاعلم ہے اور بصیر سے مراد وہ معبود ہے جو تمہارے احوال سے واقف ہو۔

اَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۚ یا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں۔ یعنی کیا کفر اور ایمان برابر ہو سکتے ہیں۔

اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ خَلَقُوْا كَخَلْقِهٖ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۱۶﴾ یا انہوں نے اللہ کے ایسے شریک قرار دے رکھے ہیں کہ انہوں نے بھی کسی چیز کو پیدا کیا ہو جیسا خدا نے پیدا کیا ہے، پھر ان کو (دونوں کا) پیدا کرنا ایک سا معلوم ہوا ہو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہی واحد اور غالب ہے۔

اَمْ بمعنی بَلْ ہے۔ استفہام انکاری ہے۔ خَلَقُوْا شرکاء کی صفت ہے۔ ایسے شرکاء جنہوں نے پیدا کیا ہو۔ فَتَشَابَهَ کہ دونوں کی مخلوق میں باہم اشتباہ ہو گیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جن معبودوں کو شریک بنا رکھا ہے وہ کسی چیز کے خالق

نہیں کہ ان کو خدا کی تخلیق اور معبودوں کی تخلیق میں اشتباہ ہو جاتا اور یہ کہتے کہ خدا خالق ہے اس لئے معبود ہے اور ہمارے معبود بھی خالق ہے اس لئے وہ بھی مستحق عبادت ہیں۔ بلکہ جن کو یہ اللہ کا شریک ٹھہرا رہے ہیں وہ تو بالکل عاجز ہیں ان میں تو بالکل ہی قدرت نہیں۔ دوسری مخلوق میں بھی کچھ نہ کچھ قدرت ہے۔ ان معبودوں میں تو اتنی بھی سکت نہیں۔ اللہ کے سوا کوئی خالق نہیں اجسام ہوں یا اعراض یا غیر مادی ارواح جس کو وہ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اگر وہ کسی چیز کو پیدا کرنا نہ چاہے تو اس کا پیدا ہونا ممکن ہی نہیں لہٰذا اس کے سوا کسی کی عبادت جائز نہیں جو لوگ (یعنی معتزلہ فرقہ والے) کہتے ہیں کہ بندے اپنے افعال کے خود خالق ہیں اللہ ان کے افعال کا خالق نہیں۔ وہ اسی گروہ میں سے ہیں جن کو دونوں انسان اور خدا کی تخلیق ایک جیسی معلوم ہوتی ہے (حضرت مفسّر کے کلام سے اس طرف اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت کے نزدیک معتزلہ کا گروہ بھی مشرک ہے یا مشرکوں جیسے عقائد رکھتا ہے اس فرقۂ معتزلہ کو بدعتی گروہ بھی قرار دیا ہے۔ لیکن کافر کسی نے نہیں کہا۔ مترجم)

وَهُوَ الْوَاحِدُ یعنی اللہ ربوبیت اور معبودیت میں اکیلا ہے بلکہ اصل وجود میں بھی واحد ہے اصل وجود میں اس کا کوئی شریک نہیں سارے عالم کا وجود تو ظلّی ہے اور اللہ کے وجود کا پَرتو ہے۔

الْقَهَّارُ وہی ہر چیز پر غالب ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا کیونکہ ہر چیز فی ذاتہٖ معدوم ہے بغیرہ موجود ہے خود اس کا اپنا وجود نہیں پھر کس طرح اس موجود کا مقابلہ کر سکتی ہے جس کا وجود ذاتی ہے، اور اسی کی ہستی اصل ہستی ہے۔[1]

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ

اللہ نے آسمان سے پانی نازل فرمایا پھر نالے (بھر کر) اپنی مقدار کے موافق چلنے لگے پھر وہ سیلاب خس وخاشاک کو بہا لایا جو (پانی کے) اوپر آرہا ہے۔

اَوْدِيَةٌ وادی کی جمع ہے وہ ندی نالے جہاں پانی بکثرت بہتا ہے وادی کہلاتے ہیں مجازاً وادی میں بہنے والے پانی کو بھی وادی کہہ لیا۔ (یعنی بہنے کی نسبت پانی کی بجائے وادی کی طرف کر دیتے ہیں جیسا کہ آیت مذکورہ میں آیا ہے) بارش ہونے سے تمام وادیاں تو نہیں بہتی ہیں بعض بہتی ہیں اسی لئے اس کو بصورتِ نکرہ ذکر کیا (غیر معین وادیاں)

بِقَدَرِهَا۔ یعنی وادیوں کے اندازے کے موافق چھوٹی بڑی جیسی بھی ہوں۔

اَلسَّيْلُ وادیوں میں بہنے والا پانی سیلاب زَبَدًا، کف، جھاگ، میل کچیل جو سیلاب کے اوپر آتا ہے۔ رَابِيًا صاف پانی کے اوپر۔

وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ اور جن چیزوں کو آگ کے اندر زیور یا اور سامان بنانے کے لئے تپاتے ہیں اس میں بھی ایسا ہی میل کچیل اوپر آجاتا ہے۔

يُوْقِدُوْنَ کا فاعل ضمیر مستتر ہے مراد لوگ۔ فاعل معلوم معروف تھا اس لئے ذکر نہیں کیا۔ اِیقاد (مصدر باب افعال) پگھلانے کے لئے کسی چیز کو آگ میں تپانا۔

مِمَّا میں مِن ابتدا کے لئے ہے یعنی جو چیزیں لوگ پگھلانے کے لئے آگ میں تپاتے ہیں ان سے بھی پانی کے جھاگوں کی طرح جھاگ اور میل کچیل پیدا ہوگا ہے۔ یا مِن تبعیض کے لئے ہے یعنی بعض چیزوں سے جھاگ پیدا ہوتے ہیں۔

---

[1] آیت اَمْ جَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ کی تفسیر کے ذیل میں ابن جریج کی روایت آئی ہے جو چند وسائط سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت معقل بن یسارؓ تک پہنچتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمہارے اندر شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ (طور پر داخل ہو جاتا) ہے میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں جس کی وجہ سے (اقسام) شرک چھوٹے ہوں یا بڑے سب دور ہو جائیں گے، صحابہؓ نے عرض کیا فرمائیے فرمایا ہر شخص ہر روز تین بار کہے اے اللہ میں دانستہ طور پر تیرے ساتھ شریک بنانے سے تیری پناہ لیتا ہوں اور نادانستہ شرک کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں۔ اور (شرک) یہ (بھی) ہے کہ مجھے اللہ نے اور فلاں شخص نے دیا اور (یہ بھی شرک ہے کہ) کوئی یوں کہے کہ اگر فلاں شخص نہ ہوتا تو فلاں شخص مثلاً زید مجھے مار ڈالتا۔

مَا یُوْقِدُوْنَ جس کو تپاتے ہیں سونا چاندی، لوہا تانبا، پیتل بہر حال لفظ عام ہے ہر پگھلائی جانے والی دھات اس میں داخل ہے۔
اِبْتِغَآءَ حِلْیَۃٍ زیور بنانے کے لئے جیسے سونا چاندی پگھلایا جاتا ہے۔
اَوْ مَتَاعٍ یا کچھ سامان ظروف بنانے کے لئے جیسے برتن بنانے کے لئے تانبا پیتل پگھلایا، تپایا جاتا ہے یا اسلحہ بنانے کے لئے یا کھیتی کے اوزار کے لئے لوہا پگھلایا تپایا جاتا ہے۔ اِبْتِغَآءَ حِلْیَۃٍ اَوْ مَتَاعٍ کہنے سے دھاتوں کو پگھلانے کی غرض کا اظہار مقصود ہے۔
زَبَدٌ مِّثْلُہٗ پانی کے کف کی طرح اس سے بھی میل اوپر آجاتا ہے۔ یعنی بھٹی میں پڑ کر اس سے بھی میل نکل کر اوپر آجاتا ہے۔
کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ۚ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ ؕ کَذٰلِکَ یَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾
یعنی اللہ کے نازل کردہ علم (قرآن اور دوسری کتبِ سماویہ) سے لوگ طرح طرح کے دُنیوی اور اُخروی فائدے حاصل کرتے ہیں اور اپنے دلوں کی وسعت کے مطابق اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں اور یہ علم خداوندی قیامت تک بلکہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والا ہے اس کو کبھی زوال نہیں ہے اس کی تمثیل بارش کے پانی سے دی جاسکتی ہے اوپر سے بارش ہوتی ہے ندی نالے بھر جاتے ہیں وادی میں بہہ نکلتے ہیں وادی کی جتنی وسعت ہوتی ہے اور جیسی ضرورت ہوتی ہے اتنا ہی پانی وادی میں سماتا ہے۔ چھوٹی ندی میں تھوڑا پانی اور گہری بڑی ندی میں زیادہ پانی رواں ہو جاتا ہے لوگ اس پانی سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اس پانی کا کچھ حصہ زمین کے اندر بھی سما جاتا ہے اور اندر گھسنے کے بعد باولی، چشموں اور کنوؤں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کچھ حصہ زمین کے اوپر گڑھوں اور تالابوں میں رُک جاتا ہے اور مدت تک باقی رہتا ہے۔
یا اللہ کے نازل کردہ علم کو دھات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے لوگ زیور، برتن، ہتھیار اور اوزار وغیرہ بنانے میں اس سے فائدہ اندوز ہوتے ہیں اور اس سے بنا ہوا سامان مدتِ دراز تک باقی رہتا ہے، رہا باطل یعنی منکرین و مشرکین (کی خود ساختہ خرافات اور نفس) کی اختراعات اور شیطانی توہمات تو ظاہر ہے کہ وہ سب بے اصل ہیں پراگندہ اور منتشر ہیں نہ ان کو پائیداری حاصل ہے نہ استقرار و ثبات نہ وہ فائدہ رساں اور نہ دنیا و دین میں منفعت بخش ہیں ان کو ہم ان جھاگوں اور میل کچیل سے تشبیہ دے سکتے ہیں، جو سیلاب اور پگھلائی ہوئی دھات کے اوپر آجاتا ہے، جو کوڑا کرکٹ سیلاب کے اوپر آجاتا ہے سیلاب اس کو اِدھر اُدھر پھینک دیتا ہے، اسی طرح حق بھی باطل کو جمنے نہیں دیتا اِدھر اُدھر پراگندہ کر دیتا ہے۔
جُفَآءً وہ میل کچیل جو سیلان یا پگھلائی ہوئی دھات کے اوپر آکر اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتا ہے۔ جَفَا الْوَادِی (ثلاثی مجرّد) اور اَجْفَا الْوَادِی (ثلاثی مزید) دونوں ہم معنی ہیں۔ یعنی وادی اور سیلابی نالے نے کوڑا کرکٹ اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ بعض اہل لغت نے کہا کہ جُفَآءً کا معنی ہے، منتشر، پراگندہ، جَفَأَتِ الرِّیْحُ ہوا نے پراگندہ کر دیا۔
وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ۔ یعنی اصل پانی اور دھات تو زمین میں قائم رہتا ہے اور لوگ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علم نافع کی بھی یہی حالت ہے یہ بھی پائیدار اور قائم رہنے والا اور لوگوں کو فائدہ پہنچانے والا ہے۔
کَذٰلِکَ یعنی جس طرح اللہ نے حق و باطل کی مذکورہ تمثیل بیان کی اسی طرح غیر واضح اُمور کو کھول کر سمجھانے کے لئے اللہ تمثیلات سے کام لیتا ہے۔ بعض علماء نے کہا اس میں اہلِ ایمان کے لئے در پردہ پیام تسکین ہے کہ کفر اگرچہ بظاہر بلند و بالا نظر آتا ہے لیکن اس کی تاریکی چھٹ جائے گی اور نورِ اسلام چمکے گا۔ اور اس کی روشنی ہمیشہ قائم رہے گی۔
لِلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰی ؔ وَالَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ ؕ
جن لوگوں نے اپنے رب کا کہنا مان لیا ان کے واسطے اچھا بدلہ ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کا کہنا نہ مانا ان کے پاس اگر دنیا بھر کی چیزیں موجود ہوں اور اس کے ساتھ اتنا ہی اور بھی ہو تو وہ

سب اپنی رہائی کے لئے دے ڈالیں گے (مگر ان کی رہائی نہ ہوگی)

اَلْحُسْنٰی مفعول مطلق کی صفت ہے یا مفعول بہ محذوف کی صفت ہے یعنی جن لوگوں نے اپنے رب کی دعوتِ اسلام کو اچھی طرح قبول کرلیا اور اس کے احکام کی تعمیل کی یا اپنے رب کی اچھی دعوت کو قبول کرلیا۔

اَلَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ سے مراد کفار ہیں۔ اس صورت میں لِلَّذِیْنَ کے لام کا تعلق یَضْرِبُ سے ہوگا یعنی اللہ دونوں گروہوں کے حال بطورِ تمثیل بیان کرتا ہے دعوتِ الٰہیہ کو قبول کرنے والوں کے احوال کو بھی اور نہ قبول کرنے والوں کے احوال کو بھی۔ بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک اَلْحُسْنٰی مبتدا مؤخر ہے اور لِلَّذِیْنَ خبر مقدم یعنی اچھا ثواب یا جنت ان لوگوں کے لئے ہے جنہوں نے اپنے رب کی دعوت قبول کرلی اس تقدیر پر اَلَّذِیْنَ لَمْ یَسْتَجِیْبُوْا لَهٗ بجائے خود مبتدا ہوگا اور لَوْ اَنَّ لَهُمْ الخ اس کی خبر۔

لَافْتَدَوْا بِهٖ یعنی قیامت کے دن اگر کل زمین کی دولت ان کو مل جائے تو دوزخ سے اپنی رہائی کے لئے وہ دے دیں گے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ سُوْٓءُ الْحِسَابِ ۙ ان لوگوں کا سخت حساب ہوگا۔ ابراہیم نخعی نے کہا سُوء حساب یہ ہے کہ ان سے سختی کے ساتھ حساب فہمی کی جائے گی اور کوئی گناہ معاف نہیں کیا جائے گا۔

وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۸﴾ اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور جہنم بری قرار گاہ ہے۔ اللہ نے ایک اور آیت میں فرمایا ہے لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ۔ ان کا بچھونا اوڑھنا جہنم کا ہوگا۔

اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ جو شخص یقین رکھتا ہو کہ جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے وہ سراسر حق ہے کیا ایسا شخص اس کی طرح ہو سکتا ہے جو اندھا ہے۔ اندھے سے مراد ہے بے بصیرت کور دانش، حق کو باطل سے تمیز نہ کرنے والا۔ روایت میں آیا ہے کہ اول الذکر شخص سے مراد ہیں حضرت حمزہؓ یا حضرت عمارؓ اور نابینا سے مراد ہے ابوجہل۔

اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۱۹﴾ پس نصیحت تو سمجھ دار ہی لوگ قبول کرتے ہیں یعنی سلیم دانش والے جو عقل کو جذباتِ حمیت و تعصب سے اور فہم کو وہم سے پاک رکھتے ہیں۔

الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ یعنی یوم میثاق میں جو اللہ کی ربوبیت کا انہوں نے اقرار کیا تھا اور اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے جواب میں بلٰی کہا تھا اس کو پورا کرتے ہیں اور اللہ نے جو اپنی کتابوں میں احکام کی پابندی کا وعدہ لیا تھا اس کو بھی پورا کرتے ہیں۔

وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ﴿۲۰﴾ اور پیمان کو نہیں توڑتے یعنی اللہ سے اور آپس میں بندوں سے کئے ہوئے وعدوں کو نہیں توڑتے۔ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ میں صرف عہدِ خداوندی کی صراحت تھی اور الْمِيْثَاقَ کا لفظ عام ہے اللہ سے کیا ہوا عہد ہو یا بندوں سے کئے ہوئے وعدے۔

وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ اور وہ لوگ جوڑے رکھتے ہیں، ان تمام چیزوں کو جن کو جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ کے ذیل میں تمام انبیاء اور ساری آسمانی کتابوں پر بغیر تفریق کے ایمان لانا اور تمام مؤمنوں کے ساتھ تعاون و تنظیم اور اقارب سے حسن سلوک کرنا داخل ہے (ان تمام چیزوں کو جوڑے رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے) بغوی نے لکھا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک اس جگہ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ سے مراد صرف صلۂ رحم ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے اللہ نے فرمایا ہے میں ہی اللہ ہوں میں ہی رحمٰن ہوں میں نے رحم کو پیدا کیا ہے اور اپنے نام رحمٰن سے لفظ رحم کو مشتق کیا جو اس کو جوڑے رکھے گا میں اس کو

اپنے ساتھ جوڑے رکھوں گا جو اس کو کاٹے گا اس سے میں قطع تعلق کرلوں گا۔ رواہ ابو داؤد۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے مخلوق کو پیدا کیا، پیدا کرچکا تو رحم نے کھڑے ہو کر رحمٰن کی کمر پکڑلی۔ اللہ نے فرمایا کیا ہے۔ رحم نے عرض کیا یہ اس کی جگہ ہے جو قطع تعلق سے تیری پناہ چاہتا ہے۔ اللہ نے فرمایا کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ جو تجھے جوڑے رکھے گا میں اسے اپنے ساتھ جوڑے رکھوں گا اور جو تجھے توڑے گا میں اس سے قطع تعلق کرلوں گا۔ رحم نے عرض کیا بے شک میں اس پر راضی ہوں اے میرے ربؐ اللہ نے فرمایا پس یہ فیصلہ تیرے لئے ہے۔ متفق علیہ۔

بغویؒ اور حکیم اور محمد بن نصر نے حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن تین چیزیں عرش کے نیچے ہوں گی۔ قرآن مجید، امانت، رحم۔ قرآن (بندوں سے یا بندوں کی طرف سے) حجت کرے گا اس کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن[1] اور رحم ندا کرے گا خوب سن لو جس نے مجھے جوڑے رکھا اللہ اس سے تعلق رکھے گا اور جس نے مجھے توڑا اللہ اس سے قطع تعلق کرلے گا۔ رواہ البغوی والحکیم ومحمد بن نصر۔

حضرت انس بن مالکؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص چاہتا ہو کہ اللہ اس کے رزق میں وسعت اور عمر میں درازی عطا کرے تو وہ قرابت داروں کو جوڑے رکھے۔ متفق علیہ۔

حضرت ابو ایوب انصاریؓ راوی ہیں کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی فرودگاہ پر سامنے سے آیا اور عرض کیا مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے جو مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کردے فرمایا اللہ کی بندگی کر کسی چیز کو اس کا شریک نہ قرار دے، نماز قائم کر، زکوٰۃ ادا کر اور رشتہ داری کو جوڑے رکھ (یعنی قرابتداروں سے اچھا سلوک کر) رواہ البغوی۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، رشتۂ قرابت کو جوڑنے والا وہ نہیں جو برابر کا بدلہ دے۔ بلکہ قرابت کو جوڑنے والا وہ ہے کہ اگر رشتۂ قرابت (کسی عزیز کی طرف سے) ٹوٹ گیا ہو تو وہ اس کو جوڑ دے۔ (یعنی جو شخص تجھ سے عزیز داری اور قرابت ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو یا ختم کرچکا ہو تو اس سے قرابت پیدا کر اور رشتہ کو جوڑ) رواہ البخاری۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میری طرف سے حسنِ سلوک کا کون سب سے زیادہ مستحق ہے۔ فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد، فرمایا تیری ماں۔ اس نے عرض کیا اس کے بعد کون فرمایا تیرا باپ۔ دوسری روایت میں اتنا زائد ہے کہ تیرا باپ کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا پھر تیرے قرابت دار حسب درجۂ قرابت۔ متفق علیہ۔

حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (باپ کے ساتھ یہ بھی) بہت اچھا سلوک اور بِر ہے کہ باپ کے منہ پھیرنے (یعنی مرنے) کے بعد اس کے دوستوں سے اچھا سلوک کیا جائے۔ رواہ مسلم۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے اپنے نسب کو جانو تاکہ رشتہ داروں کو جوڑے رکھو صلۂ رحم سے رشتہ داروں میں محبت، مال میں وسعت اور عمر میں برکت ہوتی ہے۔ رواہ الترمذی وقال حدیث غریب۔

وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ اور اپنے رب سے یعنی اس کی وعید سے (بالعموم) ڈرتے ہیں۔

---

[1] ظاہر و باطن ہونے سے مراد یہ نہیں ہے کہ باطنِ قرآن ظاہر کے مخالف ہے اور کوئی ایسا معنی مراد ہے جو اہلِ لغت اور علماء امت کی سمجھ میں نہیں آسکتا صرف ائمہ اور اہلِ عرفان ہی کی عقل کی رسائی وہاں تک ہوسکتی ہے۔ مثلاً موسیٰؑ سے مراد باطنی طور پر قلب یا روح ہے اور بنی اسرائیل سے مراد روحانی اور علمی طاقتیں اور فرعون سے مراد نفسِ امارہ ہے اور قبطیوں سے نفسِ امارہ کی شہوانی اور غضبی قوتیں۔ یہ حقیقت میں قرآن کی معنوی تحریف ہے بلکہ باطن سے مراد قرآن کا مغز اور رُوح ہے اور ظاہر سے مراد پوست اور ہیئت مثلاً نماز سے مراد یہی خاص ہیئت کی نماز ہے اور حضورِ قلب، استغراق، خلوص اس کا باطن ہے زکوٰۃ یہی مقررہ خیرات ہے مگر اس کا باطن غریب پروری اور اہلِ ضرورت کی معاشی کفالت حُبِّ مال کو دل سے دور کرنا ہے۔

وَيَخَافُونَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ﴿٢١﴾ اور (بالخصوص) حساب آخرت کی خرابی سے خوف کھاتے ہیں اس لئے آخرت کی حساب فہمی سے پہلے وہ خود اپنے نفسوں سے اسی زندگی میں حساب فہمی کرتے ہیں (اور سوچتے ہیں کہ ہم نے کیا کیا گناہ کئے ہیں پھر اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہیں)

وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا اور جن لوگوں نے صبر کیا یعنی جو احکام ان کو دیئے گئے ہیں ان پر ثابت قدم رہے (حضرت ابن عباسؓ) یا مصائب اور شدائد پر صابر رہے (عطاء) بعض علماء کے نزدیک صبر سے مراد ہے نفسانی خواہشات سے اجتناب کرنا۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ صبر سے مراد ہو خواہشات کی مخالفت پر جمار ہنا۔ یہ تفسیر تمام اقوال کو جامع ہے۔[1]

ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ اپنے رب کی خوشنودی طلب کرنے کے لئے۔ کسی دوسری دنیوی غرض کے لئے نہیں نہ دکھاوٹ اور شہرت کے لئے۔ (نہ مال وجاہ و حکومت کے حصول کے لئے۔ مترجم)

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ اور نماز قائم کی یعنی فرض نماز اور سُنن و نوافل میں سے اپنی مرضی کے مطابق جس قدر چاہا نماز پڑھی۔

وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ اور جو کچھ مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے کچھ بطورِ زکوٰۃ فرض اور بطورِ نفقہ واجب اور بطورِ صدقہ نفل راہِ خدا میں خرچ کیا۔ (خدا دادمال میں سے شرائطِ مقررہ کے مطابق کچھ مال زکوٰۃ میں ادا کرنا ضروری ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی اگر مسلمانوں کو یا اسلام کو ضرورت ہو تو مزید کچھ مال امدادی طور پر دینا لازم ہے اِنَّ فِی الْاَمْوَالِ حَقًّا سِوَی الزَّکٰوۃ اور کچھ مال بطورِ خیرات دینا مستحب ہے۔ اَنْفِقُوْا کا لفظ ان تینوں صورتوں کو حاوی ہے حضرت مفسرؒ کی یہی مراد ہے۔ مترجم)

سِرًّا وَّعَلَانِيَةً چھپا کر اور کھلم کھلا۔ نفل خیرات چھپا کر دینا افضل ہے (تاکہ شہرت طلبی کا شائبہ بھی نہ ہو) اور (لوگوں کی بدگمانی کو دور کرنے اور دوسروں کو ترغیب دینے) کے لئے زکوٰۃ کھلم کھلا دینا بہتر ہے۔ مسلمانوں پر زکوٰۃ کا وجوب بہت کم ہوتا ہے (اول تو اتنا مال ہی نہیں ہوپاتا کہ زکوٰۃ واجب ہو اور مال ہوتا بھی ہے تو اس کے اسلام کا تقاضا ہے کہ پہلے ہی سے ادا کردے) عموماً مسلمان نفل خیر، خیرات کرتا ہی رہتا ہے (اتنی کہ اس پر زکوٰۃ بہت کم ہی واجب ہوتی ہے) اس لئے سِرًّا کو علانیۃً سے پہلے ذکر کیا۔ (ورنہ زکوٰۃ کی ادائیگی دوسرے خیرات پر مقدم ہے اس لئے علانیۃً کا لفظ سِرًّا سے پہلے آنا چاہئے تھا۔)

وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اور نیکی سے بدی کو دفع کرتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا نیک کام کر کے کئے ہوئے بُرے کاموں کی تلافی کر دیتے ہیں اللہ نے فرمایا اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ بلاشبہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں۔ حضرت ابوذرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تجھ سے کوئی گناہ ہو جائے تو اس کے پیچھے نیکی بھی کر یہ اُس کو مٹا دے گی۔ رواہ احمد بسندِ صحیح۔

ابن عساکر نے عمر بن اسود کی مُرسَل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دس گناہ تو نے کئے ہوں تو ایک نیکی بھی ایسی کر جس سے تو گناہوں کو اُتار دے۔

حضرت عقبہ بن عامرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص گناہوں کے بعد نیکیاں کر لیتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کوئی اتنی تنگ زرہ پہن رکھی ہو جس سے اس کا دم گھٹ رہا ہو (یعنی اتنے گناہ کئے کہ ہلاکت کے قریب پہنچ گیا) پھر اس نے ایک نیکی کر لی تو زرہ کی ایک کڑی ٹوٹ گئی پھر دوسری کڑی ٹوٹ گئی (اس طرح نیکیاں کرتے کرتے سب کڑیاں ایک کے بعد ایک ٹوٹ گئیں) یہاں تک کہ زرہ زمین پر گر پڑی۔ رواہ الطبرانی۔

[1] حاصلِ اختلاف یہ ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور عطاء کے نزدیک صَبَرُوْا کے بعد عَلٰی محذوف ہے احکام پر ثابت قدم رہنا یا مصائب پر دونوں صورتوں میں عَلٰی (جو صبر کا صلہ ہے) محذوف ہوگا۔ لیکن بعض علماء کے نزدیک عَنْ (حرفِ صلہ) محذوف یعنی نفسانی خواہشات یا گناہوں سے اجتناب کرنا۔ حضرت مفسرؒ کی تفسیر زیادہ عام ہے مگر عَلٰی اس صورت میں بھی محذوف ماننا پڑے گا۔ مترجم)

ابن کیسان نے کہا آیت کا معنی یہ ہے کہ گناہ توبہ کے ذریعہ سے دفع کر دیتے ہیں (یعنی حسنہ سے مراد توبہ ہے) امام احمد نے عطاء کی مُرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تو نے گناہ کیا ہو تو فوراً اس کے بعد توبہ کر لے۔ چھپے گناہ کی توبہ مخفی طور پر اور علانیہ گناہ کی توبہ علانیہ (الزہد)

بعض علماء کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ برائی کے عوض برائی نہیں کرتے بلکہ برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ سدی نے کہا مطلب یہ ہے کہ جب ان کے خلاف کوئی جہالت کرتا ہے تو (جہالت کا جواب وہ جہالت سے نہیں دیتے) وہ تحمل کرتے ہیں، سَیِّئَة سے مراد ہے جہالت اور حسنہ سے مراد ہے تحمل۔ قتادہ نے کہا جب کوئی ان سے برائی کرتا ہے اور تو وہ لوٹا کر اس سے بھلائی کرتے ہیں جیسا دوسری آیت میں آیا ہے۔ وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوْا سَلَامًا۔

حسن نے کہا جب ان کو محروم رکھا جائے تب بھی محروم رکھنے والوں کو وہ محروم نہیں رکھتے بلکہ وہ دیتے ہیں ان پر ظلم کیا جاتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اگر ان سے قطع قرابت کیا جائے تو وہ پھر بھی قرابت کو جوڑتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے کچھ رشتہ دار ایسے ہیں کہ میں ان کو جوڑے رکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور وہ مجھ سے قرابت توڑتے ہیں، میں ان سے بھلائی کرتا ہوں وہ مجھ سے برائی کرتے ہیں۔ ان کی زیادتیوں کو برداشت کرتا ہوں اور وہ مجھ پر زیادتیاں کرتے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تم ایسے ہی ہو جیسا کہہ رہے ہو تو تم ان پر خاک جھونک رہے ہو (یعنی ان کو ناکام بنا رہے ہو وہ خسارے میں رہیں گے اور تم کامیاب ہو گے) جب تک تم اس سلوک پر قائم رہو گے اللہ کی طرف سے ان کے مقابلہ میں تمہاری حمایت ہوتی رہے گی۔ رواہ مسلم۔

عبد اللہ ابن مبارکؒ نے فرمایا یہ مذکورہ بالا آٹھ خصائل ہیں جو جنت کے آٹھ دروازوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں (ہر خصلت جنت کے ایک دروازے کی طرف رہنمائی کر رہی ہے)

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۲۲﴾ اس جہان میں نیک انجام ان لوگوں کے واسطے ہے۔ عُقْبٰی کسی کام کا بدلہ۔ اَعْقَبَہٗ اس کو بدلہ دیا (قاموس) کام کے پیچھے اس کا بدلہ (نتیجہ) آتا ہے اس کو عُقْبٰی کہا جاتا ہے (خواہ اچھا بدلہ ہو یا برا) لیکن (عرفِ عام میں) عُقْبَة عُقْبٰی اور عَاقِبَتٌ اچھی جزا یعنی ثواب کے لئے خاص کر لیا گیا ہے اور عُقُوْبَتٌ معاقبة اور عِقَابٌ کا اطلاق عذاب اور برے بدلہ پر ہی ہوتا ہے۔ ثواب کے متعلق اللہ نے فرمایا خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ نِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ اور عذاب کے بارے میں فرمایا ہے۔ فَحَقَّ عِقَابِ۔ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ۔ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ۔ لیکن لفظ عَاقِبَتٌ اگر مضاف ہو تو عقوبت کے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں جیسے ثُمَّ كَانَ عَاقِبَةَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوا السُّوْٓاٰى یا فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِى النَّارِ۔ عَاقِبَتٌ بمعنی عُقُوْبَتٌ یا تو بطورِ استعارہ مستعمل ہے یا بطورِ اشتراک (یعنی لفظ عَاقِبَتٌ دونوں معنی میں مشترک ہے اچھا انجام اور برا انجام)

حقیقت میں آخرت ہی قرار گاہ ہے اس لئے الدَّار سے مراد آخرت ہے، دنیا تو گزر گاہ ہے قرار گاہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مذکورہ بالا اشخاص کے لئے دارِ آخرت میں اچھا نتیجہ اور ثواب ہوگا۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ یعنی قیام اور رہنے کے باغ۔ عدن کا معنی ہے قیام کرنا۔[1]

يَدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ جن میں وہ لوگ بھی داخل ہوں گے اور ان کے ماں باپ اور بیبیوں اور اولادوں میں سے جو جنت کے لائق ہوں گے وہ بھی داخل ہوں گے۔

---

[1] مجاہد کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے ممبر پر آیت جنّٰت عدن تلاوت فرمائی پھر فرمایا لوگو! تم کو معلوم ہے کہ جنّاتِ عدن کیا ہیں عدن جنت میں قصر ہے جس کے دس ہزار دروازے ہیں اور ہر دروازے پر پچیس ہزار فراخ چشم حوریں متعین ہیں اس قصر میں سوائے نبی، صدیق اور شہید کے اور کوئی داخل نہ ہوگا۔ (از مفسّر رحمہ اللہ)

"صلاح" سے صرف ایمان مراد ہے کامل (عملی) درستی مراد نہیں۔ معطوف اور معطوف علیہ میں مغایرت ہونی چاہئے۔ ہاں اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ میں کامل صلاح والے مراد ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کاملوں کی عزت افزائی کرے گا اور ان کے دلوں کو خوش کرنے کے لئے ایسے لوگوں کو بھی ان کے مرتبے پر فائز کردے گا جو اپنے اعمال کے لحاظ سے اس درجہ کے مستحق نہ ہوں گے اور کاملین کے اعمال کی طرح ان کے اعمال نہ ہوں گے آباؤاجداد، اولاد اور بیویاں خواہ اہلِ جنت کے درجات پر فائز ہونے کے اہل نہ ہوں مگر جنتیوں کی خوشی کی خاطر ان کو بھی اہلِ جنت کا ساتھی کردیا جائے گا۔ بشرطیکہ وہ مؤمن ہوں۔ صالح (یعنی مؤمن) ہونے کی شرط بتارہی ہے کہ بغیر ایمان کے قرابتِ نسب مفید نہ ہوگی۔ آباء کے اندر بدلالتِ نص مائیں بھی داخل ہیں۔

ایک شبہ

طبرانی، حاکم اور بیہقی نے حضرت عمرؓ کی روایت سے صحیح سند کے ساتھ اور طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ و حضرت مسور بن مخرمہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن میرے نسب اور رشتۂ زوجیت کے علاوہ ہر نسب اور رشتۂ زوجیت ٹوٹ جائے گا۔ ابن عساکر نے صحیح سند سے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ حدیثِ مذکورہ نقل کی ہے۔ ہر نسب اور رشتۂ زوجیت علاوہ میرے نسب اور رشتۂ زوجیت کے منقطع ہوجائے گا۔ اس حدیث سے معلوم ہورہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قرابت (نسبی و سُسرالی) کے علاوہ اور کسی کی قرابت کام نہ آئے گی (اور آیت میں مؤمنوں کے لئے ان کی قرابت و زوجیت کا سودمند ہونا مذکور ہے)۔

حل

تمام مؤمن رسول اللہ کی اولاد ہیں۔ اللہ نے فرمایا اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗٓ اُمَّهٰتُهُمْ۔ حضرت اُبی کی قرأت میں اتنا لفظ اس کے بعد زیادہ ہے۔ وَهُوَ اَبٌ لَّهُمْ (رسول اللہ ﷺ مؤمنوں کے باپ ہیں)۔
ایک اور آیت میں آیا ہے۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ سورۂ کوثر کی تفسیر میں ہم نے ذکر دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق عاص بن وائل نے لوگوں سے کہا اس کو چھوڑو یہ تو دُم بریدہ ہے اس کے پیچھے اس کی نسل نہیں ہے۔ اس پر اللہ نے نازل فرمایا اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ آپ کا دشمن ہی حقیقت میں دُم بریدہ ہے اسی کی نسل نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ عاص بن وائل کے بیٹے عمر اور ہشام تھے مگر عمر و ہشام مسلمان ہوگئے اس سے عاص کا ان سے کوئی رشتۂ والدیت قائم نہیں رہا اور عاص کو لاولد کہہ دیا گیا۔ عمر و ہشام عاص کے وارث بھی انقطاعِ رشتہ کی وجہ سے نہ قرار پائے۔ بلکہ دونوں رسول اللہ ﷺ کی اولاد ہوگئے۔ اس توضیح کی روشنی میں حدیث مذکور کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے دن میرا رشتہ اور نسب سودمند ہوگا اور سب رشتے منقطع ہوجائیں گے۔ میرا نسب و رشتہ براہِ راست ہو یا بالواسطہ۔ حاصلِ مطلب یہ کہ کافروں کا کافروں سے یا کافروں کا مؤمنوں سے رشتۂ قرابت و زوجیت منقطع ہوجائے گا اور مؤمنوں کا باہمی رشتہ سودمند ہوگا۔ اسی مضمون کو اللہ نے آیت اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ الخ میں بیان فرمایا ہے۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ﴿٢٣﴾ اور (جنت یا محلاتِ جنت کے ہر دروازے سے یا تحائف و ہدایا کی پیش کش کے) ہر دروازے سے ملائکہ ان کے پاس داخل ہوں گے۔ مقاتل نے کہا روزانہ یعنی ہر رات دن میں تین بار فرشتے ان کو تحفے اور ہدیے پیش کریں گے اور رات دن کی یہ مقدار دُنیوی شب و روز کے برابر ہوگی۔
سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو۔ یعنی جن تکالیف کا تم کو ڈر رہتا تھا۔ اب اللہ نے ان سے تم کو بچالیا اور لازوال نعمتیں عطا فرمادیں۔
بِمَا صَبَرْتُمْ تمہارے صبر کرنے کی وجہ سے یعنی گناہوں سے بچ کر نفسانی خواہشات کو روک کر طاعت پر

قائم رہنے اور مصائب کو برداشت کرنے کی وجہ سے تم کو یہ ثواب ملا ہے۔

فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ ﴿۲۴﴾ سو اس جہان میں تمہارا انجام بہت اچھا ہے۔

حضرت ابو امامہؓ کا بیان ہے کہ جنت کے اندر اپنی مسند (مسہری) پر مؤمن راحت اندوز ہوگا خادموں کی دو قطاریں اس کے سامنے ہوں گی۔ دونوں قطاروں کے سرے پر ایک بند دروازہ ہوگا دروازے پر فرشتہ اندر آنے کا طلب گار ہوگا، مؤمن اپنے قریبی خادم سے اور وہ خادم اپنے برابر والے خادم سے اور یونہی سلسلہ وار ہر خادم اپنے متصل خادم سے کہے گا کہ فرشتہ دروازہ پر خواستگار اجازت ہے۔ یہاں تک کہ آخری خادم جو دروازہ سے متصل ہوگا وہ دروازہ کھول دے گا فرشتہ اندر آکر سلام کرے گا اور واپس چلا جائے گا۔ رواہ البغوی۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت کے اندر سب سے پہلے وہ فقراء و مہاجرین داخل ہوں گے جن کے ذریعہ سے سرحدوں کی بندش ہوتی ہے اور مصائب سے بچاؤ ہوتا ہے۔ غریب دل کی خواہش دل ہی میں لے کر مر جاتے ہیں ان کی حاجت پوری نہیں ہوتی اللہ اپنی مشیّت کے مطابق فرشتوں سے فرمائے گا ان کے پاس جاؤ اور ان کو سلام کرو۔ فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے مالک ہم تیرے آسمان کے رہنے والے اور تیری مخلوق میں سب سے برگزیدہ ہیں کیا تو ہم کو حکم دے رہا ہے کہ ان کو جا کر سلام کریں، اللہ فرمائے گا یہ میرے بندے میری عبادت کرتے تھے کسی چیز کو میرا شریک نہیں قرار دیتے تھے انہی کے ذریعہ سے اسلامی سرحدوں کی بندش ہوتی تھی اور انہی کے سبب مصائب سے بچاؤ ہوتا تھا یہ ایسی حالت میں مرے کہ ان کی تمنا ان کے دلوں میں ہی رہی۔ دنیا میں ان کی حاجت پوری نہیں ہوئی، حسبُ الحکم ملائکہ ان کے پاس آئیں گے اللہ نے فرمایا يَدۡخُلُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ مِّنۡ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمۡ بِمَا صَبَرۡتُمۡ فَنِعۡمَ عُقۡبَى الدَّارِ

وَالَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ اور جو لوگ اللہ کے عہد کو پختہ کرنے کے بعد توڑ دیتے ہیں، یعنی پختہ اقرار اور قبول کرنے کے بعد پھر اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

وَيَقۡطَعُوۡنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنۡ يُّوۡصَلَ اور جس چیز کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اس کو توڑ دیتے ہیں۔

یعنی بعض کتابوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے، ماننے سے انکار کرتے ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کے درمیان تفرقہ کرتے ہیں اللہ کو مانتے ہیں اور رسول کو نہیں مانتے اور رشتہ داریاں منقطع کرتے ہیں۔

وَيُفۡسِدُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ۙ اور زمین میں بگاڑ پیدا کرتے ہیں یعنی اللہ کی نافرمانیاں کرتے ہیں، کھیتیاں تباہ کرتے اور نسل (یعنی انسانوں اور مویشیوں) کو ہلاک کرتے ہیں راستے لوٹتے ہیں اور ناحق بغاوت و ظلم کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آخرت میں جو سزا رکھی گئی ہے اس کے باوجود دنیا میں جس گناہ کی سزا اللہ کی طرف سے جلد ملنے کا استحقاق ہو جاتا ہے وہ بغاوت اور قطع رحم ہے (اس سے زیادہ جلد عذاب دنیا کو لانے والا اور کوئی گناہ نہیں) رواہ احمد والبخاری فی الادب وابوداؤد والترمذی وابن ماجۃ والحاکم وابن حبان۔ حضرت جبیر بن مطعمؓ راوی ہیں میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے ہیں رحم کو کاٹنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔ متفق علیہ۔

حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ راوی ہیں، میں نے حضورؐ کو فرماتے سنا، ان لوگوں پر اللہ کی رحمت نازل نہیں ہوتی جن میں قرابت رحم کو کاٹنے والا موجود ہو۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (احسان کر کے) احسان جتلانے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا، نہ ماں باپ کا نافرمان نہ ہمیشہ مخمور رہنے والا (نشہ کا خوگر) رواہ النسائی والدارمی۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعۡنَةُ ایسے لوگوں پر لعنت ہوگی، لعنت سے مراد ہے اللہ کی رحمت سے دور رہنا۔

وَلَهُمۡ سُوۡۤءُ الدَّارِ ﴿۲۵﴾ اور ان کے لئے اس جہان میں خرابی ہوگی یعنی دار آخرت میں ان کے لئے بُری سزا ہے۔ بُری سزا سے مراد ہے جہنم کی آگ۔

اَللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَیَقْدِرُ ؕ اللہ ہی جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کرتا ہے اور جس کا چاہتا ہے تنگ کرتا ہے۔

وَفَرِحُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ؕ اور اہلِ مکہ دنیوی زندگی پر پھولے ہوئے ہیں۔ فَرِحُوْا مغرور ہیں اتراتے ہیں۔ یعنی دنیا میں اللہ نے جو اُن کو رزق کی کشائش عطا فرمادی ہے اس پر مغرور ہیں اللہ کا شکر ادا نہیں کرتے۔

وَمَا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴿۲۶﴾ اور آخرت (کے مقابلہ) میں دُنیوی زندگی صرف ایک حقیر متاع ہے جو ہمیشہ رہنے والی نہیں، جیسے مسافر کا زادِراہ اور چرواہے کی وقتی غذا۔ دنیوی عیش و راحت قابل بھروسہ نہیں، آخرت کی فلاح و آسائش کے مقابلہ میں اس کی کوئی وقعت نہیں۔ دنیوی سرمایہ کی وسعت نا قابلِ افتخار ہے اگر اس کو نعیم آخرت کے حصول کے لئے صرف کیا جائے تو بہتر ہے ورنہ مستحقِ نفرت۔

وَیَقُوْلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ (کھلے معجزات اور واضح نشاناتِ نبوت دیکھنے کے باوجود محض عناد اور سرتابی کے زیرِ اثر (مَن مانے) معجزات اور نشانات کے یہ کافر طلبگار ہوتے ہیں) اور کہتے ہیں محمد ﷺ پر کوئی ایسی نشانی کیوں نازل نہیں ہوئی (جو ان کی صداقت کی شہادت دیتی)۔

قُلْ اِنَّ اللّٰہَ یُضِلُّ مَنْ یَّشَآءُ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے گمراہ کردیتا ہے یعنی نزولِ آیات اور قیامِ معجزات میں کوئی کمی نہیں مگر (گمراہی اور ہدایت اللہ کے قبضہ میں ہے) آیات و معجزات کا کام (راہنمائی ہے) ہدایت بخشی نہیں (ہدایت بخش تو اللہ ہے) ہدایت و گمراہی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کردیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یابی کی توفیق نہیں دیتا اور تم جیسے لوگوں کا شمار مؤخر الذکر گروہ میں ہے اس لئے ہر معجزے کے ظہور کے بعد بھی تم ہدایت یاب نہیں ہوسکتے۔

وَیَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ ﴿۲۷﴾ اور جو شخص اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس کی ہدایت کردیتا ہے یعنی اپنی اطاعتِ ایمان اور مراتبِ قُرب کے حصول اور جنت کی طرف ان لوگوں کو ہدایت کرتا ہے جن کے دل کا رخ اپنی طرف موڑنا چاہتا ہے پس جس کی توجہ کو وہ اپنی طرف پھیر دیتا ہے وہ عناد چھوڑ کر اللہ کی طرف پھر جاتا ہے۔ ایسا آدمی نازل شدہ معجزات بلکہ ان سے بھی ادنیٰ معجزہ اور ضعیف ترین نشان دیکھ کر ہی ایمان لے آتا ہے (مزید فرمائشی معجزات کے ظہور کا طلبگار ہی نہیں ہوتا)

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (اللہ کی طرف رجوع کرنے والے) وہ لوگ ہیں جو ایمان لے آئے۔

وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِکْرِ اللّٰہِ ؕ اور ان کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہوجاتے ہیں، یعنی ان کے دلوں میں ایمان و یقین جم جاتا ہے۔ ہر طرح کا شک زائل ہوجاتا ہے۔ "ذکر" سے مراد ہے قرآن اور "اطمینان" سے مراد ہے ایمان کیونکہ ایمان دلوں کا سکون ہے اور نفاق دلوں کی بے چینی یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی یاد سے شیطانی وسوسے زائل ہوجاتے ہیں (اس مطلب پر ذکر سے مراد ہوگی اللہ کی یاد۔ صرف قرآن مراد نہ ہوگا) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہر آدمی کے دل کے دو خانے ہوتے ہیں ایک خانہ میں فرشتہ کا ظہور ہوتا ہے اور دوسرے خانہ میں شیطان کا ظہور جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو سمٹ جاتا ہے اور اللہ کی یاد نہیں کرتا تو شیطان اپنی چونچ آدمی کے دل کے اندر رکھ دیتا ہے اس طرح وسوسہ پیدا ہوجاتا ہے (رواہ ابن ابی شیبۃ فی المصنف عن عبد اللہ بن شقیق ورواہ البخاری تعلیقاعن ابن عباسؓ مرفوعاً) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ان الفاظ کے ساتھ ہے آدمی کے دل پر شیطان مالش کرتا ہے جب آدمی اللہ کی یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے کو سُکڑ جاتا ہے اور جب اللہ کی یاد سے غافل ہوتا ہے تو شیطان اس کے دل میں وسوسہ ڈال دیتا ہے یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ اہلِ ایمان کے پاک و صاف دلوں کی روزی اللہ کی یاد ہے اللہ کی یاد سے ان کو چین اور سُکھ ملتا ہے جیسے مچھلیوں کو پانی میں، پرندوں کو ہوا میں اور وحشی جانوروں کو جنگل میں لیکن اگر غفلت آفریں کوئی اندرونی خیال دل میں آجاتا ہے یا اہلِ غفلت کی صحبت اثر انداز ہوجاتی ہے تو دلوں کا چین جاتا رہتا ہے بے چینی

اور عدم سکون پیدا ہو جاتا ہے جیسے پانی سے باہر مچھلی کو اور خشکی کے جانور کو پانی کے اندر اور وحشی جانوروں کو پنجرے میں اضطراب ہوتا ہے۔

صوفیہ صافیہ کے خادموں کے لئے ان حالات کا مشاہدہ بالکل بدیہی ہے ہر مُرشدِ برحق کا خدمت گزار ان حالات کو دیکھا کرتا ہے اس مطلب پر اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مراد ہوں گے پاک باطن روشن دل صوفیہ۔

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾ خوب سن لو اللہ کی یاد سے ہی (پاک صاف) دلوں کو چین ملتا ہے۔

بغوی نے اس جگہ ایک شبہ اور اس کا جواب لکھا ہے۔ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ نے دوسری آیت میں فرمایا ہے اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ بس مؤمن وہی ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور اس جگہ ذکر الٰہی مؤمن کے قلب کا اطمینان فرمایا گیا ہے۔ ایک حالت میں خوف اور اطمینان ایک دل میں کیسے جمع ہوسکتے ہیں اس شبہ کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ عذاب کے ذکر کے وقت مؤمن کا دل ڈر جاتا ہے اور ثواب کے وعدہ کے ذکر کے وقت اس کے اندر اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے اللہ کے انصاف اور عذاب سے اور چین پاتا ہے اللہ کے فضل و کرم کے ذکر سے۔ اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اطمینان و خوف میں باہم تضاد ہے (لیکن ایک حالت میں دونوں کا اجتماع نہیں ہوتا اطمینان کی حالت جدا ہوتی ہے اور خوف کی جدا)

میرے نزدیک طمانیت اور خوف میں کوئی تضاد نہیں طمانیت اُنس سے پیدا ہوتی ہے اور اُنس خوف کی حالت میں بھی ہوتا ہے بلکہ خوف و امید بھی ایک حالت میں جمع ہوسکتے ہیں حضرت انسؓ راوی ہیں کہ ایک جوان کے مرنے کے وقت رسول اللہ ﷺ اس کے پاس تشریف لے گئے اور پوچھا تجھے (اپنے دل کی) کیفیت کیا محسوس ہوتی ہے۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میں اللہ سے امید رکھتا ہوں اور اپنے گناہوں کا مجھے خوف بھی ہے۔ فرمایا ایسے موقع پر جس بندہ کے دل میں یہ دونوں باتیں جمع ہوتی ہیں اللہ ضرور اس کو اس کی امید کے مطابق عطا فرماتا ہے اور جس چیز سے اس کو خوف ہوتا ہے اس چیز سے محفوظ رکھتا ہے رواہ الترمذی و ابن ماجۃ۔ ترمذی نے اس روایت کو غریب کہا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ طُوْبٰى لَهُمْ جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کئے ان کے لئے خوشی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے طُوْبٰى کا ترجمہ کیا ہے خوشی اور خنکیٔ چشم۔ عکرمہ نے کہا ان کا مآل اچھا ہوگا۔ قتادہ نے کہا ان کے لئے بھلائی ہوگی (ان تمام مطالب پر) طُوْبٰى بروزن بُشْرٰی مصدر ہوگا۔ طاب (ماضی) یَطِیْبُ (مضارع)[1]

معمر نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے اگر تم کو کوئی بھلائی اور فائدہ حاصل ہو جائے تو دوسرا آدمی کوئی دوست تم سے کہتا ہے۔ طُوْبٰى لَكَ گویا طوبیٰ کلمہ تبریک ہے ابراہیمؒ نے کہا نیکوکار مؤمنوں کے لئے بھلائی اور عزت ہوگی۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا حبشی زبان میں طوبیٰ باغ (جنت) کو کہتے ہیں۔ بغوی کا بیان ہے کہ حضرت ابو امامہ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو درداءؓ نے فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جو تمام جنتوں پر سایہ فگن ہے۔

عبید بن عمیر نے کہا طوبیٰ جنتِ عدن کے اندر رسول اللہ ﷺ کے جنّتی مکان میں ایک درخت ہے جس کی شاخیں (مؤمن کے ہر جنّتی) مکان اور بالاخانہ پر سایہ فگن ہیں۔ سوائے سیاہ رنگ کے ہر رنگ کے ہر پھول اور ہر پھل اور ہر میوہ اللہ نے اس درخت میں پیدا کیا ہے اس کی جڑ سے دو چشمے نکلتے ہیں کافور اور سلسبیل۔

مقاتل نے کہا اس کا ہر پتہ ایک گروہ پر سایہ فگن ہے اور ہر پتہ پر ایک فرشتہ اللہ کی طرح طرح کی تسبیح بیان کرنے میں

[1] حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ کے سامنے طوبیٰ کا ذکر آیا تو فرمایا ابو بکرؓ کیا تم کو معلوم ہے کہ طوبیٰ کیا ہے حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا اللہ اور اللہ کا رسول ﷺ ہی خوب جانتے ہیں۔ فرمایا طوبیٰ جنت میں ایک درخت ہے جس کی لمبائی سے اللہ ہی واقف ہے اس کی ایک شاخ کے نیچے ستّر برس تک گھوڑا سوار چلتا رہے (تو اس کو طے نہ کرپائے) الخ (ازالۃ الخفاء)

مشغول ہے۔

احمد، ابن حبان، طبرانی، ابن مردویہ، اور بیہقی نے حضرت عتبہ بن عبداللہ سلمیؓ کا بیان نقل کیا کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ کیا جنت کے اندر پھل ہوں گے فرمایا ہاں وہاں ایک درخت ہوگا طوبیٰ جو فردوس کے مطابق ہوگا (شاید مطابق ہونے سے یہ مراد ہے کہ پوری جنتِ فردوس پر چھایا ہوا ہوگا) سائل نے عرض کیا ہماری زمین کے کس درخت سے اس کی مشابہت ہو سکتی ہے فرمایا تیری اس زمین کے کسی درخت سے اس کی مشابہت نہیں، کیا تو شام کو گیا ہے سائل نے جواب دیا نہیں، فرمایا شام میں ایک درخت ہوتا ہے جو طوبیٰ سے کچھ مشابہت رکھتا ہے اس درخت کو اخروٹ کا درخت کہتے ہیں اس کا ایک تنہ ہوتا ہے اور اوپر جا کر اس کی شاخیں پھیل جاتی ہیں۔ سائل نے کہا وہ کتنا بڑا ہوگا فرمایا اگر تو اپنے گھر والوں کے اونٹوں کا گلہ لے کر اس کی جڑ کے گرداگرد گھومے تو اگر تو بوڑھا ہو جائے اور بوڑھا ہو کر گر پڑے تب بھی اس کی جڑ کا دورہ پورا نہ ہوگا۔ سائل نے عرض کیا، کیا اس میں انگور بھی ہوں گے فرمایا ہاں عرض کیا ان کا خوشہ کتنا بڑا ہوگا فرمایا چت کبرے کوّے کی ایک ماہ کی رفتار اُڑان کے برابر، عرض کیا اس کا ایک دانہ کتنا بڑا ہوگا فرمایا کیا تیرے باپ نے کوئی بڑا بکرا کبھی ذبح کیا ہے۔ عرض کیا جی ہاں، فرمایا کیا اس کی کھال اتار کر تیری ماں کو دے کر یہ کہا تھا کہ اس کی دباغت کر کے ایک بڑا ڈول اس کا بنا لینا جس میں پانی بھر کر ہم اپنے جانوروں کو پلایا کریں گے۔ سائل نے عرض کیا تو (اس سے اندازہ یہ ہوا کہ) اس کا ایک دانہ میرے اور میرے گھر والوں کا پیٹ بھر دے گا فرمایا ہاں اور تیرے سارے کنبہ کا بھی۔

حضرت ابو سعید خدریؓ راوی ہیں کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا طوبیٰ کیا ہے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس کا پھیلاؤ سو سال کی رفتار کے برابر ہے اہلِ جنت کے کپڑے اس کے شگوفوں سے برآمد ہوں گے۔ رواہ ابن حبان۔

معاویہ بن قرّہ نے اپنے باپ کی مرفوع روایت سے بیان کیا ہے کہ طوبیٰ ایک درخت ہے جس کو اللہ نے اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اس کے اندر اپنی روح سے پھونکا اس درخت سے زیور اور کپڑے پیدا ہوں گے اور اس کی شاخیں حصارِ جنت کے باہر سے دکھائی دیں گی۔

بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جنت کے اندر ایک درخت ہے جس کے سایہ میں گھوڑا سوار سو برس تک چلتا رہے تب بھی قطع نہ کر سکے اگر تم اس کا ثبوت چاہتے ہو تو پڑھو وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (متفق علیہ) امام احمد نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد اتنا زائد بیان کیا کہ اس کے پتے جنت کو ڈھانک لیں گے۔

نہاد بن سری نے الزہد میں، بغوی نے تفسیر میں آخر میں اتنا اور بھی بیان کیا کہ اس بیان کی اطلاع کعب کو پہنچی تو انہوں نے کہا یہ سچ ہے قسم ہے اس خدا کی جس نے موسیٰ پر تورات اور محمد ﷺ پر قرآن نازل کیا اگر کوئی شخص سہ سالہ یا چہار سالہ اونٹ پر سوار ہو کر اس درخت کے تنہ کے گرداگرد چکر لگائے تو دورہ پورا نہ کر سکے یہاں تک کہ عمر ختم ہو جائے اور پیر فرتوت ہو کر گر پڑے، اللہ نے اس کو اپنے ہاتھ سے بویا ہے اور اپنی روح اس میں پھونکی ہے اس کی شاخیں جنت کے باہر سے نظر آئیں گی (یعنی پوری جنت پر وہ سایہ فگن ہوگا) جنت کے ہر نہر اسی درخت کی جڑ سے نکلتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے کہ جنت میں ایک درخت ہے جس کو طوبیٰ کہا جاتا ہے اللہ اس سے فرمائے گا میرا بندہ جو کچھ چاہتا ہے تو شگفتہ ہو اپنے اندر سے اس چیز کو برآمد کر دے۔ حسبُ الحکم درخت پھٹے گا اور اس کے اندر سے بندہ کی خواہش کے مطابق گھوڑا زین اور لگام پورے ساز سمیت برآمد ہو جائے گا اور بندہ کی خواہش کے مطابق اونٹنی اپنے کجاوے، نکیل اور سامان سمیت برآمد ہو جائے گی اور کپڑے بھی چٹکر اس درخت سے نکلیں گے۔ رواہ البغوی و ابن ابی الدنیا، ابن مبارک اور ابن جریر نے شہر بن حوشب کا قول نقل کیا ہے کہ طوبیٰ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ جنت کا ہر درخت اسی سے پیدا ہے اس کی شاخیں حصارِ جنت سے باہر دکھائی دیں گی۔

وَحُسْنُ مَاٰبٍ ﴿۲۹﴾ اور اچھا انجام ہے، ماب پلٹنے کی جگہ۔

كَذٰلِكَ اَرْسَلْنٰكَ فِيْٓ اُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَآ اُمَمٌ لِّتَتْلُوَاۡ عَلَيْهِمُ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ

اسی طرح (یعنی دوسرے پیغمبروں کی طرح) ہم نے آپ کو بھی ایک امت میں بھیجا ہے جس سے پہلے دوسری امتیں گزر چکی ہیں (جن کی طرف دوسرے پیغمبروں کو بھیجا تھا مطلب یہ کہ آپ کی پیغمبری کوئی انوکھی چیز نہیں ہے) تاکہ جو قرآن ہم نے آپ کو وحی کے ذریعہ دے دیا ہے اس کو پڑھ کر آپ ان کو سنائیں۔

وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ ۭ مگر ان کی حالت یہ ہے کہ یہ رحمٰن کی ناشکری کرتے ہیں۔ "رحمٰن" بہت زیادہ رحمت والا جس کی نعمت سب کو گھیرے ہوئے ہے اور ہر چیز کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اللہ کا ان پر بہت بڑا انعام یہ ہے کہ اس نے آپ کو ان کے اندر رسول بنا کر بھیجا، قرآن نازل فرمایا جو تمام دینوی و اخروی منافع کا خزانہ ہے۔ مگر یہ لوگ ناشکرے ہیں اتنی بڑی نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کرتے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قتادہ، مقاتل اور ابن جریج نے بیان کیا کہ اس آیت کا نزول صلح حدیبیہ کے سلسلے میں ہوا (یعنی یہ آیت مدنی ہے) ابن جریر، ابن ابی حاتم اور ابوالشیخ نے بھی قتادہ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ اس کی توضیح اس طرح ہے کہ جب قریش اور صحابہ کا صلح نامہ لکھنے پر اتفاق ہو گیا اور سہل بن عمرو قریش کی طرف سے آ گیا۔ سورۃ الفتح میں تفصیل کے ساتھ ہم نے لکھ دیا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا، لکھو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، قریش بولے ہم تو الرحمٰن کو نہیں جانتے ہم تو صرف یمامہ والے رحمٰن (یعنی مسیلمہ کذاب) کو جانتے ہیں (ہم اللہ کو رحمٰن نہیں کہتے) تم وہی لکھو جو پہلے لکھتے تھے۔ یعنی باسمک اللھم (سے تحریر شروع کرو) هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ کا یہی مطلب ہے (یعنی یہ لوگ اللہ کے رحمٰن ہونے کا انکار کرتے ہیں)

بغویؒ نے لکھا ہے (عام اہل تفسیر میں) مشہور ہے کہ یہ آیت مکی ہے ابو جہل وغیرہ کے حق میں نازل ہوئی حجر اسود کے پاس رسول اللہ ﷺ دعا میں یا اللہ یا رحمٰن فرما رہے تھے ابو جہل نے یہ لفظ سن پایا فوراً مشرکوں سے جا کر کہا محمدؐ دو معبودوں کو پکار رہے تھے اللہ کو اور رحمٰن کو اور ہم تو یمامہ والے رحمٰن کے علاوہ کسی اور رحمٰن سے واقف نہیں (پھر وہ رحمٰن کونسا ہے جس کو محمدؐ پکار رہے تھے) اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى

ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہ آیت کفار قریش کے حق میں نازل ہوئی جب کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا تھا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو، کافروں نے جواب میں کہا رحمٰن کیا چیز ہے۔

قُلْ هُوَ رَبِّيْ آپ کہہ دیجئے وہی میرا رب ہے یعنی جس رحمٰن کو جاننے کے تم منکر ہو وہی میرا خالق اور کارساز ہے۔

لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ مَتَابِ ﴿۳۰﴾ سوائے اس کے اور کوئی مستحق عبادت نہیں، اسی پر میرا بھروسہ ہے (وہی تمہارے مقابلے میں میری مدد کرے گا) اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے وہی مجھے ثواب دے گا۔

طبرانی وغیرہ نے حضرت ابن عباسؓ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تم جو کچھ کہہ رہے ہو اگر وہ صحیح ہے تو ہمارے مُردہ اسلاف کو ہم سے ملا دو تاکہ ہم ان کو دیکھیں اور ان سے باتیں کریں (اور وہ تمہاری تصدیق کریں، مترجم) اور مکہ کے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے ہٹا کر) پھیلا دو اس زمین کو کشادہ کر دو۔ اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اگر قرآن کے ذریعہ سے پہاڑوں کو چلا دیا جائے (جگہ سے ہٹا کر پھیلا دیا جائے)

ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ نے عطیہ عوفی کا بیان نقل کیا ہے کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا اگر مکہ کے پہاڑوں کو یہاں سے چلا دیں کہ میدان نکل آئے اور ہم اس میں کھیتی کریں یا جس طرح ہوا کے ذریعہ سے سلیمان قطع مسافت کرتے تھے اور قوم کو ہوا کے دوش پر قطع مسافت کراتے تھے آپ بھی ہمارے لئے ایسا ہی کر دیتے یا جس طرح عیسیٰؑ مُردوں کو

زندہ کر دیتے تھے آپ بھی ہمارے مُردوں کو زندہ کر دیتے (تو ہم ایمان لے آتے) اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔ بغوی نے تفصیل کے ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ آیت مذکورہ چند مشرکوں کے حق میں نازل ہوئی۔ جن میں ابو جہل بن ہشام اور عبداللہ بن امیہ بھی شامل تھے، وہاں سے عبداللہ بن امیہ نے ایک شخص کی زبانی یہ کہلوایا کہ اگر آپ ہم کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں تو قرآن کے ذریعے سے مکہ کے پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دیجئے تاکہ کشائش پیدا ہو جائے ہماری کھیتی کے لئے اس وقت زمین تنگ ہے اور یہاں چشمے اور نہریں بھی نکال دیجئے تاکہ ہم درخت لگائیں کھیتیاں بوئیں اور باغ تیار کریں۔ آپ اپنے دعوے کے اعتبار سے اللہ کے نزدیک داؤدؑ سے کم مرتبہ تو نہیں ہیں آپ کہتے ہیں کہ داؤدؑ کے لئے پہاڑ رواں کر دیئے گئے تھے جو اُن کے ساتھ مل کر اللہ کی پاکی بیان کرتے تھے آپ ہوا کو بھی ہمارا تابع بنا دیجئے کہ ہم غلہ کو حاصل کرنے اور دوسری ضروریات کو فراہم کرنے کے لئے جو شام کو جاتے ہیں ہوا پر چلے جایا کریں اور ہم روز لوٹ آیا کریں۔ آخر آپ کا قول ہے کہ ہوا کو سلیمانؑ کے زیر حکم کر دیا گیا تھا اور آپ کا یہ بھی خیال ہے کہ عیسیٰؑ مُردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے اور خدا کے نزدیک آپ کا مرتبہ (بقول آپ کے) عیسیٰؑ سے کم نہیں ہے لہٰذا آپ اپنے دادا قصی یا ہمارے مُردوں میں سے کسی کو زندہ کر دیجئے تاکہ ہم اس سے آپ کے معاملہ میں دریافت کریں کہ آپ کا دعویٰ نبوت صحیح ہے یا غلط۔ اس پر آیت مذکورہ نازل ہوئی۔

ابو یعلیٰ نے مسند میں حضرت زبیر بن عوامؓ کے حوالہ سے بھی حدیث مذکورہ کے ہم معنیٰ حدیث نقل کی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآن یعنی کسی آسمانی کتاب کے ذریعے سے اگر پہاڑ رواں کئے جاسکتے ہیں ان کی جگہ سے ان کو ہٹایا جاسکتا ہے۔

اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ یا کسی آسمانی کتاب کے ذریعہ سے زمین طے کی جاسکتی ہے یعنی اللہ ہوا کو تابع حکم بنا سکتا ہے اور لوگ دوش ہوا پر سوار ہو کر قطع مسافت کر سکتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اگر کسی آسمانی کتاب کے ذریعے سے زمین پھاڑی جاسکتی ہے اور اس سے چشمے اور نہریں نکالی جاسکتی ہیں۔

اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى یا اس کے ذریعہ سے مردوں سے کلام کیا جاسکتا ہے یعنی مردے زندہ ہو کر کلام کر سکتے ہیں۔ اَلْمَوْتٰى سے مراد قصی وغیرہ ہیں شرط کا جواب محذوف ہے یعنی امور مذکورہ میں سے کوئی امر کسی آسمانی کتاب سے سر انجام پانا ممکن ہو سکتا تو اللہ قرآن کے ذریعہ سے بدرجۂ اولیٰ ایسا کر دیتا مگر اللہ نے ایسا نہیں کیا۔

یا یہ مطلب ہے کہ اگر امور مذکورہ قرآن کی ذریعہ سے کر بھی دیئے جاتے تب بھی یہ لوگ ایمان نہ لاتے۔ اسی مؤخر الذکر مضمون کو آیت ذیل میں ادا کیا ہے۔ وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى الخ اگر ہم فرشتوں کو اتار کر ان کے پاس بھیج دیتے اور مُردے ان سے کلام کرتے اور ہر چیز کو جمع کر کے ان کی سامنے لے آتے (اور سب توحید و رسالت کی شہادت دیتے) تب بھی یہ ماننے والے نہ تھے۔ بعض نے کہا کہ جواب شرط مقدم ہے وَهُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ جواب شرط ہے اور درمیانی کلام جملہ معترضہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے گویا مطلب یہ ہے کہ اگر قرآن کے ذریعہ سے پہاڑ بھی رواں کر دیتے تب بھی یہ کفر ہی کرتے ایمان نہ لاتے کیونکہ ان کے لئے بدبختی لکھ دی گئی ہے ان کافروں کا مبدء تعین اللہ کے اسم مُضِلّ کا پَرتو ہے ان کو ہدایت کیسے مل سکتی ہے۔

بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا بلکہ سارا اختیار خاص اللہ ہی کو ہے۔

اس جملہ سے پہلے کچھ کلام محذوف ہے جو عبارت کی رفتار سے سمجھ میں آرہا ہے پورا کلام اس طرح تھا کہ کافروں کی فرمائشوں کا پورا نہ کیا جانا اس وجہ سے نہیں ہے کہ اللہ ایسا کرنے پر قدرت نہیں رکھتا بلکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ان کی فرمائشیں بلکہ ہر امر کر سکتا ہے مگر اللہ ایسا چاہتا نہیں کیونکہ اس کو علم ہے کہ یہ لوگ اس کے بعد بھی ایمان نہیں لائیں گے خواہ کوئی سی بھی نشانی ان کو نظر آجائے یا اس لئے یہ فرمائشی معجزات اللہ ظاہر نہیں کرتا کہ ان کو ہدایت یاب کرنا نہیں چاہتا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ بعض صحابہؓ نے جب مذکورہ بالا معجزات کی درخواست سنی تو ان کی بھی خواہش ہوئی کہ اللہ یہ فرمائشیں پوری کر دے تو

بہتر ہے یہ کافر لوگ اسی طرح سے ایمان لے آئیں (تو مناسب ہے) اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اَفَلَمۡ یَایۡـَٔسِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا کیا (ان کافروں کے ایمان لانے سے) اہلِ ایمان ابھی ناامید نہیں ہوئے باوجودیکہ ان معجزات سے بڑھ چڑھ کر یہ کافر معجزات دیکھ چکے پھر بھی ایمان نہ لائے چاند پھٹنے کا معجزہ انہوں نے دیکھا پھر بھی تصدیق نہیں کی، کنکریوں کا کلام کرنا انہوں نے دیکھ لیا اور ایمان نہ لائے، پہاڑوں کے رواں کرنے اور دوشِ ہوا پر قطعِ مسافت کرنے سے تو چاند کے پھٹنے کا معجزہ زیادہ مؤثر ہونا چاہئے اور مُردوں کے کلام کرنے سے کنکریوں کا بولنا زیادہ مشکل ہے، جب یہ معجزات ان کو قبولِ ایمان پر آمادہ نہ کرسکے تو فرمائشی معجزات کی تکمیل کیا ایمان بخش ہوسکتی ہے۔

اَنۡ لَّوۡ یَشَآءُ اللّٰہُ لَہَدَی النَّاسَ جَمِیۡعًا ؕ کہ اگر اللہ چاہتا تو تمام دنیا کے آدمیوں کو ہدایت کردیتا۔

اس کلام کا تعلق ایک محذوف لفظ سے ہے۔ یعنی یہ جانتے ہوئے بھی اہلِ ایمان کافروں کے ایمان لانے سے ناامید نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت کردے یا یہ مطلب ہے کہ مؤمنوں کا ایمان ہے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو مؤمن بنادے اس ایمان کے باوجود کیا مؤمن ان کافروں کے ایمان دار بن جانے کی امید رکھتے ہیں ابھی ناامید نہیں ہوئے۔

اکثر اہلِ تفسیر نے لکھا کہ لَمۡ یَایۡـَٔسۡ کا معنی ہے لَمۡ یَعۡلَمۡ یعنی کیا اہلِ ایمان نہیں جانتے کہ اگر اللہ چاہے تو سب لوگوں کو ہدایت یاب کردے۔

کلبی نے کہا قبیلۂ نخع کے محاورے میں یَاسٌ بمعنی علم آتا ہے بعض لوگوں نے ان کو بنی ہوازن کا محاورہ قرار دیا ہے یعنی ہوازن والے یَاسٌ کو علم کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ فراء نے اس کا انکار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ کسی عرب سے یَاسٌ کا معنی علم نہیں سنا گیا یَئِسۡتُ بمعنی عَلِمۡتُ نہیں آتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اَیاسٌ کو مجازاً بمعنی علم قرار دیا جائے۔ علم کا نتیجہ کبھی ناامیدی ہوتا ہے۔ مسبّب بول کر سبب مراد لیا جاسکتا ہے جس چیز سے مایوسی ہو وہ مجہول نہیں ہوتی یقیناً معلوم ہوتی ہے لَمۡ یَیۡـَٔسۡ کو لَمۡ یَعۡلَمۡ کے معنی میں لینے کی ضرورت اس وجہ سے پڑی کہ اسی آیت میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے بموجب لَمۡ یَیۡـَٔسۡ کی جگہ لَمۡ یَتَبَیَّنۡ آیا ہے اور لَمۡ یَتَبَیَّنۡ کا معنی ہے لَمۡ یَعۡلَمۡ گویا لَمۡ یَتَبَیَّنۡ، لَمۡ یَایۡـَٔسۡ کی تفسیر ہے۔

وَلَا یَزَالُ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا تُصِیۡبُہُمۡ بِمَا صَنَعُوۡا قَارِعَۃٌ اور یہ مکہ کے کافر تو ہمیشہ آئے دن اس حالت میں رہتے ہیں کہ ان کے (بد) کردار کے سبب ان پر کوئی نہ کوئی حادثہ پڑتا رہتا ہے۔

قارعۃ سے مراد ہے کوئی مصیبت، بلاء، آفت خواہ بصورتِ قحط ہو یا بصورتِ قید و قتل پامال کی تباہی اور غارت گری ہو یعنی کفر و بداعمالی کی وجہ سے ان کافروں پر کوئی نہ کوئی آفت آتی رہے گی حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قَارِعَۃ سے مراد ہیں وہ فوجی دستے جو رسول اللہ ﷺ کافروں پر بھیجتے رہتے تھے۔

اَوۡ تَحُلُّ قَرِیۡبًا مِّنۡ دَارِہِمۡ حَتّٰی یَاۡتِیَ وَعۡدُ اللّٰہِ ؕ یا ان کی بستی کے قریب نازل ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آجائے گا۔ یعنی فوجی دستے یا کوئی دوسری آفت اگر براہِ راست ان پر نہیں آئے گی تو ان کی بستیوں کے قریب کسی جگہ آتی رہے گی اور اس کی چنگاریاں اڑ کر ان پر بھی پڑتی رہیں گی۔ بعض نے کہا تَحُلُّ مخاطب کا صیغہ ہے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے۔ یعنی آپ خود ان کی بستیوں کے قریب جاکر اتریں گے۔ چنانچہ حضور ﷺ حدیبیہ میں جاکر اترے تھے۔ مؤخر الذکر قول اور ابن عباسؓ کی تشریح پر آیت کا نزول کفارِ مکہ کے متعلق مانا جائے گا۔ اگر آیت میں کفارِ مکہ مراد ہوں تو وَعۡدُ اللّٰہِ سے مراد فتح ہوگی اور اگر آیت عموم پر رکھی جائے تو وعدُ اللہ سے مراد موت یا قیامت ہوگی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُخۡلِفُ الۡمِیۡعَادَ ﴿۳۱﴾ یہ حقیقت ناقابلِ شک ہے کہ اللہ وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ اللہ کے کلام میں کذب اور وعدہ کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔ ع ۵ ۱۰

وَلَقَدِ اسۡتُہۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ قَبۡلِکَ (یعنی جس طرح یہ کافر آپ سے استہزاء کرتے ہیں اسی طرح) آپ سے پہلے پیغمبروں سے کافروں کی طرف سے استہزاء کیا جاچکا ہے۔

فَاَمْلَيْتُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا پھر میں نے کافروں کو ڈھیل دی۔
الملوۃ کا معنی ہے لمبی مدت، طویل زمانہ۔ ملوانِ رات دن کو امتداد کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ حقیقت میں رات دن ملوان نہیں ہیں ملوہ کا حقیقی معنی تو مدت ہے ایک شاعر کا قول ہے۔

نہار ولیل دائم ملوھما علی کل حال المرء یختلفان

رات اور دن کی مدت بہر حال آتی جاتی ہے۔ آدمی کا کوئی حال ہو اچھا یا بُرا ملو کی ھُما کی طرف اضافہ بتا رہی ہے کہ ملو (بمعنی مدت ہے) بعینہ رات دن اس کا معنی نہیں ہے۔ اس تنقیح کی بنا پر اُمْلِيْتُ کا ترجمہ ہوا، میں نے بغیر عذاب دیئے ان کو چھوڑے رکھا ڈھیل دی۔
ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۫ فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ ۝۳۲ آخر میں نے (عذاب میں) ان کو دھر پکڑا پس (دیکھو) میرا عذاب کیسا برمحل واقع ہوا اسی طرح جو لوگ آپ سے استہزاء کرتے ہیں ان کے ساتھ بھی میں یہی سلوک کروں گا۔
اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۚ بھلا وہ اللہ جو شخص کے اچھے برے تمام اعمال کا نگراں ہے اس مخلوق کی طرح ہو سکتا ہے جو اللہ کی طرح علم نہیں رکھتی یعنی اللہ ہر عمل سے واقف ہے اس لئے کسی عمل کا بدلہ اس کی طرح سے فوت نہیں ہوگا۔ ہمزہ سوالیہ ہے اور فا عاطفہ اور معطوف علیہ محذوف ہے پورا کلام اس طرح تھا کیا تم اللہ کے ساتھ بتوں کو شریک قرار دیتے ہو اور جو ذات ہر شخص کے ہر عمل کی نگراں ہے اس کو بے خبر، جماد، عاجز کی طرح سمجھتے ہو۔
وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ ۭ اور بنا رکھے ہیں انہوں نے اپنے گمان میں اللہ کے ساجھی۔ اس جملہ کا عطف كَسَبَتْ پر ہے اگر مَا کو مصدری کہا جائے یا کلام محذوف پر ہے یعنی وہ اللہ کو ایک نہیں کہتے اور استحقاقِ معبودیت میں دوسروں کو اللہ کا شریک بنا رکھا ہے۔
قُلْ سَمُّوْهُمْ ۭ آپ ان سے کہیے کہ ان شریکوں کے اوصاف تو بیان کرو اور پھر غور کرو کہ کیا وہ مستحقِ معبودیت اور قابلِ شرکت ہو سکتے ہیں۔
اَمْ تُنَبِّئُوْنَهٗ بِمَا لَا يَعْلَمُ فِي الْاَرْضِ یا اللہ کو تم ایسی بات بتا رہے ہو جس سے وہ ساری زمین میں واقف نہیں۔ یعنی جو چیز ہے یا ہونے والی ہے، اللہ تو سب سے واقف ہے مگر اس کو ایسی کوئی ہستی معلوم نہیں جو استحقاقِ عبادت میں اس کی شریک ہو۔ پس کیا تم بتوں کے وہ اوصاف بتا سکتے ہو جن کی وجہ سے وہ مستحقِ عبادت ہو سکیں۔ اور ایسے شریکوں کی صفات بیان کر سکتے ہو جو مستحقِ عبادت قرار پا سکیں۔
اَمْ بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ ۭ یا (بتوں کو تم اللہ کا شریک) صرف ظاہری طور پر کہتے ہو۔ سطحی طور پر یونہی سُن سنا کر زبان سے کہہ دیتے ہو جس کی واقع میں کوئی حقیقت نہیں۔ جیسے حبشی کا نام کافور رکھ دیا جاتا۔ بعض اہلِ تفسیر نے بِظَاهِرٍ مِّنَ الْقَوْلِ کا ترجمہ کیا ہے باطل قول، غلط بات۔
بَلْ زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَكْرُهُمْ بلکہ کافروں کو اپنے مغالطہ کی باتیں مرغوب معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی شیطان نے ان کی فریب کاری اور مکر سازی کو ان کی نظر میں آراستہ کر دیا ہے (دلکش اور فائدہ آگیں بنا رکھا ہے) اس لئے وہ اپنی غلط جھوٹی باتوں اور فریب کاریوں کے تخیل میں مست ہیں۔
وَصُدُّوْا عَنِ السَّبِيْلِ ۭ اور صحیح راستہ سے ان کو روک دیا گیا ہے یعنی دین کی راہ سے اللہ نے ان کو پھیر دیا ہے اور شیطان نے ان کو بہکا دیا ہے۔
وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝۳۳ اور جس کو بے مدد چھوڑ کر اللہ گمراہ کر دے اس کو صحیح راستے پر ڈالنے والا ہدایت کی توفیق دینے والا کوئی نہیں۔
لَهُمْ عَذَابٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا دنیوی زندگی میں ان پر عذاب مسلّط ہے یعنی قتل ہونا قید ہونا اور جزیہ ادا

کرتا۔

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَقُّ ۚ اور آخرت کا عذاب تو دنیوی عذاب سے زیادہ سخت اور دوامی اور بلاشبہ موجود ہی ہے (جس میں یہ گرفتار ہوں گا)

وَمَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۳۴﴾ اور ان کو اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہیں۔

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ جس جنت کا پرہیزگاروں سے وعدہ کیا گیا ہے۔ اس کی حالت یہ ہے یعنی جنت کی خوبی اور نُدرت کی حالت وہ ہے جو آئندہ بیان کی جارہی ہے۔ سیبویہ نے کہا مَثَلُ الْجَنَّةِ مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے یعنی جنت کی حالت وہ ہے جو آگے بیان کی گئی ہے۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ وہ ایسی جنت ہے جس کے درختوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔

اُكُلُهَا دَآئِمٌ اس کے پھل ہمیشہ ہوں گے کبھی منقطع نہ ہوں گے۔

بزار اور طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ثوبانؓ نے فرمایا، میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے جنت والوں میں سے جو شخص بھی جنت کا کوئی پھل لے گا فوراً اس کی جگہ ویسا ہی دوسرا پھل دوبارہ آجائے گا۔

فرقہ جہمیہ قائل ہے کہ جنت کی راحت فناپذیر ہے آیت مذکورہ اور حدیث سے اس فرقہ کے قول کی تردید ہو رہی ہے۔

وَّظِلُّهَا ؕ اور اس کا سایہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ یعنی ہمیشہ رہے گا دنیا میں سایہ دھوپ کی وجہ سے معدوم ہو جاتا ہے۔ جنت میں سایہ اس طرح نہ ہوگا۔

بیہقی نے شعیب بن جیحان کا قول نقل کیا ہے۔ شعیب نے کہا میں اور ابوالعالیہ ریاحی سورج نکلنے سے پہلے نکلے (سہانا وقت دیکھ کر) ابوالعالیہ نے کہا مجھے بتایا گیا ہے کہ جنت کا وقت ایسا ہی ہوگا پھر انہوں نے آیت وَظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ تلاوت کی۔

تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖ یہ جنت پرہیزگاروں کے لئے جزا ہوگی یا ان کا انجام اور آخری نتیجہ بصورتِ جنت ہوگا۔

وَّعُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾ اور کافروں کا بُرا انجام دوزخ ہے۔ عُقْبٰى کا معنی اس جگہ اگر جزا اچھا انجام قرار دیا جائے تو اس لفظ کا استعمال بطور استعارہ ہوگا جیسے آیت هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ میں لفظ ثواب اور آیت وَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ میں لفظ "بشارت" آیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے۔ اس سے مراد یا تمام صحابہؓ ہیں یا یہودیوں اور عیسائیوں میں سے وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو گئے تھے۔ جیسے حضرت عبد اللہ بن سلامؓ اور آپ کے ساتھی اور حبش کے عیسائی مسلمان۔

یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وہ اس قرآن سے خوش ہوتے ہیں جو آپ پر اُتارا گیا ہے کیونکہ قرآن ان کی سابق کتابوں کے موافق ہے۔

وَمِنَ الْاَحْزَابِ اور ان گروہوں میں سے یعنی کافروں میں سے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف جتھا بندی کرلی تھی یا ان یہودی اور عیسائیوں میں سے جو مسلمان نہیں ہوئے تھے جیسے کعب بن اشرف اور اسید اور عاقب وغیرہ۔

مَنْ یُّنْكِرُ بَعْضَهٗ ؕ وہ لوگ ہیں جو قرآن کے کچھ حصہ کا انکار کرتے ہیں۔ یعنی اس حصہ کا انکار کرتے ہیں جو ان کی خواہشات یا ان کی شریعتوں کے موافق نہیں ہوتا۔

بغوی نے لکھا ہے بعض لوگوں کا قول ہے کہ الرَّحْمٰنُ کا لفظ قرآن مجید میں کم آیا تھا جب حضرت عبد اللہ بن سلامؓ اور آپ کے ساتھی مسلمان ہو گئے اور قرآن میں الرَّحْمٰن کا ذکر انہوں نے کم پایا تو یہ چیز ان کو کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی۔ کیونکہ توریت میں تو یہ لفظ بکثرت آیا ہے اس کے بعد جب بار بار یہ لفظ قرآن میں آیا تو ان کو اس سے خوشی ہوئی۔ اس پر یہ آیت نازل

ہوئی۔

بعض علماء تفسیر کے نزدیک وَمِنَ الْاَحْزَابِ مَنْ یُّنْکِرُ بَعْضَهٗ میں منکرین سے مکہ کے مشرک مراد ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صلح نامہ میں جب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھوائی تو مشرکین کہنے لگے ہم تو رحمٰنِ یمامہ (مسیلمۂ کذاب) کے علاوہ کسی اور رحمٰن سے واقف نہیں۔ اس پر آیت وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ اور آیت هُمْ يَكْفُرُوْنَ بِالرَّحْمٰنِ نازل ہوئی۔ بَعْضَهٗ کا لفظ بتا رہا ہے کہ مشرکین لفظ اللہ کے ذکر کا انکار نہیں کرتے تھے، بلکہ الرحمٰن کا لفظ ذکر کرنا ان کو گوارا نہ تھا۔

قُلْ اِنَّمَاۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ وَلَاۤ اُشْرِكَ بِهٖ ؕ اے محمد ﷺ آپ کہہ دیجئے مجھے تو بس یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں اللہ کی بندگی کروں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ قرار دوں۔ اگر یہ قول پیش کرنے کا حکم منکرینِ اہل کتاب عیسائی اور یہودی کے مقابلہ میں ہے تو آیت کا مطلب اس طرح ہوگا کہ آپ کہہ دیجئے جو قرآن مجھ پر نازل ہوا اور جو وحی مجھ پر بھیجی گئی ہے اس میں مجھے اللہ کی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ دین کا مرکزی ستون یہی ہے تم لوگ بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ باقی تمہاری شریعتوں سے میرے شرعی احکام کا مختلف ہونا سو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تمام آسمانی کتابیں اور شریعتیں، جزئی احکام میں باہم اختلاف رکھتی ہیں ایک دوسری کا نسخ کرتی چلی آئی ہیں۔

اگر آیت کو عام کافروں کے حق میں قرار دیا جائے گا تو مطلب اس طرح ہوگا۔ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ اللہ کی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اللہ کو اللہ، رحمٰن، رحیم کے مختلف ناموں سے پکارنا توحید کے خلاف نہیں۔ لفظ رحمٰن کا انکار بے حقیقت ہے (شاید مشرکوں کو لفظ رحمٰن سے اس لئے چڑ تھی کہ ان کی صلاحیت واستعداد میں رحمتِ الٰہی کی قابلیت ہی نہیں تھی)

اِلَیْهِ اَدْعُوْا وَاِلَیْهِ مَاٰبِ ﴿۳۶﴾ اسی کی طرف میں لوگوں کو بلاتا ہوں اور اسی کی طرف میرا رجوع ہے نہ کسی دوسرے کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں نہ کسی اور کی طرف میرا رجوع ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ؕ اور ..... جس طرح ہم نے گزشتہ قوموں کے انہیں کی زبانوں میں کتابیں نازل کیں ..... اسی طرح ہم نے اس قرآن کو عربی زبان میں (تمام معاملات، عبادات، حِلت وحُرمت وغیرہ کا) فیصلہ بنا کر اتارا ہے۔ تاکہ تمہارے اور تمہاری قوم کے لئے اس کو سمجھنا سمجھانا آسان ہو۔

وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا وَاقٍ ﴿۳۷﴾ ع ۵ ۱۱

اور آپ کے پاس علم پہنچ جانے (یعنی قرآن نازل ہونے) کے بعد اگر آپ ان کی خواہشات پر چلیں گے تو اللہ کے عذاب وگرفت سے آپ کو بچانے والا اور مدد کرنے والا کوئی نہیں۔ یعنی کوئی ایسا مددگار اور حامی نہ ملے گا جو اللہ کے عذاب سے بچا سکے۔

روایت میں آیا ہے کہ یہودیوں نے کہا تھا اس شخص کا مطمح نظر تو صرف عورتیں ہیں (یعنی یہ شخص نفس پرست اور عورتوں کا شیفتہ وفریفتہ ہے) اس پر آیتِ ذیل نازل ہوئی۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ؕ اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آپ سے پہلے بہت پیغمبر بھیجے (جو فرشتے نہ تھے آپ کی طرح آدمی تھے) اور ہم نے ان کے لئے بیویاں اور اولاد (نرو مادہ) مقرر کیں (جیسے آپ کو عطا کی گئیں)۔

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِیَ بِاٰيَةٍ اور کسی رسول کے اختیار میں نہیں (نہ کسی رسول کے لئے جائز ہے) کہ کوئی آیت (معجزہ اور حکم جو اس سے طلب کیا جائے وہ خود) لے آئے (کیونکہ سب پیغمبر بندے ہیں کوئی رب نہیں)۔

اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ ہاں اللہ کے حکم (اور اجازت) سے۔ (وہ معجزات اور احکام پیش کرتے تھے)۔

لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ۝۳۸ ہر مدت (اور ہر چیز کے وقت) کے لئے (اس کی طرف سے ازل میں) ایک مقرر تحریر ہے (اسی تحریر میں ہر چیز کی ابتدا اور انتہا لکھی ہوئی ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ازل میں لکھ دیا ہے کہ زید فلاں وقت پیدا ہوگا اور اتنی مدت تک زندہ رہے گا۔ کافر ہوگا یا مؤمن وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح قرآن کی ہر آیت کے نزول اور ہر معجزے کے ظہور کو بھی اللہ نے لکھ دیا ہے کہ فلاں وقت نزول یا ظہور ہوگا۔ لوگ خواہ کتنی بھی طلب میں عجلت کریں مگر وقتِ مقرر سے پہلے کوئی بات نہیں ہوسکتی۔

قرآن کے وہ احکام جو توریت کے خلاف تھے اہل کتاب ان کو نہیں مانتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس خیال اور انکار کو دور کرنے کے لئے اللہ نے لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ فرمایا ہو۔ یعنی ہر مدت اور وقت کے لئے اللہ نے حکم نازل فرمایا ہے اور صرف مقررہ مدت کے لئے بندوں کو کوئی معیّن حکم دیا ہے۔ بندوں کی مصلحت کے مطابق اللہ نے وقتی احکام بھیجے ہیں (جب مقررہ مدت ختم ہوگئی تو دوسرے زمانے کے لئے دوسرے احکام بھیج دیئے اور پہلے احکام بدل دیئے)۔

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَيُثْبِتُ ۚ اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹاتا اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت برقرار رکھتا ہے۔ [1]

اس آیت کے مطلب میں اختلاف ہے سعید بن جبیرؓ اور قتادہ نے فرمایا، جن فرائض واحکام کو خدا چاہتا ہے منسوخ کر دیتا اور بدل دیتا ہے اور جن کو چاہتا ہے منسوخ نہیں کرتا ہے آیت لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ کا یہی مطلب مناسب ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لوحِ محفوظ میں سے جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے اس میں ثبت کر دیتا ہے۔ لوحِ محفوظ کی جو تحریر مٹانے کے قابل ہوتی ہے جس کو تقدیرِ معلّق کہا جاتا ہے اس کو مٹا دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسری چیز پیدا کر دیتا ہے کہ خواہ اس قضاء کا معلّق ہونا لوحِ محفوظ میں درج ہو یا نہ ہو صرف اللہ کے علم میں پوشیدہ ہو اور تحریرِ لوح مٹانے کے قابل نہیں ہوتی جس کو تقدیرِ مُبرم کہتے ہیں اس کو نہیں مٹاتا قضاء مبرم رد نہیں ہوتی۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے رزق اور عمر اور سعادت و شقاوت کے یعنی یہ امور نہیں بدلے جاتے۔

بغوی نے لکھا ہے ہم کو حضرت حذیفہ بن اُسیدؓ کی روایت سے یہ فرمانِ رسول پہنچا ہے کہ استقرارِ نطفہ کے چالیس یا پینتالیس دن کے بعد ایک فرشتہ داخل ہوتا ہے اور عرض کرتا ہے اے میرے رب یہ شقی ہے یا سعید یہ دونوں باتیں لکھ دی جاتی ہیں پھر فرشتہ کہتا ہے اے رب یہ نر ہے یا مادہ یہ دونوں امور بھی لکھ دیئے جاتے ہیں پھر اس کا عمل، اثر، عمر اور رزق لکھ دیا جاتا ہے پھر یہ تحریریں لپیٹ دی جاتی ہیں جن کے اندر اس کے بعد نہ زیادتی ہوتی ہے نہ کمی۔

صحیحین میں حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے آیا ہے کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور آپ سچے تھے اور اللہ کی طرف سے آپ کو سچا بنایا گیا تھا کہ آدمی کی بناوٹ ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک بصورتِ نطفہ پھر اتنے ہی روز بصورتِ علقہ (لوتھڑا، خون جما ہوا) پھر اتنی ہی مدت بصورتِ مُضغہ (گوشت کی بوٹی) رہتی ہے پھر اللہ اس کی طرف ایک فرشتہ چار باتوں

---

[1] طبرانی نے ضعیف سند سے بیان کیا کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ سے خود سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے قائم رکھتا ہے سوائے بدبختی اور خوش بختی اور زندگی اور موت کے (یعنی ان چاروں چیزوں کو نہیں بدلتا) ابن مردویہ نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کی روایت سے حضرت ربابؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ رزق کی وسعت و کثرت کو مٹا بھی دیتا ہے اور رزق میں زیادتی بھی کر دیتا ہے اور عمر (کی میعاد) کو مٹا بھی دیتا ہے اور اس میں زیادتی بھی کر دیتا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے آیت يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ الخ کے متعلق دریافت کیا گیا فرمایا یہ ہر شبِ قدر میں ہوتا ہے اللہ (مرتبہ) اٹھاتا ہے اور پناہ (یعنی دوزخ سے پناہ) دیتا ہے اور رزق دیتا ہے سوائے زندگی اور موت اور شقاوت و سعادت کے کہ ان میں تبدیلی نہیں کرتا۔ (از مؤلف رحمۃ اللہ)

کے لئے بھیجتا ہے فرشتہ اس کا عمل، اس کی زندگی اس کا رزق اور اس کا شقی (دوزخی) یا سعید (جنتی) ہونا لکھ دیتا ہے اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔

بغوی نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے دونوں حضرات نے فرمایا اللہ سعادت و شقاوت کو بھی مٹا دیتا ہے اور رزق و مدتِ حیات کو بھی اور کچھ ثابت رکھتا ہے یہ بھی روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمرؓ کعبہ شریف کا طواف کرنے میں رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے اللہ اگر تو نے مجھے اہلِ سعادت میں لکھا ہے تو ان میں قائم رکھ (میرا نام ان کی فہرست سے نہ مٹا) اور اگر تو نے میرے لئے شقاوت لکھ دی ہے تو میرا نام اہلِ شقاوت کی فہرست سے مٹا دے اور اہلِ سعادت و مغفرت میں لکھ دے بلا شبہ تو جو کچھ چاہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہے قائم رکھتا ہے تیرے ہی پاس امّ الکتاب (اصل کتاب، ہر چیز کا تحریر نامہ) ہے۔ ایسی ہی روایت حضرت ابن مسعودؓ سے بھی آئی ہے۔

بعض آثار میں آیا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض آدمیوں کی عمر کے تیس سال باقی ہوتے ہیں لیکن جب وہ قرابت کو قطع کرتا ہے (قطعِ رحم کرتا ہے) تو لوٹا کر تیس سال کے تین دن کر دیئے جاتے ہیں اور بعض آدمیوں کی عمر کے تین دن باقی رہتے ہیں اور وہ کنبہ کی پرداخت (صلۂ رحمی) کرتا ہے تو تین دن کھینچ کر تیس سال کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ اثر نقل کرنے کے بعد بغوی نے حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی کی عمر کے جب صرف تین گھنٹے رہ جاتے ہیں تو) اللہ رات کے آخری تین گھنٹوں میں نزولِ اجلال فرماتا ہے اور کتاب مندرج شدہ کو پہلے گھنٹہ میں ملاحظہ فرماتا ہے کہ اس کے سوا کوئی بھی اس کتاب کو نہیں دیکھ سکتا پس جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثبت فرما دیتا (یا برقرار رکھتا ہے) ہے۔

میں کہتا ہوں حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کی روایت کے مطابق مقاماتِ مجددیہ میں ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے ایک شخص مُلّا طاہر لاہوری تھے حضرت مجدد صاحبؒ کے دونوں صاحبزادگان حضرت محمد سعید اور حضرت محمد معصوم کے معلّم تھے حضرت مجدد قدس سرہ نے بنظرِ کشف ملاحظہ فرمایا کہ مُلّا طاہر کی پیشانی پر لکھا ہے "مُلّا طاہر لاہوری شقی" حضرت نے اس کا ذکر اپنے لڑکوں سے کر دیا صاحبزادگان تو مُلّا طاہر کے شاگرد تھے ہی اس لئے انہوں نے حضرت سے درخواست کی کہ اللہ سے دعا کر دیجئے اللہ اس شقاوت کو مٹا کر سعادت سے بدل دے حضرت نے فرمایا، میں نے لوح محفوظ میں لکھا دیکھا ہے کہ یہ قضاء مُبرَم ہے جس کو بدلا نہیں جا سکتا لڑکوں نے دعا کرنے کے لئے اصرار کیا حضرت مجدد نے فرمایا مجھے یاد آیا کہ حضرت غوث الثقلین شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ نے فرمایا تھا۔ میری دعا سے قضاء مبرم بھی بدل دی جاتی ہے اس لئے میں دعا کرتا ہوں اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتا ہوں اے اللہ تیری رحمت وسیع ہے تیرا فضل کسی ایک پر ختم نہیں ہو جاتا میں تجھ سے امید کرتا ہوں اور تیرے ہمہ گیر فضل سے درخواست کرتا ہوں کہ میری دعا قبول فرمالے اور مُلّا طاہر کی پیشانی سے شقاوت کی تحریر مٹا کر اس کی جگہ سعادت کے نقوش ثبت کر دے جیسے تو نے میرے آقا حضرت غوثِ اعظم کی دعا قبول فرمائی تھی حضرت مجدد قدس سرہ کا بیان ہے اس دعا کے بعد وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے آ گیا کہ گویا میری نظر کے سامنے لفظ "شقی" مُلّا طاہر کی پیشانی سے مٹا کر اس کی جگہ لفظ "سعید" لکھ دیا گیا اور اللہ کے لئے یہ بات دُشوار نہیں۔

حضرت مفسّر کا بیان ہے اس تقریر کے بعد میرے دل میں ایک اشکال پیدا ہو گیا کہ کسی کی دعا سے قضاءِ مُبرَم کے ٹل جانے کا معنی ہی کیا ہو سکتا ہے اگر قضاء مبرَم بھی ٹل جاتی ہے تو وہ مبرم ہی کب ہوئی ایسی قضاء کو مبرم کہنا ہی غلط ہے اس اشکال کا جواب اللہ نے میرے دل میں اس طرح القاء کیا کہ قضاءِ معلّق دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جس کا معلّق ہونا لوح محفوظ میں لکھ دیا گیا ہے دوسری وہ قضاء جس کا مبرَم ہونا لوح محفوظ میں درج نہیں۔ اس کا معلّق یا مبرم ہونا صرف اللہ کے علم میں ہے لوحِ محفوظ میں چونکہ اس کی تعلیق مکتوب نہیں اس لئے تحریرِ لوح کے اعتبار سے اس کو قضاء مبرم کہا جاتا ہے حضرت غوث الثقلین نے جس قضاء مبرم کا اپنی دعا سے بدل جانا ذکر کیا ہے اس سے مراد یہی قضاء ہے جو لوح محفوظ میں مبرم یعنی غیر معلّق ہے اور علمِ الٰہی میں

معلق غیر مبرم ہے۔ مُلا طاہر کی بد بختی بھی اسی قسم کی تھی۔ لوح میں غیر معلق یعنی مبرم تھی، لیکن اللہ کے علم میں معلق غیر مبرم تھی اس لئے بدل دی گئی۔ واللہ اعلم۔

ضحاک اور کلبی نے آیت یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَ یُثْبِتُ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ کراماً کاتبین آدمی کے تمام افعال و اقوال اپنے رجسٹروں میں لکھ لیتے ہیں ان میں کچھ ایسے اعمال و اقوال بھی ہوتے ہیں جن کا نہ کوئی ثواب ہوتا ہے نہ عذاب مثلاً کوئی کہتا ہے میں نے کھالیا، میں نے پی لیا، میں وہاں گیا، میں گھر سے نکلا۔ یہ کلام اگر سچا ہوتا ہے تو اس پر نہ ثواب مرتّب ہوتا ہے نہ عذاب اور کچھ اعمال ایسے ہوتے ہیں جو موجبِ ثواب و عذاب ہوتے ہیں۔ اول قسم کے اندر اجات کو اللہ کراماً کاتبین کے رجسٹروں سے مٹا دیتا ہے اور دوسری قسم کی تحریروں کو قائم رکھتا ہے۔ کلبی نے اتنا مزید بیان کیا کہ جمعرات کے دن ایسے لاحاصل اعمال واقوال مٹائے جاتے ہیں۔

عطیہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول تشریح آیت کے ذیل میں اس طرح بیان کیا کہ جو شخص اللہ کی اطاعت کرتا ہے، لیکن آخر میں نافرمانی کرنے لگتا ہے اور اسی گمراہی پر مر جاتا ہے تو اللہ اس کے سابق نیک اعمال مٹا دیتا ہے اور جو شخص مرتے دم تک اطاعت پر قائم رہتا ہے اللہ اس کی نیکیاں قائم رکھتا ہے۔

مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام آدمیوں کے سارے دل ایک آدمی کے دل کی طرح رحمٰن کی ایک چٹکی میں ہیں جس طرح چاہتا ہے پھیر دیتا ہے پھر حضورؐ نے یہ دعا کی اے اللہ اے دلوں کو پھیر دینے والے ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر پھیر دے۔ (یعنی اپنی طاعت پر قائم رکھ)

حسن نے آیت کی تفسیر اس طرح کی جس کی موت کا وقت آجاتا ہے اللہ اس کو لے جاتا ہے یعنی (اس کی زندگی کا نقش) مٹا دیتا ہے اور جس کی موت کا وقت نہیں آیا ہوتا اس کو قائم رکھتا ہے۔

سعید بن جبیرؒ نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے، مٹا دیتا ہے اور جو گناہ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے معاف نہیں کرتا۔

عکرمہؓ نے کہا اللہ اپنے بندوں کے جو گناہ توبہ سے معاف کرنا چاہتا ہے مٹا دیتا ہے اور گناہوں کے بدلے نیکیاں ثبت کر دیتا ہے، اس نے خود دوسری آیت میں فرمایا اُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِہِمْ حَسَنٰتٍ۔

مسلم نے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن بعض آدمیوں کی پیشی ہوگی تو حکم ہوگا اس کے سامنے اس کے صغیرہ گناہ رکھو، حسب الحکم صغیرہ گناہ اس کے سامنے لائے جائیں گے اور کبیرہ گناہ مخفی رکھے جائیں گے اور کہا جائے گا فلاں دن تو نے یہ کام کئے تھے وہ شخص اقرار کرتا جائے گا، انکار نہیں کرے گا مگر کبائر سے خوفزدہ رہے گا کہ ان کی بھی پرسش ہوگی کبائر اس سے پوشیدہ رکھے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہر گناہ کی جگہ اس کو ایک نیکی دے گا، بندہ عرض کرے گا میرے گناہ تو اور بھی تھے جو میں یہاں نہیں دیکھتا۔ راوی کا بیان ہے یہ فرمانے کے وقت میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ ہنس دیئے کہ آپ کی کچلیاں بھی نمودار ہو گئیں۔ مؤلف نے کہا میں کہتا ہوں شاید یہ عمل ان لوگوں کے لئے ہوگا جو محبوبیت کے سمندر میں غرق ہیں صاف بدن عالی قدر صوفی ہیں۔

سدی نے کہا مطلب یہ ہے کہ اللہ جو کچھ چاہتا ہے مٹا دیتا ہے، یعنی چاندنی کو مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے ثابت کرتا ہے یعنی سورج یا دھوپ کو لے آتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اسی کا اس آیت میں اظہار کیا ہے فرمایا ہے فَمَحَوْنَا اٰیَةَ اللَّیْلِ وَجَعَلْنَا اٰیَةَ النَّہَارِ مُبْصِرَةً ہم نے رات کی نشانی یعنی چاندنی مٹا دی اور ہم دن کی نشانی نظروں کے سامنے لے آئے۔

ربیع نے کہا اس آیت کے مطلب کا تعلق ارواح سے ہے، اللہ سونے کی حالت میں ارواح کو قبض کر لیتا ہے، اس کے بعد جس کو موت دینا چاہتا ہے اس کی روح کو روک لیتا ہے اور جس کو زندہ رکھنا چاہتا ہے اس کی روح واپس لوٹا دیتا ہے اللہ نے خود فرمایا ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا الخ بعض اہل تفسیر نے لکھا ہے جو اعمال ریاکاری اور شہرت کے حصول کے لئے کئے جاتے ہیں اللہ ان کو کراماً کاتبین کے رجسٹر سے مٹا دیتا ہے اور جو اعمال خالص اللہ کے لئے کئے

جاتے ہیں ان کو قائم رکھتا ہے۔
بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ ایک قوم کو مٹاتا ہے اور دوسری قوم کو قائم رکھتا ہے۔
وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ ۳۹ اور اسی کے پاس اُمّ الکتاب ہے۔ امّ الکتاب، کتاب کی اصل جڑ۔ امّ الکتاب سے مراد ہے "اللہ کا علم"۔ حضرت ابن عباسؓ نے جب حضرت کعبؓ سے امّ الکتاب کا معنی دریافت کیا تو حضرت کعبؓ نے فرمایا علمُ الکتاب۔ (یعنی اللہ کا علم) عکرمہؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ کے پاس دو کتابیں ہیں ایک کتاب تو وہ ہے جس میں محو و اِثبات ہوتا ہے (کچھ برقرار رکھا جاتا ہے کچھ مٹا دیا جاتا ہے) دوسری امّ الکتاب ہے اس کے مندرجات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔
بغوی نے کہا امّ الکتاب لوح محفوظ ہے جس کے مندرجات میں کوئی تغیّر و تبدّل نہیں ہوتا۔ عطا نے کہا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ کی ایک لوح محفوظ ہے (اتنی بڑی کہ) بقدر پانسو برس کی راہ کے (اس کی لمبائی ہے) یا سفید موتی کی بنی ہوئی ہے اس کے دونوں پٹھے یاقُوت کے ہیں اللہ روزانہ تین سو تیس بار اس کو ملاحظہ فرماتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اس میں سے مٹا دیتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے برقرار رکھتا ہے۔
وَاِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اگر (آپ کی وفات سے پہلے) ہم آپ کو اس بات کا کچھ حصہ دکھا دیں جس کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں، بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ سے مراد ہے دنیا میں مسلمانوں کو مشرکوں پر غالب کر کے اہلِ اسلام کے ہاتھوں ان کو سزا دینا اور مغلوب کرنا۔ اللہ نے یہ وعید آیت سَیُهْزَمُ الْجَمْعُ وَیُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ میں دی تھی (ان کا جتھا شکست پائے گا اور سب پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے) یہ شکست جنگِ بدر کے دن کفّار پر پڑی کچھ قتل ہوئے کچھ قید۔
اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ یا ہم وعدہ پورا کرنے سے پہلے آپ کو وفات دے دیں اور آپ کی زندگی میں ان کو کامل شکست نہ ہو تو آپ اس کی فکر نہ کریں ان کی روگردانی کی پروانہ کریں اور ان کے جلدی عذاب پانے کی خواہش نہ کریں۔
فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ کیونکہ آپ کے ذمّہ تو فقط پہنچا دینا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں اور یہ آپ کر چکے۔
وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۴۰ اور ہمارے ذمّہ حساب فہمی ہے اور قیامت کے دن سزا دینا ہے جب ہمارے پاس آئیں گے تو ہم ان کو سزا دیں گے۔ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ط
کیا (مکّہ کے کافروں نے) نہیں دیکھا کہ ہم زمین کو ہر چہار طرف سے کم کرتے چلے آرہے ہیں۔
بغوی نے اکثر اہلِ تفسیر کا قول بیان کیا ہے کہ "زمین" سے مراد ہے کافروں کی زمین اور "کم کرنے" سے مراد ہے مسلمانوں کا کافروں کی زمین کو فتح کرنا۔ کیونکہ مسلمانوں کے مقبوضات بڑھنے کا معنی ہی یہ ہے کہ کافروں کے مقبوضات میں کمی آئے۔ پورا مطلب اس طرح ہے کہ ہم نے جو اُن کو وعید دی ہے کہ یہ بہت کچھ کفر کی حمایت میں صرف کریں گے لیکن وہ تمام مصارف ان کے لئے باعثِ حسرت بن جائیں گے آخر ان کو مغلوب ہونا پڑے گا کیا ان کو اس قول کی سچائی کا انکار ہے کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ ہم سرزمینِ کُفر گھٹا رہے ہیں مسلمانوں کے مفتوحات بڑھا رہے ہیں کیا ان کی عبرت اندوزی کے لئے یہ مشاہدہ کافی نہیں ہے۔ آیت کی یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ قتادہ اور اکثر علماء نے کی ہے۔ آیت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیامِ تسکین ہے تاکہ آپ فکر نہ کریں رنجیدہ نہ ہوں اور یقین رکھیں کہ اللہ کا وعدہ فتح پورا ہو کر رہے گا۔
بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک "زمین کی کمی" سے مراد ہے ویرانی اور تباہی اس توجیہ پر مطلب کا خلاصہ اس طرح ہوگا کیا ان لوگوں کو اپنی بربادی اور اپنی بستیوں کی ویرانی کا اندیشہ نہیں، کیا ان کو نہیں نظر آتا کہ ہم ان کی آبادیوں کو اُجاڑ رہے ہیں اور آبادیوں کے رہنے والوں کو ہلاک کر رہے ہیں۔ یہ تفسیر مجاہد اور شعبی کی طرف منسوب ہے۔
وَاللّٰهُ يَحْكُمُ اور اللہ (اپنی مخلوق کے معاملات میں) جیسا چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔
لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ ط اس کے حکم کو پلٹنے والا کوئی نہیں۔ یعنی اس کی قضاء کو رد کرنے والا اور اس کے حکم کو توڑنے والا کوئی نہیں۔ مُعَقِّبٌ کا معنی ہے کسی چیز کو پیچھے کی طرف پلٹ دینے والا اور موڑ کر بے کار کر دینے والا۔ مطلب یہ ہے

کہ اللہ نے اسلام کی ترقی اور کفر کی بربادی کا حکم دے دیا ہے ایسا ضرور ہو کر رہے گا اس کو پلٹنے والا کوئی نہیں۔

وَهُوَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۴۱﴾ اور وہ جلد محاسبہ کرنے والا ہے، یعنی دنیا میں قتل وقید اور جلاوطنی کی سزا دینے کے بعد قیامت کے دن ان سے حساب فہمی کرے گا۔

وَقَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ اور ان سے پہلے گزشتہ اقوام میں جو کافر گزرے ہیں انہوں نے بھی اپنے اپنے انبیاء اور مؤمنوں سے مکر وفریب کئے تھے جیسے ان لوگوں نے آپ سے فریب کیا ہے۔ "مکر" کا معنی ہے نامعلوم طریقوں سے کسی کو دکھ پہنچانا۔

فَلِلَّهِ الْمَكْرُ جَمِيعًا پس اللہ ہی کے پاس ہے ان کا مکر یعنی ان کے مکر کی سزا۔ بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ ہی ان کے فریب کا خالق ہے، خیر وشر اسی کے قبضہ میں ہے نفع اور ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے اس کی اجازت اور حکم کے بغیر کسی کا فریب کسی کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لہٰذا ان کی فریب کاری بے سود ہے۔

يَعْلَمُ مَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ جو شخص بھی جو کچھ کرتا ہے اللہ اس کو جانتا ہے اور عمل کے مطابق بدلہ بھی دے گا، یہی اللہ کی مخفی تدبیر ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا بدلہ نامعلوم طریقے سے دیتا ہے۔

وَسَيَعْلَمُ الْكُفَّارُ لِمَنْ عُقْبَى الدَّارِ ﴿۴۲﴾ اور کافروں کو یقیناً معلوم ہو جائے گا کہ دونوں گروہوں میں سے کس کے لئے آخرت میں اچھی جزا ہوگی جب کہ غفلت کی حالت میں کافر مبتلائے عذاب ہوں گے اور مؤمن جنت میں داخل ہوں گے۔ یہ کلام گویا "مکر اللہ" کی تفسیر ہے۔

وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَسْتَ مُرْسَلًا وہ (کفار مکہ یا سرداران یہود) کہتے ہیں کہ آپ پیغمبر نہیں ہیں۔

قُلْ كَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ آپ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمہارے درمیان میری نبوت پر اللہ کی شہادت کافی ہے۔

یعنی میری سچائی نبوت کے لئے اللہ کی شہادت کافی ہے۔ اس نے میری رسالت کی صداقت ایسے دلائل سے واضح کر دی ہے کہ ان کے بعد کسی اور شاہد کی ضرورت نہیں۔ اور وہی قیامت کے دن فیصلہ کرے گا۔ اس روز اُن منکروں کے پاس کوئی عذر نہ ہوگا۔

وَمَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ ﴿۴۳﴾ اور ان لوگوں کی شہادت کافی ہے جن کے پاس اللہ کی کتابوں کا علم ہے۔ یعنی ایمان رکھنے والے اہل کتاب کی شہادت کافی ہے، جیسے حضرت عبداللہ بن سلامؓ وغیرہ۔ رہا کافروں کا انکار تو اس کی بناء محض حسد، عناد اور مال وجاہ کی طلب پر ہے۔ حرص وہوا اور حسد ان کو اقرار کرنے سے روک رہے ہیں۔ اس تفسیر کی بناء پر بعض علماء نے کہا کہ پوری سورت اگرچہ مکی ہے مگر یہ آیت مدنی ہے۔ ع ۱۲

شعبی اور ابوبشر نے آیت کی مندرجہ بالا تفسیر کا انکار کیا ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ تو مدنی تھے ہجرت کے بعد مسلمان ہوئے تھے ان کے حق میں آیت کا نزول نہیں ہو سکتا۔

میں کہتا ہوں آیت کو اگر ہم مکی ہی قرار دیں تب بھی آیت میں اہل کتاب مراد ہونا ناممکن نہیں ہے گویا اللہ نے کفار مکہ سے فرمایا کہ اگر تم کو محمدؐ کی رسالت کا یقین نہیں ہے تو اہل کتاب سے دریافت کر لو معتبر اہل کتاب تصدیق کریں گے اور محمدؐ کی نبوت کی شہادت دیں گے۔

حسن اور مجاہد نے کہا الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہے اور مَنْ عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ سے مراد اللہ ہے دونوں جملوں کا ملا کر یہ مطلب ہوگا کہ اس کی شہادت کافی ہے جو مستحق الوہیت ہے اور لوح محفوظ کی تحریر کا حکم اس کے سوا کسی کو نہیں، پس وہی جھوٹے کو سزا دے گا تم ہو یا میں، ہم دونوں میں سے کوئی ہو۔ حسن اور سعید بن جبیرؒ کی قرائت میں مِنْ عِنْدِهِ بکسر میم آیا ہے اس قرائت سے بھی حسن ومجاہد کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ الحمد للہ سورۃ الرعد کی تفسیر اور اس کے ترجمے کی تصحیح ختم ہوئی (از مصحح)

سورۃ ابراھیم

یہ سورت مکی ہے اس میں باون۵۲ آیات ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الٓرٰ قف کِتٰبٌ اَنۡزَلۡنٰهُ اِلَیۡكَ
الٓرٰ (یہ سورۃ یا قرآن) ایک ایسی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اُتاری ہے۔

لِتُخۡرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ ۙ۬
تاکہ آپ لوگوں کو ان کے رب کے حکم سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں۔ یعنی آپ ہماری کتاب کی ہدایات کی طرف لے آئیں۔ یعنی آپ ہماری کتاب کی ہدایات کی طرف لوگوں کو بلائیں اور نفع و نقصان میں امتیاز پیدا کرنے والے امور کی تعلیم دیں۔
"تاریکیوں" سے مراد ہیں طرح طرح کی گمراہیاں اور "نور" سے مراد ہے ہدایت۔ اِذۡن سے مراد ہے توفیق اور اسبابِ سہولت فراہم کر دینا۔ دربان داخلہ کی اجازت دیتا ہے یعنی اندر داخل ہونے میں سہولت دے دیتا ہے (رکاوٹ دور کر دیتا ہے)

اِلٰی صِرَاطِ الۡعَزِیۡزِ الۡحَمِیۡدِ ۙ ①
(نور کی طرف نکال کر لائیں یعنی) اس خدا کے راستہ کی طرف لائیں جو غالب اور مستحقِ ستائش ہے اس کے سوا کوئی بھی قابلِ تعریف نہیں۔
اللہ کے یہ دونوں اوصاف ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ غالب و محمود اللہ کی راہ پر چلنے والا گمراہ نہیں ہوتا اور نامراد نہیں رہتا۔

اللّٰهِ الَّذِیۡ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ
اس اللہ کا راستہ جس کی (مخلوق اور مملوک) ہر وہ چیز ہے جو آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔

وَوَیۡلٌ لِّلۡكٰفِرِیۡنَ مِنۡ عَذَابٍ شَدِیۡدِ ۙ ②
اور بڑی خرابی یعنی بڑا سخت عذاب ہے ان کافروں کے لئے۔
وَیۡل کا معنی ہے نزولِ شر (اس سے مراد ہے پوری خرابی) بیضاوی نے لکھا ہے وَیۡل کا معنی وال کے معنی کی ضد ہے وَال کا معنی ہے نجات (پس وَیل کا معنی ہوا ہلاکت) ہلاک کی طرح وَیل مصدر ہے مگر اس سے کوئی صیغہ مشتق نہیں ہوتا بیضاوی کے تحقیقی ترجمہ کی بنا پر یہ کلمۂ وعید قرار پائے گا کافروں سے مراد ہیں وہ منکرینِ کتاب جو تاریکیوں سے نکل کر روشنی میں نہیں آئے۔

اَلَّذِیۡنَ یَسۡتَحِبُّوۡنَ الۡحَیٰوةَ الدُّنۡیَا عَلَی الۡاٰخِرَةِ وَیَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ
جو دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں۔ اِستحباب پسند کرنا اختیار کرنا، کسی چیز کو اپنا محبوب

قرار دے لینا۔ دنیوی زندگی سے مراد ہے دنیا کی لذتیں۔ اللہ کے راستہ پر چلنے سے روکنے کا مطلب ہے اللہ کے پیغمبر کے اتباع سے روکنا۔

وَ يَبْغُونَهَا عِوَجًا ؕ اور اللہ کے راستہ میں کجی ڈھونڈتے ہیں یعنی عیب چینی اور۔۔۔ خوردہ گیری کے لئے دین میں کجی ڈھونڈتے ہیں، یا یہ مطلب ہے کہ حق سے مُڑ کر اپنا رخ موڑ کر اللہ کی راہ کے طلب گار ہوتے ہیں حالانکہ ایسا ممکن نہیں (کہ حق سے منہ موڑ کر اللہ کا راستہ مل جائے) ایک مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ راہِ خدا سے منہ موڑ کر دنیا کے طلب گار ہوتے ہیں مراد یہ ہے کہ حرام مال چاہتے ہیں۔

اُولٰٓئِكَ فِیْ ضَلٰلٍۭ بَعِیْدٍ ۞ ایسے لوگ بڑی دور کی گمراہی میں ہیں یعنی ایسی گمراہی میں ہیں جو حق سے دور ہے۔ حق سے دور ہونا حقیقت میں گمراہ کا وصف ہے لیکن بطورِ مبالغہ کے گمراہی کی صفت قرار دے دیا گیا۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ اور ہم نے ہر پیغمبر کو اسی قوم کی زبان میں پیغمبر بنا کر بھیجا۔

قَوْمِهٖ سے مراد ہے وہ قوم جس میں پیغمبر پیدا ہوا اور مبعوث ہوا۔ عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن المنذر نے حضرت قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ "لسانِ قوم" سے مراد ہے قوم کی بولی اگر قوم عربی ہوئی تو پیغمبر کی زبان بھی عربی ہوئی اور عربی میں ہی اس کو پیام دے کر بھیجا گیا اور اگر قوم کی زبان عجمی ہوئی تو پیغمبر کو بھی عجمی زبان میں پیام دے کر بھیجا گیا۔ اسی طرح سریانی کو سریانی زبان میں (اور ہندی کو ہندی زبان میں، مترجم) پیام دیا گیا۔

لِيُبَيِّنَ لَهُمْ ؕ تا کہ (پیغمبر کی امت کو جو احکام دیئے گئے تھے) وہ قوم کے سامنے کھول کر بیان کر دے اور قوم والے آسانی کے ساتھ ان کو سمجھ لیں اور پیغمبر کو قوم کے خلاف تبلیغ کی ایک مضبوط دلیل مل جائے۔ رسول اللہ ﷺ سے پہلے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی اصلاح کے لئے (خصوصیت کے ساتھ) بھیجا گیا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کو تمام انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا مگر اول اپنی قوم کو تبلیغ کرنے کے لئے آپ کو مبعوث فرمایا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَكَ الْاَقْرَبِیْنَ دوسری آیت ہے لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَ مَنْ حَوْلَهَا تیسری آیت ہے لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ (اول آیت میں صرف اقربا کو تبلیغ کرنے کا حکم ہے۔ دوسری آیت میں اہلِ مکہ اور دوسرے آفاقیوں کو اور تیسری آیت میں تمام عرب کو۔ مترجم) اس لئے اہلِ حجاز کے لئے (اول اور بلا واسطہ) اور پھر بالواسطہ تمام انسانوں کے لئے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور واضح عربی زبان میں پیام نازل فرمایا گیا پس اہلِ حجاز نے اللہ کا کلام اور پیام رسول اللہ ﷺ سے سیکھا پھر اس کو منتقل کیا اور دوسرے لوگوں نے (اپنی زبانوں میں) اس کے ترجمے کئے اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ خیر و شر میں قریش کے تابع ہیں۔ رواہ احمد و مسلم فی الصحیح عن جابرؓ۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کفارِ قریش چونکہ سب سے پہلے منکرِ نبوت ہوئے۔ اس لئے دوسرے کافر نبوت کفارِ قریش کے تابع ہوئے اور کفارِ قریش سب کے امام۔ اسی طرح جو قریش ایمان لے آئے اور دوسروں سے پہلے ایمان لائے اور دوسرے لوگ ان کے بعد مؤمن ہوئے اس لئے ایمان لانے والے قریشی امام اور دوسرے مؤمن ان کے تابع ہوئے پس خیر و شر دونوں میں قریش امام اور باقی لوگ ان کے پیرو قرار پائے۔

حضرت جریر کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ قائم کیا اس کو اس طریقے (پر چلنے کا اور قائم کرنے کا ثواب بھی) ملے گا اور اس طریقے پر جتنے لوگ چلیں گے ان کے ثواب کے برابر بھی اجر ملے گا (بعد کو) اس طریقہ پر عمل کرنے والوں کے ثواب میں کمی نہیں کی جائے گی (ایسا نہ ہوگا کہ ان کا ثواب گھٹا کر طریقۂ حسنہ قائم کرنے والے کا ثواب بڑھا دیا جائے) اور جس نے اسلام میں کوئی طریقہ بُرا جاری کیا اس پر اس طریقے کو (اختیار کرنے) کا گناہ بھی ہوگا اور (آئندہ) جو لوگ اس طریقے پر عمل کریں گے ان کا گناہ بھی ہوگا مگر اس سے برے طریقہ پر چلنے والوں کے گناہ (اور سزا) میں کوئی کمی نہیں ہو جائے گی۔ رواہ مسلم۔

ابن عساکر نے ضعیف سند کے ساتھ حضرت ابو سعیدؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے مدینے

والو، لوگ علم میں تمہارے تابع ہیں۔ مدینے والوں سے مراد ہیں انصار اور مہاجر، دوسرے لوگ مہاجرین وانصار کے تابع ہیں مگر انصار، دین (خلافت) میں مہاجرین کے تابع ہیں۔ دونوں حدیثوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

حضرت ابورافع کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر والوں کے لئے شیخ (سب کا بزرگ) ایسا ہے جیسے امت کے لئے پیغمبر۔ رواہ ابن النجار والجلیلی فی مشیختہ حضرت ابن عمرؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنے گھر میں شیخ ایسا ہے جیسے اپنی قوم (امت) میں پیغمبر۔ رواہ ابن حبان فی الضعفاء۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا علماء انبیاء کے وارث ہیں رواہ احمد والترمذی وابوداؤد وابن ماجۃ والدارمی عن کثیر بن قیس۔ ترمذی نے راوی کا نام قیس بن کثیر بتایا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اور لوگ تمہارے متبع ہیں لوگ تمہارے پاس اطراف سے دین سیکھنے آتے ہیں تم ان سے اچھا سلوک کرو، بھلائی کی ان کو نصیحت کرو، رواہ الترمذی۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ حدیث الشیخ فی بیتہ کالنبی فی قومہ میں قومہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے (اور النبی سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں) اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمام کتابیں عربی میں اتاری گئی تھیں پھر حضرت جبرئیلؑ نے ان کا ترجمہ مختلف (انبیاء کی) زبانوں میں کیا۔ ابن مردویہ نے بوساطت کلبی حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جبرئیلؑ کو عربی زبان میں وحی کی جاتی تھی پھر جبرئیلؑ ہر نبی کے پاس ان کی قوم کی زبان میں وحی لے کر آتے تھے۔

ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے حضرت سفیان ثوریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ (پیغمبروں پر) وحی تو صرف عربی میں نازل کی گئی پھر ہر نبی نے وحی کا ترجمہ اپنی قوم کی زبان میں کر دیا۔ سفیان ثوریؒ نے یہ بھی کہا قیامت کے دن سریانی زبان ہوگی اور جنت میں جو لوگ جائیں گے وہ عربی میں کلام کریں گے۔

(حضرت مفسرؒ نے کہا) میں کہتا ہوں قومہ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع کرنا بعید از فہم ہے آیت لِيُبَيِّنَ لَهُمْ بِلِسَانِ قَوْمِهٖ کی صراحت اس کے خلاف ہے۔

فَيُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ　پس اللہ گمراہ کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے یعنی ایمان کی توفیق نہیں دیتا۔

وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ　اور جس کو چاہتا ہے ہدایت یاب کرتا ہے یعنی ایمان کی توفیق دے دیتا ہے اور حق کا یقین اسکے دل میں پیدا کر دیتا ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ　اور وہی غالب ہے اس کی مشیت پر کوئی غالب نہیں جس کو وہ ہدایت کر دے اس کو کوئی گمراہ کرنے والا نہیں اور جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو کوئی ہدایت یاب نہیں کر سکتا۔

الْحَكِيْمُ ④　وہی حکمت والا ہے۔ اپنی مصلحت کے تحت ہدایت یاب یا گمراہ کرتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ　اور ہم نے اپنی (نو) نشانیاں دے کر موسیٰ کو بھیجا۔

اَنْ اَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۙ وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ　(ہم نے یہ پیام دے کر بھیجا) کہ اپنی قوم کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاؤ اور اللہ کی نعمتوں کی یاد دہانی کرو۔

ایام اللہ سے حضرت ابن عباسؓ حضرت ابی بن کعبؓ مجاہد اور قتادہ کے نزدیک اللہ کی نعمتیں مراد ہیں اور مقاتل کے نزدیک وہ واقعات مراد ہیں جو گزشتہ امتوں (عاد، ثمود، قوم نوح) کو پیش آئے۔ محاورہ میں بولا جاتا ہے کہ فلاں شخص ایام العرب کا عالم ہے یعنی عرب کی لڑائیوں سے واقف ہے اس تقریر پر کلام کا مطلب اس طرح ہوگا کہ اپنی قوم کو وہ واقعات بتاؤ جو اللہ نے گزشتہ ایام میں ظاہر کئے خواہ وہ بصورت نعمت ہوئے ہوں یا بشکل مصیبت۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ　بلاشبہ ان واقعات میں (اللہ کی ہستی اس کی قدرت و حکمت اور توحید کی) بڑی نشانیاں ہیں

لِّكُلِّ صَبَّارٍ　ہر ایسے آدمی کے لئے جو (مصیبت اور طاعت اور گناہ سے اجتناب پر) بہت صبر کرنے والا۔

شَكُورٍ ﴿٥﴾ (اور نعمتوں پر) بڑا شکر ادا کرنے والا ہو۔ مراد یہ ہے کہ ہر مؤمن کے لئے اس میں بڑی نشانیاں ہیں صبّار اور شکور کے الفاظ سے اس طرف اشارہ ہے کہ ہر مؤمن کے اندر صبر و شکر کی صفت ہونی لازم ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی حاتم نے باسنادِ ابوظبیان حسب روایتِ علقمہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ صبر آدھا ایمان ہے اور یقین پورا ایمان۔ یہ قول علاء بن بدر کے سامنے ذکر کیا گیا تو علاء نے کہا یہ قرآن میں نہیں ہے کیا اللہ نے نہیں فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿٥﴾ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ (یعنی ایک آیت میں اللہ نے صبّار اور شکور کے لئے اور دوسری آیت میں مؤمنین کے لئے اس کو آیاتِ توحید ذاتی و صفاتی قرار دیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ صابر و شاکر سے مراد مؤمن ہی ہے۔)

بیہقی نے حضرت انسؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ ایمان دو حصوں کا مجموعہ ہے ان کا آدھا حصہ صبر میں اور آدھا حصہ شکر میں ہے۔ طبرانی نے مکارم الاخلاق میں اور ابویعلیٰ نے نقل کیا ہے کہ ایمان صبر و سماحت (ایثار) کا نام ہے۔

مسلم اور امام احمد نے حضرت صہیبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مؤمن کا بھی عجیب معاملہ ہے اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے، مؤمن کے علاوہ کسی اور کو یہ بات نصیب نہیں، اگر اس کو سکھ پہنچتا ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے اور دکھ پہنچتا ہے تو صبر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔

بیہقی نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے ان الفاظ کے ساتھ یہ حدیث نقل کی ہے کہ مؤمن کی عجیب حالت ہے اگر اس پر مصیبت آتی ہے تو وہ امیدِ ثواب رکھتا اور صبر کرتا ہے اور اس کو کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو وہ اللہ کی حمد اور شکر کرتا ہے مؤمن کو ہر بات میں ثواب دیا جاتا ہے یہاں تک کہ جو لقمہ اٹھا کر وہ اپنے منہ میں رکھتا ہے (اس کا بھی اس کو ثواب ملتا ہے)

حضرت ابودرداءؓ کا بیان ہے میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے کہ اللہ نے فرمایا عیسیٰؑ میں تیرے بعد ایک ایسی امت پیدا کروں گا کہ جب ان کو کوئی مرغوبِ خاطر چیز حاصل ہو گی تو وہ اللہ کی حمد کریں گے اور اگر کوئی ناگوار بات ان کو پیش آئے گی تو وہ ثواب کی امید رکھیں گے اور صبر کریں گے حالانکہ (ان میں) نہ برداشت ہو گی نہ سمجھ۔ حضرت عیسیٰؑ نے عرض کیا اے میرے رب یہ بات ان کو کیسے حاصل ہو گی جب کہ ان کو نہ برداشت حاصل ہو گی نہ عقل فرمایا میں ان کو اپنی دانش اور علم سے عطا کروں گا۔ رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ اَنْجٰىكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ وَيُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم سے کہا اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہوئی جب کہ اللہ نے تم کو فرعون والوں سے نجات دی وہ تم کو بری تکلیفیں دیتے تھے اور تمہارے لڑکوں کو قتل کرتے تھے اور لڑکیوں کو زندہ رہنے دیتے تھے۔ "نعمت" سے مراد انعام (بمعنی مصدری) نہیں ہے بلکہ عطیۂ الٰہی مراد ہے "عذاب" سے مراد قتلِ اولاد نہیں بلکہ بنی اسرائیل کو غلام بنانا اور سخت ترین کام لینا مراد ہے کیونکہ وَيُذَبِّحُوْنَ کا عطف يَسُوْمُوْنَ پر ہے اور عطف مغایرت کو چاہتا ہے (معطوف، معطوف علیہ سے غیر ہوتا ہے) ہاں سورۂ بقرہ اور سورۂ اعراف میں عذاب سے مراد ذبح کرنا ہی ہے۔

وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٦﴾ ع ۱۶ اور تمہاری ان تمام باتوں میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ﴿٧﴾

اور جب تمہارے رب نے اطلاع دے دی تھی کہ اگر شکر کرو گے تو میں تم کو اور زیادہ دوں گا اور ناشکری کرو گے تو (سمجھ لو) میرا عذاب یقیناً سخت ہے یہ بھی حضرت موسیٰؑ کے کلام کا ایک حصہ ہے تَاَذَّنَ کا معنی ہے اطلاع دے دی، بتا دیا

اور شکر تم و فکر تم کا خطاب بنی اسرائیل کو ہے۔ شکر نعمت سے مراد ہے ایمان لانا اور اپنے پیغمبر کے حکم پر چلنا۔ شکر زیادتی نعمت کا موجب ہے موجود نعمت کو برقرار رکھتا ہے اور غیر موجود کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہو جاتا ہے رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کو شکر دیا گیا (شکر کرنے کی توفیق دی گئی) وہ زیادتی سے محروم نہ رہے گا۔ رواہ ابن مردویہ عن ابن عباسؓ
بعض اہلِ تفسیر نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اگر تم اطاعت (کی شکل میں شکر ادا) کرو گے تو میں تمہارے ثواب میں زیادتی کروں گا۔

اِنَّ عَذَابِیْ لَشَدِیْدٌ سے مراد یہ ہے کہ میں تم کو سخت عذاب دوں گا دنیا میں اپنی نعمت تم سے چھین لوں گا اور آخرت میں عذاب دوں گا کیونکہ میرا عذاب سخت ہے۔

آیت میں وعدۂ زیادت کی توصراحت ہے اور وعید عذاب کی طرف اشارہ ہے اس سے تنبیہ مقصود ہے اس امر پر کہ زیادتی نعمت تو شکر کی حالت میں لازم ہے اس کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور ناشکری پر عذاب کی وعید کو پورا کرنا اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہے تو عذاب دے اور چاہے معاف فرمادے۔

وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝۸

اور موسیٰؑ نے کہا (اے بنی اسرائیل) اگر تم اور تمام زمین کے باشندے اللہ کی ناشکری کریں تو اللہ (تم سب کے شکریہ سے) بے نیاز ہے فی نفسہٖ وہ مستحقِ حمد اور محمود ہے اس کی حمد ابدی ازلی ہے خود اس کی ذات سے پیدا ہو رہی ہے فرشتے بھی اس کی حمد کرتے ہیں اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی حمد میں مشغول ہے۔ پورا کلام اس طرح تھا اگر تم ناشکری کرو گے تو اپنے آپ کو خود نقصان پہنچاؤ گے اپنی ذات کو مستحقِ عذاب اور ثواب سے محروم بناؤ گے اللہ بے نیاز اور مستحقِ حمد ہے۔

اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَبَؤُا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۛ وَالَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۛ

کیا تمہارے پاس ان لوگوں کی (تباہی) کی خبر نہیں پہنچی جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں۔ نوحؑ کی قوم اور عاد اور ثمود اور وہ لوگ جو ان کے بعد ہوئے جیسے ابراہیمؑ اور لوطؑ کی قومیں اور اصحاب الرس اور مدین والے اور ایکہ والے اور تبع کی قوم۔ یہ بھی حضرت موسیٰؑ کے کلام کا جزء ہے اس صورت میں بنی اسرائیل کو خطاب ہے یا اللہ کا کلام ہے اس صورت میں امتِ محمدیہ کو خطاب ہوگا۔

مع لَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا اللّٰهُ ۛ جن (کی گنتی شمار) کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ یہ جملہ معترضہ ہے۔ روایت میں آیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے یہ آیت تلاوت کی پھر فرمایا نسب بیان کرنے والے جھوٹے ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ حضرت ابراہیمؑ اور عدنان کے درمیان تیس قرن ہوئے ہیں۔ جن سے سوائے اللہ کے کوئی واقف نہیں۔ امام مالک بن انسؒ کو یہ امر پسندیدہ نہ تھا (یعنی جائز نہ سمجھتے تھے) کہ کوئی شخص مسلسل اپنے اسلاف کا سلسلہ پشت در پشت حضرت آدمؑ سے جوڑتا چلا جائے اور رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی کے متعلق بھی امام موصوف کی یہی رائے تھی۔

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ان کے پیغمبر (اللہ کی طرف سے) کھلے واضح معجزات لے کر پہنچے (تو غصہ یا تعجب یا استہزاء سے)

فَرَدُّوْٓا اَيْدِيَهُمْ فِىْٓ اَفْوَاهِهِمْ تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں دے لئے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا انہوں نے غصہ سے اپنے ہاتھ اپنے دانتوں سے کاٹے۔ اسی طرح دوسری روایت میں آیا ہے عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب انہوں نے اللہ کی کتاب سنی تو تعجب کیا اور تعجب یا استہزاء سے اپنے ہاتھ منہ میں دے لئے جیسے ہنسی سے مغلوب ہو کر کبھی آدمی منہ پر ہاتھ رکھ لیتا ہے کلبی نے کہا انہوں نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر پیغمبروں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اشارہ کر کے بتایا کہ منہ بند رکھو ایسی باتیں نہ کرو۔ مقاتل نے کہا انہوں نے اپنے ہاتھ پیغمبروں کے منہ پر ان کو خاموش کرنے کے لئے رکھ دیئے۔ (اس صورت میں

افواہھم کی ضمیر پیغمبروں کی طرف راجع ہو گی) بعض علماء کے نزدیک اَیدِی کا معنی ہے اَیادِیْ "نعمتیں" یعنی پیغمبروں کی نصیحتیں اور احکام شریعت و وحی۔ یعنی انہوں نے پیغمبروں کے احکام اور شریعت کو پیغمبروں کے منہ پر لوٹا کر دے مار اور انکار کیا مجاہد و قتادہ نے یہی مطلب بیان کیا محاورہ میں بولا جاتا ہے میں نے اس کی بات اس کے منہ میں لوٹا دی (یعنی اس کے منہ پر) اس کی تکذیب کر دی۔ بعض نے کہا فی افواہھم کا معنی ہے بافواہھم یعنی اپنی زبانوں سے انہوں نے احکام انبیاء کا انکار کیا اور پیغمبروں کی نصیحتوں کو لوٹا دیا۔

وَقَالُوْٓا اِنَّا كَفَرْنَا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ　اور کہنے لگے (تمہارے دعوے کے بموجب) جو احکام تم کو دے کر اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے ہم (تمہارے دعوے کی صحت و حقانیت کے) منکر ہیں۔

وَاِنَّا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَنَآ اِلَيْهِ مُرِيْبٍ ۝۹ قَالَتْ رُسُلُهُمْ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ

اور جس امر کی طرف تم ہم کو بلاتے ہو ہم تو اس کی جانب سے بہت بڑے شبہ میں ہیں جو ہم کو تردد میں ڈالے ہوئے ہے ان کے پیغمبروں نے کہا کیا تم کو اللہ کے بارے میں شک ہے۔ استفہام انکاری ہے یعنی ہم تو تم کو اللہ کی توحید کی طرف بلا رہے ہیں اور اللہ کی توحید قابل شک نہیں ہے تمام محسوسات اور ذہنی موجودات اللہ کی توحید کو پکار پکار کر ظاہر کر رہی ہے۔

فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ　جو آسمانوں کو اور زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے۔ یہ فقرہ اللہ کی صفت یا لفظ "اللہ" سے بدل ہے۔

يَدْعُوْكُمْ　وہ تم کو (اپنی طرف ہم کو بھیج کر) بلا رہا ہے تم کو دعوت دے رہا ہے کہ تم اس پر ایمان لاؤ۔

لِيَغْفِرَ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ　تا کہ تمہارے گناہ معاف کر دے یا یہ مطلب ہے کہ تم کو مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک مِنْ ذُنُوْبِكُمْ میں مِنْ زائد ہے مطلب یہ کہ تمہارے سب گناہ معاف کرنے کی طرف تم کو بلا رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اسلام ڈھا دیتا ہے اس (گناہ) کو جو مسلمان ہونے سے پہلے کا ہو۔ رواہ مسلم فی حدیث عمرو بن العاص۔ بعض کے نزدیک مِنْ ذُنُوْبِكُمْ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔ کیونکہ اسلام سے وہ گناہ معاف ہوتے ہیں جو براہ راست اللہ کے حقوق سے متعلق ہوں، انسانوں کے حقوق معاف نہیں ہوتے۔ ایک عالم کا قول ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں کافروں کو خطاب ہے وہاں مِنْ ضرور آیا ہے اور جہاں مؤمنوں کو خطاب ہے وہاں مِنْ نہیں ہے اس تفریق کی یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ کافروں کے خطاب میں جو مغفرت کا اظہار کیا گیا ہے وہ شرط ایمان پر مبنی ہے اور مسلمانوں کے خطاب میں جو مغفرت کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا جوڑ طاعت اور اجتناب عن المعصیۃ کے ساتھ ہے پس ادائے طاعت اور گناہ سے اجتناب کے ذیل میں حقوق انسانی کی ادائیگی اور معاملات باہمی میں حق تلفی سے اجتناب بھی داخل ہے اس لئے خطاب حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کو شامل ہے۔

وَيُؤَخِّرَكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ　اور تم کو ایک معین وقت تک چھوڑے رکھے اجل مسمّٰی یعنی وہ وقت جو اللہ نے زندگی کا مقرر کر دیا ہے۔ اس معین وقت تک اللہ تم کو چھوڑے رکھے گا عذاب دینے میں جلدی نہیں کرتا۔

اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جن سابق قوموں کو کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے ہلاک کیا گیا ان کی ہلاکت کفر پر اصرار رکھنے کے ساتھ مشروط تھی اور یہ قضاء ہلاکت معلق تھی اگر وہ ایمان لے آتے تو ان کی عمریں طویل ہو جاتیں (اور انتہائے عمر سے پہلے ہلاک نہ ہوتے)

قَالُوْٓا اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۭ　کافروں نے (پیغمبروں سے) کہا تم تو بس ہماری طرح آدمی ہو۔ یعنی تمہاری حقیقت اور صورت انسانوں جیسی ہے تم کو ہم پر کوئی (خلقی) برتری حاصل نہیں ہے پھر خصوصیت کے ساتھ تمہارے پیغمبر ہونے کی کوئی وجہ نہیں اگر انسانوں کی ہدایت کے لئے اللہ کو کوئی نبی اور رسول بھیجنا ہی تھا تو اس نوع میں سے بھیجتا جو نوع انسان سے افضل ہوتی۔ دوسری آیت میں کافروں کا اسی مضمون کا قول نقل کیا ہے فرمایا ہے لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً۔

تُرِيدُونَ أَنْ تَصُدُّونَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ آبَاؤُنَا فَأْتُونَا بِسُلْطَانٍ مُبِينٍ ⑩
(اس دعوت سے) تمہارا مقصد یہ ہے کہ جن معبودوں کی ہمارے اسلاف پرستش کرتے تھے ان کی پرستش سے ہم کو روک دو (اگر یہی بات ہے) تو کوئی کھلی ہوئی دلیل پیش کرو۔ جس سے تمہاری فضیلت اور عزتِ نبوت کا استحقاق ثابت ہو یا مراد یہ ہے کہ ایسی واضح حجت پیش کرو جس سے تمہارا دعوائے نبوت ثابت ہو سکے۔ کافروں نے واضح معجزات کو نہیں مانا اور محض عناد اور ضد کے زیر اثر مزید واضح دلائل کی طلب کی۔

قَالَتْ لَهُمْ رُسُلُهُمْ إِنْ نَحْنُ إِلَّا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَمُنُّ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ
کافروں سے ان کے پیغمبروں نے کہا بے شک ہم تمہاری ہی طرح آدمی ہیں لیکن اللہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فضل کرتا ہے۔ یعنی نبوت اور دوسری نعمتیں عنایت کرتا ہے انبیاءؑ نے عام نوع بشری سے اپنا اشتراک تسلیم کرتے ہوئے اختصاصِ نبوت کو اللہ کا فضل وانعام بیان کیا۔

وَمَا كَانَ لَنَا أَنْ نَأْتِيَكُمْ بِسُلْطَانٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ　اور ہمارے لئے ممکن نہیں کہ اللہ کی مشیت کے بغیر ہم تمہارے سامنے کوئی دلیل لا سکیں۔ یعنی اپنے اختیار اور قابو سے معجزات پیش کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں کہ ہم تمہاری درخواست پوری کریں اس کا مدار تو اللہ کی مشیت پر ہے وہی ہر نبی کو ایسے اور اتنے معجزات عطا فرماتا ہے جن سے نبوت کا ثبوت ہو جائے۔

وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ⑪　اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہئے۔ اس کلام سے انبیاء نے دوسرے ساتھی ایمانداروں کو ہدایت کر دی کہ کافروں کے مقابلے میں تم کو اللہ پر اعتماد کرنا چاہئے اور اپنے توکل علی اللہ کا بھی اظہار کر دیا۔ آیت سے درپردہ وہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اللہ پر ہی بھروسہ رکھنا تقاضاء ایمان ہے کیونکہ مؤمن کا جب یہ پختہ عقیدہ ہو جاتا ہے کہ خیر وشر کو پیدا کرنے والا اور نفع وضرر پہنچانے والا اللہ کے سوا اور کوئی نہیں تو لازمی طور پر وہ اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کر دیتا ہے۔

وَمَا لَنَا أَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللَّهِ وَقَدْ هَدَانَا سُبُلَنَا ۚ　اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اللہ پر بھروسہ نہ رکھیں جب کہ اسی نے ہم کو ہماری راہیں دکھادی ہیں جن کی وجہ سے ہم جانتے اور پہچانتے ہیں کہ تمام امور اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں ہیں۔

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا ۚ　اور ہم (اور ہمارے مؤمن ساتھی) ضرور تمہاری طرف سے ایذا رسانیوں پر صبر کریں گے یہ محذوف قسم کا جواب ہے پہلے انبیاء نے اللہ پر توکل کرنے اور کافروں کی طرف سے بے نیازی کا اظہار کیا اور اس کلام سے اس کو پختہ کر دیا۔

وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ⑫　اور اہلِ توکل کو اللہ ہی پر توکل کرنا لازم ہے یعنی ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اللہ ہی پر توکل کریں۔

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِنْ أَرْضِنَا أَوْ لَتَعُودُنَّ فِي مِلَّتِنَا ۖ　اور کافروں نے اپنے پیغمبروں سے کہا ہم تم کو اپنی زمین (بستی، شہر وغیرہ) سے ضرور نکال باہر کر دیں گے یا تم کو ہمارے مذہب میں ضرور لوٹ کر آنا ہوگا۔ یعنی اپنا مذہب چھوڑ کر ہمارے مذہب میں آنا ہوگا۔ لوٹ کر آنے سے مراد ہے اپنا مذہب چھوڑ کر کافروں کے دین میں آنا کیونکہ پیغمبر کبھی کافروں کے مذہب پر پہلے بھی نہ تھے اس لئے لوٹنے سے مراد دوبارہ کفر اختیار کرنا نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ مخاطب تمام مؤمن ہوں، پیغمبر بھی اور ان پر ایمان لانے والے رُفقاء بھی۔ جماعت کو بطورِ تغلیب خطاب کیا گیا (پیغمبروں پر ایمان لانے والے پہلے کفر پر تھے، کر چھوڑ کر ایمان لائے تھے اور پیغمبر کبھی کافر نہ تھے اس لئے خطاب تو پیغمبروں کو کیا مگر روئے خطاب دوسرے مؤمنوں کی طرف ہے کہ تم کو دوبارہ اپنے اصلی مذہب کی طرف لوٹنا لازم ہے ورنہ ہم

ع ۱۴

تم کو نکال دیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لفظ اَوْ کا معنی اِلَّا اَنْ (ورنہ) یا اِلٰی اَنْ (یہاں تک) ہو اس وقت دھمکی کا تعلق صرف اخراج سے ہوگا مطلب اس طرح ہوگا کہ ہم تم کو اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ، یا یہاں تک کہ تم ہمارے مذہب میں لوٹ آؤ۔

فَاَوْحٰۤى اِلَیْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۱۳﴾ پس پیغمبروں کے رب نے ان کے پاس وحی بھیجی کہ ہم ظالموں کو ضرور ہلاک کردیں گے۔ یعنی ہم نے وحی بھیجی اور کہہ دیا۔

وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ۭ اور (کافروں کے گھروں اور) ان کی زمین میں ان کے بعد تم کو (یعنی پیغمبروں کو اور مؤمنوں کو) ضرور بسائیں گے۔ ان کے بعد سے مراد ان کو ہلاک کرنے کے بعد۔

ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ ﴿۱۴﴾ (میری) یہ (رحمت وعنایت) اس شخص کے لئے ہوگی جو (قیامت کے دن) میرے سامنے کھڑے ہونے کا ڈر رکھتا ہو اور میرے عذاب کی وعید سے (یا میرے موعود عذاب سے جو کافروں کے لئے مقرر ہے) خوف کرتا ہے۔

مَقَامِیْ سے مراد ہے اللہ کے سامنے قیامت کے دن کھڑا ہونا لفظ "مقام" کا اسی معنی میں استعمال آیت وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ میں بھی ہوا ہے۔ یا "مقام" سے مراد ہے قیام یعنی اعمال کی نگہداشت۔ مطلب یہ ہے کہ میں جو اعمال کو محفوظ رکھتا ہوں اور ہر عمل میری نگہداشت میں ہے مؤمن اس سے ڈرتا ہے (اور حفظِ اعمال پر یقین رکھتا ہے) بعض علماء نے کہا "مقام" کا لفظ زائد ہے یعنی جو شخص مجھ سے ڈرتا ہے۔

وَاسْتَفْتَحُوْا اور انہوں نے (یعنی انبیاء نے اللہ سے دشمنوں پر) فتح پانے کی دعا کی یہی مضمون آیت رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ میں بھی آیا ہے اِسْتَفْتَحُوْا کا عطف اَوْحٰی پر ہے اور ضمیر انبیاء کی طرف لوٹ رہی ہے (اسی کے موافق ہم نے ترجمہ کیا ہے) ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے یہی قول نقل کیا ہے اور قتادہ کا بھی یہی قول ہے یعنی جب انبیاء قوم کے ایمان لانے سے مایوس ہوگئے تو انہوں نے فتح پانے اور کافروں پر عذاب نازل ہونے کی دعا کی۔ حضرت نوحؑ نے کہا رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ دَیَّارًا اور حضرت موسیٰؑ نے کہا رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰۤى اَمْوَالِهِمْ حضرت ابن عباسؓ اور مقاتل کا قول ہے کہ اِسْتَفْتَحُوْا کی ضمیر کافروں کی طرف لوٹ رہی ہے کافروں کا اسی مضمون کا قول دوسری آیت میں بھی آیا ہے کافروں نے کہا تھا اَللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ اگر یہ ہی تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کردے۔ بعض اہل تفسیر نے کہا اِسْتَفْتَحُوْا کی ضمیر دونوں فریقوں کی طرف راجع ہے "اہل حق اور اہلِ باطل" دونوں نے دعا کی کہ سچے کو فتح دی جائے اور باطل پرست کو تباہ کردیا جائے كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ ہر فریق اپنے مسلک پر مگن تھا۔

وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ ﴿۱۵﴾ اور ہر ظالم سرکش ناکام ہوگیا۔ اس کا عطف محذوف کلام پر ہے یعنی مؤمن کامیاب ہوئے اور نامراد وتباہ ہوگیا ہر سرکش مغرور۔ صاحبِ قاموس نے جبّار کا ترجمہ سرکش اور عنید کا ترجمہ مغرور سے کیا ہے۔ تجبّر کا معنی ہے تکبّر یعنی بڑا ہونا (خواہ برحق ہو یا ناحق) اللہ جبّار ہے یعنی برحق اس کے اندر کبریائی ہے اور ہر سرکش بھی جبّار ہے یعنی اس کی بزرگی کا دعویٰ تو ہے مگر غلط اور ناحق یا جبّار ایسے شخص کو کہتے ہیں جس کے دل میں رحم کا گزر بھی نہ ہو اور ناحق خون ریزی کرتا ہے یا جبّار ایسے شخص کو کہتے ہیں جو انتہائی غرور کی وجہ سے کسی کا اپنے اوپر کوئی حق نہ سمجھے (اور ہر ذمہ داری سے اپنی ذات کو بالا قرار دے) بغوی نے لکھا ہے کہ جبّار اس کو کہتے ہیں جو اپنی ذات سے اعلیٰ اور بالا کسی کو نہ سمجھے جبریّۃ (مصدر ہے) انتہائی بزرگی کی طلب کہ اس سے اونچی کوئی چیز نہ ہو اسی معنی کی وجہ سے اس صفت کا استحقاق صرف حق تعالیٰ کو ہے اس کے سوا جو بھی اس صفت کا دعویٰ کرے گا وہ مستحقِ لعنت وہلاکت اور نامراد ہوگا۔ بعض علماء نے کہا جبّار اس کو کہتے ہیں جو مخلوق کو اپنے حکم پر چلنے کے لئے مجبور کرے۔ اور عَنِیْد کا معنی ہے حق سے عناد رکھنے والا اور سچائی سے بیزار ہونے والا۔

قاموس میں ہے عَنَدَ دانستہ حق کی مخالفت کی۔ عَنید و عاند حق کی دانستہ مخالفت کرنے والا۔ حضرت ابن عباسؓ نے عنید کا ترجمہ کیا حق سے روگردانی کرنے والا مقاتل نے کہا عنید متکبّر کو کہتے ہیں قتادہ نے کہا عنید وہ شخص ہے جو لاالٰہ الااللہ کا انکار کرے۔

مِنْ وَّرَآئِهٖ جَهَنَّمُ اس کے پیچھے یعنی اس کے مرنے کے بعد اس کے لئے جہنم ہے۔ مقاتل نے یہی ترجمہ کیا ہے یا یہ مراد ہے کہ اس کے سامنے جہنم ہے دنیا میں گویا وہ جہنم کے کنارے پر کھڑا ہوا ہے۔ جہنم، اس کی گھات میں ہے آخرت میں اس کو جہنم کی طرف بھیج دیا جائے گا ابو عبیدہ نے کہا وَرَآءَ کا ترجمہ ہے آڑ۔ یہ لفظ اضداد میں سے ہے آگے اور پیچھے دونوں اس کے معنی ہیں۔

وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ ﴿۱۶﴾ اور اس کو پانی یعنی کچ لہو پلایا جائے گا "صدید" وہ پانی جو دوزخیوں کے جوف اور کھالوں سے بہے گا اور پیپ وخون اس میں آمیختہ ہو گا۔ محمد بن کعب نے کہا جو پانی زناکاروں کے اعضاء نہانی سے بہے گا وہ کافروں کو پلایا جائے گا۔ بر قولِ بیہقی مجاہد نے "صدید" کا ترجمہ کیا پیپ وخون (کچ لہو)۔

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن جریر ابن ابی حاتم، ابن المنذر، بیہقی بغوی نے اور ابن ابی الدنیا نے صفتہ النار میں اور حاکم نے اپنی صحیح اسناد سے حضرت ابو امامہ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے سلسلہ میں فرمایا، صدید کو دوزخی کے قریب لایا جائے گا تو اس کو برداشت نہ ہو گی اور زیادہ قریب لایا جائے گا تو اس کے چہرہ کو بھون ڈالے گا اس کے سر کی کھال گر پڑے گی جب اس کو پیئے گا تو انتڑیوں کاٹ کر دُبر سے نکل جائے گا پس اللہ فرمائے گا وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ۔

يَّتَجَرَّعُهٗ وہ گھونٹ گھونٹ کر کے اس کو پیئے گا یعنی تکلّف کے ساتھ تھوڑا تھوڑا پیئے گا (بدبو، بدمزگی اور ناگواری کی وجہ سے پینے کے طریقے سے نہ پی سکے گا)

وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ اور آسانی کے ساتھ ان کو نگل نہ سکے گا۔ بلکہ وہ صدید اس کے حلق کا پھندا بن جائے گا آسانی سے اندر نہ اترے گا اور یونہی کافر طول عذاب میں مبتلا رہے گا۔ سَوْغ (مصدر) کا معنی ہے آسانی کے ساتھ کسی پینے کی چیز کا حلق سے اتر جانا اور طبیعت کا اس کو (خوش گواری کے ساتھ) قبول کر لینا۔ قاموس میں ہے سَاغَ الشَّرَابُ سَوْغًا آسانی کے ساتھ پینے کی چیز کو حلق میں اتار لیا۔

وَيَاْتِيْهِ الْمَوْتُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ اور موت (یعنی تکلیفیں اور قسم قسم کے عذاب) ہر طرف سے اس پر آئیں گے یعنی ہر طرف سے اس کو طرح طرح کا عذاب گھیر لے گا۔ یَاْ الموت" سے مراد موت کی سختیاں اور شدائد ہیں اور کل مکان سے مراد ہے جسم کا ہر حصہ یعنی ہر حصۂ جسم سے اس پر موت کی سختیاں آئیں گی۔ ابن ابی شیبہ، ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابراہیم تیمی کا قول نقل کیا ہے کہ ہر (بن) مو سے اس پر موت (کی شدّت) آئے گی۔

وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ ط اور وہ مردہ نہ ہو گا کہ تکلیف سے چھوٹ جائے۔ ابن جریج نے کہا سانس گلے میں اٹکی رہے گی نہ منہ سے باہر نکلے گی نہ اندر ہی اترے گی۔ ابن المنذر نے فضیل بن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ اس سے مراد سانس کا (گلے میں) بند ہو جانا ہے۔

وَمِنْ وَّرَآئِهٖ عَذَابٌ غَلِيْظٌ ﴿۱۷﴾ اور اس (عذاب) کے بعد اس سے بھی سخت عذاب ہو گا۔ بعض علماء نے کہا کہ عذاب غلیظ سے مراد ہے دوزخ میں ہمیشہ رہنا کبھی نہ نکلنا۔

بعض اہل علم کہتے ہیں کہ آیت اِسْتَفْتَحُوْا کا انبیاء کے قصہ سے کوئی تعلق نہیں یہ بالکل الگ آیت ہے اور اس کا نزول مکہ والوں کے متعلق ہوا اہلِ مکہ رسول اللہ ﷺ کی بددعا سے قحط میں مبتلا ہو گئے تھے اس لئے انہوں نے فتح یعنی بارش کے لئے اللہ سے دعا کی مگر اللہ نے انکی مراد پوری نہیں کی اور بجائے پانی کے دوزخ میں دوزخیوں کے جوف کا گندہ پانی پلائے جانے کی وعید سنا

دی۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ جن لوگوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا ان کی تعجب آفریں حالت ایسی ہے۔ ''مثل'' سے مراد ہے ایسی صفت جس میں نُدرت ہو۔

اَعْمَالُهُمْ كَرَمَادِ ۨاشْتَدَّتْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ يَوْمٍ عَاصِفٍ (یعنی) ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے کچھ راکھ جس کو تیز آندھی کے دن ہوا تیزی کے ساتھ اُڑا لے جائے۔ عَصُوف ہوا کا تیز چلنا (عَاصِف تیز چلنے والی ہوا) دن کو عاصف بطورِ مبالغہ قرار دیا گیا جیسے نہارہ صائم اور لیلہ نائم کہا جاتا ہے (آدمی دن میں روزہ رکھتا ہے اور رات کو سوتا ہے دن کو روزہ دار اور رات کو سونے والا بطور مجاز کہا جاتا ہے) اعمال سے مراد ہیں کافروں کی وہ خود تراشیدہ نیکیاں جن کے ثواب کے وہ امیدوار تھے، جیسے (ان کی مفروضہ) خیرات، کنبہ پروری، اعانتِ فقراء، آزادی غلاماں وغیرہ۔ ان تمام کارہائے خیر کی بنیاد چونکہ خداشناسی پر نہ تھی اور ان سے اللہ کی خوشنودی مطلوب نہیں تھی یا بتوں کے نام پر یہ نیکیاں کی جاتی تھیں جو ان کے کسی عمل اور عبادت سے واقف نہ تھے اور نہ بدلہ دینے کی ان میں طاقت تھی اس لئے اللہ نے ایسی خوش اعمالیوں کو آندھی کی خاک سے تشبیہ دی جس کو آندھی اڑا کر لے جاتی ہے۔

لَا يَقْدِرُوْنَ مِمَّا كَسَبُوْا عَلٰى شَيْءٍ انہوں نے (دنیا میں) جو کچھ کیا ہو گیا (قیامت کے دن) اسکے کسی حصہ پر قادر نہ ہوں گے۔ یعنی کسی عمل کا کوئی ثواب نہ پائیں گے نام ونشان بھی کسی نیکی کا انکو نظر نہ آئے گا۔ اس تشبیہ کا خلاصہ یہی ہے۔

ذٰلِكَ یہ یعنی نیکی سمجھ کر کسی کام کو کرنا اور پھر اس نیکی کا برباد ہو جانا اور نیکی کا گمراہی پر مبنی ہونا۔

هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۸﴾ (پرلے درجہ کی) حق سے بہت دور کی گمراہی ہے۔ بدکاریوں کا گمراہی ہونا تو درکنار ان کی تو نیکیاں بھی گمراہی ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ کیا آپ نہیں جانتے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا ہے ''حق'' سے مراد ہے حکمتِ کاملہ اور وہ طریقہ جو کائنات کی تخلیق کے لئے مناسب تھا اس جہان بالاو پست کی یہی پُر حکمت تخلیق حق وباطل میں امتیاز کا راستہ بتاتی اور صانعِ حکیم کی واحد ہستی کو ثابت کرتی ہے۔

اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ وَيَاْتِ بِخَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۹﴾ اگر وہ چاہے تو تم کو (دنیا سے) لے جائے (تم کو معدوم کر دے) اور نئی مخلوق پیدا کر دے جو تم سے زیادہ فرماں بردار ہو جس نے یہ آسمان وزمین حکمت سے پیدا کئے ایسا بڑا قادر اس بات پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم کو دنیا سے معدوم کر دے اور تمہاری جگہ کوئی نئی مخلوق پیدا کر دے۔

وَّمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ ﴿۲۰﴾ اور یہ بات اللہ کے لئے کچھ بھی دشوار نہیں ہے وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ایسا نہیں ہے کہ ایک چیز پر وہ قادر ہو اور دوسری چیز اسکی قدرت سے خارج ہو۔ اور جو ایسا قادر مطلق ہو وہی مستحق ہے اس امر کا کہ اسی کی پرستش اور اطاعت کی جائے اور اسی سے ثواب کی امید رکھی جائے اور اسی کی ناراضگی سے خوف کیا جائے۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ جَمِيْعًا اور اللہ کے حکم سے (اور حساب فہمی کے لئے) سب کے سب (اپنی قبروں سے) باہر نکل آئے (یعنی قیامت کے دن یقیناً قبروں سے نکل آئیں گے گویا نکل ہی آئے)

فَقَالَ الضُّعَفٰٓؤُا پس کہیں گے کمزور (نچلے طبقہ کے) لوگ کمزور سے مراد ہیں مال ودولت میں کمزور یا عقل ودانش میں کمزور۔

لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا ان لوگوں سے جو (دنیا میں) بڑے بن بیٹھے تھے۔ یعنی ان سرداروں اور لیڈروں سے کہیں گے جو پیغمبروں کے اِتباع سے روکتے تھے۔

اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا ہم تو بلاشبہ تمہارے تابع حکم تھے تم نے پیغمبروں کی تکذیب اور ان سے اعراض

کرنے کا حکم دیا تھا ہم تمہارے حکم پر چلے۔ تَبَعً تابع کی جمع ہے۔

فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ پس کیا (تم) ہم سے اللہ کے عذاب کا کچھ حصہ بھی دفع کر دو گے۔ مِنْ عَذَابِ اللّٰهِ میں مِنْ بیانیہ اور مِنْ شَیْءٍ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔

قَالُوْا لَوْ هَدٰىنَا اللّٰهُ لَهَدَیْنٰكُمْ ؕ وہ کہیں گے اگر اللہ ہم کو (ایمان کی) ہدایت نصیب کر دیتا تو ہم تم کو ہدایت پر آنے کی دعوت دے دیتے۔ لیکن ہم گمراہ تھے سو ہم نے تم کو بھی گمراہ کر دیا جو چیز اپنے لئے پسند کی تھی وہی تمہارے لئے بھی پسند کی، یا یہ مطلب ہے کہ ہم تم کو آگ کے کنارے پر لے آئے اب اگر اللہ عذاب سے بچنے کا کوئی طریقہ ہم کو بتا دیتا تو ہم تم کو وہی راستہ بتا دیتے اور تم کو عذاب سے بچا لیتے مگر نجات کا راستہ تو خود ہمارے لئے بھی بند کر دیا گیا۔

سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ ﴿۲۱﴾ ع ۱۵ ہم بے قراری کریں یا صبر کریں اب ہمارے لئے دونوں باتیں برابر ہیں (کوئی سود مند نہیں) ہمارے لئے بچنے اور بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ مَحِیْص اسم ظرف ہے حیصٌ مصدر حیص کا معنی بھاگنے کے لئے مڑنا یا مَحِیْص مصدر ہے جیسے مغیب۔ یہ جملہ یا سرداروں کے کلام کا جز ہے یا دونوں فریقوں کا مقولہ ہے۔ مقاتل کا قول ہے کہ کافر دوزخ کے اندر سب مل کر پانچ سو برس تک فریاد وزاری کریں گے لیکن کوئی حاصل نہ ہوگا پھر پانچ سو برس تک صبر کریں گے پھر بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اس وقت کہیں گے سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ۔

ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن مردویہ نے حضرت کعب بن مالکؓ کی مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ دوزخی کہیں گے آؤ ہم صبر کریں (شاید اللہ کو رحم آجائے) چنانچہ پانچ سو برس تک صبر کریں گے اور جب یہ دیکھیں گے کہ کوئی نتیجہ نہیں نکلا تو کہیں گے سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَا الخ

محمد بن کعب قرظی کا بیان ہے کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ دوزخی دوزخ کے منتظمین سے کہیں گے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ یُخَفِّفْ عَنَّا یَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ "اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن ہی ہمارے عذاب میں تخفیف کر دے" منتظمین دوزخ جواب دیں گے اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَیِّنٰتِ "کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر احکامِ واضحہ لے کر نہیں پہنچے تھے" دوزخی کہیں گے پہنچے کیوں نہ تھے، اس پر منتظمین جواب دیں گے اُدْعُوْا وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ "تم خود دعا کرو کافروں کی دعا کا سوائے ناکامی کے اور کچھ نتیجہ نہیں"۔ جب وہ ناامید ہو جائیں گے تو کہیں گے یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ "اے مالک (داروغہ جہنم) تمہارا رب تو ہمارا کام تمام ہی کر دے" (یعنی موت ہی دے دے تو اس عذاب سے چھوٹ جائیں) مالک ان کو اسّی برس تک کوئی جواب نہیں دے گا۔ اسّی برس میں ہر سال تین سو ساٹھ دن کا ہی ہوگا لیکن ہر دن ہزار برس کا ہوگا (یعنی ہمارے ہزار برس کے برابر ہوگا) اسّی برس کے بعد جواب دے گا تم کو یہیں رہنا ہوگا جب وہ ناامید ہو جائیں گے تو ایک دوسرے سے کہے گا تم پر جو مصیبت آنی تھی وہ آ ہی گئی (اب جزع فزع کرنا بیکار ہے) ہم کو صبر کرنا چاہئے، ممکن ہے صبر سے کچھ اچھا نتیجہ نکل آئے جس طرح دنیا میں جن لوگوں نے اللہ کی اطاعت پر صبر کیا تھا اور ہر دکھ کو برداشت کیا تھا تو ان کو (آج) فائدہ ہوا۔ غرض بالاتفاق (مجبوراً) صبر کریں گے اور طویل مدت تک صبر رکھیں گے (مگر بے سود) پھر جزع فزع کریں گے اور طویل مدت تک کریں گے (لیکن کچھ نتیجہ نہ ہوگا) آخر پکار اٹھیں گے سَوَآءٌ عَلَیْنَاۤ اَجَزِعْنَاۤ اَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَّحِیْصٍ یعنی کوئی بچنے کا مقام نہیں۔ اس کے بعد ابلیس کھڑا ہو کر انکو خطاب کرے گا اور کہے گا اللہ نے بلاشبہ تم سے سچا وعدہ کیا تھا اور میں نے جو وعدے تم کو دیئے تھے ان کے خلاف ہوا مگر تم پر میری کوئی زبردستی نہ تھی میں نے تو تم کو صرف دعوت دی تھی تم نے میری دعوت مان لی۔ لہٰذا آج مجھے ملامت نہ کرو خود اپنے کو ملامت کرو[1] ابلیس کا یہ کلام سن کر لوگوں کو خود اپنے سے نفرت ہو جائے گی اس پر

---

[1] اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ وَوَعَدْتُّكُمْ فَاَخْلَفْتُكُمْ وَمَا كَانَ لِیَ عَلَیْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّاۤ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ط

ندا آئے گی جتنی نفرت تم کو (آج) اپنے سے ہے اس سے زیادہ نفرت اللہ کو تم سے اس وقت تھی جب تم کو ایمان کی دعوت دی جا رہی تھی اور تم انکار کر رہے تھے[۱] یہ ندا سنکر وہ پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب (نبیؐ کے قول اور تیرے وعدے کی سچائی) ہم نے دیکھ لی اور سن لیا اب ہم کو (دنیا میں) پھر لوٹا دے ہم اچھے عمل کریں گے ہم کو یقین آ گیا[۲] اللہ ان کی تردید میں فرمائے گا وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ ھُدٰاھَا۔ وہ تیسری مرتبہ پکاریں گے۔ اے ہمارے رب ہم تیری دعوت قبول کریں گے اور پیغمبروں کا بھی اتباع کریں گے تو تھوڑی مدت کو ہم کو مہلت دے دے[۳] اللہ فرمائے گا کیا تم نے اس سے پہلے قسم کھا کر نہ کہا تھا کہ ہم کو فنا نہیں[۴] پھر وہ چوتھی مرتبہ پکاریں گے اے ہمارے رب تو ہم کو (یہاں سے) نکال دے ہم جو کام پہلے کر چکے ہیں ان کے سوا دوسرے عمل کریں گے[۵] اللہ ان کے رد میں فرمائے گا کیا ہم نے تم کو ایسی اور اتنی زندگی نہیں دی تھی کہ اس میں جو نصیحت پکڑنے والا تھا نصیحت پکڑ لیتا اور کیا تمہارے پاس ڈرانے والا نہیں پہنچا تھا[۶] پھر ایک مدت تک توقف کرنے کے بعد اللہ اُنسے فرمائے گا کیا میرے احکام تم کو پڑھ کر نہیں سنائے گئے تھے اور تم ان کی تکذیب کرتے تھے[۷] یہ بات سنکر وہ کہیں گے کیا ہم پر آئندہ ہمارا رب رحم (بالکل) نہیں کرے گا۔ اس کے بعد پکار اٹھیں گے اے ہمارے رب ہم پر ہماری بدبختی غالب آ گئی تھی ہم لوگ گمراہ ہو گئے تھے اے ہمارے رب (اب کی بار) ہم کو یہاں سے نکال لے اگر پھر ہم نے دوبارہ ایسا کیا تو ہم بلاشبہ ظالم ہوں گے[۸] اللہ فرمائے گا اس میں ذلت کے ساتھ رہو مجھ سے بات بھی نہ کرو[۹] اس وقت وہ بالکل مایوس ہوں گے اور دعا کا سلسلہ ختم ہو جائے گا اور باہم نوحہ کریں گے اور دوزخ کا پٹ بند کر دیا جائے گا۔

وَقَالَ الشَّیْطٰنُ لَمَّا قُضِیَ الْاَمْرُ　جب معاملہ کا فیصلہ ہو چکا تو شیطان (ابلیس) نے کہا یعنی فیصلہ سے فراغت ہو چکے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو چکیں گے تو شیطان کافروں سے کہے گا۔ مقاتل نے کہا شیطان کے لئے ایک تخت رکھا جائے گا تمام کفار اپنے پیشواؤں کے ساتھ اس کے پاس جمع ہوں گے اور جن و انس دونوں قسم کے بدبختوں میں وہ تقریر کرے گا۔

ابن جریر، ابن مردویہ، ابن ابی حاتم، بغوی، طبرانی اور ابن المبارک نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب اللہ اگلوں پچھلوں کو سب کو جمع کر کے ان کا فیصلہ کر چکے گا تو اہلِ ایمان کہیں گے ہمارے رب نے ہمارے درمیان فیصلہ کر دیا اب کوئی شخص ایسا ہو جو ہمارے رب سے ہماری سفارش کر دے، لوگ کہیں گے آدمؑ ایسے ہو سکتے ہیں اللہ نے اپنے ہاتھ سے ان کو بنایا تھا اور ان سے کلام کیا تھا چنانچہ سب لوگ جا کر حضرت آدمؑ سے گزارش کریں گے کہ ہمارا رب ہمارا فیصلہ کر چکا اور حکم جاری کر چکا اب آپ اُٹھ کر ہماری شفاعت کر دیجئے۔ حضرت آدمؑ کہیں گے نوحؑ کے پاس جاؤ۔ لوگ حضرت نوحؑ کے پاس جائیں گے۔ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ کے پاس جانے کی ہدایت کر دیں گے لوگ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جائیں گے آپ حضرت موسیٰؑ کا راستہ بتا دیں گے لوگ حضرت موسیٰؑ کے پاس جائیں گے۔ آپ حضرت عیسیٰؑ کا حوالہ

۱۔ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ۔
۲۔ رَبَّنَآ اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔
۳۔ رَبَّنَآ اَخِّرْنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ نُّجِبْ دَعْوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ۔
۴۔ اَوَلَمْ تَكُوْنُوْٓا اَقْسَمْتُمْ مِّنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِّنْ زَوَالٍ۔
۵۔ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ۔
۶۔ اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَآءَكُمُ النَّذِيْرُ۔
۷۔ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔
۸۔ رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَآلِّيْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْهَا فَاِنْ عُدْنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوْنَ۔
۹۔ اِخْسَئُوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ۔

دے دیں گے جب لوگ حضرت عیسیٰ کے پاس پہنچیں گے تو آپ کہیں گے میں تم کو پتہ بتاتا ہوں تم نبی امی عربی ﷺ کے پاس جاؤ وہ سب سے زیادہ صاحبِ فخر (فضیلت) ہیں آخر لوگ میرے پاس آئیں گے اور اللہ مجھے کھڑے ہو کر گزارش کرنے کی اجازت دے گا پھر میری مجلس ایک بے نظیر پاکیزہ ترین خوشبو سے مہکا دی جائے گی ایسی مہک ہو گی کہ کسی نے ایسی خوشبو نہیں سونگھی پھر میں اپنے رب کے سامنے حاضر ہو کر شفاعت کروں گا اللہ میری شفاعت قبول فرمائے گا اور سر کے بالوں سے پاؤں کے ناخن تک مجھے نور ہی نور کر دے گا سر تا قدم میرے لئے نور کر دے گا۔ یہ بات دیکھ کر کافر کہیں گے مسلمانوں کو تو سفارشی مل گیا اور ہماری سفارش کون کرے، خود ہی جواب دیں گے اب تو ابلیس ہی جس نے ہم کو گمراہ کیا تھا ہمارے سامنے ہے اور کوئی سفارشی موجود ہی نہیں ہے چنانچہ یہ لوگ ابلیس سے جا کر کہیں گے مؤمنوں کو تو شفاعت کرنے والا مل گیا اب تو اٹھ کر ہماری شفاعت کر، تو نے ہی ہم کو گمراہ کیا تھا ابلیس جونہی اٹھے گا اس کی مجلس میں بدترین بُو اڑنے لگے گی ایسی بدبو تو کسی نے سونگھی ہی نہ ہو گی پھر ابلیس ان کو جہنم کی طرف لے جائے گا اور کہے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ وَعَدَكُمْ وَعْدَ الْحَقِّ بے شک اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا اس کو پورا کر دیا وعدہ سے مراد ہے دوبارہ زندہ کرنے اور بدلہ دینے کا وعدہ۔

وَوَعَدْتُّكُمْ اور میں نے تم سے (غلط) وعدہ کیا تھا کہ نہ دوبارہ زندگی ہو گی نہ حساب فہمی ہو گی اور دوبارہ زندگی ہوئی بھی تو بُت تمہاری سفارش کر دیں گے۔

فَاَخْلَفْتُكُمْ پس میں نے (آج) وعدہ کے خلاف کیا یعنی میرے وعدے کے خلاف واقعہ کا ظہور ہوا۔

وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اور میرا تم پر کوئی جبر نہ تھا کہ تم کو مجبور کر کے کفر و گناہ کی طرف کھینچ لیتا یا سلطان سے مراد ہے دلیل یعنی میں نے تم کو دعوت دی تھی مگر میری دعوت کی کوئی دلیل نہیں تھی میں تمہارے سامنے کوئی دلیل نہیں لایا تھا۔

اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ میں نے تم کو صرف دعوت دی کفر و معاصی کی طرف بہکاوا دے کر بلایا تھا اور میرا یہ بہکاوا کوئی دلیل نہ تھا۔

فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ پس تم نے میری بات مان لی۔ میری دعوت قبول کر لی اور جس نے حجتِ کاملہ پیش کی تھی اسکی بات ماننے سے تم نے انکار کر دیا۔

فَلَا تَلُوْمُوْنِيْ اب تم مجھے (میرے بہکانے پر) ملامت نہ کرو۔

وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اور اپنی جانوں کو ملامت کرو کہ تم نے میری اطاعت کی باوجودیکہ میرے پاس اپنے قول کی کوئی دلیل نہ تھی اور اپنے رب کی اطاعت نہیں کی۔

فرقۂ معتزلہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بندہ اپنے افعال کا خود (خالق) و مختار ہے مگر معتزلہ کا یہ استدلال غلط ہے آیت سے یہ مضمون ثابت نہیں ہوتا صرف اتنا ثابت ہوتا ہے کہ بندہ کی قدرت کو عمل میں کچھ دخل ہے اور اسی دخل کو اشاعرہ کسب کہتے ہیں۔ (پس خالقِ افعال اللہ ہے اور کاسب بندہ ہے)۔

مَآ اَنَا بِمُصْرِخِكُمْ تمہاری فریاد رسی نہیں کر سکتا کہ تم کو عذاب سے بچا لوں۔

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُصْرِخِيَّ اور نہ تم میری فریاد کو پہنچ سکتے ہو (کہ مجھے عذاب سے بچا لو)

اِنِّيْ كَفَرْتُ بِمَآ اَشْرَكْتُمُوْنِ مِنْ قَبْلُ میں خود تمہارے اس فعل سے بیزار ہوں کہ تم اس کے قبل (دنیا میں) مجھ کو خدا کا شریک بناتے تھے۔

بِمَا میں مَا مصدر ہے اور مِنْ قَبْلُ میں مِنْ کا تعلق اَشْرَكْتُمُوْنِ سے ہے مطلب یہ ہو گا کہ آج سے پہلے دنیا میں جو تم مجھ کو اللہ کے ساتھ عبادت و طاعت میں شریک کرتے تھے آج اس شرک کا میں انکار کرتا ہوں تمہاری اس حرکت سے بیزاری

کا اظہار کرتا ہوں۔ اسی مفہوم کی طرح دوسری آیت آئی ہے فرمایا وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ يَكْفُرُونَ بِشِرْكِكُمْ قیامت کے دن تمہارے معبود تمہارے شرک سے بیزار ہوں گے۔ یاما بمعنی مَنْ ہے جیسے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا اور سُبحان ما یسخر کن لنا میں اس وقت بین کا تعلق کَفَرْتُ سے ہوگا مطلب اس طرح ہوگا کہ جس خدا کے ساتھ تم نے مجھے طاعت میں شریک بنایا تھا یعنی میرے کہنے سے بتوں وغیرہ کی پوجا کی تھی میں تو تمہارے اس فعل شرک سے پہلے ہی اس خدا کا انکار کرچکا تھا اس نے مجھے آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تھا تو میں نے انکار کردیا تھا۔

اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۲﴾ بلا شبہ ظالموں کے لئے بڑے دکھ کا عذاب ہے۔ یہ ابلیس کے کلام کا جزء ہے یا اللہ کا کلام ہے اس قسم کی گفتگو کو نقل کرنے سے سننے والوں کو تنبیہ کرنی مقصود ہوتی ہے کہ وہ خود اپنی حساب فہمی کرلیں اور اپنے انجام پر غور کرلیں۔ اس طریقہ سے سننے والوں کے لئے پھر نزاکت اور لطیف پیام بیداری پیدا ہو جاتا ہے۔

وَاُدْخِلَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ

اور جو لوگ ایمان لے آئے اور نیک کام کئے ان کو یقیناً ایسی جنتوں میں داخل کیا جائے گا جن کے (درختوں اور عمارتوں کے) نیچے نہریں بہتی ہوں گی ان جنتوں میں وہ اپنے رب کے حکم سے ہمیشہ رہیں گے جنتیوں کو جنت میں لے جانے والے ملائکہ ہوں گے جو بحکم خداوندی جنت کے اندر ان کو لے جائیں گے۔

تَحِيَّتُهُمْ فِيْهَا سَلٰمٌ ﴿۲۳﴾ وہاں ان کو لفظ سلام کہہ کر سلام کیا جائے گا۔ یعنی ایک دوسرے کو سلام کرے گا اور فرشتے سب کو سلام کریں گے بعض نے کہا سلامتی کی تحیّت اللہ کی طرف سے ہوگی۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ ﴿۲۴﴾

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اللہ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمۂ طیّبہ (یعنی کلمۂ توحید وایمان) کی کہ وہ مشابہ ہے ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہے اور شاخیں اونچائی میں جا رہی ہیں۔

ضَرَبَ مَثَلًا مثل بیان کی قائم کی۔ مَثَل وہ کہاوت جو کسی چیز سے تشبیہ دینے کے لئے بیان کی جاتی ہے۔ کلمۂ طیّبہ سے مراد ہے کلمۂ توحید جو خلوص کے ساتھ ادا کیا جائے۔ شجرۂ طیّبہ سے مراد ہے قوی، بلند، خوش ثمر درخت۔

كَلِمَةً طَيِّبَةً: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا کی تفسیر ہے یا مثلاً سے بدل ہے اَصْلُهَا ثَابِتٌ یعنی اس کی جڑ زمین کے اندر مضبوط طور پر جمی ہوئی ہے جڑ کے سُوتے اور ریشے زمین کے اندر پھیلے ہوئے ہیں۔

فَرْعُهَا سے مراد ہے چوٹی یا شاخیں۔ مؤخر الذکر ترجمہ پر فرع اسم جنس ہوگا اور اضافت کی وجہ سے اس میں استغراق کا مفہوم ہو جائے گا۔

تُؤْتِيْ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا جو اپنے خالق کے ارادے اور تخلیق کی وجہ سے ہر (اس) وقت پھل دیتا ہے (جو اس کے رب نے پھل لانے کے لئے مقرر کر دیا ہے) کلمۂ طیّبہ کی بھی یہی حالت ہے مؤمن کے دل میں اس کی جڑ یعنی ایمان مضبوطی کے ساتھ قائم ہے جب یہ کلمہ زبان سے نکلتا ہے تو اوپر اٹھنے اور اللہ تک پہنچنے سے اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اللہ نے فرمایا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ اللہ ہی کی طرف پاکیزہ کلمہ چڑھتا ہے ترمذی نے حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ پڑھنا (قیامت کے دن) میزان (عدل) کا آدھا حصہ ہوگا اور الحمدللہ (پڑھنا) میزان کو نیکیوں سے بھر دے گا اور لا الٰہ الا اللہ کو (اللہ تک پہنچنے سے) کوئی مانع نہیں۔

ترمذی نے حسن کی سند سے حضرت ابوہریرہؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب بھی کوئی بندہ خلوص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے تو ضرور اس کے لئے آسمان کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ کلمہ عرش تک پہنچ جاتا ہے بشرطیکہ اس کا قائل کبیرہ گناہوں سے بچتا رہے۔ ترمذی، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا شجرۂ طیّبہ کھجور کا درخت ہے اور شجرۂ خبیثہ حنظل

(اندرائن) کا درخت ہے۔

لغت میں حِیۡنٍ کا معنی ہے "وقت" مجاہد اور عکرمہ کے نزدیک اس جگہ پورا سال مراد ہے کیونکہ درخت کھجور میں پورے سال پھل آتا ہے۔ سعید بن جبیرؓ قتادہ اور حسن بصریؒ کے نزدیک چھ مہینے کی مدت مراد ہے۔ یعنی گابا نکلنے کے وقت سے کھجور توڑنے کے وقت تک حضرت ابن عباسؓ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی جاتی ہے۔ بعض علماء کے نزدیک چار ماہ کی مدت مراد ہے۔ یعنی پھل بر آمد ہونے کے وقت سے پھل پکنے کا وقت سعید بن مسیبؒ نے کہا دو ماہ مراد ہیں یعنی کھجور کھانے کے قابل ہو جائے اس وقت سے لے کر توڑنے کے وقت تک۔ ربیع بن انسؓ نے کہا کُلَّ حِیۡنٍ سے مراد ہے ہر صبح شام کیونکہ کھجوریں ہر زمانہ میں اور ہر فصل میں اور ہر وقت کھائی جاتی ہیں صبح ہو یا شام گرمی کی فصل ہو یا سردی کا موسم چھواروں کی شکل میں اس کو کھایا جاتا ہے یا کھجوروں کی صورت میں یا نیم پخت حالت میں مؤمن کے عمل کی بھی یہی حالت ہے صبح و شام رات و دن اور درمیانی اوقات میں غرض ہر وقت نیک عمل اوپر چڑھتا ہے اور ایمان کی برکت کبھی منقطع نہیں ہوتی ہر وقت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا درختوں میں ایک درخت ایسا ہے جس کے پتے نہیں جھڑتے اور وہ مسلمان کی طرح ہوتا ہے بتاؤ وہ کون سا درخت ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا لوگوں کے خیالات صحرائی درختوں کی طرف جا پڑے اور میرے دل میں آیا کہ ایسا درخت کھجور ہوتا ہے مگر میں چھوٹا تھا اس لئے جھجکا (اور کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی) آخر حاضرین نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ حضور خود ہی بیان فرما دیں فرمایا وہ کھجور کا درخت ہے۔

بغوی نے لکھا ہے درخت کی تکمیل تین اجزاء سے ہوتی ہے زمین کے اندر جمے ہوئے ریشے تنہ اور شاخیں۔ ایمان کی تکمیل بھی تین ہی چیزوں سے ہوتی ہے (دل سے) تصدیق سے، زبان سے اقرار اور اعضاءِ جسم سے عمل۔

ابوظبیان نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا کہ شجرۂ طیبہ جنت کے اندر ایک درخت ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے (خلوص کے ساتھ) سبحان اللہ العظیم وبحمدہٖ کہا اس کے لئے کھجور کا ایک درخت جنت میں بو دیا جاتا ہے۔ (رواہ الترمذی)

وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۵﴾ اور اللہ لوگوں کے (فائدہ کے) لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ تمثیل نام ہے معانی کی تصویر کشی کا اور غیر محسوس کو حس کے قریب لے آنے کا۔ اس لئے تمثیلات سے مقصود کے سمجھنے میں آسانی اور نصیحت اندوزی میں سہولت ہو جاتی ہے۔

وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيْثَةٍ اور ناپاک کلمہ کی مثال ایسی ہے بظاہر کلمۂ خبیثہ سے مراد ہے وہ کلمۂ توحید و رسالت جو نفاق کے ساتھ کہا جائے اللہ کی رضامندی پیش نظر نہ ہو۔

كَشَجَرَةٍ خَبِيْثَةِ ۨ جیسے خراب درخت یعنی غیر مفید، ناکارہ درخت جس کی جڑ زمین کے اندر پیوست نہ ہو۔

اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ جس کو زمین کے اوپر سے ہی اکھاڑ لیا جائے اس کے سُوتتے زمین کے اوپر ہی رکھے ہوں۔

مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ ﴿۲۶﴾ (زمین کے اندر) اس کا جماؤ نہ ہو اسی طرح اس کلمہ کی حالت ہے جو رضائے الٰہی کے لئے نہ ہو۔ اس کا کبھی کوئی فائدہ نہیں ابن مردویہ نے بوساطت حبان بن شعبہ، حضرت انس بن مالکؓ کا قول بیان کیا کہ شجرۂ خبیثہ شربانہ ہے حضرت انسؓ سے پوچھا گیا شربانہ کیا ہے۔ فرمایا اندرائن۔ میں کہتا ہوں ظاہر یہ ہے کہ شجرۂ طیبہ کے اندر کھجور کا درخت بھی داخل ہے اور شجرۂ خبیثہ کا لفظ درخت حنظل کو بھی شامل ہے (خاص طور پر کھجور اور حنظل کے درخت مراد نہیں ہیں) اور حدیث میں جو طیبہ کی تشریح میں نخلہ اور خبیثہ کی تشریح میں حنظلہ آیا ہے وہ بطورِ تمثیل ہے۔ طیبہ اور خبیثہ کے بعض افراد کا ذکر بطورِ مثال کر دیا گیا ہے۔

يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ ۚ

اللہ ایمان والوں کو اس پکی بات (یعنی کلمۂ طیبہ) کی برکت سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے اور ظالموں (یعنی کافروں) کو (دین و امتحان میں) بچلا دیتا ہے۔ القول الثابت سے مراد ہے کلمۂ توحید جس کا اعتراف خلوص کے ساتھ کیا گیا ہو خلوصِ دل سے کلمۂ توحید کا اقرار دل میں جم جاتا ہے اور اس کا ثواب اللہ کے ہاں ثابت ہو جاتا ہے۔ دین کے معاملات میں دنیا کے اندر جو دکھ اور آلام اہلِ ایمان پر آتے ہیں ان کے ایمان کو نہیں ہلا سکتے وہ ایمان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہتے ہیں جیسے حضرت زکریاؑ حضرت یحییٰؑ حضرت جرجیسؑ حضرت شمعونؑ اصحاب اُخدود (جن کو گڑھوں میں آگ بھڑکا کر جھونک دیا گیا تھا یہ واقعہ یمن میں ہوا تھا اور شاہ ذونواس کے حکم سے ہوا تھا مترجم) حضرت جبیبؓ اور آپ کے ساتھی اور چاہِ معونہ والے (قاری جن کو دھوکہ سے شہید کیا گیا تھا مگر وہ اپنے ایمان پر قائم رہے) اور آخرت میں یعنی قبروں کے اندر نکیرین کے سوال کے وقت بھی اللہ ان کو اقرارِ توحید پر قائم رکھتا ہے۔ ظالمین سے مراد ہیں منافق اور کافر یہ لوگ آزمائش کے وقت ثابت قدم نہیں رہتے آغازِ مصیبت کے وقت ہی ان کے قدم پھسل جاتے ہیں اور آخرت میں تو ان کا گمراہ ہونا اور ثابت قدم نہ ہونا ظاہر ہی ہے۔

ائمۂ ستہ نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مسلمان سے جب قبر میں سوال کیا جاتا ہے تو وہ شہادت دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں آیت یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ کا یہی مطلب ہے، دوسری روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ کا نزول عذاب قبر کے سلسلہ میں ہوا۔ صاحبِ قبر سے کہا جائے گا تیرا رب کون ہے وہ جواب دے گا اللہ میرا رب ہے محمدؐ میرے پیغمبر ہیں (متفق علیہ)

ابو داؤد اور امام احمد کی روایت میں حدیثِ مذکورہ ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے (مردہ کے پاس) دو فرشتے آتے ہیں اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تیرا رب کون ہے وہ شخص جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے۔ فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے وہ جواب دیتا ہے میرا دین اسلام ہے۔ فرشتے کہتے ہیں وہ شخص کیسا تھا جس کو تمہارے اندر بھیجا گیا تھا وہ شخص جواب دیتا ہے وہ اللہ کے رسول تھے۔ فرشتے کہتے ہیں تجھے کیا معلوم وہ شخص کہتا ہے میں نے اللہ کی کتاب پڑھی اور میں نے اس کو مانا اور اس کو سچا جانا پس آیت يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (کی مراد) یہی ہے حضور ﷺ نے فرمایا پھر ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے میرے بندے نے سچ کہا اس کے لئے جنت کا بستر کر دو اور اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لئے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو۔ حضور ﷺ نے فرمایا پھر اس کے پاس جنت کی ہوائیں اور خوشبوئیں آنے لگتی ہیں اور حدِ نگاہ تک اس کے جنت کی وسعت کر دی جاتی ہے۔ کافر کی موت کا ذکر کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا اس کی روح بدن میں لوٹائی جاتی ہے دو فرشتے آکر اس کو بیٹھاتے ہیں اور پوچھتے ہیں تیرا رب کون ہے وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ مجھے نہیں معلوم فرشتے کہتے ہیں تیرا دین کیا ہے وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ مجھے نہیں معلوم۔ فرشتے کہتے ہیں وہ آدمی جو تمہارے پاس بھیجا گیا تھا اس کی کیا حالت تھی وہ کہتا ہے ہاہ ہاہ مجھے نہیں معلوم۔ پھر آسمان سے ایک منادی پکارتا ہے اس نے جھوٹ کہا اس کے لئے آگ کا بچھونا کر دو اور آگ کا لباس پہنا دو اور دوزخ کی طرف ایک دروازہ اس کے لئے کھول دو پھر دوزخ کی گرمی اور لُو اس پر آنے لگتی ہے اور اس کی قبر اتنی تنگ ہو جاتی ہے کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر نکل جاتی ہیں پھر اس کو عذاب دینے کے لئے ایک اندھے بہرے (فرشتہ) کو مقرر کر دیا جاتا ہے جس کے ہاتھ میں لوہے کا ایسا گرز ہوتا ہے کہ اگر اس کی ضرب پہاڑ پر پڑ جائے تو اس کو بھی خاک کر دے یہ فرشتہ گرز اس کافر پر مارتا ہے جس کی آواز آدمی اور جن کے علاوہ مشرق سے مغرب تک ہر چیز سنتی ہے گویا ضرب سے کافر خاک ہو جاتا ہے پھر دوبارہ اس میں جان ڈالی جاتی ہے۔

حضرت عثمانؓ راوی ہیں کہ مردہ کے دفن سے فارغ ہو کر رسول اللہ ﷺ اس کے پاس توقف فرماتے تھے اور ارشاد فرماتے تھے اپنے بھائی کے لئے دعائے مغفرت کرو اور اللہ سے اس کے لئے ثابت قدم رہنے کی درخواست کرو۔ اس وقت اس

سے سوال کیا جا رہا ہے۔ رواہ ابو داؤد۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم میں حضرت انسؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندہ کو جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھی واپس آنے لگتے ہیں تو مردہ اس کی جوتیوں کی آواز سنتا ہے (اس وقت) دو فرشتے آکر اس کو بٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں تو اس شخص یعنی محمد ﷺ کے بارے میں کیا کہتا ہے، مؤمن جواب دیتا ہے میں شہادت دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے کہا جاتا ہے اپنے دوزخ والے ٹھکانے کو دیکھ اس کی جگہ اللہ نے جنت کا ٹھکانہ عطا فرما دیا، مؤمن دونوں ٹھکانوں کو دیکھتا ہے۔ منافق اور کافر سے جب پوچھا جاتا ہے تو اس شخص کی بابت کیا کہتا تھا تو وہ کہتا ہے مجھے کچھ نہیں معلوم۔ جو بات اور لوگ کہتے تھے میں بھی کہتا تھا فرشتے کہتے ہیں نہ تو نے جانا اور نہ (قرآن میں) پڑھا پھر اس پر لوہے کے ہتھوڑوں کی مار پڑتی ہے اور وہ چیختا ہے اس کی چیخوں کو سوائے جن وانس کے سب قریب والے سنتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میت کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو دو سیاہ فام نیلے (یعنی نیلی آنکھوں والے) فرشتے اس کے پاس آتے ہیں ایک کا نام منکر دوسرے کا نام نکیر ہے دونوں فرشتے پوچھتے ہیں تو اس شخص کے متعلق کیا کہتا تھا مردہ کہتا ہے وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے بندے اور رسول ہیں فرشتے کہتے ہیں ہم تو جانتے ہی تھے کہ تو یہ کہے گا پھر اس کی قبر میں ستر ستر ہاتھ ہر طرف وسعت کر دی جاتی ہے اور روشنی کر دی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے سو جاؤ، وہ سو جاتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے میں واپس جا کر اپنے گھر والوں کو (اس کیفیت کی) اطلاع تو دے دوں۔ فرشتے کہتے ہیں اس دلہن کی طرح (محبت آرام اور سکون کے ساتھ) سو جا جس کو سوائے اس شخصیت کے جو سب گھر والوں میں اس کو پیاری ہوتی ہے اور کوئی نہیں اٹھاتا (آخر وہ سو جائے گا) یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خواب گاہ سے اٹھائے گا اور اگر مردہ منافق ہو گا تو جواب دے گا میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے سنا تھا میں نے بھی ویسے ہی کہہ دیا مجھے کچھ نہیں معلوم (کہ یہ اللہ کے رسول تھے یا نہ تھے) فرشتے کہیں گے ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ تو یہ بات کہے گا پھر زمین کو حکم دیا جاتا ہے تو اس پر مل جا (یعنی ایسا دبا کہ تیرے دونوں حصے آپس میں مل جائیں) زمین اس منافق کو اتنا دبائے گی کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نکل جائیں گی اس طرح یہ برابر عذاب میں مبتلا رہے گا یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خواب گاہ سے اٹھائے گا۔ رواہ الترمذی۔

وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ ﴿٢٧﴾ اور اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے کسی کو ایمان کی توفیق دیتا ہے کسی کو توفیقِ ایمان سے محروم رکھتا ہے، کسی کو ایمان پر قائم رکھتا ہے کسی کو قائم نہیں رکھتا اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ حضرت ابو درداءؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے آدمؑ کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد ان کے دائیں شانہ پر ہاتھ مارا اور ان کی گوری نسل باہر آگئی۔ گویا (کثرت میں) وہ چھوٹی چیونٹیوں کی طرح تھی اور بائیں شانہ پر ہاتھ مارا تو کالی نسل جیسے کوئلہ باہر آگئی۔ پھر اس نسل کے متعلق جو دائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) جنت کی طرف (جانے والے ہیں) اور مجھے پرواہ نہیں اور اس نسل کے متعلق جو بائیں شانہ میں تھی فرمایا (یہ) دوزخ کی طرف جانے والے ہیں اور مجھے پرواہ نہیں۔

حضرت ابی بن کعبؓ راوی ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا اگر تمام آسمانوں و زمین والوں کو اللہ عذاب دے تو وہ عذاب دے سکتا ہے اور وہ ظالم نہیں ہو گا اور اگر سب پر رحم فرمائے تو اس کی رحمت ان کے اعمال سے ان کے لئے بہتر ہو گی اگر (کوہ) اُحد کے برابر سونا تم راہِ خداوندی میں دے دو تو جب تک تقدیر پر تمہارا ایمان نہ ہو گا اللہ اس کو قبول نہیں فرمائے گا اور جان لو کہ جو کچھ تم کو پہنچے گا وہ تم سے چوکنے والا نہیں اور جو کچھ نہیں پہنچے گا وہ کسی طرح پہنچنے والا نہیں۔ اگر اس کے خلاف عقیدہ پر مرو گے تو دوزخ میں جاؤ گے۔ حضرت ابن مسعودؓ حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ سے بھی اسی طرح کی احادیث منقول ہیں۔ رواہ احمد وابن ماجہ۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا کیا آپ نے ان لوگوں نہیں دیکھا جنہوں نے بجائے نعمتِ الٰہی کے کفر کیا۔ یعنی اللہ کی نعمت کے شکریہ کو ناشکری سے بدل دیا (شکر کے بجائے ناشکری کی) یا یہ مطلب ہے کہ

اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل دیا ناشکری کی وجہ سے ان سے اللہ کی نعمت چھین لی گئی تو گویا انہوں نے بجائے نعمت کے ناشکری کو پسند کر لیا۔ بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ واللہ وہ کفار قریش تھے (یعنی کفار قریش آیت میں مراد ہیں) حضرت عمرؓ نے فرمایا: وہ (ناشکرے) قریش تھے اور اللہ کی نعمت محمد ﷺ کی ذات تھی۔ ابن جریر نے عطاء بن یسار کا قول نقل کیا ہے کہ بدر کی جنگ میں جو لوگ مکہ والوں میں سے مارے گئے وہ مراد ہیں اللہ نے ان کو پیدا کیا حرم کا ساکن بنایا جہاں ہر طرف سے پھل اور غلہ لایا جاتا تھا (اور چین کے ساتھ مکہ والے بیٹھے کھاتے تھے) اصحاب فیل (نے جب کعبہ پر چڑھائی کی تو اللہ نے ان) کو مکہ والوں کی طرف سے دفع کیا ان کے لئے رزق کے دروازے کھول دیئے (شام و یمن کو) سردی و گرمی کے زمانہ میں سفر کرنے کا ان کو خوگر اور مانوس بنایا (تاکہ غلہ، پھل، کپڑا اور ہر ضرورت کی چیز ان کو بافراط مل سکے) اور انہی میں سے محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا۔ تاکہ آپ ان کو قرآن پڑھ کر سنائیں ان کے عقائد و اخلاق کو پاکیزہ اور ستھرا بنائیں اور ان کو قرآن و حکمت کی تعلیم دیں اور تمام لوگوں کو ان کا تابع بنایا لیکن انہوں نے تمام نعمتوں کی ناشکری کی رسول اللہ ﷺ کے دشمن بن گئے اور ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی پر قائم رہے۔ آخر قحط ہفت سالہ میں مبتلا ہوئے اور بدر کے دن قید بھی ہوئے اور مارے بھی گئے اور ذلیل بھی ہوئے اور مرتے دم تک اللہ کی مذکورہ نعمتوں سے محروم ہو گئے۔

وَّاَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ﴿۲۸﴾ اور (کفر پر ابھار کر) انہوں نے اپنی قوم کو ہلاکت کے مقام میں اتار دیا۔

جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا یعنی جہنم میں جس میں یہ خود بھی داخل ہوں گے (اور ان کے ساتھ والے بھی) سب کے سب جہنم کی گرمی میں جلیں گے۔ جہنم یا عطف بیان ہے یا فعل محذوف کا مفعول۔

وَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿۲۹﴾ اور جہنم بری قرار گاہ ہے، برا ٹھکانہ ہے۔ ابن مردویہ کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا امیر المؤمنین آیت اَلَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا میں کون لوگ مراد ہیں حضرت عمرؓ نے فرمایا قریش کے وہ دو (قبیلے) جو سب سے زیادہ بدکار تھے۔ بنی مغیرہ اور بنی امیہ۔ بنی مغیرہ کے شر سے تو بدر کی لڑائی میں تمہاری حفاظت ہو چکی (یعنی بدر میں انکا زور ٹوٹ گیا) اور بنی امیہ کو ایک وقت تک مزے اڑانے کا موقع دیا گیا ہے۔ بغوی نے بھی اسی طرح حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، حاکم اور ابن مردویہ نے اسی طرح کا قول حضرت علیؓ کا بھی مختلف روایات سے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح بھی کہا ہے۔

میں کہتا ہوں بنی امیہ کو حالت کفر میں مزے اڑانے کا موقعہ دیا گیا یہاں تک کہ ابو سفیانؓ معاویہؓ اور عمرو بن عاصؓ وغیرہ مسلمان ہو گئے پھر یزید اور اس کے ساتھیوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی اور اہل بیت کی دشمنی کا جھنڈا انہوں نے بلند کیا آخر حضرت حسینؓ کو ظلماً شہید کر دیا اور یزید نے دین محمدی کا ہی انکار کر دیا اور حضرت حسینؓ کو شہید کر چکا تو چند اشعار پڑھے جن کا مضمون یہ تھا آج میرے اسلاف ہوتے تو دیکھتے کہ میں نے آل محمدؐ اور بنی ہاشم سے ان کا کیسا بدلہ لیا۔ یزید نے جو اشعار کہے تھے ان میں آخری شعر یہ تھا۔

وَلَسْتُ مِن جُنْدَبٍ اِنْ لَمْ اَنْتَقِم ۔۔۔ مِنْ بَنِي اَحْمَدَ مَا كَانَ فَعَل

(احمد نے جو کچھ (ہمارے بزرگوں کے ساتھ بدر میں) کیا اگر احمد کی اولاد سے میں نے اس کا انتقام نہ لیا تو میں بنی جندب سے نہیں ہوں)

یزید نے شراب کو بھی حلال قرار دے دیا تھا شراب کی تعریف میں چند شعر کہنے کے بعد آخری شعر میں اس نے کہا تھا:

فَاِنْ حُرِّمَتْ يَوْمًا عَلٰى دِيْنِ اَحْمَدَ ۔۔۔ فَخُذْهَا عَلٰى دِيْنِ الْمَسِيْحِ بْنِ مَرْيَمَ

(اگر شراب دینِ احمد میں حرام ہے تو (ہونے دو) مسیح بن مریم کے دین (یعنی عیسائیت) کے مطابق تم اس کو (حلال سمجھ کر) لے لو۔

یزید اور اس کے ساتھیوں اور جانشینوں کے یہ مزے ایک ہزار مہینے تک رہے اس کے بعد ان میں سے کوئی نہ بچا۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا اور انہوں نے اللہ کی مثل دوسروں کو قرار دیا باوجودیکہ اللہ کا کوئی مثل نہیں مثل قرار دینے سے مراد یہ ہے کہ نام اور عبادت میں اللہ کی طرح دوسروں کو قرار دیا (اللہ کی پرستش کی طرح دوسروں کو معبود والہ مانا)

لِّيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ تاکہ اللہ کی راہ سے لوگوں کو بھٹکا دیں لِیُضِلُّوْا میں لام سبب اور علت کے لئے نہیں ہے کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کو پوجا کرنے سے ان کی غرض نہ خود گمراہ ہونا تھا نہ دوسروں کو گمراہ کرنا۔ بلکہ یہ لامِ غایت ہے یعنی اللہ کی مثل دوسروں کو قرار دینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ گمراہ ہو گئے۔

قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ ﴿۳۰﴾ آپ کہہ دیجئے کہ چندے عیش کر لو کیونکہ اخیر انجام تمہارا دوزخ میں جانا ہے یعنی اپنی نفسانی خواہشات یا بُت پرستی اور گمراہی میں پڑے کچھ مدت تک مزے اڑاتے رہو۔ جو کچھ تمہارے لئے مقدر کر دیا گیا ہے اور جس وقت تک مزہ اڑانا تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے اتنی مدت تک مزے اڑاؤ۔ ذوالنون نے کہا تمتع کا معنی یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو آدمی اپنی نفسانی خواہشات سے بہرہ اندوز ہو۔

تَمَتَّعُوْا اگرچہ امر کا صیغہ ہے لیکن امر سے مراد حکم نہیں بلکہ یہ ایک تہدید اور عذاب کی دھمکی ہے اور اس بات کی اطلاع ہے کہ تمہاری یہ گمراہیاں تم کو عذاب میں لے جائیں گی۔ اسی لئے امر کے بعد فرمایا کہ آخر تم کو دوزخ میں جانا ہے گویا دوزخ میں جانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً

(اے محمد ﷺ) آپ ﷺ میرے ان بندوں سے جو ایمان لے آئے ہیں کہہ دیجئے کہ وہ نمازیں قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور ظاہر طور پر راہِ خدا میں کچھ خرچ کریں۔ اہلِ ایمان کو خصوصی طور پر نماز پڑھنے اور راہِ خدا میں خرچ کرنے کی ہدایت کرنے کا حکم دیا اور مؤمنوں کو خاص طور پر عِبَادِیْ فرمایا اور اپنے بندے قرار دیا اس سب سے مقصود اہلِ ایمان کی عزت افزائی ہے اور اس امر پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اہلِ ایمان ہی حقیقتاً حقوقِ عبدیت کو ادا کرنے اور تعمیلِ احکام کرنے والے ہیں وہ امر کی تعمیل کریں گے۔

یُقِیْمُوْا قُلْ کا مفعول نہیں ہے۔ قُلْ کا مفعول محذوف ہے یعنی آپ ان کو حکم دیں کہ تم لوگ نماز پڑھو اور راہِ خدا میں خرچ کرو۔ یُقِیْمُوْا اور یُنْفِقُوْا شرطِ محذوف کی جزا ہے یعنی اگر تم ان کو حکم دو گے تو وہ تعمیل کریں گے اس کلام میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ وہ رسول اللہ کے فرماں بردار ہیں فرمان کو ضرور مانیں گے اور تعمیل کریں گے۔

مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ﴿۳۱﴾ قبل اس کے کہ وہ دن آجائے کہ اس میں نہ خرید فروخت ہو گی (کہ کوئی قصور وار کوئی ایسی چیز خرید کر دے دے جو اس کے قصور کا بدلہ ہو سکے) اور نہ کوئی دوستی ہو گی (کہ دوست اپنے دوست کی سفارش کر کے بچا لے)

ایک شبہ: متقی شفاعت کریں گے اور بعض مؤمن بعض مؤمنوں کی بھی شفاعت کریں گے یہ مسئلہ مسلّمہ ہے۔ اللہ نے فرمایا اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ "سب دوست باہم دشمن ہو جائیں گے سوائے تقویٰ والوں کے (یعنی متقی باہم دشمن نہ ہوں گے) پھر عموماً دوستی کام نہ آنے کی جو اس آیت میں صراحت ہے وہ کس طرح صحیح ہو سکتی ہے۔

جواب: نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم ہی تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ہے جن میں تقویٰ نہ ہو ان میں باہم دوستی نہ ہو گی اور دوستی نہ ہو گی تو ان میں سے کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ

اللہ ہی تو ہے جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا اور اوپر سے پانی اتارا پھر اس پانی سے تمہاری معیشت کے لئے پھل (غلّہ، روئی وغیرہ) پیدا کئے۔ ''رزق'' کا لفظ عام ہے کھانا ہو یا لباس، سب کو یہ لفظ شامل ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ﴿٣٢﴾

اور (تمہاری سواری و بار برداری کے لئے) جہازوں اور کشتیوں کو تمہارے کام پر لگادیا تاکہ اللہ کی مشیّت کے مطابق وہ سمندر میں چلیں اور دریاؤں کو بھی تمہارا خدمت گار بنادیا جہاں چاہتے ہو تم ان کو (رخ موڑ کر) لے جاتے ہو ان کے پانی سے فائدہ حاصل کرتے ہو اور ان پر پُل اور بند باندھتے ہو۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ　اور تمہارے کام کے لئے سورج اور چاند کو بھی سرگرم کردیا۔ یعنی انسانوں کے منافع کے لئے یہ تیزی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔

قاموس میں (دَاَبَ فِي عَمَلِهِ، کام میں کوشش اور محنت کی (دَأْبٌ، دَاَبٌ اور دُءُوْبٌ مصدر تیزی سے ہنکانا

دَائِبَيْنِ شب وروز۔ یعنی دونوں تیز رفتاری کے ساتھ چلتے ہیں حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اللہ نے اپنی اطاعت میں ان کو تیز رفتار بنادیا۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴿٣٣﴾　اور رات دن کو بھی تمہاری خدمت پر لگادیا۔ رات دن کے پیچھے آتی ہے اور دن رات کے پیچھے۔ تمہارے آرام کے لئے رات بنادی کہ کام کی تھکان اور ماندگی دور ہو جائے اور کسبِ معاش کے لئے دن کا اُجالا کردیا۔

وَآتَاكُمْ مِنْ كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ　اور جو کچھ تم نے اس سے مانگا اس میں سے کچھ (بقدرِ ضرورت و مناسبت) تم کو دیا۔ مِنْ كُلِّ میں مِنْ تبعیضیہ ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے شاید مراد یہ ہے کہ تمہاری ضرورتوں کا جو تقاضا تھا اور تمہاری حاجتیں (فطری طور پر جس چیز کی خواہش مند تھیں وہ سب تم کو دیا خواہ زبان سے تم نے مانگا ہو یا نہ مانگا۔ لفظ ''کل'' کثرت کے اظہار کے لئے استعمال کیا گیا ہے (استغراقِ حقیقی مراد نہیں ہے) جیسے محاورے میں بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص سب کچھ جانتا ہے (یعنی بقدرِ ضرورت) اس کے پاس ہر شخص آگیا ہے یعنی بہت آدمی آگئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ یعنی بہت چیزوں کے دروازے ہم نے ان پر کھول دیئے۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ　اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گنو گے تو پوری گنتی نہیں کر سکتے یعنی ان کے انواع واقسام کو بھی نہیں گن سکتے افراد کا تو ذکر ہی کیا ہے افرادِ نعمت تو اَن گنت ہیں ان سب کا شکر ادا کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے لیکن اللہ نے اپنے کرم سے ادائے شکر نہ کرسکنے کے اقرار کو ہی اہلِ ایمان کے لئے شکر کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور جو لوگ شکر سے عاجزی کا اقرار کرتے ہیں ان کو اپنا شکر گذار بندہ فرمایا ہے اور جو لوگ شکر نہ کرسکنے کے باوجود اپنی عاجزی کا اقرار نہیں کرتے ان کے متعلق فرمایا ہے۔

إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ﴿٣٤﴾　بے شک انسان بے صبرا ناشکرا ہے سختی اور مصیبت میں اللہ کا شکوہ کرتا اور بے صبری کا اظہار کرتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کا رب جوّاد ہے، کریم ہے، حکیم ہے یہ مصیبت بھی پُراز مصلحت ہے، تقاضائے حکمت ہے، خواہ اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے اور آسائش ونعمت ملتی ہے تو آدمی شکر ادا نہیں کرتا۔ ناشکرے کی ضد شکر گذار ہے ظاہر ہے کہ شکر اور عدم شکر باہم ضد ہیں اور بالواسطہ ظلم کی ضد کو صبر کہا جاتا ہے کیونکہ ظلم کا لغوی معنی ہے کسی چیز کو بے محل رکھ دینا مصیبت پر صبر کرنا برمحل ہے مصیبت کا تقاضا ہے پس اگر مصیبت پر صبر نہ کیا جائے بے صبری کے ساتھ شکایت کرنے لگے تو یہ ظلم ہو جائے گا اسی وجہ سے آیت میں ظلوم سے مجاز اً مراد ہے بے صبرا۔ بعض علماء نے کہا کہ انسان کو ظلوم کہنے

ع ۵ ۱۷

کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کر کے آدمی اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے دنیا اور آخرت میں مبتلائے عذاب ہو جانے کے اسباب فراہم کر دیتا ہے یا یوں کہو کہ شکرِ نعمت کو ترک کر کے آدمی اپنے نفس کو نعمت سے محروم کر دیتا ہے یہی اپنے نفس پر ظلم ہوا یا یوں کہا جائے کہ ناشکرا آدمی نعمت پر ظلم کرتا ہے کہ اسکا شکر ادا نہیں کرتا یا غیر منعِم کا شکریہ ادا کرتا ہے اور منعم حقیقی کا شکر نہیں کرتا تو اس طرح شکر کا استعمال بے محل کرتا ہے ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ نے فرمایا میرے اور جن وانس کے معاملات عجیب ہیں۔ میں پیدا کرتا ہوں اور وہ دوسروں کو پوجتے ہیں میں رزق دیتا ہوں اور وہ دوسروں کا شکر ادا کرتے ہیں۔ رواہ الحاکم والبیہقی۔ عن ابی الدرداءؓ۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهِیْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا اور جب ابراہیمؑ نے کہا اے میرے رب اس شہر (یعنی مکہ) کو امن والا (شہر) بنا دے جو یہاں رہے (یا آئے) امن سے رہے امن سے ہو جائے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس جگہ مکہ سے خوف کو دور کرنے اور شہر کو پُر امن بنانے کی دعا کی اور آیت اِجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا سے یہ درخواست کی کہ اس وادی کو امن کی بستی بنا دے۔ (یعنی یہاں وادی میں ایک شہر بسا دے جو پُر امن ہو)

وَّاجْنُبْنِیْ وَبَنِیَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ؕ۳۵ اور مجھے اور میری اولاد کو بُت پرستی کرنے سے بچا، دور رکھ، الگ رکھ، یہ آیت بتا رہی ہے کہ انبیاءؑ کا معصوم ہونا محض اللہ کی توفیق اور نگہداشت سے وابستہ ہے (یعنی انسانی فطرت تو انبیاءؑ میں بھی کار فرما ہے خیر و شر کے جذبات تو انبیاءؑ میں بھی دوسرے انسانوں کی طرح ہوتے ہیں پیدائش اور عناصر پیدائش میں کوئی فرق نہیں لیکن اللہ کی توفیق انبیاءؑ کے شامل حال رہتی ہے جو ہر وقت ان کو گناہوں سے بچائے رکھتی ہے) بَنِیَّ (اولادِ صُلبی) کے لفظ کے اندر اولاد کی اولاد داخل نہیں ہے۔ آیت یٰبَنِیْ اٰدَمَ، یٰبَنِیْ اِسْرَآءِیْلَ سے مراد جو ساری نسل آدم و اسرائیل ہے وہ عمومِ مجاز کے طور پر مراد ہے پس آیت زیر تفسیر میں حضرت ابراہیمؑ نے جو اپنی اولاد کے لئے شرک سے محفوظ رکھے جانے کی دعا کی تھی اس سے مراد صرف صلبی اولاد تھی تمام نسلِ اسماعیلؑ (واسحاقؑ) مراد نہ تھی، نسلِ اسماعیلؑ میں تو بکثرت بُت پرست گزرے ہیں لیکن آیت مذکورہ کے لفظ بنی کو دیکھ کر بقولِ ابن ابی حاتم سفیان بن عینیہ نے بیان کیا کہ اولادِ اسماعیلؑ میں سے کوئی بھی بُت پرست نہ تھا جن کو بُت پرست کہا جاتا ہے ان کی بُت پرستی کی حقیقت صرف اتنی تھی کہ وہ پتھروں کا طواف کر لیا کرتے تھے اور اسکو دوار (طواف) کہا کرتے تھے وہ کہتے تھے کعبہ بھی تو پتھروں کا نام ہے (جن کا طواف کیا جاتا ہے) اس لئے ہم جہاں پتھر نصب کر لیں وہ کعبہ کی طرح ہو جائیں گے (ان کا طواف کیا جا سکتا ہے) دُرِّ منثور میں اتنا مزید آیا ہے کہ سفیان بن عینیہ سے دریافت کیا گیا پھر آپ نے اولادِ اسحاق اور دوسری نسلِ ابراہیمیؑ کو کیوں اس میں داخل نہیں کیا اور اولادِ اسمٰعیلؑ کا خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر کیا سفیان نے جواب دیا، حضرت ابراہیمؑ نے اس شہر کے رہنے والوں ہی کے لئے دعا کی تھی کہ وہ بُت پرستی نہ کریں اور آبادی کے بعد انہی کے لئے دعا کی کہ اللہ اس شہر کو پُر امن بنا دے تمام بستیوں کے لئے دعا نہیں کی تھی اور آیت رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ میں اسی شہر کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا۔ سفیان بن عینیہ کی یہ تشریح قرآن کے بھی خلاف ہے اور سنّت واجماع کے بھی۔ خبرِ متواتر سے ثابت ہے کہ اللہ کی کتاب میں مشرکوں سے مراد اہلِ مکہ (نسلِ اسماعیلؑ) ہیں اور اللہ نے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَیْءٍ کے علاوہ بھی دوسری آیات سے (یہی) ثابت ہے کہ اہلِ مکہ مشرک تھے اور ان کے باپ دادا بھی۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ اے میرے رب ان مورتیوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے ان کی وجہ سے لوگ راہِ حق سے بھٹک گئے ان کی پوجا کرنے لگے یہ مورتیاں لوگوں کی گمراہی کا سبب بن گئیں۔

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ پس جو شخص (دین میں) میرا پیرو ہو گا وہ میرا ہے یعنی مجھ سے متعلق ہے دنیا اور آخرت میں اسکا تعلق مجھ سے نہیں ٹوٹے گا یہاں تک کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۳۶ اور جو میری نافرمانی کرے گا تو (اس کو تو بخش دے اس پر رحم

فرما کیونکہ تو) غفور رحیم ہے۔ سدی نے کہا اس فقرہ کا مطلب یہ ہے جو میری نافرمانی کرے پھر توبہ کرلے تو اس کو تو معاف کر دے تو غفور رحیم ہے۔ مقاتل نے کہا نافرمانی سے مراد ہے شرک سے کم درجہ کی نافرمانی یعنی شرک کے علاوہ جو میری نافرمانی کرے۔

ظاہر یہ ہے کہ (لفظ عَصَانِیْ میں شرک بھی داخل ہے لیکن) حضرت ابراہیمؑ نے یہ دعا اس وقت کی تھی جب کہ آپ کو مشرک کا غیر مغفور ہونا معلوم نہ ہوا تھا جب آپ کو مشرک کے غیر مغفور ہونے کی اطلاع دے دی گئی تو اس وقت آپ نے دعا کی وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرَاتِ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اور ان کو پھلوں سے رزق دے۔ اور اس (شہر) کے باشندوں میں سے ان لوگوں کو جو اللہ پر اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہوں کھانے کے لئے پھل عطا فرما۔ اس دعا میں صرف اہلِ ایمان کو رزق عطا کرنے کی دعا اس لئے کی کہ مشرک کے غیر مغفور ہونے کی صراحت سے آپ کو خیال پیدا ہو گیا کہ مشرک سے اللہ دنیا میں بھی انتقام لے گا اور اپنے پیدا کئے ہوئے پھلوں سے محروم رکھے گا۔ (چونکہ یہ خیال غلط تھا اس لئے اس کے جواب میں) اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ اور جو کفر کرے گا اس کو تھوڑی مدت (بقدرِ مدتِ زندگی) میں بہرہ اندوز رکھوں گا پھر اس کو عذابِ دوزخ کی طرف کھینچ کر لے جاؤں گا (یعنی کافروں کو دنیوی نعمتوں سے محروم نہیں رکھوں گا۔ ہاں آخرت میں اس کی مغفرت نہ ہو گی۔)

رَبَّنَآ اِنِّیْۤ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ اے ہمارے رب میں نے اپنی کچھ اولاد کو باشندہ کر دیا۔ کچھ اولاد سے مراد ہیں اسمٰعیلؑ اور آپ کی نسل۔ حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کو وادیٔ مکہ میں رکھا تھا نسلِ اسماعیلی اس کے ذیل میں آ گئی۔

بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ ایسے وادی میں جہاں کھیتی نہیں ہے۔ لغت میں وادی پہاڑی نالے کو کہتے ہیں پھر (توسیعِ استعمال کے بعد) چند پہاڑوں یا ریت کے ٹیلوں کے درمیانی میدان پر اس لفظ کا اطلاق ہونے لگا مکہ کی بستی بھی ایسے ہی میدان میں تھی جو پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ چونکہ یہ وادی پتھریلا علاقہ تھا نا قابلِ روئیدگی تھا اس لئے اس کو غیر ذِی زرع فرمایا۔

عِنْدَ بَیْتِكَ الْمُحَرَّمِ تیرے ممنوعہ گھر کے پاس۔ بیت اللہ سے مراد وہ بیت اللہ ہے جو طوفان نوحؑ سے پہلے موجود تھا۔

فتح مکہ کے روز رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے جس روز آسمان و زمین بنائے (اسی روز) اس شہر کو باحرمت (ممنوعہ) قرار دے دیا۔ پس روز قیامت تک اللہ کی عطا کی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ شہر ممنوعہ (باحرمت) رہے گا یہاں کسی کے لئے لڑنا حلال نہیں اور ایک ساعت سے زیادہ میرے لئے بھی یہاں قتال جائز نہیں۔ روزِ قیامت تک خداداد حرمت کی وجہ سے یہ باحرمت (ممنوعہ) رہے گا۔ یہاں کے کانٹے یعنی جھاڑیاں (بھی) نہ کاٹے جائیں نہ یہاں کے شکار کو (بھگا کر) باہر نکالا جائے نہ یہاں گری پڑی چیز کوئی اٹھائے سوائے اس غرض کے کہ اس چیز کی شناخت کرائی ہو (کہ شناخت کر کے اس کا مالک لے لے) نہ یہاں کی گھاس کاٹی جائے حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ اِذخر (مرچیا گند) اس سے مستثنیٰ کر دیجئے یہ لوہاروں کے اور مکہ والوں کے گھر کے کام میں آتی ہے فرمایا اِذخر مستثنیٰ ہے۔ متفق علیہ۔ رواہ ابن عباسؓ۔

واقدی اور ابن عساکر نے عامر بن سعید کے سلسلہ سے حسبِ ذیل روایت کی ہے۔ حضرت سارہ حضرت ابراہیمؑ کی بی بی تھیں مدت تک حضرت کے پاس رہیں لیکن اولاد نہیں ہوئی جب حضرت ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہو گئے تو حضرت سارہ کو جذبۂ رقابت نے ابھارا اور آپ کے دل میں کچھ احساس افسردگی و انتقام پیدا ہو گیا اور انہوں نے قسم کھائی کہ ہاجرہ کے تینوں ناک کان کاٹیں گی (تاکہ بدصورت ہو جائیں اور حضرت ابراہیمؑ کو ان سے نفرت ہو جائے) حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تم اپنی قسم پوری کرنی چاہتی ہو۔ حضرت سارہ نے عرض کیا میں کیا کروں (میری قسم پوری ہونے کی کیا صورت ہو) حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاجرہ کے کانوں میں سوراخ کر دو اور اس کا ختنہ کر دو۔ حضرت سارہ نے ایسا ہی کیا حضرت ہاجرہ نے کان چھدنے

کے بعد دو بالیاں کانوں میں پہن لیں، اس سے ان کا حسن اور بڑھ گیا حضرت سارہ بولیں اس سے تو میں نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا غرض حضرت سارہ نے پسند نہیں کیا کہ حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کے ساتھ رہیں۔ مگر حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہ سے بڑی محبت تھی۔ (بہر حال) آپ ہاجرہ کو مکہ لے گئے اور چونکہ آپؑ کو ہاجرہ سے بڑی محبت تھی اور بغیر ہاجرہ کے نہیں رہ سکتے تھے اس لئے روزانہ بُراق پر سوار ہو کر شام سے مکہ کو ہاجرہ سے ملنے آیا کرتے تھے۔

بخاری نے صحیح میں اور بغوی نے اپنی سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے نِطاق حضرت ہاجرہ نے اس غرض سے پہنا کہ قدموں کے نشانوں کو پیچھے سے نِطاق کا سِر امِٹاتا چلے اور حضرت سارہ کو ان کا نشانِ قدم معلوم نہ ہو (عرب کی عورتوں نے نِطاق کا استعمال حضرت ہاجرہ سے ہی سیکھا تھا)

غرض حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ اور ان کے لڑکے اسماعیلؑ کو لے کر بیت اللہ کے پاس پہنچے اور مسجد سے بالائی مقام پر زم زم کے اوپر ایک بڑے درخت کے پاس دونوں کو بٹھایا۔ حضرت اسماعیلؑ (ان دِنوں) شیر خوار تھے، حضرت ہاجرہ کا دودھ پیتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے ایک خورجین جس میں چھوارے تھے اور ایک مشکیزہ پانی سے بھرا ہوا حضرت ہاجرہ کے پاس رکھ دیا پھر لَوٹ پڑے، حضرت ہاجرہ نے پیچھا کیا اور کہا ابراہیمؑ آپ ہم کو اس ویران وادی میں (جہاں نہ کوئی آدمی ہے نہ کچھ اور چیز) چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں۔ حضرت ہاجرہ نے یہ بات کئی بار کہی مگر حضرت ابراہیمؑ نے منہ پھیر کر نہیں دیکھا۔ آخر حضرت ہاجرہ نے کہا کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا ہاں! اس پر ہاجرہ بولیں تو اللہ ہم کو ضائع نہیں کرے گا۔ پھر لوٹ آئیں۔ حضرت ابراہیمؑ چل دیئے جب ہاجرہ کی نظر سے غائب ہو گئے تو کعبے کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ اٹھا کر ان الفاظ میں دعا کی رَبَّنَا اِنِّی اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِی...... یَشْکُرُوْنَ تک۔

حضرت اسماعیلؑ کی والدہ مشکیزہ کا پانی پیتی رہیں اور بچہ کو دودھ پلاتی رہیں یہاں تک کہ پانی ختم ہو گیا اور پیاس لگی اور بچہ بھی پیاسا ہو گیا تو چل دیں بچہ کی طرف نظر اٹھائی تو بچہ اپنی زبان منہ میں گھمارہا تھا یہ منظر دیکھ کر (بے تاب ہو گئیں اور) نظر پھیر لی اور چل کر کوہ صفا پر پہنچ گئیں۔ وہاں سے قریب ترین پہاڑ صفا تھا۔ صفا پر چڑھ کر اوپر کھڑی ہو کر وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آ جائے جب کوئی نظر نہ آیا تو صفا سے اُتر کر وادی میں پہنچیں اور قوت کے ساتھ دوڑنے والے آدمی کی طرح کُرتہ کا دامن اوپر کو اٹھا کر دوڑ کر وادی سے گذر کر مروہ پہاڑی پر پہنچیں اور اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کوئی نظر پڑ جائے لیکن کوئی دکھائی نہ دیا۔ اس طرح سات بار کیا حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسی لئے (حاجی لوگ صفا و مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں آخر (مرتبہ) جب مروہ پر پہنچیں تو ایک آواز سنی، اور خود اپنے آپ سے کہنے لگیں چپ۔ پھر کان لگا کر سنا تو پھر آواز سنائی دی۔ کہنے لگیں میں نے آواز تو سن لی اگر تیرے پاس کچھ مدد کا سامان ہو (تو لا) اچانک زم زم کے مقام پر ایک فرشتہ نمودار ہوا اور زمین کو ایڑی یا پَر مار کر اس نے کھودا فوراً پانی نکل آیا حضرت ہاجرہ پانی کا گھیر ابنانے لگیں اور اپنے ہاتھ سے چلو بنا کر پانی لے کر مشکیزہ میں بھرنے لگیں جونہی چلو بھر کر اٹھاتی تھیں پانی اور اُبل آتا تھا۔ حضرت ابن عباسؓ کا بیان ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ پر اللہ کی رحمت ہو اگر وہ زمزم کو یونہی رہنے دیتیں یا یہ فرمایا کہ اگر وہ چلو نہ بھرتیں تو زم زم ایک جاری چشمہ ہو جاتا غرض حضرت ہاجرہ نے خود پانی پیا اور اپنے بچہ کو دودھ بھی پلایا فرشتہ نے کہا تم ہلاکت کا اندیشہ نہ کرو۔ یہاں اللہ کا گھر ہے یہ لڑکا اور اس کے والد اللہ کے گھر کی تعمیر کریں گے اللہ اپنے گھر والوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ کعبہ اس زمانہ میں ٹیلہ کی شکل میں زمین سے کچھ اونچا تھا۔ سیلاب آ کر اس کے دائیں بائیں کناروں کو کاٹ کر لے جاتا تھا۔ حضرت ہاجرہ اسی حالت میں رہتی رہیں، آخر بنی جُرہم کا ایک قافلہ ادھر سے گذرا اور آ کر مکہ کے نشیبی مقام پر اس نے پڑاؤ ڈالا۔ قافلہ والوں نے دیکھا کہ کچھ پرندے پانی کے اوپر اڑ رہے ہیں کہنے لگے یہ پرندے یقیناً پانی پر گھوم رہے ہیں لیکن ہم تو اس وادی سے پہلے گذر چکے ہیں یہاں تو پہلے کوئی پانی نہ تھا کچھ لوگوں کو (تفتیشِ احوال کے لئے) بھیجا انہوں نے جا کر دیکھا تو پانی موجود پایا، لوٹ کر آئے اور ساتھیوں کو اطلاع دے دی اس کے بعد قافلہ والوں نے آ کر حضرت اسماعیلؑ کی والدہ سے گزارش کی کہ ہم کو اپنے پاس رہنے کی

اجازت دے دیں حضرت ہاجرہ نے فرمایا لیکن پانی پر تمہارا کوئی (مالکانہ) حق نہ ہوگا۔ قافلے والوں نے اس کا اقرار کرلیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسماعیلؑ کی والدہ انس کی طالب تھیں (تنہائی کی وحشت دور کرنا چاہتی تھیں) پانی پر قبضہ انہی کا رہا قافلہ والوں نے اپنے متعلقین کو بھی بلوالیا اور سب وہیں مقیم ہوگئے رفتہ رفتہ بہت خاندان بن گئے اسماعیلؑ بھی جوان ہوگئے بنی جرہم سے عربی بھی انہوں نے سیکھ لی اور جوان ہونے کے بعد سب کے محبوب بن گئے بنی جرہم نے اپنی ہی ایک عورت سے ان کا نکاح کردیا اور اسماعیلؑ کی والدہ کی وفات بھی ہوگئی۔

حضرت اسماعیلؑ کا نکاح ہوچکا تھا کہ حضرت ابراہیمؑ (اپنی دعا کی) برکت کا معائنہ کرنے کے لئے تشریف لائے۔ باقی حصہ ہم نے سورت بقرہ کی آیت وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى کی تفسیر کے ذیل میں نقل کردیا ہے۔

رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ　　اے ہمارے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں یعنی میں نے اپنی اولاد کو اس ویران وادی میں جہاں نہ کچھ کھانے کو ہے نہ آرام کا کوئی ذریعہ ہے صرف اس لئے رکھا ہے کہ وہ تیرے محترم گھر کے پاس نماز قائم کریں رَبَّنَا کو مکرر ذکر کرنے سے اور درمیان میں لانے سے اس طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہاں اپنی اولاد کو رکھنے سے میرا مقصود صرف اقامتِ صلوٰۃ ہے اور میری دعا کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ ان کو نماز کی توفیق عطا فرمائے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ لیقیموا امر کا صیغہ ہے اس سے آپ کا مقصد تھا اولاد کے لئے اقامتِ صلوٰۃ کی دعا کرنا گویا آپ نے یہ لفظ کہہ کر اولاد کو اقامتِ نماز کا حکم غائبانہ دیا اور اللہ سے دعا کی کہ ان کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔

فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ　　پس کچھ لوگوں کے دلوں کو بنادے۔ من النّاس میں من تبعیض کے لئے ہے یعنی کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف پھیر دے۔ مجاہد نے کہا اگر (بغیر مِن کے) اَفْئِدَةَ النَّاسِ فرماتے تو تمام فارس، رومی ہندی اور ترک تم پر ہجوم کر آتے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا یہودی، عیسائی اور مجوسی بھی کعبہ کا حج کرنے لگتے۔ مگر مِنَ النَّاسِ فرمایا اب صرف مسلمان ہی حج کرتے ہیں۔

تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ　　کہ (شوق و محبت میں) ان کی طرف تیزی کے ساتھ بڑھیں۔ سدی نے ترجمہ کیا کہ کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف جھک جائیں۔

وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴿۳۷﴾　　اور کھانے کے لئے ان کو پھل عطا فرما امید ہے کہ وہ تیری نعمت کا شکر ادا کریں گے۔ یعنی باوجودیکہ یہ وادی ویران ہے اس میں کھیتی باڑی اور باغ نہیں ہیں مگر ان کو یہاں پھل عطا فرما، جس طرح شاداب مقامات پر رہنے والوں کو تو عطا فرماتا ہے اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کی دعا قبول فرمالی وادی کو پرامن حرم بنادیا یہاں ہر طرف سے پھل لائے جانے لگے یہاں تک کہ ایک ہی وقت اور ایک ہی زمانہ میں یہاں گرمی سردی اور ربیع و خریف کے پھل ملتے ہیں۔

رَبَّنَآ اِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ　　اے ہمارے رب ہم جو کچھ چھپائے رکھیں یا ظاہر کریں تو سب کو جانتا ہے یعنی ہمارے تمام احوال و مصالح سے واقف ہے اور ہم سے زیادہ ہم پر رحم کرنے والا ہے ہم کو دعا کی ضرورت بھی نہیں ہے لیکن ہم اپنی عبدیت و بندگی کا مظاہرہ کرنے کے لئے تجھ سے دعا کرتے ہیں اور اپنی احتیاج کا اظہار کرنے اور تیری رحمت کی طلب میں اور عجلت اختیار کرنے کی غرض سے تجھ سے سوال کرتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور مقاتل کا قول ہے کہ مَا نُخْفِيْ وَمَا نُعْلِنُ سے مراد ہے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو وادی غیر ذی زرع میں چھوڑنے کا غم جو حضرت ابراہیمؑ کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مَا نُعْلِنُ سے مراد ہے زاری اور تضرع اور مَا نُخْفِيْ سے مراد ہے غم جدائی۔

وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ﴿۳۸﴾　　اور اللہ سے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے زمین میں نہ آسمان میں وہ بالذات عالم ہے اس کے علم کی ہر چیز کی طرف نسبت برابر ہے۔ لہٰذا ہر چیز اس کو معلوم

ہے (ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کو معلوم ہو اور کوئی نا معلوم) اکثر علماء کے نزدیک یہ اللہ کا قول ہے بعض علماء اس کو حضرت ابراہیمؑ کے کلام کا جز قرار دیتے ہیں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ ؕ　تعریف ہے اس اللہ کو جس نے باوجود بڑھاپے کے مجھ کو اسمٰعیلؑ و اسحٰقؑ (دونوں بچے) عطا فرمائے یعنی بڑھاپے کی وجہ سے میں مایوس ہو گیا تھا ایسی حالت میں اللہ نے اولاد عطا فرمائی یہ اللہ کی عظیم الشان نعمت اور شانِ قدرت ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جب ابراہیمؑ کی عمر ننانوے سال کی تھی تو حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے اور ایک سو بارہ سال کی عمر میں حضرت اسحاقؑ کی ولادت ہوئی۔ ابن جریر نے سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو ایک سو سترہ ۱۱۷ سال کی عمر میں حضرت اسحاقؑ کے پیدا ہونے کی بشارت دی گئی تھی۔

اِنَّ رَبِّیْ لَسَمِیْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۹﴾　میرا رب دعا کو خوب سننے والا ہے یعنی دعا قبول کرنے والا ہے سَمِعُ الْمَلِكُ الْكَلَامَ بادشاہ نے بات سن لی یعنی بات کا اثر لے لیا۔ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب سے دعا کی تھی اور اولاد ہونے کی درخواست کی تھی اللہ نے دعا قبول فرمالی اور ناامیدی کی حالت میں نرینہ اولاد عطا کی۔

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ۖۗ　اے میرے رب مجھے اور میری کچھ نسل کو نماز کا پابند بنا۔ اقامتِ صلوٰۃ" نماز کو ارکان و آداب اور پابندی اوقات و شرائط کے ساتھ ہمیشہ ادا کرنا۔" مِنْ ذُرِّیَّتِیْ میں مِنْ تبعیضی اس لئے ذکر کیا کہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آئندہ میری نسل میں کچھ کافر بھی ہوں گے کیونکہ اللہ نے فرمادیا تھا لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ۔

رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَآءِ ﴿۴۰﴾　اے میرے رب اور میری دعا (یا عبادت) قبول فرما۔ ترمذی نے حضرت انسؓ کی روایت سے امام احمد نے اور بخاری نے الادب میں اور چاروں اصحابُ السنن نے اور ابن حبان نے اور حاکم نے حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت سے اور ابو یعلی نے حضرت براء بن عازبؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دعا عبادت کا مغز ہے۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ　اے میرے رب مجھے بخش دے اور میرے والدین کو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے والدین مسلمان تھے۔ آزر آپ کا چچا تھا اور تارخ آپ کے باپ کا نام تھا۔ تفصیل سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے چونکہ اَبٌ کا لفظ چچا کے لئے بھی بولا جاتا ہے اس لئے اگر وَالِدَیَّ کی جگہ اَبَوَیَّ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو خیال ہو سکتا کہ شاید حضرت نے آزر کے لئے بھی دعاء مغفرت کی تھی (باوجودیکہ آزر مشرک تھا اور مشرک نا قابلِ مغفرت ہے) اس خیال کو دفع کرنے کے لئے وَالِدَیَّ فرمایا یعنی حقیقی ماں اور حقیقی باپ۔ اور بالفرض اگر آزر کو (حقیقی) باپ مان بھی لیا جائے تو اس کے لئے دعاء مغفرت کی وجہ خود ہی اللہ نے بیان فرمادی ہے کہ ابراہیمؑ نے باپ کے لئے دعاء مغفرت صرف اس وعدہ کی وجہ سے کی تھی کہ اس سے وعدہ کر لیا تھا لیکن جب ان پر ظاہر ہو گیا کہ ان کا باپ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے اور بیزاری کا اظہار کر دیا اللہ نے ارشاد فرمایا ہے وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِیَّاهُ ۚ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗۤ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ ؕ۔

وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ ﴿۴۱﴾ ع　اور (تمام) ایمان والوں کو جس روز حساب برپا ہوگا۔ برپا ہونے سے مراد ہے موجود ہونا، یا ظاہر ہونا۔ یہ معنیٰ "قیام علی الرجل" (پاؤں پر کھڑا ہونا) سے مستعار لیا گیا ہے محاورے میں بولا جاتا ہے "قامتِ الحربُ علیٰ ساق" لڑائی اپنی پنڈلی پر کھڑی ہو گئی (یعنی برپا ہو گئی) یا الحساب سے پہلے لفظ اہل محذوف ہے یعنی جس روز اہلِ حساب کھڑے ہوں گے جیسے آیت "واسئل القریۃ" اور بستی سے پوچھ لو یعنی بستی والوں سے بعض لوگوں نے کہا کہ کھڑے ہونے کی نسبت حساب کی طرف مجازی ہے (پہلی صورت میں مجاز فی الحذف ہوگا اور اس صورت میں مجاز فی الاسناد) یعنی لوگ

حساب کے لئے کھڑے ہوں گے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اور تم اللہ کو ظالموں کے عمل سے غافل نہ خیال کرو کہ اس کو حقیقتِ امور کا علم نہ ہو یہ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے آپ تو اللہ کو غافل خیال ہی نہیں کر سکتے تھے یہ تو تم ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ حضور اللہ کو لاعلم سمجھتے ہیں اس لئے آیت میں ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ آپ جو اللہ کو واقفِ کل جانتے ہیں اس خیال پر آپ جمے رہیں اور جانتے رہیں کہ اللہ ظالموں کے تمام احوال و افعال پر مطلع ہے اس سے ان کی کوئی بات پوشیدہ نہیں وہ لامحالہ ان کے ہر چھوٹے بڑے ظلم کی سزا دے گا۔

یا آیت میں خطاب عمومی ہے ہر وہ شخص مخاطب ہے جو اللہ کی ذات و صفات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے اللہ کو غافل خیال کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے ڈھیل ملنے کو اللہ کی ناواقفیت پر محمول کرتا ہے بعض علماء کا قول ہے کہ آیت میں مظلوم کے لئے پیامِ تسلی اور ظالم کے لئے عذاب کی دھمکی ہے۔

اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ ﴿٤٢﴾ کیونکہ ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے جس میں ان لوگوں کی نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی یعنی اس دن کے ہول سے آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی پلک نہ جھپکے گی یا یہ مطلب ہے کہ نظر اٹھ جائیں گی اور اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گی۔

مُهْطِعِيْنَ تیزی کے ساتھ بھاگ رہے ہوں گے اِدھر اُدھر منہ پھیر کر نہیں دیکھیں گے نہ یہ جانیں گے کہ ان کے قدم کہاں پڑ رہے ہیں۔ قتادہ نے کہا تیزی کے ساتھ بلانے والے کی طرف دوڑیں گے۔ مجاہد نے کہا ٹکٹکی باندھے ہوں گے، برابر نظر جمائے ہوں گے۔ قاموس میں ہے هَطَعَ (ماضی) هُطُوْعًا (مصدر) سامنے سے دوڑتا ہوا تیزی کے ساتھ آیا، یا کسی چیز پر نظر جمائے رکھی نگاہ نہ ہٹائی۔ مُهْطِعٌ بروزن مُحْسِن عاجزی کے ساتھ دیکھنے والا جو اپنی نظر کو نہ ہٹا سکے یا خاموشی کے ساتھ پکارنے والے کی آواز کی طرف جانے والا۔

مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ اپنے سر اوپر اٹھائے۔

قتیبی نے کہا مُقْنِع اس شخص کو کہتے ہیں جو سر اٹھائے اپنے سامنے دیکھتا رہے، سامنے سے نظر نہ ہٹائے۔ حسن نے کہا قیامت کے دن لوگوں کے منہ آسمان کی طرف ہوں گے کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھے گا۔

لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ ان کی نظر ان کی طرف واپس نہیں آئے گی۔ کہ اپنے آپ کو دیکھ سکیں بلکہ ٹکٹکی باندھے اوپر ہی کی طرف تکتے رہیں گے۔

وَاَفْـِٕدَتُهُمْ هَوَآءٌ ﴿٤٣﴾ اور ان کے دل بالکل بدحواس ہوں گے یعنی انتہائی دہشت اور حیرت کی وجہ سے ان کے دل، فہم و عقل سے خالی ہو جائیں گے۔ احمق آدمی کے متعلق کہا جاتا ہے قَلْبُهٗ هَوَاءٌ اس کا دل (فہم سمجھ اور قوت سے) خالی ہے (مطلب یہ کہ اس کا دماغ کھوکھلا ہے) قتادہ نے کہا ان کے دل سینوں سے نکلنے لگیں گے اور حلق میں آکر اٹک جائیں گے، نہ منہ سے باہر آئیں گے نہ اپنی جگہ پر لوٹیں گے۔ پس دل ہوا ہو جائیں گے یعنی ان کے اندر کچھ نہ ہوگا۔ آسمان و زمین کی درمیانی خلاء کو اسی وجہ سے ہوا کہا جاتا ہے سعید بن جبیرؓ نے کہا ان کے دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا بغوی نے لکھا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ دل بے تاب اور بے قرار ہوں گے کسی جگہ ان کو قرار نہ ہوگا۔ بغوی نے لکھا ہے اصل مطلب یہ ہے کہ دل اپنی جگہ سے ہٹ چکے ہوں گے اور نظریں خیرہ اور اوپر کو اٹھی ہوئی ٹکٹکی باندھے تک رہی ہوں گی۔

وَاَنْذِرِ النَّاسَ يَوْمَ يَاْتِيْهِمُ الْعَذَابُ اور (اے محمد ﷺ) لوگوں کو اس دن سے ڈراؤ جس دن ان پر عذاب آجائے گا یعنی قیامت کے دن یا مرنے کے دن سے۔ مرنے کا دن بھی عذاب کا پہلا دن ہوگا، یا یہ مراد ہے کہ اس دن سے ڈراؤ جس روز ان کو مکمل تباہ کرنے اور جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینے والا عذاب دنیا میں ہی آجائے گا۔

فَیَقُوۡلُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا پس ظالم یعنی وہ لوگ جنہوں نے شرک اور تکذیبِ رسول ﷺ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا ہے کہیں گے۔

رَبَّنَاۤ اَخِّرۡنَاۤ اے ہمارے رب ہم کو (دنیا میں) مہلت دے، یا یہ مطلب ہے کہ ہم کو دنیا میں لوٹا دے اور عذاب کو پیچھے کر دے۔

اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ تھوڑی مدت کے لئے، اور اتنی مدت ہم کو وہاں باقی رکھ کہ ہم تجھ پر ایمان لے آئیں اور تیری دعوت کو قبول کرلیں۔

نُّجِبۡ دَعۡوَتَكَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ ہم تیری دعوت قبول کرلیں اور تیرے پیغمبروں کی پیروی کریں یہ امر کا جواب ہے اسی کی نظیر آیت لَوۡ لَاۤ اَخَّرۡتَنِیۡۤ اِلٰۤی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنۡ مِّنَ الصّٰلِحِیۡنَ ہے اس درخواست کا ان کو جواب دیا جائے گا۔

اَوَلَمۡ تَكُوۡنُوۡۤا اَقۡسَمۡتُمۡ مِّنۡ قَبۡلُ مَا لَكُمۡ مِّنۡ زَوَالٍ ﴿۴۴﴾ ۙ کیا اس سے پہلے (دنیا میں) تم نے قسمیں کھا کر یہ نہیں کہا تھا کہ ہم دنیا میں ہمیشہ رہیں گے ہم کو کبھی نہیں مرنا ہے شاید یہ الفاظ انہوں نے انتہائی غرور و تکبر کی حالت میں کہے ہوں یا اقسموا سے مراد ہے دلالتِ حال کی پختگی۔ انہوں نے مستحکم عمارتیں بنائی تھیں، لمبی لمبی امیدیں باندھی تھیں جس سے (بدلالتِ التزامی) ثابت ہو رہا تھا کہ ان کو اپنے ہمیشہ رہنے کا یقین ہے۔ یہ بھی مطلب بیان کیا گیا ہے کہ (زوال سے مراد ہے دارِ آخرت کی طرف منتقل ہو جانا) انہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا کہ ہم کو دارِ آخرت کی طرف پہنچنا نہیں (قیامت نہیں ہو گی اور دوبارہ کوئی زندہ کر کے نہیں اٹھایا جائے گا) دوسری آیت میں یہی مضمون آیا ہے۔ ارشاد فرمایا ہے وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَيۡمَانِهِمۡ لَا يَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ يَّمُوۡتُ انہوں نے پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ جو مر جائے گا اس کو اللہ دوبارہ زندہ نہیں کرے گا۔

وَّسَكَنۡتُمۡ فِیۡ مَسٰكِنِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ اور جن لوگوں نے (کفر و معصیت کر کے) اپنے آپ پر خود ظلم کیا تھا (جیسے قومِ نوح، عاد، ثمود وغیرہ) کیا ان کے گھروں میں ان کی جگہ پر تم نہیں رہے تھے۔

وَتَبَیَّنَ لَكُمۡ كَیۡفَ فَعَلۡنَا بِهِمۡ وَضَرَبۡنَا لَكُمُ الۡاَمۡثَالَ ﴿۴۵﴾ اور (کیا ان کے آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ کر کے اور ان کی تباہیوں اور بربادیوں کی خبر سن کر) تم پر ظاہر نہ ہو گیا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ کیا کیا اور (کیا) تمہاری عبرت کے لئے ہم نے (ان کے احوال کی) مثالیں (نہیں) بیان کر دی تھیں۔ یعنی کیا ہم نے پیغمبروں کی معرفت اور ان کی زبانی نہیں بیان کر دیا تھا کہ تم کفر و استحقاقِ عذاب میں گزشتہ اقوام کی طرح ہو یا یہ مطلب کہ گزشتہ اقوام کے حالات و اعمال اور ان کے نتائج۔ جو ندرت میں مشہور کہاوتوں کی طرح ہو گئے تھے تم سے بیان نہ کر دیئے تھے، یا یہ مطلب ہے کہ تمہاری سبق آموزی کے لئے ہم نے قرآن میں مثلیں نہیں بیان کر دی تھیں۔

وَقَدۡ مَكَرُوۡا مَكۡرَهُمۡ اور انہوں نے اپنی سازشیں کیں یعنی کفارِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو جلاوطن کرنے یا قید کر دینے یا قتل کر ڈالنے کی سازش کی۔ اہلِ تفسیر کے نزدیک مکروا کی ضمیر فاعلی اور ضمیر ھم دونوں کفارِ مکہ کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ یعنی کفارِ مکہ نے اپنی سی ہر تدبیر کر لی اور حق کو مٹانے اور باطل کو اٹھانے کی ہر کوشش جو کر سکتے تھے کر لی۔ اس تفسیر پر اس کلام کا سابق کلام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ میرے نزدیک اس جملے کا عطف سَكَنۡتُمۡ پر ہے مَكَرُوۡا کی ضمیر تو کفارِ مکہ کی طرف راجع ہے۔ اور ھم ضمیر الذین کی طرف لوٹ رہی ہے اور الذین سے مراد اقوامِ گزشتہ ہیں یعنی کفارِ مکہ نے بھی گزشتہ امتوں کے کافروں جیسے فریب کئے اور ان کی تدبیروں کی طرح سازشیں کیں۔

وَعِنۡدَ اللّٰهِ مَكۡرُهُمۡ ؕ اور اللہ کے پاس ان کا فریب (لکھا ہوا) موجود ہے وہ اس فریب کاری کی ان کو سزا دے گا یا یہ مطلب ہے کہ ان کی سازشوں اور مکاریوں کی سزا دینے کے لئے اللہ کے پاس بھی پوشیدہ تدبیر ہے جس سے ان

کی سازشوں کو بے حقیقت کر دے گا۔

وَاِنۡ کَانَ مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ ﴿۴۶﴾ اور واقعی ان کی تدبیریں ایسی تھیں کہ ان سے پہاڑ بھی ٹل جائیں اِنۡ نافیہ ہے اور لِتَزُوۡلَ میں لام تاکیدِ نفی کے لئے ہے اور "جبال" سے مراد ہے رسول اللہ ﷺ کی نبوت کا معاملہ اور قوانینِ شریعت اور آیاتِ خداوندی مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر ایسا نہیں کہ اس سے پہاڑ ٹل جائیں یعنی نبوّتِ محمدیہ اور احکامِ الٰہیہ ان کی سازشوں سے باطل نہیں ہوسکتے نہ ان کی فریب کاریوں سے ان میں زوال آسکتا ہے۔ یا اِنۡ، اِنَّ کا مخفّف ہے مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور شریعتِ الٰہیہ اور احکامِ خداوندی جو پہاڑوں کی طرح پائیدار ہیں، انہوں نے اپنی سازشوں سے ان کو اکھاڑ دینا چاہا اور ارادہ کیا کہ فریب و مکر سے ان کی بیخ کنی کر دیں لیکن ایسا نا ممکن ہے۔ حسن نے کہا ان کا مکر پہاڑوں کو ان کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا۔ ابن جریج کی قرأت میں لِتَزُولَ کی جگہ لَتَزُوۡلَ آیا ہے۔ اِنۡ مخففہ ہے اور لام تاکیدی فصل کے لئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا مکر بلاشبہ ایسا تھا کہ پہاڑ بھی اس کی وجہ سے اپنی جگہ چھوڑ کر اکھڑ جائیں۔ یہی مضمون ایک اور آیت میں آیا ہے۔ تَخِرُّ الۡجِبَالُ هَدًّا اَنۡ دَعَوۡا لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا۔

بغوی نے حضرت علیؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول نمرود کے حق میں ہوا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کی ہستی کی بابت مناظرہ کیا تھا نمرود نے کہا اگر ابراہیمؑ کا قول سچا ہے تو میں آسمان تک پہنچ کر خود دیکھوں گا کہ وہاں کون ہے، کیا ہے۔ چنانچہ آسمان تک چڑھنے کی اس نے یہ اسکیم بنائی کہ گدھ کے چار بچے لے کر ان کو پالا اور ٹریننگ دی جب وہ جوان ہو گئے تو ایک صندوق بنوایا اور جس کے دو دروازے قائم کئے۔ ایک بالائی جانب ایک نیچے کی طرف اور چار لکڑیاں لے کر صندوق کے ہر گوشہ میں ایک ایک لکڑی کھڑی کر دی اور ہر لکڑی کی بالائی نوک پر گوشت کا ٹکڑا باندھ دیا پھر صندوق کو گدھوں کی ٹانگوں سے باندھ دیا (صندوق نیچے گدھ اوپر اور لکڑیوں میں گوشت بندھا ہوا گدھوں کے اوپر) اسکے بعد نمرود ایک آدمی کو ساتھ لے کر صندوق میں بیٹھ گیا اور گدھوں کو اڑایا گدھ اڑے اور گوشت حاصل کرنے کے لئے اوپر اٹھتے گئے (جتنا اوپر اٹھتے تھے گوشت لکڑیوں میں لٹکتا ہوا ان کے اوپر ہی رہتا تھا اور گدھوں کی رسائی گوشت تک نہیں ہوتی تھی) اسطرح اوپر چڑھتے رہے اور دور ہوا میں پہنچ گئے۔ ایک روز گزر گیا تو نمرود نے ساتھی سے کہا اوپر کا دروازہ کھول کر دیکھو آسمان قریب آگیا یا نہیں ساتھی نے دروازہ کھول کر دیکھا اور بولا آسمان تو ویسا (ہی دور) ہے جیسا پہلے تھا۔ نمرود نے کہا اب نیچے کا دروازہ کھول کر دیکھو ساتھی نے نیچے کا درواہ کھول کر دیکھا اور کہا زمین ایک تالاب کی طرح اور پہاڑ دھوئیں کی مانند دکھائی دے رہے ہیں۔ غرض گدھ اڑتے اور اوپر کو اٹھتے رہے یہاں تک کہ ایک دن اور گذر گیا اور اب خلا گدھوں کی اڑان میں رکاوٹ پیدا کرنے لگی نمرود نے ساتھی سے کہا اب دونوں دروازے کھول کر دیکھو اوپر کا دروازہ کھولا تو آسمان ویسا ہی اپنی ہیئت پر نظر آیا اور نیچے کا دروازہ کھول کر دیکھا تو زمین کی جگہ صرف ایک تاریک سیاہی نظر آئی اور (غیب سے) ندا آئی باغی تو کہاں جانا چاہتا ہے۔ عکرمہ کا بیان ہے نمرود کے ساتھ تابوت میں ایک غلام بھی تیر کمان لئے موجود تھا غلام نے (اوپر کی جانب) تیر پھینکا، تیر خون آلودہ ہو کر لوٹ آیا کوئی مچھلی (بحکم خداوندی) سمندر سے تڑپ کر خلا میں پہنچ گئی تیر اسی کے خون سے رنگین ہو گیا تھا۔ بعض نے کہا کسی پرندے کے خون سے آلودہ ہو گیا تھا نمرود نے کہا آسمان والے خدا کے کام سے تو میں فارغ ہو گیا پھر ساتھی کو حکم دیا اب (ستون والی) لکڑیوں کو الٹ دو اوپر کا رخ نیچے کی طرف کر دو۔ ساتھی نے حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح گوشت نیچے کی طرف ہو گیا اور گدھ گوشت کو نیچے کی طرف دیکھ کر نیچے اترنے لگے۔ پہاڑوں نے صندوق اور گدھوں کی سرسراہٹ سنی تو خوف زدہ ہو گئے ان کا خیال ہوا کہ آسمان سے کوئی نئی مصیبت آگئی اور قیامت برپا ہو گئی۔ خوف زدہ ہو کر قریب تھا کہ وہ اپنی جگہ سے ٹل جائیں یہ ہی مفہوم ہے آیت وَاِنۡ کَادَ[لہ] مَكۡرُهُمۡ لِتَزُوۡلَ مِنۡهُ الۡجِبَالُ کا (حضرت مفسّر نے فرمایا کہ) یہ روایت عقل و درایت کے بھی خلاف ہے اور نقلِ صحیح کے بھی۔

لہ آیت میں وَاِنۡ کَانَ مَكۡرُهُمۡ ہے لیکن اس روایت میں کَانَ کی جگہ کَادَ ہے یا یہ ناقل کا سہو قلم ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ ط پس آپ یہ خیال بھی نہ کرنا کہ اللہ نے جو وعدہ اپنے پیغمبروں سے ان کی نصرت اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کا کیا ہے وہ ان کے خلاف کرنے والا ہے۔ اللہ نے اپنے پیغمبروں کی نصرت کا وعدہ ایک اور آیت میں کیا ہے فرمایا ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا اور پیغمبروں کو غالب کرنے اور دشمنوں کو ہلاک کرنے کے متعلق فرمایا ہے لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ وَعْدِهٖ کو رُسُلَهٗ سے پہلے ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ وعدہ خلافی کرتا ہی نہیں ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ اور وہ کسی سے وعدہ خلافی نہیں کرتا تو پیغمبروں سے جو وعدہ کیا ہے اسکے خلاف کیسے کر سکتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ نا قابلِ شک ہے یہ بات کہ اللہ غالب ہے اس کے مقابلے میں کوئی سازش نہیں کی جاسکتی اور ایسا قادر ہے کہ اس کا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴۷﴾ (اپنے دوستوں کا دشمنوں سے) انتقام لینے والا ہے۔

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ جس روز دوسری زمین بدل دی جائے گی، اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی يَوْمَ تُبَدَّلُ، يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ سے بدل ہے یا انتقام کا مفعول فیہ ہے یا اُذْكُرُوْا محذوف کا مفعول بہ ہے اور السَّمٰوٰتُ کا عطف الْاَرْضِ پر ہے۔

تبدیل دو طرح کی ہوتی ہے ایک تبدیلِ ذاتی یعنی ایک شئ کی بجائے دوسری چیز لے آئی جائے جیسے میں نے درہم کو دینار سے بدل دیا، درہم دے کر دینار لے لیا۔ اللہ نے فرمایا ہے بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا ہم ان کو ان کی کھالوں کی جگہ دوسری کھالیں دے دیں گے (۲) تبدیلِ وصفی (یعنی نفسِ شئ تو باقی رکھی جائے اس کی حالت شکل وغیرہ بدل جائے) جیسے بَدَّلْتُ الْحَلْقَةَ بِالْخَاتَمِ میں نے چھلا بدل کر انگوٹھی بنادی یعنی چھلے کو پگھلا کر انگوٹھی کی شکل دے دی۔ چھلے کی شکل کو انگوٹھی کی شکل میں تبدیل کر دیا۔

عبد الرزاق، عبد بن حمید، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیروں میں اور بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابن مسعودؓ کا قول اس آیت کی تشریح کے ذیل میں نقل کیا ہے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا یہ زمین بدل کر ایسی زمین کر دی جائے گی جو چاندی کی طرح ہو گی جہاں نہ کبھی حرام خون بہایا گیا ہو گا نہ کوئی اور گناہ کیا گیا ہو گا۔ بیہقی نے یہ حدیث مرفوعاً بھی بیان کی ہے، یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول نہیں ہے، بلکہ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں اور موقوفاً بھی یعنی حضرت ابن مسعودؓ کا قول بھی قرار دیا ہے اور موقوف ہونے کو ترجیح دی ہے۔ میں کہتا ہوں اس جگہ موقوف حدیث بھی مرفوع کی طرح ہے۔ (واقعاتِ قیامت کا بیان اجتہاد، فکر ورائے سے کوئی صحابی نہیں کر سکتا کہ جس میں غلطی کا امکان ہو سکے۔ مبدء ومعاد، ملائکہ، نبوت، جنت ودوزخ اور مستقبل کے سلسلے میں جو اقوال کسی صحابی کی طرف منسوب ہیں وہ یقیناً صحابی کے از خود نہیں ضرور رسول اللہ ﷺ سے سنے ہوئے ہیں احتیاطاً یا کسی اور وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی طرف ان کی نسبت نہیں کی گئی پس تبدیلِ ارض وسماء کے سلسلے میں جو حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے وہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے۔ مترجم)

ایک دوسری سند سے ابن جریر و حاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا یہ زمین بدل کر سفید زمین ہو جائے گی جیسے خالص چاندی۔ احمد، ابن جریر، ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ایوبؓ کی روایت سے اور (صرف) ابن جریر نے حضرت انسؓ کی روایت سے (موقوفاً) بیان کیا، قیامت کے دن اللہ اس زمین کو چاندی کی ایسی زمین سے بدل دے گا جس پر گناہ نہیں کیا گیا ہو گا۔ ابن جریر نے ابو حمزہ کے سلسلے سے حضرت زید کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا، یہ زمین چاندی کی طرح سفید ہو جائے گی۔ ابن ابی الدنیا نے صفۃ الجنتہ میں حضرت علیؓ کی روایت سے اس آیت کی تشریح کے ذیل میں بیان کیا کہ (حضرت علیؓ نے فرمایا) زمین چاندی کی ہو گی اور آسمان سونے کا۔ ابن جریر نے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ زمین ایسی ہو گی جیسے چاندی اور آسمان بھی ایسا ہی ہو گا۔ عبد بن حمید نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے، عکرمہ نے کہا ہم کو

یہ (روایت) پہنچی ہے کہ یہ زمین لپیٹ دی جائے گی اور اس کے برابر ایک اور زمین ہو گی۔ اس زمین سے اس زمین کی طرف لوگوں کو لے جا کر جمع کیا جائے گا۔ صحیحین میں حضرت سہل بن سعدؓ کی روایت آئی ہے، حضرت سہلؓ نے فرمایا کہ میں نے خود سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے: قیامت کے دن لوگوں کو ایک سفید زمین پر جمع کیا جائے گا جس کا رنگ خاکستری (سفیدی آفریں مٹیالا) ہو گا اور چھنے ہوئے آٹے کی ٹکیہ کی طرح (ہموار وہم رنگ) ہو گی جس میں کسی کی کوئی (عمارت، منارہ، گنبد وغیرہ غرض کوئی) نشانی نہ ہو گی۔ بیہقی نے بسند سدی صغیر بحوالۂ کلبی از ابو صالح اس آیت کی تشریح میں حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اس میں کمی بیشی کر دی جائے گی ٹیلے، پہاڑ وادیاں، درخت اور جو کچھ اس زمین میں ہے ختم کر دیا جائے گا اور عکاظ کے چمڑے کی طرح اس کو کھینچ کر پھیلایا جائے گا وہ چاندی کی طرح ایک سفید زمین ہو گی جس پر کوئی خون نہیں بہایا جائے گا اور نہ کوئی گناہ کیا گیا ہو گا اور آسمانوں کے سورج چاند ستارے ختم کر دیئے جائیں گے۔

حاکم نے حضرت ابن عمرؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو چمڑے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور سب مخلوق کو (اس پر) جمع کیا جائے گا۔

حاکم نے عمدہ سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے رسول اللہ ﷺ کا فرمان نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن چمڑے کے کھینچنے کی طرح زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا پھر کسی آدمی کے لئے قدموں کے رکھنے سے زیادہ جگہ نہ ہو گی پھر سب سے پہلے مجھے پکارا جائے گا اور میں سجدہ میں گر پڑوں گا پھر مجھے اجازت ملے گی تو اٹھ کر کھڑا ہو جاؤں گا اور عرض کروں گا اے میرے رب! یہ جبرئیلؑ ہیں (حضرت جبرئیل اس وقت رحمان کے دائیں جانب ہوں گے اور جبرئیلؑ نے اس سے پہلے رحمٰن کو کبھی نہ دیکھا ہو گا) انہوں نے مجھے اطلاع دی تھی کہ آپ نے ان کو میرے پاس بھیجا تھا، جبرئیل خاموش ہوں گے کوئی بات نہیں کریں گے اللہ فرمائے گا اس نے سچ کہا تھا پھر اللہ مجھے شفاعت کرنے کی اجازت عطا فرمائے گا۔ میں عرض کروں گا اے میرے رب تیرے بندے زمین کے تمام اطراف میں ہیں۔ یہی مقام محمود ہو گا (اللہ کی حمد کرنے کا مقام جس پر قیامت کے دن رسول اللہ ﷺ کو فائز کیا جائے گا۔)

صحیحین میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے دن زمین ایک روٹی ہو گی جو اللہ اپنے ہاتھ سے اہلِ جنت کی مہمانی کے لئے تیار کرے گا جیسے تم لوگ سفر کے لئے اپنی روٹی تیار کرتے ہو (اس حدیث میں نُزُلاً لِّاَھلِ الْجَنَّۃِ کا لفظ آیا ہے ہم نے نزل کا ترجمہ "مہمانی" کیا ہے خواہ مہمان کے لئے تیار کیا ہوا کھانا یا کوئی اور چیز جو کھانے کے لئے کھانے سے پہلے پیش کی جائے) دراوردی نے کہا، نُزُل اس چیز کو کہتے ہیں جو طعام مہمانی سے پہلے مہمان کو پیش کی جاتی ہے مراد یہ ہے کہ اہلِ جنت کو جنت میں پہنچنے تک مختلف مواقف و مقامات پر بطورِ نُزُل زمین کی روٹی پیش کی جائے گی اور آخر وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔

اسی طرح ابن مرجان نے الارشاد میں بیان کیا ہے کہ زمین بدل کر ایک روٹی کر دی جائے گی (جس کو) مؤمن اپنے قدموں کے درمیان سے اٹھا کر کھائے گا اور حوض (غالباً کوثر یا تسنیم) کا پانی پیے گا۔ ابن حجر نے لکھا ہے اس سے مستفاد ہوتا ہے کہ میدانِ حشر کے سارے مواقف کی پوری مدت میں مؤمنوں کو بھوک کی سزا نہیں دی جائے گی بلکہ اللہ اپنی قدرت سے زمین کی فطرت بدل دے گا کہ اللہ کی مشیت کے مطابق مؤمن اپنے قدموں کے نیچے سے بغیر کمائی اور تکلیف کے اٹھا کر روٹی کھائیں گے اسی کی تائید کرتا ہے سعید بن جبیرؓ کا وہ قول جو ابن جریر نے نقل کیا ہے کہ زمین سفید روٹی ہو جائے گی جو مؤمن اپنے قدموں کے نیچے سے اٹھا کر کھائے گا اسی طرح کا محمد بن کعب کا قول بھی مروی ہے بیہقی نے عکرمہ کا قول نقل کیا ہے کہ زمین بدل کر سفید مثل روٹی کے ہو جائے گی جس کو اہلِ اسلام حساب سے فراغت کے وقت تک کھاتے رہیں گے۔ امام ابو جعفر یعنی امام باقر کا قول بھی روایت میں اسی طرح آیا ہے۔

خطیب نے حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر ایسی حالت میں ہو گا کہ بہت زیادہ

بھوکے ہوں گے ایسے بھوکے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بہت زیادہ پیاسے ہوں گے ایسے پیاسے کبھی نہیں ہوئے ہوں گے بالکل برہنہ ہوں گے کبھی ایسے ننگے نہ رہے ہوں گے اور ایسے تھکے ہوئے ہوں گے کہ کبھی ایسے نہ تھکے ہوں گے۔ پس جس نے دنیا میں اللہ کے لئے کھانا کھلایا ہوگا اللہ اس روز اس کو کھانا کھلائے گا اور جس نے اللہ کے لئے پانی پلایا ہوگا اللہ اس کو پانی پلائے گا اور جس نے اللہ کے واسطے لباس پہنایا ہوگا اللہ اس کو لباس پہنائے گا اور جس نے (اللہ کے لئے) کوئی عمل کیا ہوگا اللہ اس کے لئے کافی ہوگا۔

ابن جریر نے محمد بن کعب کا قول اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ ابن کعب نے کہا آسمان باغ ہو جائیں گے اور سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی اور زمین تبدیل کر کے کچھ اور کر دی جائے گی۔ حضرت ابن مسعودؓ کا ایک قول آیا ہے کہ قیامت کے دن ساری زمین آگ ہو جائے گی۔ کعب احبار کا قول ہے کہ سمندر کی جگہ آگ ہو جائے گی۔

مسلم نے حضرت ثوبان کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک یہودی عالم نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر دریافت کیا جس روز زمین دوسری زمین میں تبدیل کر دی جائے گی اس روز لوگ کہاں ہوں گے حضور ﷺ نے فرمایا پل سے ورے تاریکی میں۔

مسلم نے حضرت عائشہؓ کا بیان نقل کیا ہے ام المؤمنین نے فرمایا، میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بیان فرمایئے کہ جس روز زمین تبدیل کر دی جائے گی تو لوگ کہاں ہوں گے، فرمایا صراط پر۔ بیہقی نے کہا اس حدیث میں صراط کا لفظ بطورِ مجاز استعمال کیا گیا ہے چونکہ لوگوں کو (اسکے بعد) صراط سے گزرنا ہوگا اس لئے بطورِ مجاز صراط پر ہونے کی صراحت فرمائی اب حضرت ثوبان کی روایت سے اس روایت کی مطابقت ہو جائے گی ثوبان کی روایت میں پل سے ورے تاریکی میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ امر بھی ہے کہ تبدیلِ ارضی یعنی اس زمین سے منتقل ہو کر ارضِ موقف پر پہنچنا توزجرہ (جھڑکی یا جھنجھوڑ) کے وقت ہوگا (جو پل صراط پر پہنچنے سے پہلے ہوگا)

بیہقی نے حضرت اُبی بن کعب کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً کی تشریح میں آپ نے فرمایا، دونوں خاک ہو جائیں گے جو کافروں کے چہروں پر پڑے گی مؤمنوں کے چہروں پر نہیں پڑے گی وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ کا یہی مطلب ہے کافروں کے چہروں پر اس روز خاک ہوگی جن پر سیاہی چڑھی ہوگی۔

سیوطی نے لکھا ہے کہ قدماء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے کہ کیا تبدیلِ ارض سے مراد صرف تبدیلِ اوصاف (احوال، رنگ، ہیئت وغیرہ) ہے یا تبدیلِ ذات ہی ہو جائے گی مؤخر الذکر قول کو ابن ابی حمزہ نے ترجیح دی ہے اور صراحت کی ہے کہ یہ دنیا کی زمین نابود ہو جائے گی اور موقف قیامت کی نئی زمین پیدا کی جائے گی۔

شیخ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ تبدیلِ ارض کی احادیث اور زمین کو کھینچ کر پھیلانے اور اس میں کمی بیشی کرنے کی احادیث میں کوئی تضاد نہیں۔ کیونکہ یہ سارے حوادثِ ارض دنیا پر واقع ہوں گے اور موقف کی زمین اس کے علاوہ ہوگی تو ایک جھڑکی سے سب لوگ یہاں سے نکل کر ارضِ محشر میں پہنچ جائیں گے۔

ابن حجر نے لکھا ہے اسی طرح ان احادیث میں بھی باہم منافات نہیں جن میں سے کسی میں زمین کا روٹی ہو جانا اور کسی میں خاک ہو جانا اور کسی میں آگ ہو جانا مذکور ہے کچھ زمین روٹی بن جائے گی کچھ خاک ہو جائے گی اور سمندر کی زمین آگ ہو جائے گی۔ حضرت اُبی بن کعب کا اثر اسی پر دلالت کر رہا ہے۔

(حضرت مفسّر نے فرمایا) میں کہتا ہوں کہ مؤمنوں کے قدموں کے نیچے کی زمین روٹی بن جائے گی اور کافروں کے قدموں کے نیچے کی زمین خاک اور آگ ہو جائے گی۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ صاحبِ افصاح نے ان تمام متضاد احادیث کا تعارض دور کرنے کیلئے کہا ہے کہ زمین و آسمان کی تبدیلی دو مرتبہ ہوگی، پہلی مرتبہ نفخۂ صعق (پہلی مرتبہ صور پھونکنے) سے پہلے ہوگی کہ ستارے جھڑ جائیں گے چاند اور سورج بے نور ہو جائیں گے، آسمان تانبے کی طرح سرخ ہو جائے گا اس کا پوست اتار لیا جائے

گا پہاڑ اڑے اڑے پھریں گے، سمندر آگ ہو جائیں گے، زمین میں لرزہ پیدا ہو جائے گا اور وہ پارہ پارہ ہو جائے گی۔ اس کی ہیئت ہی بدل جائے گی پھر پہلا صور پھونکا جائے گا تو آسمان لپیٹ دیئے جائیں گے آسمان بدل کر دوسرا آسمان ہو جائے گا اور زمین کو کھینچ کر پھیلا دیا جائے گا اور ویسا ہی دوبارہ کر دیا جائے گا جیسے وہ پہلے تھی اس کے اندر قبریں ہوں گی جن کے اندر مردے ہوں گے۔

پھر (دوبارہ صور پھونکے جانے پر) زمین میں دوسری تبدیلی ہو گی یہ اس وقت ہو گا جب لوگ میدان حشر میں کھڑے ہوں گے ایسی حالت میں روئے زمین جس کو ساہرہ کہا جائے گا اور اس پر حساب فہمی ہو گی بدل دیا جائے گا اس وقت زمین چاندی کی ہو گی، سفید خاکستری رنگ ہو گا جس پر نہ خوں ریزی کی گئی ہو گی نہ کوئی گناہ کیا گیا ہو گا اس تبدیلی کے وقت لوگ صراط پر کھڑے ہوں گے اور سب اس میں سما جائیں گے جو بچیں گے وہ جہنم کے پل پر ٹھہرے ہوں گے۔ دوزخ اس وقت منجمد ہو گی۔ حضرت عبداللہ کی روایت میں آیا ہے کہ زمین آگ ہو جائے گی اس سے یہی مراد ہے جب لوگ صراط سے گزر جائیں گے اور (مؤمن) انبیاء کے حوضوں پر پہنچ کر قیام کریں گے اور حیاض انبیاء کا پانی پئیں گے، تو زمین روٹی کی ایک ٹکیہ بنا دی جائے گی جو جنت میں جانے والے ہوں گے وہ سب اس روٹی میں سے کھائیں گے۔ جنت کے بیل کے جگر یا مچھلی کی جگری کا ان کے لئے سالن ہو گا۔

طبرانی نے الاوسط میں اور ابن عدی نے ضعیف سند کے ساتھ بیان کیا ہے کہ قیامت کے دن سوائے مسجدوں کے سب زمین نابود ہو جائے گی مساجد کو باہم ملا دیا جائے گا (یعنی تمام مساجد یکجا جمع کر دی جائیں گی)

میں کہتا ہوں، اگر یہ روایت صحیح ثابت ہو جائے تو شاید سب مساجد کی زمین جنت کی زمین بنا دی جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا میرے گھر اور میرے ممبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔ رواہ الشیخان فی الصحیحین و احمد و النسائی عن عبداللہؓ بن زید وفی الصحیحین والترمذی عن ابی ہریرۃؓ۔

وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ﴿۴۸﴾ اور (قبروں سے نکل کر حساب فہمی اور جزا و سزا پانے کے لئے) ایک غالب اللہ کے سامنے آئیں گے واحد و قہار دو صفتیں ذکر کرنے سے یہ بات بتانی ہے کہ معاملہ بہت سخت ہو گا۔ ایسے خدا کی پیشی ہو گی جو سب پر غالب ہے جس سے مقابلہ ممکن نہیں نہ اس کے سوا کہیں پناہ کی جگہ ہو گی، نہ فریاد کا مقام۔

وَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ مُّقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۴۹﴾ اور اس روز تم مجرموں یعنی کافروں کو طوق و زنجیر میں جکڑا ہوا دیکھو گے سب باہم ایک ساتھ بندھے ہوئے ہوں گے عقائد و اعمال کی مشارکت کی وجہ سے ایک ساتھ زنجیروں میں گرفتار بھی ہوں گے۔ سعید بن منصور نے حضرت عمر بن خطابؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نیک آدمی کو نیک آدمی کے ساتھ جنت میں اور بد آدمی کو بد آدمی کے ساتھ دوزخ میں ملا دیا جائے گا یا یہ مراد ہے کہ شیطانوں کے ساتھ ان کو ملا دیا جائے گا، یا یہ مطلب ہے کہ باطل عقائد اور نادرست اعمال جو دنیا میں ان کے تھے انہی کے ساتھ ان کا جوڑ لگا دیا جائے گا یا ہاتھوں اور پاؤں کو گردنوں سے ملا کر زنجیروں میں جکڑ دیا جائے گا۔

اَصفاد جمع صِفد واحد، بیڑیاں، ہتھکڑیاں اور طوق، صَفَدْتُہ میں نے اسکو خوب مضبوطی کے ساتھ زنجیروں میں جکڑ دیا۔

سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ ان کے کرتے قطران (تار کول وغیرہ) کے ہوں گے ابہل کا نچوڑا ہوا عرق جو آگ پر پکا لیا جائے قطران کہلاتا ہے یہ سیاہ بدبودار ہوتا ہے، خارشی اونٹوں کے بدن پر ملا جاتا ہے یہ اتنا تیز ہوتا ہے کہ تیزی کی وجہ سے خارشت کو جلا دیتا ہے۔ یہ بہت جلد آگ پکڑ لیتا ہے دوزخیوں کے بدن پر اس کو ملا جائے گا اور اس کا دوزخیوں کے جسم پر لیپ مثل کرتے کے ہو جائے گا۔

عکرمہ اور یعقوب کی روایت میں مِنْ قَطِرٍ اٰنٍ آیا ہے قِطر کا معنی ہے پگھلا ہوا تانبا اور پیتل۔ اٰنٍ (اصل میں آنیٌ تھا) کھولتا ابلتا ہوا۔

وَّتَغْشٰى وُجُوْهَهُمُ النَّارُ ﴿۵۰﴾ اور آگ ان کے چہروں پر لپٹی ہو گی ظاہری اعضاء میں چہرہ ممتاز حیثیت رکھتا

ہے اسی لئے خصوصیت کے ساتھ چہروں کا ذکر کیا جس طرح باطنی اعضاء میں دل کی حیثیت ممتاز ہے اور اسی امتیاز کی وجہ سے تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ فرمایا ہے یایوں کہا جائے کہ جب انہوں نے حق کی طرف اپنا رخ نہیں کیا اور دماغی حواس سے غور کا کام نہیں لیا باوجودیکہ آلات شعور وادراک کی تخلیقی غرض ہی یہ تھی کہ حق پر غور کرنے کا کام ان سے لیا جائے اس لئے قیامت کے دن ان کے چہروں پر آگ چھا جائے گی اور چونکہ ان کے دل وایمان معرفت سے خالی اور جہالتوں سے پُر تھے اس لئے آگ ان کے دلوں کو جھانکے گی۔

لِيَجْزِيَ اللّٰهُ كُلَّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ　تاکہ جس شخص نے جو کچھ کیا ہے اس کا بدلہ اللہ اس کو دے دے "نفس" سے مراد ہے مجرم شخص، عام آدمی بھی مراد ہو سکتا ہے۔ فرماں بردار ہو یا نافرماں۔ کیونکہ مجرموں کو سزا دینے کا جب اظہار کر دیا گیا تو اطاعت گزاروں کو اطاعت کا ثواب دیا جانا معلوم ہی ہو گیا اول صورت میں لیجزی کا تعلق مقرنین یا تغشی وغیرہ سے ہو گا اور دوسری صورت میں اسکا تعلق برزوا سے ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿۵۱﴾　بے شک اللہ بہت تیز حساب لینے والا ہے سیوطیؒ نے کہا یعنی ایک سے حساب فہمی اس کو دوسرے کی حساب فہمی سے نہیں روکتی (ایک ہی وقت میں سب کا حساب لے لے گا) سیوطی نے جلالین میں یہ بھی لکھا ہے کہ آدھے دن یعنی اس دنیوی دن کی نصف مدت میں سب کی حساب فہمی کرلے گا۔ اسکا ثبوت حدیث سے ملتا ہے نخعی کا بیان ہے وہ لوگ (غالباً صحابہؓ) خیال کرتے تھے کہ قیامت کے دن اللہ لوگوں کے حساب سے آدھے دن کی مدت میں فارغ ہو جائے گا یہاں تک کہ ایک فریق جنت اور دوسرا فریق دوزخ میں قیلولہ کرے گا (دوپہر گزارے گا) رواہ ابو نعیم وابن المبارک۔

ابن ابی حاتم اور ابن مبارک نے بیان کیا کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا اس دن کا آدھا حصہ گزرنے نہ پائے گا کہ یہ (جنت والے جنت میں) اور وہ (دوزخ والے دوزخ میں) قیلولہ کریں گے۔ حضرت ابن مسعودؓ نے اس کے بعد (قیلولہ کرنے کے ثبوت میں) یہ آیات تلاوت فرمائیں أَصْحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيْرٌ مُّسْتَقَرًّا وَّأَحْسَنُ مَقِيلًا۔ ثُمَّ إِنَّ مَقِيلَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ (اول آیت اہل جنت کے قیلولہ کا بیان ہے اور دوسری آیت میں دوزخیوں کے قیلولہ کا۔)

ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ وہ صرف دوپہر تک کا وقت ہو گا پھر اولیاء اللہ (جنت کے اندر) کشادہ چشم حوروں کے ساتھ مسہریوں پر (دوپہر گزاریں گے یعنی) قیلولہ کریں گے اور اللہ کے دشمن شیطانوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہوں گے۔ میں کہتا ہوں مذکورہ بالا اقوال صحابہؓ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدھے دن سے مراد ہے آخرت کا آدھا دن (اس سے دنیوی دن کا آدھا حصہ مراد نہیں ہے)

هٰذَا　یہ یعنی قرآن یا سورت یا سورت کے اندر آیت وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ میں جو وعظ ونصیحت درج ہے۔

بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ　لوگوں کی نصیحت کے لئے کافی ہے (یعنی پوری نصیحت ہے)

وَلِيُنْذَرُوا بِهٖ وَلِيَعْلَمُوا أَنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّلِيَذَّكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ ﴿۵۲﴾ ع　ع ۱۱ ۱۹

اور تاکہ اس کے ذریعہ عذاب سے ڈرائے جائیں اور تاکہ اس بات کا یقین کرلیں کہ وہی ایک معبود برحق ہے اور تاکہ دانش مند لوگ نصیحت حاصل کریں جس عذاب قیامت سے ان کو ڈرایا جائے گا اور وہ ڈر جائیں گے تو یہ خوف ان کو غور وفکر کرنے پر آمادہ کر دے گا اور غور وتامل کے بعد وہ آیات اور نشانیاں ان کے سامنے آجائیں گی جو اللہ کی توحید کو ثابت کرنے والی ہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ اللہ کو واحد لاشریک مان لیں گے اور تسلیم توحید کے بعد اللہ کی نافرمانی سے رک جائیں گے۔

ان آیات میں اللہ نے بلاغ قرآنی کے تین فائدے بیان فرمائے تمام آسمانی کتابیں نازل ہونے کی یہی تین حکمتیں ہیں:

(۱)　پیغمبروں کے ذریعہ سے لوگوں کو اللہ کی نافرمانی سے ڈرانا تاکہ اتمام حجت ہو جائے۔

(۲)　انسان کی قوت فکریہ کی تکمیل قوت فکریہ کا انتہائی کمال اعتراف توحید ہے۔

(۳)　قوت عملیہ کی درستی جو نصیحت پذیری اور اختیار تقویٰ سے حاصل ہوتی ہے۔

تفسیر سورۂ ابراہیم کی تالیف بحمد للہ ۱۲۰۲ھ ختم ہوئی ۱۵ جمادی الثانی — ترجمہ سورۂ ابراہیم بتوفیق الٰہی ۱۳۸۲ھ ختم ہوا فللہ الحمد اولاً وآخراً

سورۃ الحجر

یہ سورۃ مکی ہے اس میں ۹۹ آیات اور چھ ۶ رکوع ہیں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ① الٓرٰ یہ آیتیں ہیں کامل کتاب اور واضح قرآن کی۔ تلک سے سورت کی آیات کی طرف اشارہ ہے الکتاب سے مراد سورت ہے یا قرآن۔ قرآن کی تنوین اظہارِ عظمت کے لئے ہے مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی کتاب کی آیات ہیں جو کامل کتاب بھی ہے اور عربی قرآن بھی ہے حلال کو حرام سے جدا کرنے والا اور ہدایت و گمراہی کو کھول کر بیان کر دینے والا۔

چودھواں پارہ شروع

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ② کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کیا خوب ہوتا اگر وہ (یعنی ہم دنیا میں) مسلمان ہوتے۔ لفظ رُبَّ اظہارِ قلت کے لئے آتا ہے لیکن اس جگہ مجازاً اظہارِ کثرت کے لئے آیا ہے تقلیل و تکثیر میں علاقہ تضاد ہے یا اس بات پر تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ اگر ان کو اسلام سے کچھ بھی مودّت ہوتی خواہ ایک ہی بار ہوتی تو ضرور جلد از جلد اسلام کے دائرے میں آجاتے پس جب ان کو اسلام کی مودّت بہت زیادہ ہے تو پھر کفر پر قائم رہنا تعجب انگیز ہے یا تکثیر سے اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام کی مودّت ان کے دلوں میں اتنی زیادہ ہو گئی ہے جو ناقابلِ بیان ہے پس قلت کا لفظ ہی اس کے لئے کافی ہے۔ بعض اہل تفسیر کے نزدیک رُبَّ اس جگہ اظہارِ قلت کے لئے ہی ہے کیونکہ قیامت کی ہولناکیاں ان کو دہشت زدہ بنائے ہوئے ہوں گی۔ اگر کسی وقت کچھ ہوش ہوگا تو مسلمان ہونے کی تمنا کریں گے۔

مَا رُبَمَا میں کافہ ہے اس لئے فعل پر داخل ہونا جائز ہے (ورنہ رُبَّ حرف جر ہے جو صرف اسم پر داخل ہوتا ہے) مناسب تو یہ تھا کہ اس کے بعد فعل ماضی آتا لیکن اللہ کے بیان میں آئندہ ہونے والا واقعہ بھی گزشتہ کی طرح یقینی ہوتا ہے اس لئے ماضی کی جگہ مضارع کا استعمال بھی ماضی ہی کی طرح ہے۔ ابن جریر، ابن مبارک اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ اور حضرت انسؓ کے متعلق بیان کیا کہ ان دو بزرگوں نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا، اللہ جب دوزخ کے اندر مشرکوں اور گناہ گار مسلمانوں کو جمع کرے گا تو مشرک مسلمانوں سے کہیں گے تم کو بھی تمہارے اعمال کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے اس پر اللہ ناراض ہو کر مسلمانوں کو دوزخ سے باہر نکال دے گا (رہا کر دے گا بخش دے گا) ہناد، سعید بن منصور اور بیہقی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اللہ شفاعت قبول فرما کر مسلسل جنت میں داخل فرمائے گا اور شفاعت کے بعد رحم فرمائے گا بالآخر فرمائے گا جو بھی مسلمان ہو جنت میں چلا جائے (اس وقت کافر تمنا کریں گے کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے) آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ کا یہی مطلب ہے۔

طبرانی نے الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت جابرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا میری امت کے کچھ لوگوں کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا اور وہ دوزخ میں داخل ہو جائیں گے اور جتنی مدت اللہ چاہے گا رہیں گے پھر (دوزخ کے اندر) مشرک ان کو طعن دیں گے کہ تم نے جو تصدیق کی تھی (اور ایمان لائے تھے) اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس پر اللہ ہر موحد کو دوزخ سے نکال لے گا کسی موحد کو آگ کے اندر نہیں چھوڑے گا یہ فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ تلاوت فرمائی۔ طبرانی، ابن عاصم اور بیہقی نے حضرت ابو موسیٰؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب دوزخی دوزخ میں جمع ہو جائیں گے اور حسب مشیت خدا ان کے ساتھ کچھ اہل قبلہ بھی ہوں گے تو کافر مسلمانوں سے کہیں گے کیا تم مسلمان نہ تھے۔ مسلمان کہیں گے تھے کیوں نہیں، کافر کہیں گے تو اسلام سے تم کو کیا فائدہ ہوا تم بھی ہمارے ساتھ دوزخ میں آگئے تو مسلمان کہیں گے ہمارے کچھ گناہ تھے جن کی وجہ سے اللہ نے ہم کو پکڑ لیا۔ یہ گفتگو اللہ سنے گا تو حکم دے گا اہل قبلہ میں سے جو بھی دوزخ کے اندر ہو اس کو نکال لیا جائے چنانچہ سب مسلمان نکال لئے جائیں گے دوزخی کافر جب یہ بات دیکھیں گے تو کہیں گے کاش ہم بھی مسلمان ہوتے تو ہم کو بھی ان (مسلمانوں) کی طرح نکال لیا جاتا پھر حضور ﷺ نے آیت رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ تلاوت فرمائی۔

بغوی کی روایت میں اس حدیث میں اتنا زائد آیا ہے کہ اللہ ہر اہلِ قبلہ کے نکالنے کا حکم دے گا اور سب کو نکال لیا جائے گا اس وقت کافر تمنا کریں کہ کاش وہ بھی مسلمان ہوتے۔

طبرانی کا بیان ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ سے دریافت کیا گیا۔ آپ نے کیا اس آیت کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کو کچھ فرماتے سنا ہے۔ فرمایا ہاں میں نے سنا ہے حضور ﷺ فرما رہے تھے، انتقام لینے کے بعد اللہ دوزخ سے اپنی مشیت کے موافق مؤمنوں کو نکال لے گا (لیکن شروع میں) جب مشرکوں کے ساتھ ان مسلمانوں کو دوزخ کے اندر اللہ داخل فرما دے گا تو مشرک کہیں گے تم تو دنیا میں دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ کے دوست ہے پھر آج ہمارے ساتھ دوزخ میں کیوں ہو۔ یہ بات سماعت فرمانے کے بعد اللہ شفاعت کی اجازت دے دے گا فوراً فرشتے اور انبیاء اور مؤمن شفاعت کریں گے یہاں تک کہ ان گناہ گار مسلمانوں کو دوزخ سے بحکم خدا نکال لیا جائے گا۔ مشرک یہ بات دیکھ کر کہیں گے کاش ہم بھی تمہاری طرح ہوتے اور تمہاری طرح ہماری بھی شفاعت ہو جاتی۔ ان (رہا شدہ) مسلمانوں کے چہرے چونکہ سیاہ ہوں گے اس لئے (مسلمان) ان کو جہنمی کہیں گے ان کا نام جہنمی ہو جائے گی۔ لیکن وہ اللہ سے دعا کریں گے اے ہمارے رب ہم سے یہ نام الگ کر دے، حکم ہو گا نہر حیات میں غسل کریں گے۔ غسل کے بعد ان کے چہرے گورے گورے چمکدار ہوں جائیں گے اور یہ نام (یا خطاب) ان کا نہیں رہے گا۔

ابن جریر نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ (کافروں کی تمنا) اس وقت ہو گی جب گناہ گار مسلمانوں کو دوزخ سے نکالا جا رہا ہو گا ہناد نے اس آیت کے ذیل میں مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ اس وقت لا الہ الا اللہ کا ہر قائل (یعنی ہر مسلمان) دوزخ سے نکل آئے گا۔

ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْأَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ③ (اے محمد ﷺ) آپ ان (کافروں) کو رہنے دیجئے کہ کھائیں اور (دنیا کے) مزے اڑائیں اور (آخرت کی تیاری سے) ان کو (طولِ زندگی کی) امید روکے رہے (جب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو) اپنی بدانجامی ان کو خود معلوم ہو جائے گی۔

اس کلام کا اصل مقصد یہ ہے کہ کافروں کے ایمان لانے سے آپ ناامید ہو جائیں اور سمجھ لیں کہ اللہ کے علم میں ان کافروں کی شقاوت لکھی ہوئی ہے اگرچہ اللہ نے ان کو نصیحت کی ہے مگر یہ ایمان نہیں لائیں گے۔ نصیحت سے ان کو کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ آیت میں اتمامِ حجت بھی ہے اور عیش پرستی سے باز داشت بھی اور طولِ امید کے نتیجہ سے تحذیر بھی۔

وَمَا أَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ إِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَعْلُومٌ ④ اور ہم نے جتنی بستیاں ہلاک کی ہیں ان کے لئے ایک معین وقت نوشتہ تھا۔ یعنی لوح محفوظ میں اسکی ہلاکت کا وقت لکھا ہوا تھا جو اللہ کو معلوم تھا۔

مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۞ کوئی قوم اپنے مقررہ وقتِ ہلاکت سے پہلے ہلاکت کی طرف نہ بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے یعنی مقررہ وقت سے نہ پہلے ہلاکت ہو سکتی ہے نہ پیچھے۔

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۞ اور (ان کافروں نے بطورِ استہزاء) کہا اے وہ شخص جس پر قرآن اُتارا گیا ہے تو بلا شبہ پاگل ہے یعنی دیوانوں کی ایسی باتیں کرتا ہے کہ کہتا ہے مجھ پر قرآن اتارا گیا ہے۔

لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۞ اگر تو (نبوت کے دعویٰ میں) سچا ہے تو ہمارے سامنے (شہادت دینے کے لئے) فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا جو تیرے دعویٰ کی صداقت کی شہادت دیں اور تیری تائید کریں یہی مطلب دوسری آیت میں بھی ادا کیا گیا ہے فرمایا ہے لَوْ لَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا یا یہ مطلب ہے کہ ہم جو تکذیب کررہے ہیں ہم کو عذاب دینے کے لئے فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا جس طرح سابق امتوں کو ہلاک کرنے کے لئے فرشتوں کا نزول ہوا تھا۔

مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۞ ہم (عذاب کے) ملائکہ کو نہیں اتارتے ہیں مگر حق (عذاب) کے ساتھ (یعنی اس عذاب کے ساتھ جس کے نازل کرنے کا قطعی فیصلہ اللہ کے نزدیک ہو چکا ہوتا ہے) اور اس وقت (کافروں کو) مہلت نہیں دی جاتی۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۞ بلاشبہ ہم نے ہی قرآن اُتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

اس کلام سے پُرزور طور پر کافروں کے انکار اور استہزاء کی تردید کردی گئی "حفاظت کرنے" سے مراد ہے ہر قسم کی الفاظ کے تغیّر ردّوبدل اور کمی بیشی سے حفاظت، اب کسی طور پر بگاڑ اور تغیّر اس میں ممکن نہیں۔ یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ یہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو اس میں تحریف و تغیّر کا امکان ہوتا اور دین کے دشمن نکتہ چینی کرسکتے۔ افسوس کہ رافضی گروہ اس آیت کے باوجود قرآن کو بگڑا ہوا (اور ناقص) قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ (چالیس پارے تھے) حضرت عثمانؓ نے دس پارے جلوادیئے۔

بعض اہلِ تفسیر کے نزدیک لَهٗ کی ضمیر رسول اللہ ﷺ کی طرف راجع ہے۔ اسی کے ہم معنی ہے آیت وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ یعنی رسول اللہ کو کوئی بداندیش ضرر نہیں پہنچا سکے گا اللہ ان کا حافظ ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۞ اور ہم نے آپ سے پہلے بھی پچھلی امتوں میں پیغمبر بھیجے۔ شِیَع جمع ہے شیعۃ مفرد۔ شیعہ وہ جماعت ہے جو متفق الرائے ہو اور کسی بات پر متحد ہو۔ شاعہ اس کا اتباع کیا اس کے پیچھے چلا، چھوٹی لکڑیاں جن کو آگ لگا کر بڑی لکڑیوں کو ان کے ذریعہ سے جلایا جاتا ہے شیاع کہلاتی ہے۔

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۞ اور جو پیغمبر بھی ان کے پاس پہنچا وہ اس سے ٹھٹھول کرتے رہے۔ جیسا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کرتے تھے اس جملے میں رسول اللہ ﷺ کے لئے پیامِ تسلّی ہے۔

كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۞ اسی طرح ہم یہ استہزاء ان مجرموں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں "المجرمین" سے مراد ہیں مشرکینِ مکہ یعنی جس طرح گزشتہ کافر امتوں کے دلوں میں ہم نے کفر و استہزاء کو داخل کردیا تھا اسی طرح مکہ کے ان مشرکوں کے دلوں میں بھی ہم کفر و استہزاء کو داخل کرتے ہیں سلک (پرونا) ایک چیز کا دوسری چیز میں داخل کرنا جیسے سوئی میں ڈورے کو اور زخمی میں نیزے کی نوک کو داخل کردینا۔ اس آیت میں فرقۂ قدریہ کے قول کا رد ہے (فرقۂ قدریہ قائل ہے کہ وہ اپنے افعال کا خود خالق ہے) آیت بتارہی ہے کہ کافروں کے دلوں میں کفر و استہزاء کو

پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔

لَا يُؤْمِنُونَ بِهٖ　اسی وجہ سے یہ لوگ قرآن پر ایمان نہیں لاتے۔

وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۳﴾　اور گزشتہ لوگوں کا طریقہ بھی (ایسا ہی) گزرا ہے یعنی اللہ کا طریقہ ان کے ساتھ یہی رہا ہے کہ اللہ نے ان کی مدد نہیں کی اور کفر کو ان کے دلوں میں داخل کر دیا یا یہ مطلب ہے کہ پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کو تباہ کر دیا۔

وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ﴿۱۴﴾　اور اگر ان (طلبگارانِ آیت) پر ہم آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں اور (فرشتے) اس میں چڑھنے لگیں یعنی ان کافروں کو اپنی آنکھوں سے فرشتے چڑھتے دکھائی دیں۔

حسن نے کہا یَعْرُجُوْنَ اور ظَلُّوْا کی ضمیریں کافروں کی طرف لوٹ رہی ہیں یعنی کافر خود آسمان کی طرف چڑھنے لگیں اور دن کی روشنی میں عجائبِ آسمانی دیکھتے رہیں۔

لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا　تب بھی (یہی) کہیں گے کہ ہماری نظر بندی کر دی گئی ہے یعنی جادو کے زور سے ہماری نگاہوں کو بند کر دیا اور دیکھنے سے روک دیا گیا ہے۔

سُكِّرَتْ لفظ سُکْر سے ماخوذ ہے۔ سُکْر کا معنی ہے نہر کو بند کر دینا، روک دینا (قاموس) کذا قال ابن عباسؓ۔ حسن بصریؒ نے سکرت کا ترجمہ کیا ہے "ہماری آنکھوں کو جادو زدہ کر دیا گیا ہے" کلبی نے ترجمہ کیا "نابینا کر دیا گیا ہے" اور قتادہ نے کہا "پیچھے کر دیا گیا" قاموس میں سکرت ابصارنا کا ترجمہ کیا گیا ہے "دیکھنے سے روک دی گئیں، حیران کر دی گئیں، ان پر پردہ ڈال دیا گیا"۔

بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ﴿۱۵﴾　بلکہ ہم سحر زدہ لوگ ہیں ہم پر محمد ﷺ نے جادو کر دیا۔ یہی بات کافروں نے دوسرے معجزات کو دیکھ کر بھی کہی تھی اِنَّمَا اور بَلْ کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ کافروں کو اس امر کا قطعی یقین تھا کہ قرآن کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ ایک بے حقیقت جادو ہے جو کافروں کی قوتِ خیالیہ کو متاثر کر دیتا ہے۔ ع ۱۵

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا　اور یہ حقیقت ہے کہ ہم نے آسمان میں بڑے بڑے ستارے بنائے ہیں۔

"بُرُج" بڑا ستارہ، تبرج سے یہ لفظ ماخوذ ہے تبرّج کا معنی ہے ظاہر ہونا تَبَرَّجَتِ الْمَرْاَۃُ عورت نمودار ہو گئی عطیہ نے کہا بُروج آسمان کے اندر بڑے بڑے محلات ہیں اس آیت میں بُروج سے مراد وہ معنی نہیں ہیں جو اہلِ ہیئت کی اصطلاح میں آتا ہے۔ اہلِ ہیئت کے اصطلاحی معنی کا وجود مندرجہ ذیل اُمور پر موقوف ہے۔ تمام آسمان باہم جڑے ہوئے اور ایک دوسرے پر حاوی ہوں کہ نویں آسمان کے گھومنے سے سب اسی طرح گھومنے پر مجبور ہوں جس طرف نویں آسمان کی حرکت ہو، پھر نویں آسمان کی حرکت کے لئے ایک مِنطقہ اور دو قطب ہوں، پھر آٹھویں آسمان جس کو فلکِ ثوابت کہا جاتا ہے، کے لئے بھی ایک مِنطقہ اور دوسرے دو قطب ہوں اور سورج آٹھویں آسمان کے مِنطقہ پر قائم ہو اور دونوں مِنطقوں کا باہم تقاطع بھی ہو اور چاروں قطبوں کے درمیان ایک خط بھی کھینچا جائے جس سے چار قوس پیدا ہو جائیں اور ہر قوس میں تین بُرج ہوں۔ اس تمام خرافات کا شریعت انکار کرتی ہے شریعت سے آسمانوں کی حرکت ثابت نہیں بلکہ ستاروں کی حرکت ثابت ہوتی ہے اور ہر آسمان کا دوسرے آسمان سے فاصلہ پانچ سو برس کی راہ کے بقدر بتایا گیا ہے (ایک آسمان کا دوسرے آسمان سے چسپاں ہونے کا انکار اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے) اور شریعت کے نزدیک آسمانوں کی تعداد سات ہے اس سے زائد نہیں۔

وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿۱۶﴾　اور ہم نے (روشنی کی وجہ سے) ان برجوں کو یا (چاند سورج اور ستاروں کی وجہ سے) آسمان کی زینت عطا کی ہے۔

وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۱۷﴾　اور ہر شیطان مردود سے آسمان کو محفوظ کر دیا ہے کوئی شیطان آسمان والوں کو بہکانے یا وہاں کے احوال معلوم کرنے یا وہاں کے انتظام میں دخل دینے کے لئے نہیں چڑھ سکتا۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول لکھا ہے کہ پہلے آسمان تک پہنچنے سے شیطانوں کی روک ٹوک نہ تھی وہ جا کر آسمانوں کی خبریں لاتے اور کاہنوں کے دلوں میں القاء کرتے تھے جب حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تو تین بالائی آسمان پر جانے سے شیطانوں کو روک دیا گیا لیکن رسول اللہ ﷺ کی میلاد مبارک ہوئی تو باقی چار آسمانوں تک جانے کی بھی ممانعت کر دی گئی اب جو کوئی شیطان چوری چھپے (اوپر جا کر) کوئی خبر سن پاتا تھا فوراً اس پر (ٹوٹنے والا ستارہ بشکل) انگار امارا جاتا تھا، ان شیطانوں کی جب کامل بندش ہو گئی تو انہوں نے اس کی شکایت ابلیس سے کی۔ ابلیس نے کہا زمین میں یقیناً کوئی نیا حادثہ ہوا ہے جا کر دیکھو شیطان زمین پر آئے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو قرآن کی تلاوت کرتے پایا کہنے لگے واللہ یہی نئی بات پیدا ہوئی ہے۔

اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸﴾ ہاں جو چوری سے سُن پاتا ہے تو اس کے پیچھے روشن شعلہ آتشیں آپڑتا ہے "شہاب" آتشیں شعلہ جو ستاروں سے نکلتا ہے۔ بغوی نے چوری سے سننے اور پیچھے سے شعلہ آتشیں پڑنے کی یہ تفصیل بتائی ہے کہ شیاطین نیچے سے آسمان دنیا تک ایک کے اوپر ایک سوار ہو کر (گویا) سیڑھیاں بنا لیتے ہیں اور چوری چھپے فرشتوں کی کچھ باتیں وہ سن لیتے ہیں فرشتے (مطلع ہو کر) ان پر آتشیں شعلے مارتے ہیں کوئی انگارہ خطا نہیں جاتا۔ انگارہ پڑنے سے کوئی تو مر جاتا ہے کسی کا چہرہ یا پہلو یا ہاتھ یا کوئی اور حصہ حسب مشیتِ الٰہی جل جاتا ہے کوئی بدحواس اور پاگل ہو جاتا ہے، اور بھوت بن جاتا ہے جو زمین پر آ کر جنگلوں میں مسافروں کو سیدھے راستہ سے بھٹکاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب آسمان میں اللہ کسی کام کا کوئی فیصلہ کرتا ہے تو اطاعت اور احترام کے زیر اثر فرشتے اپنے بازو پھڑ پھڑاتے ہیں اور ایسی آواز پیدا ہوتی ہے جیسے پتھر کی چٹان پر کسی زنجیر کے لگنے سے ہوتی ہے جب دلوں سے خوف دور ہو جاتا ہے تو (آپس میں) پوچھتے ہیں تمہارے رب نے کیا فرمایا دوسرے فرشتے جواب دیتے ہیں جو کچھ فرمایا بلاشبہ حق ہے، وہی (سب سے) بزرگ و بالا ہے۔ چوری سے سننے والے ایک کے اوپر ایک لگے ہوتے ہیں چنانچہ (سب سے اوپر) چوری سے سننے والا کوئی بات سن پاتا ہے اور اپنے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اور نیچے والا اپنے سے نیچے والے کو بتا دیتا ہے اس طرح سب سے نیچے والا جادوگر یا کاہن کی زبان پر وہ بات لے آتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نیچے والے تک پہنچانے سے پہلے اوپر والے پر شعلہ آتشیں آپڑتا ہے اور کبھی آتشیں شعلہ پہنچنے سے پہلے وہ نیچے والے کو بتا چکتا ہے ساحر یا کاہن (اس ایک بات میں) سو جھوٹ ملا کر بیان کرتا ہے (جب وہ ایک بات جو کاہن کی زبان سے لوگ سنتے اور وہ واقع ہو جاتی ہے تو) کہا جاتا ہے کیا کاہن نے ہم سے ایسی ایسی بات پہلے ہی نہ کہہ دی تھی چنانچہ اس ایک آسمانی بات کی وجہ سے کاہن کی دوسری خرافات کی بھی) تصدیق کی جاتی ہے۔ رواہ البخاری۔

بغوی نے اپنی سند سے بیان کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا کہ فرشتے بادل میں اترتے ہیں اور وہاں اس بات کا تذکرہ ہوتا ہے جس کا فیصلہ آسمان پر ہو چکا ہے کوئی شیطان اس کو چوری سے سن پاتا ہے اور جا کر کاہن کے دل میں ڈال دیتا ہے، کاہن اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر بیان کر دیتے ہیں، یہ روایت بخاری کی بھی ہے اور بغوی کی بھی۔ سند میں فرق ہے۔

وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا اور ہم نے (پانی پر) زمین کو بچھایا۔

وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ اور زمین میں ہم نے جمے ہوئے پہاڑ قائم کر دیئے پہلے زمین لرزتی تھی اللہ نے اس میں پہاڑوں کی میخیں قائم کر دیں۔

وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ اور ہم نے زمین میں یا پہاڑوں میں یا دونوں میں ہر مناسب چیز پیدا کی۔

مَوْزُوْن سے مراد یا تو یہ ہے کہ حسب تقاضائے حکمت مقررہ مقدار میں پیدا کی یا مَوْزُوْن سے مراد مناسب جو نازیبا نہ ہو جیسے کلام موزون کہا جاتا ہے۔ یا موزون سے مراد یہ ہے کہ ہم نے ایسی چیزیں پیدا کیں جو دوسری نعمتوں میں اپنا خصوصی وزن (اور مرتبہ) رکھتی ہیں یا قابلِ وزن معدنیات مراد ہیں جیسے سونا، چاندی، لوہا، تانبا، ہڑتال، سُرمہ وغیرہ بلکہ یاقوت زبرجد

، فیروزہ وغیرہ بھی پہاڑوں کی پیداوار ہے۔

وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ اور زمین میں یا پہاڑوں میں ہم نے تمہارے لئے اسباب زندگانی پیدا کئے کھانے پینے کی چیزیں، لباس کی چیزیں، دوائیں، "معاش" معیشت کی جمع ہے دنیوی زندگی کے اسباب۔

وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ۞ اور ان (چوپایوں) کو بھی ہم نے پیدا کیا جن کو تم رزق دینے والے نہیں (ہم ہی رزق دیتے ہیں)

اس جگہ لفظ مَن (جو عربی زبان میں صرف عقل والی مخلوق کے لئے وضع کیا گیا ہے جیسے انسان فرشتہ، جن) بمعنی مَا کے ہے (کیونکہ اس جگہ چوپائے مراد ہیں اور چوپائے عقل والے نہیں قرار دیئے جاتے) اسی طرح آیت فَمِنْهُمْ مَّنْ يَّمْشِيْ عَلٰى بَطْنِهٖ میں مَن سے مراد جانور ہیں اس آیت میں بھی مَن بمعنی مَا کے ہیں۔

بعض علماء نے کہا مَن سے مراد بال بچے، خادم، غلام، باندی اور چوپائے وغیرہ ہیں اہل کفر خیال کرتے تھے کہ ان سب کو ہم کھلاتے پلاتے اور پرورش کرتے ہیں، آیت میں اس کی تردید کر دی گئی اور فرمایا ہم ان کو رزق دیتے ہیں، بعض علماء نے اس طرح ترجمہ کیا ہے، ہم نے تمہارے اور ان کے لئے جن کے تم رازق نہیں ہو اسباب زندگانی پیدا کئے ہیں۔ اللہ نے مذکورہ بالا آیات میں اپنی ہستی کمال قدرت، ہمہ گیر حکمت، استحقاق الوہیت اور توحید ذاتی و صفاتی کے لئے مذکورہ اشیاء کی تخلیق کو پیش کیا ہے اور بندوں کو اپنے انعامات کی یاددہانی کی ہے تاکہ لوگ دوسروں کو اس کا شریک نہ بنائیں اور تنہا اسی کو معبود سمجھیں، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں، کفران نعمت نہ کریں۔

وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ز اور جتنی چیزیں ہیں ہمارے پاس سب کے خزانے (بھرے پڑے) ہیں۔ یعنی ہماری قدرت ایسی ہمہ گیر ہے جتنی مخلوق ہم نے پیدا کی ہے اور جو چیز بنائی ہے اس سے کتنے ہی گنا زائد ہم پیدا کر سکتے ہیں۔ خزانے موجود ہونے سے مراد ہے قدرت کے اتھاہ ہونے کا بیان۔ یا اللہ نے اپنی مقدورات کو خزانوں سے تشبیہ دی جو جمع شدہ اور موجود ہوتے ہیں ان میں سے ہر وقت جو چاہو نکال سکتے ہو اللہ کے مقدورات بھی ایسے ہی ہیں اللہ جب چاہے اور جتنا حصہ چاہے اور مقدورات میں سے عالم ظہور میں لا سکتا ہے اور پیدا کر سکتا ہے اور آیت ذیل میں جو اتارنے کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد پیدا کر دینا اور عالم خارجی میں بالفعل لے آنا ہے۔

وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۞ اور ہم اس کو (یعنی ہر چیز کو) ایک معیّن مقدار سے ہی اتارتے ہیں قدر یعنی جس کو پیدا کرنا ازل میں مقدّر ہو چکا ہو اور جس کی مقدار اللہ کو معلوم ہے۔

(مفسّر رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا) میں کہتا ہوں، ممکن ہے کہ "خزائن" سے مراد اعیان ثابتہ ہوں (یعنی وہ حقائق امکانیہ جو اللہ کے علم میں ثابت ہوں۔ مترجم) اور اتارنے سے مراد ہو ان اعیان حقیقیہ کو وجود ظلّی عطا کرنا (یعنی خارج میں موجود کر دینا، خارجی وجود کو اہل تصوّف وجود ظلّی کہتے ہیں یعنی وجود ظلّی پرتو ہے اور حقائق امکانیہ جو علم خداوندی میں ثابت ہیں وہ اصل ہیں۔ وجود خارجی انہی کا پرتو ہے مترجم) بغوی نے لکھا ہے کہ امام جعفر صادق نے فرمایا خشکی اور سمندر میں اللہ نے جو کچھ پیدا کیا ہے سب کی تمثال (وجود مثالی یعنی حقیقت امکانیہ، مترجم) عرش میں ہے اور آیت وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ کی یہی تفسیر ہے۔ میں کہتا ہوں شاید امام کی مراد عرش سے عالم مثال ہے جسطرح انسان کا محل خیال دماغ ہے (اور وجود خارجی وجود خیالی کے ظہور خارجی کا نام ہے) اسی طرح عالم کبیر (کے ظہور خارجی) کا محل عالم مثال ہے اور محل تمثال عرش ہے۔

بعض علماء کا قول ہے کہ خزائن سے مراد بارش ہے۔ بارش ہر چیز کا خزانہ ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ روایت میں آیا ہے کہ آسمان سے جو قطرہ اترتا ہے اس کے ساتھ ایک فرشتہ ضرور ہوتا ہے یہ فرشتہ اس بوند کو اس جگہ تک ضرور پہنچاتا ہے جہاں پہنچانے کا حکم ہوتا ہے۔

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ اور ہم ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں۔ لَوَاقِح، لَاقِحَۃ کی

جمع ہے، لاقحۃ حاملہ۔ ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ملاقح کی بیع کی ممانعت فرمائی ہے یعنی جو بچہ اونٹنی کے پیٹ کے اندر ہو تنہا اس کی بیع بغیر اس کی ماں جائز نہیں۔ یا لَوَاقِح، لَقُوح کی جمع ہے لقوح دودھ دینے والی اونٹنی۔ بہر حال اس جگہ وہ ہوائیں مراد ہیں جو برسنے والے بادل کو اپنے اوپر اٹھائے ہوتی ہیں۔ بیضاوی نے لکھا ہے ابر بار اں کو اٹھانے والی ہواؤں کو جس طرح لَوَاقِح کہتے ہیں اسی طرح عَقِیم (ناقابلِ تولید) اس ہوا کو کہتے ہیں جو برسنے والے بادل کی حامل نہ ہو۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، اللہ ہوا کو بھیجتا ہے ہوا پانی کو اٹھا کر لاتی ہے۔ بادل پانی کو لے کر ہوا کی وجہ سے چلتا ہے اور اونٹنی کے دودھ دینے کی طرح پانی برساتا ہے۔

ابو عبید نے کہا، لواقح کا معنی ہے ملاقح۔ ملاقح کا مفرد ملقحۃ ہے جس کا ترجمہ ہوا حاملہ کرنے والی ہوائیں یعنی وہ ہوائیں جو پھلوں کے تخم درختوں میں ڈالتی ہیں اور ان کو حاملہ کرتی ہیں۔ عبید بن عمیر نے کہا پہلے اللہ خوش خبری (یعنی بارش کی خوش خبری) دینے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو زمین کو صاف کر دیتی ہیں پھر بادلوں کو اٹھا کر لانے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو بادلوں کو اٹھا کر لاتی ہیں۔ پھر منتشر بادلوں کو یکجا کرنے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو ابر کے مختلف ٹکڑوں کو یکجا کر کے تہ بر تہ کر دیتی ہیں پھر حاملہ کرنے والی ہوائیں بھیجتا ہے جو درختوں میں پھل پیدا کر دیتی ہیں (گویا درخت حاملہ ہو جاتے ہیں) ابو بکر بن عیاش نے کہا جب تک چاروں ہوائیں اپنا اپنا عمل پورا نہیں کرتیں کوئی قطرہ نہیں اترتا۔ پروا بادل کو اٹھا کر لاتی ہے، شمالی ہوا بادل کو جمع کرتی ہے جنوبی ہوا بادل کو برساتی ہے اور پچھمی ہوا بادل کو منتشر کر دیتی ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے کہ لواقح جنوبی ہوائیں ہیں بعض آثار صحابہ میں آتا ہے، جب بھی جنوبی ہوا چلتی ہے انگور کے خوشے (ساتھ) اٹھا کر لاتی ہے اور ریح عقیم عذاب کو لاتی ہے پھل نہیں پیدا کرتی۔

بغوی نے امام شافعیؒ و طبرانی کی سند سے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ جب کبھی کوئی تیز ہوا چلتی تھی رسول اللہ ﷺ فوراً دوزانو بیٹھ کر دعا کرتے تھے، اے اللہ اسکو رحمت بنادے عذاب نہ بنا اے اللہ اس کو رحمت کی ہوائیں کر دے عذاب کی آندھی نہ کر دینا۔ (رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں رحمت کی ہواؤں کے لئے لفظ رِیاح بصیغۂ جمع اور عذاب کی آندھی کے لئے لفظ رِیح استعمال فرمایا ہے) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا لفظ ریح سے مراد وہ ریح ہے جس کا ذکر آیت اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا۔ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيمَ میں اللہ نے کیا ہے اور لفظ رِیاح سے مراد وہ ریاح ہے جس کا ذکر آیت اَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ وَ يُرْسِلُ الرِّيَاحَ مُبَشِّرَاتٍ میں اللہ نے کیا ہے۔

فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ پھر ہم نے بادل سے پانی نازل کیا اور اس سے تم کو سیراب کیا یعنی بارش کو تمہارے لئے سیرابی بنا دیا۔ عربی محاورے میں سَقَيْتُ الرَّجُلَ مَاءً اَوْ لَبَنًا کا معنی ہے میں نے اسکو پانی یا دودھ پلا کر سیراب کر دیا اور اسقیت الرجل کا معنی ہے میں نے اس کو پانی دے دیا تا کہ وہ اپنی زمین یا جانوروں کو سیراب کرے۔

وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ اور تم اس (پانی) کو اپنے پاس جمع رکھنے والے نہیں ہو یعنی بارش کا خزانہ ہمارے پاس ہے تمہارے پاس نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ چشموں اور کنوؤں وغیرہ میں پانی جمع رکھنا تمہارا کام نہیں (یہ ہمارے اختیار میں ہے) جس طرح مختلف جہات سے حرکت لوگوں کے فائدے کے لئے ہوتی ہے اسی طرح پانی کی بارش بھی منافع سے پُر ہے اور یہ سب قادر و حکیم کی تدبیر اور نظم کا نتیجہ ہے ورنہ پانی کی فطرت تو نیچے جانے کا تقاضا کرتی ہے مگر اس کو کسی حد پر روک لینا بغیر کسی خاص سبب کے نہیں ہو سکتا۔

وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ اور بلاشک و شبہ ہم ہی زندہ کرتے اور موت دیتے ہیں۔ یعنی دلوں کو معرفت سے اور اجسام کو نفسِ حیوانی و نباتی کا تعلق پیدا کر کے زندہ کرتے ہیں اور ان سے تعلق کاٹ کر مردہ کر دیتے ہیں۔

وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ اور ہم ہی باقی رہنے والے ہیں۔ ہمارے سوا کوئی زندہ باقی نہیں رہے گا مردہ کے بعد زندہ باقی رہتا اور اسکا وارث ہوتا ہے بطورِ استعارہ فنائے مخلوق کے بعد خالق کے باقی رہنے کو وراثت سے تعبیر کیا۔

وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ اور ہم تمہارے اگلوں کو بھی جانتے ہیں اور ہم تمہارے پچھلوں سے بھی واقف ہیں، یعنی ہم سے تمہاری کوئی حالت پوشیدہ نہیں۔ سابق آیت میں اپنی قدرتِ کاملہ کی دلیل بیان کی تھی۔ اس آیت میں اپنے علم کی ہمہ گیری کا اظہار فرمایا جو قدرت کی دلیل ہے اسی سے قدرت کا ثبوت ہو جاتا ہے (قدرت بغیر علم کے ناممکن ہے) بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، مستقدمین سے مردے اور متاخرین سے زندے مراد ہیں۔ شعبی نے کہا اگلے پچھلے لوگ مراد ہیں عکرمہ کا قول ہے، مستقدمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو پیدا ہو چکے ہیں اور اپنے آباء کی پشت سے بر آمد ہو گئے ہیں اور متاخرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے نہ اپنے باپوں کی پشت سے باہر آئے۔ مجاہد کے نزدیک گزشتہ اقوام مستقدمین ہیں اور امتِ محمدیہ متاخرین سے مراد ہے۔ حسن نے کہا طاعت و خیر میں آگے بڑھنے والے مستقدمین ہیں اور طاعت و خیر میں سستی کرنے اور پچھڑنے والے متاخرین ہیں۔

بعض علماء کا قول ہے کہ مستقدمین و متاخرین سے مراد نمازیوں کی اگلی پچھلی صفیں ہیں۔ ابن مردویہ کا بیان ہے کہ داؤد بن صالح نے حضرت سہل بن حنیف انصاری سے دریافت کیا، کیا یہ آیت جہاد کے سلسلہ میں نازل ہوئی (یعنی مستقدمین و متاخرین سے کیا مجاہدین مراد ہیں) حضرت سہل نے فرمایا نہیں اس کا نزول نمازیوں کی صفوں کے متعلق ہوا تھا مقاتل کے نزدیک جہاد کی صفوں میں آگے پیچھے رہنے والے مراد ہیں۔ ابن عیینہ کے نزدیک وہ لوگ مراد ہیں جو مسلمان ہو چکے اور ابھی مسلمان نہیں ہوئے۔ اوزاعی کے نزدیک اول وقت اور آخرِ وقت میں نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ایک خوبصورت عورت رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھ رہی تھی کچھ لوگ اگلی صف میں بڑھ گئے تاکہ نماز میں (رکوع میں بھی) عورت پر نظر نہ پڑے اور کچھ لوگ اتنے پیچھے ہو گئے کہ آخری صف میں پہنچ گئے ان میں سے بعض لوگ رکوع میں گئے تو اپنی بغلوں کے نیچے سے عورت کو دیکھنے لگے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی، نسائی ابن ماجہ ابن حبان، حاکم، حاکم نے اس کو صحیح کہا ہے)

وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۗ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾ ع اور بے شک آپ کا رب (قیامت کے دن) ان سب کو محشور کرے گا وہ بلاشبہ بڑی حکمت اور علم والا ہے یعنی سب کو جمع کر کے بلا شک و شبہ ہر ایک کو اس کے ہر عمل کا بدلہ دے گا۔ حضرت جابرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص جس چیز پر مرے گا اللہ اسی چیز پر اس کو اٹھائے گا (رواہ احمد والحاکم والبیہقی) ضمیر ھو کا اضافہ بتا رہا ہے کہ اللہ ہی قادر اور سب لوگوں کو اٹھانے کا تنہا ذمہ دار ہے اس فعل میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ حکیم ہے یعنی اس کی حکمت نمایاں اور اس کی ہر صنعت محکم ہے۔ علیم ہے اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ اور بلاشبہ ہم نے انسان کو پیدا کیا بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے تیار کی ہوئی تھی الانسان (میں الف لام جنسی ہے اس) سے مراد ہے جنسِ بشر یعنی حضرت آدمؑ کو پیدا کیا۔ انسان کی وجہ تسمیہ متعدد ہیں انس کا معنی ہے ظہور، انسان ظاہر ہے آنکھ سے دکھائی دیتا ہے اُنس کا معنی دل بستگی اور پریم بھی ہے انسان باہم مانوس ہوتے ہیں یا نسیان سے مشتق ہے۔ حضرت آدمؑ کو ایک حکم دیا گیا تھا مگر وہ اس کو بھول گئے۔ نسیان کا معنی ہے بھولنا۔ صلصال خشک مٹی جو آگ میں نہ پکائی گئی ہو اور کھن کھن بولتی ہو (یعنی بجانے سے کھنکھناتی ہو) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا صلصال وہ عمدہ پاکیزہ کیچڑ ہے جس میں پانی سوکھ جانے کی وجہ سے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں اور جب اسکو (اس کی جگہ سے) ہلایا جاتا ہے تو کھڑ کھڑ کی آواز دیتی ہے۔ مجاہد نے کہا بدبودار کیچڑ کو صلصال کہتے ہیں۔ صَلَّ اللَّحْمُ اور اَصَلَّ اللَّحْمُ گوشت بدبودار ہو گیا صَلْصَال اسی محاورہ سے ماخوذ ہے حماء دلدلی کیچڑ جو زیادہ پانی کے قریب ہونے سے کالی پڑ جاتی ہے۔ مسنون پتلا جس میں صورت بنادی گئی ہو۔ یہ لفظ سنت الوجہ سے ماخوذ ہے۔ شروع میں مٹی، تراب، خاک پھر پانی میں گوندھے جانے کے بعد طین (کیچڑ) پھر ایک مدت تک یونہی رہنے کے بعد حماً (لیسدار کیچڑ یا دلدل) پھر اس کا خلاصہ اور جوہر نکال لیا جائے تو اس کو سُلالہ (خلاصہ) کہا جاتا ہے۔ پھر اس میں نقوش، صورت بنادیے جائیں (پتلا بنادیا جائے) تو اس کو مَسنُون کہتے ہیں اور

مسنون خشک ہو جائے تو اس کو صَلصال کہتے ہیں۔ مجاہد اور قتادہ نے کہا مسنون خراب بدبودار یہ لفظ سننت الحجر علی الحجر سے ماخوذ ہے ابو عبیدہ نے کہا مسنون (اسم مفعول) سَنّ سے مشتق ہے سنّ کا معنی ہے بہانا۔ مسنون بہایا ہوا جیسے مختلف دھاتیں جن کو پگھلا کر سانچوں میں بھر کر ڈھالا جاتا ہے اسی طرح اس (پتلی سیّال) کیچڑ کی حالت ہوتی ہے (جس کو مسنون کہا جاتا ہے) عرب کہتے ہیں سننتُ الماء میں نے پانی بہا دیا گویا (دلدلی کیچڑ سے ڈھال کر اول (قوام) تیار کیا گیا پھر انسانی صورت بنائی گئی اور مجسمہ تیار کیا گیا جو کھوکھلا تھا پھر وہ خشک ہو گیا اور بجانے سے کھَن کھَن بولنے لگا پھر رفتہ رفتہ اس پر تغیرات آتے رہے۔ آخر جب وہ بالکل ہموار اور درست ہو گیا تو اس میں روح پھونک دی گئی۔

وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ اور جن کو ہم نے پیدا کیا اس سے پہلے آگ سے جو ایک گرم ہوا سے بنی تھی۔

اَلْجَآنَّ (میں لام جنسی ہے) الانسان کی طرح جنس ہے جب ایک شخص سے نکلے ہوئے مختلف افراد اسی جنس کے ہوں اور اس شخص کو کسی خاص مادہ سے بنایا گیا ہو تو تمام افراد کا قوام اسی اصلی مادہ سے مانا جائے گا (پس ابو الجن کو جب آگ کے مادہ سے بنایا گیا تو اس کی ساری نسل کو بھی اسی مادہ سے بنا ہوا کہا جائے گا اگرچہ اولاد کا سلسلہ تناسُلی ہو گا براہِ راست آگ سے ان کو نہیں بنایا گیا ہو گا)

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، الجانّ سے مراد ہے تمام جنّات کا باپ جیسے آدم تمام انسانوں کے باپ تھے۔ قتادہ نے کہا اس سے مراد ابلیس ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ الجانّ جنّات کا باپ ہے اور شیاطین کا باپ ابلیس ہے جنات میں کچھ مسلمان ہیں کچھ کافر، مرتے بھی ہیں پیدا بھی ہوتے ہیں اور شیاطین میں سے کوئی بھی مسلم نہیں نہ کسی کو موت آتی ہے جب ابلیس مرے گا تو اسی کے ساتھ سب مریں گے۔

وہب نے کہا کچھ جنّات تو آدمیوں کی طرح ہیں ان کے بچے پیدا ہوتے ہیں کھاتے پیتے ہیں اور کچھ جنات ہوا کی طرح ہیں ان میں توالُد و تناسُل نہیں ہوتا نہ وہ کھاتے پیتے ہیں۔

مِنْ قَبْلُ سے مراد یہ ہے کہ ہم نے آدم سے پہلے جان کو پیدا کیا۔

السَّمُوْمِ وہ سخت گرمی جو مسامات کے اندر گھس جائے۔ بغوی نے کہا السّموم وہ گرم ہوا جو انسان کے بدن میں مسامات کے راستہ سے گھس کر اس کو ہلاک کر دیتی ہے (یعنی لُو) بعض کے نزدیک سَموم دن کی اور حَرُور، رات کی گرم ہوا (لُو) کو کہتے ہیں۔ کلبی نے ابو صالح کا قول نقل کیا ہے السّموم ایک آگ ہے جو آسمان اور (زیرین) حجاب کے درمیان ہے اس میں دھواں نہیں ہے صَاعقہ کی پیداوار اسی سے ہوتی ہے (صاعقہ ٹوٹ کر گرنے والی بجلی) اللہ کا حکم ہوتا ہے تو سموم (یعنی صاعقہ) زیرین حجاب کو پھاڑ کر حسبِ مشیتِ الٰہی کہیں گر جاتی ہے حجاب کو پھاڑنے کی آواز ہی کڑک کہلاتی ہے۔ بعض نے کہا نارُ السّموم آگ کے شعلے لپٹ بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے آتشِ جہنم۔ ضحاک نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابلیس بھی ملائکہ کی ایک خاص شاخ (قبیلہ یا گروہ) میں سے ہے اس شاخ کو جِن کہا جاتا ہے اس صنفِ ملائکہ یعنی جن کی تخلیق نارِ سموم سے ہوئی ہے دوسری آیت میں ان جنّات کی تخلیق بھڑکتی آگ سے بتائی گئی ہے (گویا نارُ السموم اور بھڑکتی آگ ایک ہی چیز ہے) باقی جن کے علاوہ ملائکہ کی تخلیق نور سے کی گئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ اور جب آپ کے رب نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں آئندہ ایک بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے جو سڑے ہوئے گارے سے بنی ہو گی پیدا کرنے والا ہوں سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں۔ نفخ کا معنی ہے کسی کھوکھلی چیز میں ہوا کو گزارنا (منہ سے یا کسی اور طریقہ سے مترجم) روح کی دو قسمیں ہیں۔ علوی اور سفلی روح علوی ایک خاص مخلوق ہے جو مادے سے خالی ہے (غیر مادی ہے) نظرِ کشف سے اس کو دیکھا

جاسکتا ہے چونکہ عرش سے بھی زیادہ لطیف ہے اس لئے اس کا مقام عرش کے اوپر ہے۔ فوقانی و تحتانی مراتب کے لحاظ سے ہم کہتے ہیں کہ ارواحِ علویہ پانچ ہوتی ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ انہی کو عالمِ امر کے لطائفِ (خمسہ) کہا جاتا ہے۔ روحِ سفلی اس بخارِ لطیف کو کہتے ہیں جو ان چاروں عناصر سے پیدا ہوتا ہے جن سے جسمِ انسانی کی ساخت ہوئی ہے۔ اسی کو نفس کہا جاتا ہے اللہ نے اس کو روحِ سفلی یعنی نفس کو ارواحِ علویہ کا آئینہ بنایا ہے، آفتاب آسمان پر ہونے کے باوجود جب آئینہ پر عکس ریز ہوتا ہے تو آئینہ کے اندر اس کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں روشنی بھی اور حرارت بھی۔ آئینہ روشنی آفریں بھی ہو جاتا ہے اور جلانے والا بھی۔ ارواحِ علویہ تجرّد کی انتہائی چوٹی پر ہونے کے باوجود نفس کے آئینہ پر اثر انداز ہوتی ہیں اور انہی کی پر تو فگنی کا جو اثر ہوتا ہے وہی ہر فرد کی روحِ جزئی کہلاتی ہے۔ ارواحِ علویہ سے روحِ سفلی میں نمودار ہو جاتے ہیں سب سے پہلے روحِ سفلی ان آثار کو ساتھ لے کر دل (سینہ کے اندر جو گوشت کا لوتھڑا ہے یعنی طبی قلب) سے متعلق ہوتی ہے پھر قوّتِ حیوانیہ اور معارفِ انسانیہ کو ساتھ لئے ہوئے (قلب کے ذریعہ سے) شریانوں کی خلاؤں میں پہنچتی ہے اور اس طرح بدن کے ہر حصہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ اسی کو نفخِ روح کہا جاتا ہے۔ کھوکھلی چیز میں جس طرح نفخِ ریح (ہوا کا پھونکا جانا) ہوتا ہے اسی کے مشابہ (شریانوں کی خلاؤں میں) روح کا نفخ ہوتا ہے۔ روحی میں روح کی اضافت اپنی ذات کی طرف کرنے سے روح کی عظمتِ شان کی طرف اشارہ ہے رُوحی کا مطلب ہے میرے حکم سے براہِ راست بغیر مادہ کے پیدا کی ہوئی روح۔ یا انسانی روح کو اپنی روح اس لئے قرار دیا کہ صرف انسانی روح رحمانی تجلّیات و انوار کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے دوسری مخلوق میں یہ استعداد نہیں۔ انسان کی ساخت میں اگرچہ مٹی کا عنصر غالب ہے اسی لئے انسان کی تخلیق کو مٹی سے قرار دیا ہے لیکن در حقیقت انسانی تقویم کے دس اجزاء ہیں، مٹی، پانی، ہوا، آگ اور وہ لطیف بخار جو ان چاروں کے اختلاط سے پیدا ہوتا ہے اسی کو نفس اور روحِ سفلی کہتے ہیں۔ ان پانچ اجزاء کے علاوہ پانچ اجزاء وہ ہیں جن کا فیضان عالمِ امر سے ہوتا ہے ان کا ذکر اوپر آچکا ہے (قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ) انسان اسی جامعیّت کی وجہ سے مستحقِ خلافت ہوا۔ معرفت کے نور اور عشق و محبت کی آگ کا اہل قرار پایا۔ انسان کی یہی جامعیّت اس بے کیف معیّت کی مقتضی ہے جس کا ذکر حدیثُ المرء مع مَن احبّ میں آیا ہے اور اسی جامعیّت کے باعث آدمی کو انوارِ ذاتیہ، صفاتیہ، اور ظلّیہ کا مہبط بنایا گیا پھر اسی معیّت اور حاملِ تجلّیات ہونے کے سبب سے ملائکہ کو اس کی جانب سجدہ کرنے کا حکم دیا اور فرمایا۔

فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ تو تم اس کی طرف رخ کر کے سجدے میں گر پڑنا۔

قَعُوْا امر ہے وَقَعَ وُقُوْعًا سے۔ لَهٗ میں لام بمعنی اِلٰی ہے یعنی آدمؑ کی جہت کو اور آدمؑ کی طرف رخ کر کے سجدہ کرنا۔ اللہ نے آدم کو ملائکہ کا قبلۂ سجود بنایا جیسے کعبہ کو قبلۂ عبادت انسانوں کے لئے قرار دیا۔ کعبہ کو سجدہ نہیں کیا جاتا بلکہ کعبہ کو تجلّیات و انوار سے چونکہ ایک خصوصیت ہے (اس لئے اس کو جہت سجدہ بنایا پس اسی طرح فرشتوں کے لئے آدم جو سجدہ کی جہت بنا دیا مسجودلہٗ نہیں بنایا۔

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ پس (آدم کی طرف رُخ کر کے) فرشتوں نے سجدہ کیا اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ فرشتوں نے آدم کے اندر معیّت کا ادراک کر لیا، یا محض تعمیلِ حکم غرض تھی (استحقاقِ سجود کی وجہ ان کو معلوم نہیں ہوئی)

كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ﴿۳۰﴾ سب کے سب نے۔ تاکید مزید محض مبالغۂ عموم کے لئے ہے یعنی کوئی بھی سجدہ سے الگ نہیں رہا سب ہی نے سجدہ کیا مبرّد کا قول ہے کہ كُلُّهُمْ کے لفظ سے تو عموم کی تاکید ہو گئی، یعنی سب نے سجدہ کیا اور اَجْمَعُوْنَ کے لفظ سے یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے کہ یکدم اجتماعی حالت میں سب نے سجدہ کیا۔ مگر یہ توجیہ غلط ہے اگر لفظ اجمعون سے اجتماعی حالت ظاہر کرنی مقصود ہوتی تو اجمعین (نصب کے ساتھ) کہا جاتا (کیونکہ حال منصوب ہوتا ہے)

اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ مگر ابلیس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔ بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے ابلیس معیّت کو نہ سمجھ سکا اور نہ اس نے اس امر کا لحاظ کیا کہ حکیم کا حکم حکمت سے خالی

نہیں ہوتا۔
ابلیس چونکہ ملائکہ میں سے نہ تھا جنات میں سے تھا اللہ نے فرمایا کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ اس لئے بعض علماء نے کہا کہ استثناء منقطع ہے (متصل نہیں ہے استثناء متصل میں مابعدِ اِلّا کا ما قبلِ اِلّا میں داخل ہونا ضروری ہوتا ہے) اور اِلّا بمعنی لٰکن کے ہے (اسی کے موافق آیت کا ترجمہ ہم نے کیا ہے) بعض علماء کے نزدیک استثناء متصل ہی ہے کیونکہ ابلیس ملائکہ کی اس صنف کا ایک فرد تھا جس کو جن کہا جاتا ہے اس صورت میں ترجمہ اس طرح ہوگا مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل رہنے سے انکار کردیا۔

قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾ اللہ نے فرمایا اے ابلیس تیرے سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہونے کا کیا سبب ہے یعنی تو نے کیوں سجدہ نہیں کیا باوجودیکہ حاکم کے حکم کی تعمیل تجھ پر واجب تھی اور آدم کی فضیلت اور استحقاقِ سجدہ اللہ کے بیان کرنے سے تجھے معلوم ہوگیا تھا۔

قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾
ابلیس نے (اپنی بے وقوفی کی وجہ سے) کہا میں تو ایک ایسے کثیف انسان کو سجدہ کر ہی نہیں سکتا تھا جس کو تو نے کھنکھناتی ہوئی سڑی کیچڑ سے بنایا ہے، مٹی کا درجہ تو تمام عناصر سے نچلا ہے، مجھے تو نے آگ سے بنایا ہے اور آگ تمام عناصر سے لطیف اور سب سے اعلیٰ واشرف ہے سورۂ اعراف میں اسکی مزید تشریح آچکی ہے۔

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ﴿۳۴﴾ (اللہ نے) فرمایا (جب تو نے میرا فرمان نہیں مانا) تو (جنت یا آسمان یا ملائکہ کے گروہ سے) نکل جا بلا شبہ تو مردود ہے یعنی بھلائی اور اعزاز سے نکالا اور دھتکارا ہوا ہے۔ رجیم سنگسار کیا ہوا پتھروں سے مارا ہوا جو (اللہ کی بارگاہ سے) مطرود ہو جائے گا وہ سنگسار کیا جائے گا یا یہ مطلب ہے کہ آئندہ اگر تو آسمان سے قریب آیا تو تجھ پر انگارے برسائے جائیں گے ٹوٹے ہوئے تارے تجھ پر (پتھروں کی طرح) پڑیں گے۔ شیطان کے لئے اس آیت میں وعید بھی اور اس کے اعتراض کا در پردہ جواب بھی ہے ابلیس کا اعتراض یہ تھا کہ میں تخلیقاً افضل ہوں آدم مجھ سے ادنیٰ ہے اور ادنیٰ کے سامنے افضل کو سربسجود ہو جانے کا حکم مناسب نہیں جواب یہ ہے کہ فضیلت اور برتری کا مدار اللہ کے حکم کی تعمیل پر ہے (اجزاء تخلیقی پر نہیں) جو نافرمان ہوگا وہ بھلائی سے محروم ہو جائے گا اور نکالا جائے گا۔

وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ اور روزِ جزا تک تجھ پر لعنت یقینی ہے روز جزا پر پھٹکار اور لعنت کی انتہا ہے اس کے بعد اعمال کی (اخروی) سزا و جزا ہوگی اور لعنتِ اخروی کے عذاب کا وقت آجائے گا یا یہ مطلب ہے کہ روزِ جزا تک تو لعنت ہوگی اور اس کے بعد ایسی سخت سزا دی جائے گی کہ اس کی موجودگی میں دُنیوی لعنت بھول جائے گا۔
بعض نے کہا (لعنت کو یوم الدین تک جاری رکھنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کے بعد لعنت ختم ہو جائے گی بلکہ یہ ایک محاورہ کی بات ہے) طویل ترین مدت کے لئے کہا جاتا ہے کہ قیامت تک یہ بات ہوتی رہے گی یا نہ ہوگی (اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ قیامت کے بعد اس کے خلاف ہوگا بلکہ کسی کام کے ہونے نہ ہونے کی ایک طویل ترین مدت بیان کرنا مقصود ہوتی ہے)
بغوی نے کہا آسمان پر بھی ابلیس ملعون ہے اور زمین پر بھی، آسمان والے بھی اس پر ایسی ہی لعنت کرتے ہیں جیسے زمین والے۔ میں کہتا ہوں (آسمان و زمین والے کیا) آسمان اور زمین کے خالق نے اس پر لعنت کی ہے اور فرمایا: وَاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْۤ ابلیس نے کہا اے میرے رب (جب تو نے مجھے نکال دیا اور مجھ پر لعنت کردی ہے) تو مجھے مہلت عطا کر (یعنی زندگی کی مدت باقی رکھ اور موت نہ دے)

اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ اس روز تک جب کہ لوگ (قبروں سے دوبارہ) اٹھائے جائیں گے۔ ابلیس نے اغوا کرنے کی مہلت مانگی اور بالکل موت سے محفوظ رہنے کی بھی درخواست کی کیونکہ (وہ جانتا تھا) کہ یوم بعث تک مہلت مل جائے

گی اور دوبارہ اٹھائے جانے کے بعد تو موت آئے گی نہیں اس لئے موت سے چھوٹ مل جائے گی اللہ نے اول درخواست تو قبول فرمالی اور یہ قبولیت دعا اس کی عزت افزائی کے لئے نہیں بلکہ بدبختی اور مصیبت میں اضافہ کرنے کے لئے فرمائی، اور دوسری درخواست (الی یوم یبعثون) کو رد کرتے ہوئے فرمایا۔

قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ تو مہلت یافتہ گروہ میں سے تو بے شک ہوگا (لیکن یہ مہلتِ زندگی) معلوم وقت کے دن تک ہوگی یعنی اس وقت تک مہلت زندگی ہوگی جو اللہ کو معلوم ہے مراد یہ ہے کہ پہلی مرتبہ صور پھونکنے تک جس سے سب مخلوق مرجائے گی تجھے مہلت ہے دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت تک جس سے لوگ اٹھائے جائیں گے مہلت نہیں دی جاسکتی بعض لوگوں نے کہا کہ دونوں مرتبہ صور پھونکے جانے کی درمیانی مدت چالیس سال ہوگی اسی مدت میں ابلیس کی موت ہوگی۔

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾

ابلیس نے کہا اے میرے رب چونکہ تو نے مجھے گمراہ کر ہی دیا ہے اس لئے میں بھی ضرور ضرور دنیا میں (گناہوں کو) آراستہ کر کے ان کے سامنے لاؤں گا اور سب کو گمراہ بناؤں گا۔ یا بِمَا میں بَ قسمیہ اور مَا مصدری ہے ترجمہ اس طرح ہوگا: اے رب (تو نے مجھے گمراہ کر دیا) تیرے اس گمراہ کرنے کی قسم کہ میں ان انسانوں کی نظر میں دنیا کو آراستہ کروں گا (جاذبِ توجہ کردوں گا)

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ مگر ان میں سے تیرے جو چُنے ہوئے بندے ہوں گے اور تو نے ان کو تمام کدورتوں سے پاک کر دیا ہوگا (ان کو میں نہیں بہکا سکوں گا) جن کو تو نے ہدایت کر دی ہوگی ان پر میری فریب کاری کوئی اثر نہ ڈال سکے گی۔

قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اللہ نے فرمایا، یہ (اخلاص ہی) مجھ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ ہے، اس میں کوئی کجی نہیں۔ حسن نے کہا حق کا راستہ سیدھا ہے مجاہد نے کہا حق کا رجوع اللہ کی طرف ہے۔ راہِ حق بھی اللہ تک پہنچتی ہے کسی اور طرف نہیں مُڑتی۔ اخفش نے کہا سیدھا راستہ بتانا مجھ پر ہے (یعنی میرے ذمہ ہے اس مطلب پر عَلَیَّ کو اِلَیَّ کے معنی میں لینے کی ضرورت نہ ہوگی) اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ اپنے منتخب بندوں کو گمراہ نہیں ہونے دے گا۔ منتخب بندوں کو شیطانی اغواء سے بچانے کا ذمہ اللہ کا ہے اور براہ راست ان کو محفوظ رکھنا اللہ کا کام ہے۔

کسائی نے کہا، هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ وعید آمیز تہدیدی کلام ہے جیسے کوئی شخص اپنے مخالف سے کہتا ہے کہ تیرا راستہ مجھ پر ہے یعنی تو میرے ہاتھ سے بچ نہیں سکتا۔ اللہ نے فرمایا اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ آپ کا رب گھات میں ہے۔ کسائی کی تفسیر پر ہٰذا سے اشارہ ابلیس کے راستہ کی طرف ہوگا جو اس نے اپنے لئے اختیار کیا تھا یعنی اغوا اور گمراہ کرنے کا راستہ۔

اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ بے شک میرے بندوں پر تیرا ذرا بھی بس نہ چلے گا ہاں مگر جو گمراہ لوگوں میں تیری راہ پر چلنے لگے۔

عبادی سے مراد عام بندے ہیں مؤمن ہوں یا کافر۔ عباد کی اضافت یا متکلم کی طرف استغراق ہے اگر عِبَادِیْ کو صرف ایمان کے ساتھ مخصوص کیا جائے تو من اتبعک کا استثناء صحیح نہ ہوگا (گمراہوں کو لفظ عباد میں داخل ہونا چاہیے اس کے بعد استثناء کر کے نکالنا چاہئے) مقصدِ آیت یہ ہے کہ اللہ نے صرف گمراہوں پر تجھے تسلط عطا کیا ہے تو ان پر غلبہ پا سکتا ہے مؤمنوں تک تیری دسترسی نہ ہوگی۔ ابلیس نے بھی مخلص بندوں کا استثناء اپنے قول میں کر دیا تھا اللہ کے قول سے بھی اس کی تائید ہوگئی دوسری آیت میں یہ مضمون آیا ہے فرمایا ہے اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ۔ حاصلِ مطلب یہ ہے کہ مخلص بندوں کو اللہ شیطان کے پنجہ سے محفوظ رکھے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ استثناء منقطع ہو (متصل نہ ہو اور مستثنیٰ مستثنیٰ منہ میں داخل ہی نہ ہو اس صورت میں عِبَادِیْ سے مراد ہوں گے خاص

بندے یعنی مؤمن۔ کافروں کو یہ لفظ شامل ہی نہ ہوگا) اور اِلّا استثنائیہ نہ ہو بلکہ لٰکِنْ کے معنی میں ہو اور خبر محذوف ہو مطلب اس طرح ہو گا ہاں جو گمراہ لوگ تیری پیروی کریں گے اللہ ان کو جہنم میں لے جائے گا۔ شیطان نے اپنے کلام سے یہ وہم پیدا کرایا تھا کہ جو مخلص بندے نہ ہوں گے میں ان کو ضرور گمراہ کردوں گا اللہ نے اس کی تکذیب کردی یعنی تیرا تسلّط گمراہوں پر بھی نہ ہوگا گمراہ کرنا بھی تیرے قبضہ میں نہیں زیادہ سے زیادہ تیرا کام گناہ کی ترغیب دینا اور بہکانا ہے۔ قیامت کے دن ابلیس خود کہے گا مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطَانٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ میری تم پر کوئی زبردستی نہیں تھی بس اتنی بات تھی کہ میں نے دعوت دی تم نے میری دعوت مان لی (یعنی میرا تسلّط اور جبر نہ تھا صرف ترغیب اور بہکاوا تھا)

وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ اور جو لوگ تیری راہ پر چلیں گے ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔ اَجْمَعِيْنَ: هُمْ کی تاکید ہے یا حال ہے موعد مصدر ہے اور اجمعین میں عامل ہے۔ موعد اسم مکان بھی ہے (وعدۂ مقررہ کی جگہ) اس وقت موعد عامل نہ ہوگا۔

لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ اس (جہنم) کے سات دروازے ہیں۔ ہناد، ابن المبارک اور امام احمد نے الزہد میں اور ابن جریر و ابن ابی الدنیا نے صفتُ النار (دوزخ کی حالت کا بیان) میں بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ کے اوپر اور انگلیوں کو الگ الگ کر کے فرمایا، دوزخ کے دروازے اسی طرح ہوں گے یعنی ہر دروازہ کے اوپر دروازہ ہوگا (اس طرح دوزخ کی سات منزلیں اور درجات ہوں گے) اول پہلی منزل بھر دی جائے گی، پھر دوسری، پھر تیسری، پھر چوتھی، پھر پانچویں، پھر چھٹی، ساتویں۔

بغوی نے حضرت علیؓ کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ اللہ نے جنت کو پھیلاؤ میں رکھا ہے (یعنی جنت کے اوپر جنت نہیں ہے) اور دوزخ کو ایک کو دوسرے کے اوپر بنایا ہے۔ ابن جریر اور ابن ابی الدنیا نے صفتُ النار میں اسی آیت کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ اول دروازہ (یعنی طبقہ) جہنم ہے، پھر لظیٰ، پھر حطمہ، پھر سعیر، پھر سقر، پھر جحیم، پھر ہاویہ۔

لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾ ہر طبقے کے لئے گمراہوں کا ایک حصہ بانٹا ہوا ہوگا یعنی ہر درجہ میں گمراہوں کی ایک مقررہ جماعت ہوگی جو اس درجہ کے اندر رہے گی۔ ع۱۹ ۳

بغوی نے لکھا ہے کہ ضحاک نے کہا، پہلے درجہ میں وہ اہلِ توحید ہوں گے جن کو گناہوں کی وجہ سے دوزخ میں داخل کیا جائے گا اور گناہوں کے بقدر وہ دوزخ میں رہیں گے، پھر نکال لئے جائیں گے دوسرے درجہ میں نصاریٰ۔ تیسرے میں یہودی۔ چوتھے میں صابی، پانچویں میں مجوسی چھٹے میں مشرک اور ساتویں میں منافق ہوں گے۔ (یعنی دور مسیحی ختم ہونے کے بعد نصاریٰ عیسائیت پر قائم رہے اور کسی پیغمبر کا انکار کیا یا بعد کو آنے والے پیغمبر کی شریعت کا انکار کیا۔ اسی طرح شریعتِ موسوی کا زمانہ ختم ہونے کے بعد جو یہودی یہودیت پر قائم رہے اور حضرت عیسیٰؑ یا رسول اللہ ﷺ یا کسی اور پیغمبر کا انہوں نے انکار کیا۔ صابی جو اپنے کو موحّد کہتے ہیں اور کسی پیغمبر کی شریعت کو نہیں مانتے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ صابی صرف حضرت نوحؑ کا متبع اپنے کو قرار دیتے ہیں۔ مجوسی آتش پرست اور ستارہ پرست) اللہ نے منافقوں کے متعلق فرمایا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ منافق دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کے سات دروازے (یعنی درجے) ہیں ان میں سے ایک ان لوگوں کے لئے جنہوں نے میری امت پر تلوار سونتی یا فرمایا محمدؐ کی امت پر تلوار کھینچی۔ قرطبی نے کہا پہلا طبقہ جہنم ہے یہ تمام دوسرے درجات سے سہل ترین عذاب کا درجہ ہے اس امت کے گناہ گاروں کے لئے مخصوص ہے۔ جہنم کو جہنم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی آگ مردوں اور عورتوں کے چہرے بگاڑ دے گی اور ان کے گوشت کو کھالے گی۔

ہاویہ کا درجہ سب سے نچلا ہے یہ سب سے گہرا ہے بزار نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دوزخ کا ایک ایسا درجہ ہے جس میں صرف وہی لوگ داخل ہوں گے جنہوں نے اللہ کا غضب لے کر اپنے غصہ کو تسکین دی

ہو گی (اللہ کے غضب کی پرواہ نہیں کی اور اپنے غصہ کی آگ بجھائی)

ترمذی نے حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جہنم کے سات دروازے ہیں سب سے زیادہ غم آگیں کرب آفریں اور حزن آلود اور متعفن ترین دروازہ ان زناکاروں کے لئے ہو گا جنہوں نے جانتے ہوئے زنا کا ارتکاب کیا ہو گا۔ بیہقی نے خلیل بن مرہ کی مرسل روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بغیر تبارک الذی اور حم السجدہ پڑھے نہیں سوتے تھے اور فرماتے تھے حم والی سورتیں سات ہیں اور دوزخ کے بھی سات طبقات ہیں، جہنم، حطمہ، لظی، سقر، سعیر، ہاویہ، جحیم۔ قیامت کے دن ان (حم والی سورتوں) میں سے حم السجدہ آکر ان طبقات کے دروازہ پر کھڑی ہو جائے گی اور عرض کرے گی اے اللہ جو مجھ پر ایمان رکھتا اور مجھے پڑھتا تھا وہ اس میں داخل نہ ہو۔

ثعلبی کی روایت ہے کہ حضرت سلمان فارسیؓ نے جب آیت وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ سنی تو بدحواس ہو کر بھاگے اور اسی حالت میں تین روز بھاگتے رہے آخر (پکڑ کر) رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر کیا گیا۔ حضور ﷺ نے (فرار کا سبب) دریافت فرمایا حضرت سلمان فارسیؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آیت وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ نازل ہوئی۔ قسم ہے اس کی جس نے آپ کو سچ کا حامل بنا کر بھیجا ہے میرا دل اس سے پارہ پارہ ہو گیا اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾ بے شک پرہیزگار لوگ (جنہوں نے شیطان کے اغوا میں آکر شرک نہیں کیا ہو گا، شرک سے پرہیز رکھا ہو گا جنتوں اور (جنتی) چشموں میں ہوں گے (ہر شخص کی ایک جنت اور ایک چشمہ یا ہر ایک کی متعدد جنتیں اور متعدد چشمے ہوں گے ان سے کہا جائے گا) ان جنتوں اور چشموں کے اندر سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یعنی آئندہ موت، ہر آفت اور یہاں سے نکالے جانے کے اندیشے سے تم محفوظ ہو۔

وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم وہ بالکل دور کر دیں گے کہ سب بھائی بھائی کی طرح ہو جائیں گے۔ یعنی دنیا میں ان کے آپس میں جو کینہ کشیدگی دلوں میں ہو گی (جنت میں داخل کرنے کے وقت) ہم دور کر دیں گے وہ بھائی بھائی ہو جائیں گے) غلّ کینہ چونکہ ایسا واقعہ آئندہ یقینی طور پر ہو گا اس لئے بصیغۂ ماضی اس کو بیان فرمایا۔

ابو نعیم نے الفتن میں اور سعید بن منصور، ابن ابی شیبہ، طبرانی اور ابن مردویہ نے بیان کیا ہے کہ حضرت علیؓ نے فرمایا، مجھے امید ہے کہ میں اور عثمانؓ اور طلحہؓ اور زبیرؓ انہی میں سے ہوں گے (یعنی جنت میں داخلہ سے پہلے اللہ ہماری آپس میں کشیدگیوں کو دور کر دے گا۔ میں کہتا ہوں یہ کشیدگی اس وقت ہوئی تھی جب حضرت عثمانؓ کے خلاف فتنہ برپا کیا گیا یہاں تک کہ آپ شہید کر دیئے گئے اور حضرت طلحہؓ و حضرت زبیرؓ جنگ جمل میں شہید ہوئے۔ عبد اللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں عبد الکریم بن رشید کی روایت نقل کی ہے کہ اہل جنت جنت کے دروازے تک پہنچیں گے تو ایک دوسرے کی طرف غصہ کی نظر سے دیکھتا ہو گا لیکن اندر داخل ہوتے ہی اللہ ان کے سینوں سے کینہ نکال دے گا اور وہ بھائی بھائی ہو جائیں گے۔

یا (غلّ سے مراد دنیوی کینہ نہیں بلکہ اس سے) مراد یہ ہے کہ اہل جنت کے اندر جو درجات اور مراتب قرب کے لحاظ سے تفاوت ہو گا اس پر کوئی کسی سے حسد نہیں کرے گا اللہ (جذبۂ) حسد کو ان کے دلوں سے نکال دے گا۔

عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾ مسہریوں پر (بیٹھے) ہوں گے آمنے سامنے۔ ہناد نے مجاہد کا قول اس آیت کے ذیل میں نقل کیا ہے کہ کسی کی پشت کسی کی طرف نہ ہو گی بغوی نے لکھا ہے بعض اخبار میں آیا ہے کہ جنتی جب جنت کے اندر اپنے مؤمن بھائی سے ملنا چاہے گا تو مسہری اس کو لے کر وہاں پہنچ جائے گی اس طرح دونوں کی ملاقات اور بات چیت ہو جائے گی۔

ابن ابی حاتم نے حضرت علیؓ بن حسینؓ کا قول نقل کیا ہے کہ آیت وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ کا نزول ابو بکر و عمرؓ کے حق میں ہوا۔ سوال کیا گیا ان دونوں میں کون سا کینہ تھا فرمایا دورِ جاہلیت کا کینہ، بنی تمیم اور بنی عدی اور بنی ہاشم کے درمیان جاہلیت کے زمانہ میں کینہ تھا۔ جب یہ قبائل مسلمان ہو گئے تو باہم محبت کرنے لگے (ایک بار) حضرت ابو بکرؓ کو کمر کی کچھ تکلیف ہو گئی تو حضرت علیؓ نے اپنے ہاتھ سے گدی گرم کر کے حضرت ابو بکرؓ کی کمر کو سینکا، اس پر آیت ذیل نازل ہوئی۔

اس قول پر آیت کا مطلب اس طرح ہو گا کہ دورِ جاہلیت میں لوگوں کے سینوں میں جو عداوتیں تھیں جب وہ اسلام لے آئے تو ہم نے وہ باہمی عداوتیں دور کر دیں۔

لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَّمَا هُم مِّنْهَا بِمُخْرَجِينَ ﴿۴۸﴾ جنت کے اندر اہلِ جنت کو تھکان چھوئے گی بھی نہیں اور نہ جنت سے کبھی ان کو نکالا جائے گا دوامِ نعمت ہی تکمیلِ نعمت ہے۔

طبرانی نے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ چند صحابی باہم ہنس رہے تھے، رسول اللہ ﷺ کا ادھر سے گذر ہوا صحابہؓ کو ہنستے دیکھ کر فرمایا دوزخ تم لوگوں کے سامنے ہے پھر بھی ہنس رہے ہو۔ فوراً جبرئیل نازل ہو گئے اور کہا محمد ﷺ آپ کا رب فرماتا ہے تم کیوں میرے بندوں کو میری رحمت سے ناامید کرتے ہو (اس پر آیت ذیل نازل ہوئی)

نَبِّئْ عِبَادِي أَنِّي أَنَا الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿۴۹﴾ وَأَنَّ عَذَابِي هُوَ الْعَذَابُ الْأَلِيمُ ﴿۵۰﴾

(اے نبی) میرے بندوں کو اطلاع دے دو کہ بلاشبہ میں ہی بہت بڑا بخشنے والا مہربان ہوں اور یہ بھی خبر دے دو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک عذاب ہے۔

ابن مردویہ نے دوسری سند سے کسی صحابی کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باب بنی شیبہ سے برآمد ہوئے اور فرمایا کیا میں تم کو ہنسی میں مشغول نہیں پا رہا ہوں (یعنی تم اللہ کے عذاب کی طرف سے غافل ہو اور ہنس رہے ہو) پھر پشت پھیر کر چل دیئے پھر پچھلے قدم لوٹے اور فرمایا میں یہاں سے نکل کر حجر (سنگِ اسود) تک ہی پہنچا تھا کہ جبرئیل آ گئے اور انہوں نے کہا محمد! اللہ فرماتا ہے میرے بندوں کو تم کیوں ناامید کرتے ہو نَبِّئْ عِبَادِي الخ آیت کی رفتار و ترتیب میں وعدۂ مغفرت و رحمت بھی ہے اور وعیدِ عذاب بھی گویا گزشتہ مضمون کا خلاصہ اس آیت میں مذکور ہے اور لفظ غفور رحیم بتا رہا ہے کہ آیتِ سابقہ میں الْمُتَّقِينَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے پرہیز کرنے والے ہیں، صغیرہ و کبیرہ گناہوں سے بچنے والے مراد نہیں ہیں (ورنہ مغفرت کا مفہوم ہی کیا ہو گا کس چیز کی مغفرت ہو گی)

بغوی نے قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ قتادہ نے کہا ہم کو معلوم ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر بندہ اللہ کی مقدارِ عفو کو جان لیتا تو حرام سے پرہیز نہ کرتا اور اگر اللہ کی مقدارِ عذاب کو جان لیتا تو خوف کے مارے (گویا) اس کی جان ہی نکل جاتی ترمذی نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر مؤمن بندہ کو اللہ کے عذاب کا علم ہو جاتا تو پھر جنت کی امید ہی کسی کو نہ رہتی اور اگر کافروں کو اللہ کی رحمت کی مقدار معلوم ہو جاتی تو جنت سے مایوس نہ ہوتا۔

صحیحین میں آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا میں نے سنا ہے رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے تخلیقِ رحمت کے دن اللہ نے سو رحمتیں پیدا کیں، ننانوے رحمتیں اپنے پاس روک لیں اور ایک رحمت ساری مخلوق میں پھیلا دی جو رحمتیں اللہ کے پاس ہیں اگر ان سب سے کافر واقف ہو جائے تو جنت سے ناامید نہ ہو اور جو عذاب اللہ کے پاس ہے اگر مؤمن کو اس کا علم ہو جائے تو دوزخ سے بے خوف نہ ہو۔

احمد اور مسلم نے حضرت سلمانؓ کی روایت سے اور احمد و ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آسمان و زمین کی پیدائش کے دن اللہ نے سو رحمتیں پیدا کیں ہر رحمت آسمان و زمین کے درمیانی فاصلہ کے مطابق۔ ان میں سے ایک رحمت زمین پر قائم کی جس کی وجہ سے ماں اپنے بچہ کو پیار کرتی اور چرندے پرندے باہم محبت کرتے ہیں اور ننانوے رحمتیں پیچھے رکھ چھوڑی ہیں قیامت کا دن ہو گا تو ان رحمتوں کو اس رحمت سے ملا کر پورا کر دے گا۔

اس آیت میں اللہ نے اپنی صفت غفور و رحیم بیان فرمائی، عذاب دینے والا نہیں فرمایا (حالانکہ عذاب دینا بھی اسی کی صفت ہے) اس سے معلوم ہوا کہ وعدہ کا پہلو وعید پر راجح ہے مغفرت و رحمت غضب پر غالب ہے۔

وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَيْفِ إِبْرَاهِيمَ ﴿۵۱﴾ اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں کے واقعہ کی اطلاع دے دو اس جملہ کا عطف امر سابق نَبِّئْ عِبَادِي پر ہے۔ یہ تائید ہے اس امر کی کہ اللہ کا وعدۂ رحمت اور وعید عذاب آخرت کی طرح دنیا میں بھی ظاہر ہوتے ہیں (دیکھو ابراہیمؑ پر اللہ نے رحمت کی، پیرانہ سالی کے باوجود ان کو اولاد عطا کی اور قوم لوط کو ہلاک کر دیا) ضیف کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے یہاں "ضیف" سے مراد ملائکہ ہیں جو ابراہیمؑ کو اولاد کی بشارت دینے اور قوم لوط کو ہلاک کرنے کے لئے بھیجے گئے تھے۔

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا قَالَ إِنَّا مِنْكُمْ وَجِلُونَ ﴿۵۲﴾ جب مہمان ابراہیمؑ کے پاس آئے اور انہوں نے سلام (یعنی ہم سلام کرتے ہیں سلاماً فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے) ابراہیمؑ نے کہا، ہم تم سے خوف زدہ ہیں۔ یعنی تم بغیر اجازت کے یا بے وقت آئے ہو اس لئے ہم تمہاری طرف سے ڈر رہے ہیں یا خوف کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیمؑ کی طرف سے پیش کیا ہوا اطعام مہمانی مہمانوں نے کھانے سے انکار کر دیا تھا (جس سے حضرت ابراہیمؑ کو اندیشہ ہوا کہ شاید دشمن ہیں) وَجَل کا معنی ہے کسی مصیبت کے آنے کے خوف سے دل کا بے چین ہو جانا۔

قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿۵۳﴾ مہمانوں نے کہا آپ کچھ خوف نہ کریں ہم ایک ذی علم لڑکے کی آپ کو بشارت دیتے ہیں یعنی آپ کا ایک لڑکا ہو گا جو بالغ ہو کر بڑا عالم ہو گا حضرت ابراہیمؑ چونکہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے اور بیوی بھی بوڑھی تھیں اس لئے آپ کو تعجب ہوا اور

قَالَ أَبَشَّرْتُمُونِي عَلَىٰ أَنْ مَسَّنِيَ الْكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُونَ ﴿۵۴﴾ کہا میرا تو بڑھاپا آ گیا اس کے باوجود تم بشارت دے رہے ہو کس سبب سے بشارت دے رہے ہو۔ یعنی ایسی بات کی خوش خبری دے رہے ہو جس کا معمولاً واقع ہونا ناقابل فہم ہے۔

قَالُوا بَشَّرْنَاكَ بِالْحَقِّ فرشتوں نے کہا ہم نے آپ کو سچی (یا یقین کے ساتھ یا سچے طریقے سے) خوش خبری دی ہے "حق" سے مراد ہے اللہ کا قول اور حکم جس کو ٹالنے والا کوئی نہیں۔ کسی طرح اس کو ٹالا نہیں جا سکتا۔

فَلَا تَكُنْ مِنَ الْقَانِطِينَ ﴿۵۵﴾ پس آپ آس توڑنے والوں میں سے نہ ہوں (یقینی امید رکھیں) اللہ بغیر ماں باپ کے بھی پیدا کر سکتا ہے تو کوئی تعجب نہیں کہ بوڑھے ماں باپ کو بچہ عطا فرما دے۔ حضرت ابراہیمؑ کو قدرتِ خدا کا انکار نہ تھا بلکہ ایسا ہونا چونکہ معمولِ خداوندی کے خلاف تھا اس لئے آپ کو تعجب ہوا۔

قَالَ وَمَنْ يَقْنَطُ مِنْ رَحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ ﴿۵۶﴾ ابراہیمؑ نے کہا گمراہوں کے سوا اپنے رب کی رحمت سے اور کوئی ناامید نہیں ہوتا۔ یعنی جو رحمت سے واقف نہیں، معرفت سے بے بہرہ ہیں اللہ کی رحمت، علم اور قدرت کی وسعت کا ان کو پتہ نہیں وہ ہی آس توڑ لیتے ہیں اور ناامید ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے ناامید ہو جانا ایسا ہی بڑا گناہ ہے جیسا غضب سے بے فکر ہو جانا۔

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ ﴿۵۷﴾ ابراہیمؑ نے کہا، اے فرستادگانِ (الٰہی) تمہارا آنے کا معاملہ کیا ہے۔ یعنی اس بشارت کے علاوہ اصل سبب تمہارے نازل ہونے کا کیا ہے وہ کیا بڑا کام ہے جس کے لئے تم کو بھیجا گیا ہے شاید حضرت ابراہیمؑ سمجھ گئے کہ متعدد فرشتوں کے آنے کی غرض یہ خوش خبری تو ہو نہیں سکتی بشارت دینے کے لئے تو ایک بھی کافی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت زکریاؑ اور حضرت مریمؑ کو ایک ہی فرشتہ نے بشارت دی تھی یا حضرت ابراہیمؑ یہ سمجھے کہ ان کے آنے کی اگر اصل غرض اگر خوش خبری پہنچانی ہوتی تو آتے ہی بشارت سنا دیتے۔ بشارت تو انہوں نے خوف کو دور کرنے کے لئے ذیلی اور ضمنی طور پر دے دی (شروع میں تو مہمان بن کر آئے تھے)

قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ فرشتوں نے کہا ہم کو مجرم لوگوں کو ہلاک کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے سوائے ان لوگوں کے جو لوطؑ کے پیرو ہیں (ان کو ہلاک کرنے کا ہم کو حکم نہیں) یا اس طرح ترجمہ ہوگا کہ ہم کو تمام مجرموں یعنی مشرکوں کی طرف بھیجا گیا مگر آلِ لوطؑ کے پاس نہیں بھیجا گیا تاکہ ہم مجرموں کو ہلاک کر دیں اور آلِ لوطؑ کو ہلاک نہ کریں۔

اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ہم لوطؑ کی بیوی کے سوا باقی تمام آلِ لوطؑ کو بلاشبہ بچالیں گے۔

قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ع ۴ ہم نے طے کر دیا ہے کہ وہ (عذاب میں) باقی رہنے والوں (یعنی کافروں) میں شامل ہوگی۔

تقدیر، بمعنی قضاء ہے یعنی ہم نے کہہ دیا یا ہم نے طے کر دیا۔ لغت میں تقدیر کا معنی ہے کسی چیز کو دوسری چیز کے اندازہ کے موافق بنا دینا یا کر دینا۔ حقیقت میں یہ فعل اللہ کا ہے، لیکن فرشتوں کو اللہ سے خصوصی قرب حاصل تھا اس لئے فعلِ "تقدیر" کی نسبت فرشتوں کی طرف کر دی گئی یا ملائکہ کی طرف فعلِ "تقدیر" کی نسبت کرنے کی یہ وجہ ہے کہ وہ تو محض قاصد جو نامہ بر تھے ان کا ہر قول و فعل اللہ کا قول و فعل تھا۔

فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ۙ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ جب لوطؑ کے گھر والوں کے پاس فرشتے پہنچے تو لوطؑ نے ان سے کہا بلاشبہ تم اجنبی آدمی معلوم ہوتے ہو۔ یعنی میں نے تم کو نہیں پہنچانا تم سے مجھے اندیشہ ہے نہ تو تم پر کوئی سفر کی علامت ہے کہ میں تم کو مسافر سمجھوں اور نہ تم اس بستی کے رہنے والے ہو کہیں تمہاری طرف سے مجھے کوئی دکھ نہ پہنچ جائے۔

قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ فرشتوں نے کہا ہم آپ کے پاس (کافروں کے لئے) وہ عذاب لے کر آئے ہیں جس کے آنے میں ان کو شک رہتا تھا یعنی آپ کو دکھ پہنچانے والی کوئی چیز لے کر نہیں آئے بلکہ آپ کے لئے خوش کُن بات لائے ہیں، جس عذاب سے آپ ان کو ڈراتے تھے اور وہ شک میں پڑے ہوئے ہیں ان کو عذاب کا خوف ہی نہ تھا وہی عذاب ان کے لئے لائے ہیں۔

وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ اور آپ کے پاس عذاب کی یقینی اطلاع (یا وہ عذاب جو اللہ کے علم میں محقق ہو چکا ہے) لے کر آئے ہیں۔

وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ اور ہم (اپنے اس قول میں) یقیناً سچے ہیں۔

فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ سو آپ رات کے کسی حصے میں (یہاں سے) چلے جانا اور آپ ان سب کے پیچھے پیچھے رہنا اور نہ دیکھے پیچھے مڑ کر تم میں سے کوئی۔

قِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ پارۂ شب، بعض نے کہا آخرِ شب۔ سب کے پیچھے چلنے سے مراد یہ ہے کہ تم ان کو اپنے آگے آگے تیزی سے نکال لے جاؤ اور ان کے احوال پر مطلع رہو۔ پیچھے پھر کر دیکھنے کی ممانعت اس لئے کی کہ ہولناک عذاب کا منظر ان سے دیکھا نہ جائے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قوم کو عذاب میں مبتلا دیکھ کر ان کے دلوں میں نرمی اور رقت پیدا ہو جائے اور اس قلبی ہمدردی کی پاداش میں ان پر بھی وہی عذاب آ جائے۔

لَا يَلْتَفِتْ کا مطلب یہ ہے کہ تم میں کوئی کسی کام کے لئے ساتھ جانے سے رہ جائے ورنہ وہ بھی ہمہ گیر عذاب میں مبتلا ہو جائے گا۔ بعض نے کہا، اِلتفات کی ممانعت اس لئے کی گئی کہ دل کے جماؤ کے ساتھ وہ ترکِ وطن کر سکیں۔ (وطن اور احباب و اقارب کی طرف ان کی رغبتِ خاطر ہی پیدا نہ ہو پائے) بعض علماء کے نزدیک عدمِ التفات سے مراد لفظی ترجمہ نہیں بلکہ کنائی معنی مراد ہیں یعنی سرپٹ نکل جاؤ، سستی نہ کرو، کہیں دم نہ لو، تیزی کے ساتھ بھاگے چلے جاؤ۔ التفات (رخ کرنے والے کو ادنیٰ وقفہ اتنا وقفہ کہ منہ موڑ کر دیکھ لے) کرنا ہی پڑتا ہے گویا عدمِ التفات سے مراد ہے وقفہ نہ کرنا دم نہ لینا تیزی کے ساتھ بھاگتے

چلا جانا۔
وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ اور جہاں جانے کا (اللہ کی طرف سے) تم کو حکم دیا جارہا ہے وہاں چلے جاؤ یعنی شام کو چلے جاؤ۔ حضرت ابن عباسؓ کا یہی قول ہے۔ مقاتل کے نزدیک زعر مراد ہے بعض نے اردن کہا ہے۔
وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿٦٦﴾ اور ہم نے لوطؑ کے پاس یہ حکم بھیجا کہ صبح ہوتے ہی ان کی جڑ بالکل کٹ جائے گی سب ہلاک کردیئے جائیں گے یعنی لوطؑ کے پاس ہم نے یہ قطعی حکم بھیج دیا کہ ان لوگوں کی جڑ صبح ہوتے ہوتے بالکل کٹ جائے گی۔ دَابِر، جڑ، یعنی ان میں سے کوئی بھی باقی نہیں رہے گا سب کے سب بالکل ہلاک کردیئے جائیں گے۔
وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٦٧﴾ اور شہر والے باہم خوش خبریاں سناتے آئے یعنی سدوم بستی کے رہنے والے نووارد خوب صورت لڑکوں کی آمد کی اطلاع خوشی خوشی باہم دینے لگے، امرد پرست تھے خوب صورت نووارد لڑکوں کی آمد سے ان کا شیطانی جذبہ جوش میں آیا اور خوش خبری دینے لگا۔ فرشتے خوب صورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوطؑ کے گھر پہنچے تھے۔
قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾ لوطؑ نے کہا یہ میرے مہمان ہیں مجھے رُسوا نہ کرو۔ مہمان کی رُسوائی میزبان کی رُسوائی ہے۔
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾ اور اللہ سے ڈرو (ایسی بے حیائی کی حرکت نہ کرو) اور مجھے ذلیل نہ کرو۔ تخزون خزی سے ماخوذ ہے خزی کا معنی ہے ذلت یا خزایۃ سے ماخوذ ہے۔ خزایۃ کا معنی ہے شرمندگی، حیا، یعنی مجھے شرمندہ نہ کرو۔
قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾ وہ کہنے لگے، کیا ہم تم کو دنیا بھر کے لوگوں کی (ذمہ داری لینے اور ہمارے معاملے میں دخل دینے) سے منع نہیں کرچکے تھے۔
اَوَلَمْ نَنْهَكَ کا عطف فعل محذوف پر ہے۔ پورا کلام اس طرح تھا کیا ہم ان کو تمہارے کہنے سے چھوڑ دیں باوجودیکہ ہم نے تم کو منع کردیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ تم ہمارے اور دوسرے لوگوں کے درمیان دخل نہ دو اور ہمارے خلاف کسی کو اپنے پاس پناہ میں نہ رکھو ہم تو ان سے جو کچھ چاہتے ہیں کریں گے۔ قوم لوطؑ والے (علاوہ امرد پرست ہونے کے) راہزن بھی تھے راہگیروں کو لُوٹا کرتے تھے حضرت لوطؑ بقدرِ امکان اس فعل سے ان کو منع کرتے تھے۔
قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾ لوطؑ نے کہا یہ میری لڑکیاں (موجود) ہیں (تم اپنی خواہش ان سے پوری کرسکتے ہو ان سے نکاح کرلو) اگر خواہش پوری کرنی چاہتے ہو تو ایسا کرلو یا یہ مطلب ہے کہ اگر تم میرے کہنے پر عمل کرنے والے ہو تو ان سے نکاح کرلو۔
لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿٧٢﴾ (اللہ نے فرمایا، اے محمد ﷺ) تمہاری زندگی کی قسم یہ لوگ درحقیقت اپنے نشہ میں سرمست ہیں عَمْر اور عُمُر ہم معنیٰ ہیں۔ عَمْر کا لفظ خفیف بھی ہے اور قسم کے موقع پر یہی لفظ بولا جاتا ہے (عُمُر کا لفظ قسم کے موقع پر نہیں آتا) بغوی نے ابوالجوزاء کی وساطت سے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ محمد ﷺ کی جان سے زیادہ عزیز اللہ نے کسی اور کی جان نہیں پیدا کی اور آپ کی زندگی کے علاوہ کسی اور کی زندگی کی قسم نہیں کھائی۔ عزیز ترین چیز ہی کی قسم کھائی جاتی ہے تمام جانوں میں حضورؐ کی جان اللہ کے نزدیک عزیز تھی اسی کی قسم کھائی۔ يَعْمَهُوْنَ کا معنی ہے سرگرداں ہیں، متحیر ہیں یعنی جب یہ کافر اپنے نشے میں سرمست ہیں تو آپ کی نصیحت کیسے سن سکتے ہیں، یا یہ کلام ملائکہ کا ہے جو حضرت لوطؑ کو خطاب کرکے انہوں نے کہا تھا مطلب یہ ہے کہ اے لوطؑ تمہاری زندگی کی قسم یہ لوگ اپنے نشہ میں سرمست ہیں (تمہاری نصیحت نہیں سنیں گے) یا اللہ کا قول ہے اور خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہی ہے اور اللہ نے قوم لوطؑ کی حالت بیان کی ہے مطلب اس طرح ہوگا کہ اے محمد ﷺ آپ کی زندگی کی قسم قوم لوطؑ درحقیقت اپنے نشہ میں مست تھی اور لوطؑ کی نصیحت نہیں

سن سکتے تھے۔ مترجم)

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ ﴿۷۳﴾ پس سورج نکلتے نکلتے ان کو ایک سخت آواز نے آدبایا۔ (پکڑ لیا کہ جہاں تھے وہیں رُک گئے، کوئی بچنے نہ پایا۔ مترجم) الصیحۃ یعنی ہولناک ہلاکت انگیز چیز، چیخ۔ بعض علماء کا قول ہے کہ یہ چیخ حضرت جبرئیلؑ کی تھی شروق الشمس سورج کا نکلنا اور روشن ہونا۔ مراد یہ ہے کہ عذاب کا آغاز تو فجر سے ہی ہو گیا تھا اور تکمیلِ عذاب، سورج نکلنے کے وقت ہوئی۔

فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا سو ہم نے اس بستی کو تل پٹ کر دیا۔ حضرت جبرئیلؑ نے اس بستی کو اٹھا کر الٹ دیا۔ اوپر کو نیچے کر دیا۔

وَأَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن سِجِّيلٍ ﴿۷۴﴾ اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھر برسائے۔ سجیل وہ مٹی جو سخت ہو کر پتھر ہو جاتی ہے (کنکر) یا وہ کنکر جو (ہر ایک کے لئے جُدا جُدا) نام زد تھا اس ترجمہ پر سجل کے لفظ اور اس واقعہ کی تفصیل سورۂ ہود میں گذر چکی ہے فَجَعَلْنَا میں ف (پھر) کا لفظ بتا رہا ہے کہ پہلے چیخ اور سخت آواز آئی تھی پھر بستی الٹی تھی اور پتھروں کی بارش ہوئی تھی۔

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿۷۵﴾ اس واقعہ میں کئی نشانیاں ہیں اہلِ بصیرت کے لئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے مُتَوَسِّمِيْنَ کا ترجمہ کیا ہے۔ دیکھنے والے۔ مجاہد نے کہا شناخت کرنے والے قتادہ نے کہا عبرت حاصل کرنے والے۔ مقاتل نے کہا غور کرنے والے۔ میں کہتا ہوں وَسْم کا معنی ہے اثر کرنا، نشان پیدا کرنا اور سِمَۃٌ کا معنی ہے اثر، نشان یعنی جو لوگ ظاہر علامات و آثار کو دیکھ کر اندرونی نتائج و معانی کی شناخت کرنے والے ہیں ان کے لئے اس واقعہ میں بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔

وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ﴿۷۶﴾ اور وہ (یعنی الٹی ہوئی بستی) اس راستہ پر موجود ہے جو (اب بھی) آباد ہے یعنی اب بھی موجود ہے اس کے نشانات مٹے نہیں ہیں لوگ اس پر چلتے ہیں مقیم بمعنی قائم موجود (جس کے نشان مٹے نہ ہوں!

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۷۷﴾ بلاشبہ اس بیان میں مؤمنوں کے لئے نشانی ہے۔ یعنی ان لوگوں کے لئے جو اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان رکھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ یہ بیان اللہ کی طرف سے ہے۔

وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ لَظَالِمِينَ ﴿۷۸﴾ اور بلاشبہ ایکہ والے بھی ظالم تھے۔ انہوں نے شعیبؑ کی تکذیب اور اللہ کی توحید کا انکار کر کے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور دوزخ کے مستحق بنے تھے۔ الایکۃ گھنے درخت، جھاڑی۔ اصحابُ الایکہ سے مراد حضرت شعیبؑ کی قوم ہے جو گھنے جنگل میں رہتی تھی وہاں عموماً درخت گوگل کے تھے۔

فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ پس ہم نے ان سے انتقام لیا (ان کو ان کے جرم کی سزا دی) اللہ نے سات روز تک ان پر سخت گرمی کو مسلط کر دیا۔ سات روز کے بعد بادل کا ایک ٹکڑا آیا لوگ آرام لینے اور کچھ سکھ پانے کے لئے اس کے سایہ میں آگئے لیکن اللہ نے اس بادل سے ان پر آگ برسائی اور سب جل بھُن کر خاک ہو گئے اس عذاب کو عذاب یوم الظلہ (سایہ کے دن کا عذاب) کہا گیا ہے۔

وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿۷۹﴾ ع اور دونوں (قوموں کی) بستیاں صاف سڑک پر (واقع) ہیں ہما (دونوں) سے مراد ہیں قوم لوطؑ کی بستی سدوم اور قوم شعیبؑ کی بستی ایکہ۔ بعض اہلِ تفسیر کا قول ہے کہ ایکہ اور مدین مراد ہیں کیونکہ ان دونوں شہروں کی اصلاح کے لئے حضرت شعیبؑ کو پیغمبر بنا کر بھیجا گیا تھا اوپر کی آیت میں ایک کا ذکر کر دیا گیا (اصحاب الایکۃ کا ذکر کر دیا، دوسری بستی کا ذکر اس جگہ ضروری نہ تھا)

اِمَامٍ مُّبِيْنٍ کھلا ہوا راستہ، طریق واضح۔ جس کو دیکھ کر مکہ والے عبرت حاصل کر سکتے تھے (سفر میں اس راستہ پر جاتے تھے) امام، ہر وہ چیز جس کی پیروی کی جائے (یعنی اس کو نمونۂ عمل یا پیشوا یا دستورِ کار بنا لیا جائے) لوح محفوظ کو اور معمار کی گنیا کی ڈور کو اور راستہ کو بھی اسی مناسبت سے "امام" کہا جاتا ہے (جہاں کے تمام واقعات لوح محفوظ کی تحریر کے موافق ہوتے ہیں۔ معمار اپنی

گنیا کے ڈورے سے تعمیر کو ناپتا اور اندازہ کرتا ہے اور راستے پر بھی سبھی لوگ چلتے ہیں راہ سب کے لئے راہ نما ہوتی ہے)

وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿٨٠﴾ اور حجر والوں نے بلاشبہ پیغمبروں کو جھوٹا قرار دیا یعنی حضرت صالحؑ کی اور ان پیغمبروں کی تکذیب کی جن کو حضرت صالحؑ نے سچا بتایا تھا۔ اَصحابُ الحِجر سے مراد ہے قوم ثمود۔ حجر ایک وادی کا نام ہے جو مدینہ اور شام کے درمیان تھی۔

وَاٰتَيْنٰهُمْ اٰيٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴿٨١﴾ اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں لیکن وہ نشانیوں سے کترا گئے۔ آیات سے مراد وہ کتاب ہے جو ان کے نبی پر اتاری گئی تھی (یعنی حضرت صالحؑ کے صحیفے) یا پیغمبر کے معجزات مراد ہیں پتھر سے اونٹنی اور اس کے بچے کا برآمد کرنا، اس اونٹنی کا دودھ بکثرت ہونا اور تالابوں کا سارا پانی پی جانا۔

وَكَانُوْا يَنْحِتُوْنَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا اٰمِنِيْنَ ﴿٨٢﴾ وہ لوگ پہاڑ تراش کر ان میں گھر بناتے تھے کہ امن میں رہیں یعنی نہایت مضبوط مکان بناتے تھے نہ ان کے گرنے کا اندیشہ ہوتا تھا نہ نقب زنی کا خوف، نہ دشمنوں کی طرف سے ڈھا دینے کا ڈر، یا اٰمِنِيْنَ کا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ انتہائی غفلت کی وجہ سے اللہ کے عذاب کی طرف سے بے خوف تھے ان کا خیال تھا کہ ہر طرح کے عذاب سے پہاڑوں کے اندر وہ اپنی حفاظت کر سکیں گے۔

فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِيْنَ ﴿٨٣﴾ پھر انکو بھی (عذاب کی) ایک سخت آواز نے صبح ہوتے ہی پکڑ لیا (یعنی صبح شروع ہوتے ہی عذاب آگیا)

فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٨٤﴾ سو ان کے (دنیوی) ہنر ان کے کچھ بھی کام نہیں آئے یعنی مضبوط مکانوں کی تعمیر اور مال کی فراوانی اور تعداد کی کثرت ان کو اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکی۔ ہم نے سورۂ توبہ میں غزوۂ تبوک کے بیان کے سلسلہ میں لکھ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تبوک کو جاتے ہوئے حجر میں سے گزرے تھے اور صحابہؓ سے فرمایا تھا جن لوگوں نے خود اپنے اوپر ظلم کیا تھا تم ان کے گھروں اور بستی میں داخل ہو تو روتے ہوئے جانا کہیں تم پر بھی وہ عذاب نہ آجائے جو ان پر آیا تھا حضور ﷺ اس وقت اونٹنی پر سوار تھے چادر سے منہ چھپا کر تیزی کے ساتھ اونٹنی کو دوڑاتے ہوئے وادی سے گزر گئے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۗ اور ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو درمیانی چیزوں کو بغیر مصلحت کے نہیں پیدا کیا۔ یعنی ہم نے آسمان و زمین کی تخلیق حق کے ساتھ کی ہے تاکہ صانع اور اس کی صفات پر اس سے استدلال کیا جاسکے۔ اور منکروں کے خلاف دلیل قائم ہو سکے اور ان کی جہالت کے عذر کا ازالہ ہو جائے، یا یہ مطلب ہے کہ یہ کائنات (ہم نے اس طرح صحیح بنائی ہے کہ یہ) شر اور فساد کی مقتضی نہیں ہے بلکہ حکمتِ تخلیق کا تقاضا ہے کہ ایسے مفسد اور بربادی آفریں لوگوں کو ہلاک کر دیا جائے اور ان کی فساد انگیزی کا خاتمہ کر دیا جائے۔

وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ اور بلاشبہ قیامت آنے والی ہے۔ اس روز اللہ مشرکوں اور پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے والوں سے انتقام لے گا۔

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ﴿٨٥﴾ سو آپ خوبی کے ساتھ درگذر کریں، یعنی آپ ان سے کوئی تعرض نہ کریں اور ان سے انتقام لینے کی جلدی نہ کریں۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلّٰقُ کوئی شبہ نہیں کہ آپ کا رب ہی بہت بڑا خالق ہے، اسی نے آپ کو بھی پیدا کیا اور آپ کے دشمنوں کو بھی۔ اسی کے ہاتھ میں تمام امور ہیں۔

الْعَلِيْمُ ﴿٨٦﴾ وہی (نیک و بد اور نیکوکار و بدکار کو) خوب جاننے والا ہے پس ہر ایک کو اس کے اعمال کے موافق جزا و سزا دے گا، یا یہ مطلب ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کے مخالفوں کو خوب جانتا ہے لہٰذا آپ کو اپنے تمام معاملات اسی کے سپرد کر دینا چاہئے، یا یہ مطلب ہے کہ اسی نے آپ کو پیدا کیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ آپ کے لئے کیا مناسب اور مفید ہے۔ پس اس

وقت درگذر کرنا ہی مناسب ہے آپ درگذر کیجئے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دیں جو (نماز میں) مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن عظیم دیا۔

اَلْمَثَانِیْ مَثْنَاۃٌ کی جمع ہے اور مَثْنَاۃٌ اسم ظرف ہے یا مَثْنِیَۃ کی جمع ہے اور مَثْنِیَۃ اسم فاعل ہے بہر حال اس کا موصوف محذوف ہے یعنی آیات یا سُوَر (سورتیں)

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت علیؓ، اور حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا سات مثانی سے مراد ہے سورۂ فاتحہ جس کی سات آیات ہیں۔ قتادہ، حسن بصری، عطا اور سعید بن جبیرؓ کا بھی یہی قول ہے۔ بخاری نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا امّ القرآن (سورۂ فاتحہ) سات (آیات) ہیں مثانی (نماز میں بار بار پڑھی جانے والی) اور (یہی) قرآن عظیم ہے "مثانی" کہنے کی وجوہ متعدد بیان کی گئی ہے حضرت ابن عباسؓ، حسن اور قتادہ کے نزدیک نماز میں بار بار یعنی ہر رکعت میں اس کو پڑھا جاتا ہے اس لئے مثانی کہا گیا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورتِ فاتحہ کے دو حصے ہیں نصف تو اللہ کے لئے جس میں اللہ کی ثنا کی گئی ہے اور نصف دعا ہے جو بندہ کے لئے ہے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ فرماتا ہے، میں نے (سورۂ) صلوٰۃ (یعنی سورۂ فاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندے کے لئے آدھا آدھا تقسیم کر دیا ہے اِلٰی آخر الحدیث۔ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں یہ حدیث گزر چکی ہے۔

حسین بن فضل نے وجہ تسمیہ یہ بیان کی ہے کہ سورۂ فاتحہ دو مرتبہ نازل ہوئی ایک بار مکہ شریف میں اور دوسری بار مدینہ پاک میں، ہر مرتبہ ستر ہزار فرشتے سورۂ فاتحہ کے جلو میں تھے۔ مجاہد نے کہا، مثانی کا معنی ہے منتخب، چھانٹی ہوئی۔ اللہ نے یہ سورۃ اس امت کے لئے چھانٹ کر رکھ لی تھی، کسی دوسری امت کو عطا نہیں فرمائی۔ ابو زید بلخی نے کہا ثَنَيْتُ الْعِنَانَ کا معنی ہے میں نے لگام کو پھیر دیا، موڑ دیا یہ سورۃ بھی شریروں اور بدکاروں کو بدکاری سے پھیر دیتی ہے۔ بعض نے کہا مثانی ثناء سے ہے اس سورۃ میں اللہ کی ثناء کی گئی ہے یعنی اللہ کی عظیم صفات کا بیان ہے۔

سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ سَبْعًا سے مراد ہیں سات سورتیں اور مِنَ الْمَثَانِیْ میں مِنْ بیانیہ ہے (سات سورتیں یعنی مثانی) اور سات سورتوں سے مراد سبع طِوال ہیں جن میں سب سے اول سورۂ بقرہ ہے اور انفال و توبہ کا مجموعہ ہے یہ دونوں سورتیں ایک سورت کے حکم میں ہیں اسی لئے دونوں سورتوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی جاتی، سطر خالی چھوڑ دی جاتی ہے بعض نے کہا سبع طوال میں آخری سورہ صرف سورۂ توبہ ہے۔ بعض کے نزدیک آخری سورت یونس ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے مثانی کہنے کی یہ وجہ بیان کی کہ ان ساتوں سورتوں میں فرائض، حُدود، امثال، خیر و شر اور عبرت آفریں الفاظ (و قصص) کا بار بار تذکرہ کیا گیا ہے۔[1]

یہ بھی کہا گیا ہے کہ لفظ "مثانی" ثناء سے مشتق ہے قرآن بلاغت اور اعجاز کے لحاظ سے ثناء کردہ بھی ہے اور اللہ کی صفات کو اس نے بیان بھی کیا ہے۔ اس لئے ثناء کرنے والا بھی ہے۔

محمد بن نصر نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے توریت کی جگہ مجھے سبع طوال

---

[1] حضرت عمر بن خطابؓ نے آیت لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ کے ذیل میں فرمایا یہ یعنی سبع مثانی سبع طوال و سات طویل سورتیں ہیں۔

حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ، مجاہد اور سفیان وغیرہم کی طرف بھی یہ قول منسوب ہے میں کہتا ہوں مثانی (بایں معنی) تو سارا قرآن ہے پورے قرآن میں ایک ہی قصہ بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ مفسرؒ۔

عطا فرمائی ہے اور انجیل کی جگہ الٓرٰ والی سورتیں طٰسٓ والی سورتوں تک عطا فرمائی ہیں اور زبور کی جگہ طٰسٓ سے حٰمٓ والی سورتوں تک عنایت کی ہیں اور حٰمٓ والی سورتیں مزید عطا فرمائی ہیں اور مفصّلات کو مجھ سے پہلے کسی نبی نے نہیں پڑھا (یعنی مجھے خاص طور پر مفصلات عطا فرمائی ہیں) سعید بن جبیرؓ نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو سبع طوال عطا کی گئیں (سات طویل سورتیں عطا کی گئیں) اور حضرت موسیٰؑ کو چھ عطا کی گئیں پھر جب حضرت موسیٰؑ نے تختیاں ہاتھ سے پھینک دیں تو دو سورتیں اٹھالی گئیں چار باقی رہ گئیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ سبع مثانی سے حٰمٓ والی سورتیں مراد ہیں بغوی نے اپنی سند سے حضرت ثوبانؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے توریت کی جگہ مجھے سبع طوال عطا فرمائی اور انجیل کی جگہ مئین عطا فرمائی اور زبور کی جگہ مثانی اور میرے رب نے مفصّلات مزید عنایت کیں۔

طاؤس کا قول ہے کہ مثانی سے مراد پورا قرآن ہے آیت میں آیا ہے اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ قرآن کو مثانی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں واقعات و قصص کا بیان لوٹ لوٹ کر بار بار کیا گیا ہے۔ اس قول پر مِنَ الْمَثَانِیْ میں مِنْ تبعیض کے لئے ہوگا اور سبع سے مراد سات سورتیں ہوں گی (یعنی قرآن کی سات سورتیں ہم نے تم کو دیں)

بعض کے نزدیک "مثانی" سے مراد پورا قرآن ہے اور سبع سے مراد ہیں ساتوں اجزاء (یعنی قرآن کو سات حصوں پر تقسیم کیا جائے تو ساتوں حصے یعنی پورا قرآن مراد ہے اس قول پر والقرآن العظیم کا عطف صرف اختلاف صفت کی وجہ سے ہوگا (جیسے کہا جاتا ہے زید عالم ہے اور نیک مالدار ہے اور شریف النسب ہے)

بہر حال اقوالِ مذکورہ بالا کے لحاظ سے القرآن العظیم کا عطف ایسا ہوگا جیسا کل کا اس کے جزء پر کر دیا جاتا ہے یا ایسا ہوگا جیسا عام کا خاص پر عطف ہوتا ہے۔

لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ آپ اس چیز کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں جو کہ ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو برتنے کے لئے دی ہے۔ خطاب رسول اللہ ﷺ کو ہے آنکھیں اٹھانے سے مراد ہے لالچ اور رغبت کے ساتھ نظر اٹھا کر دیکھنا۔ اَزْوَاج کا معنی ہے اصناف یعنی قسم قسم کے کافروں کو جو ہم نے دنیا کی نعمتیں عطا کی ہیں آپ ان کی طرف رغبت اور طمع کی نظر سے نہ دیکھیں۔ آپ کو جو قرآن دیا گیا ہے اس کے مقابلے میں یہ ساری نعمتیں حقیر ہیں۔ اسحاق بن راہویہ نے مسند میں حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر اللہ نے کسی کو قرآن عطا فرما دیا ہو اور کسی دوسرے شخص کو دنیا عطا کی ہو اور حاملِ قرآن مالدار کی دنیا کو اس نعمت سے بہتر خیال کرے جو اسے دی گئی ہے تو اس نے بڑی نعمت کو چھوٹی اور چھوٹی کو بڑی قرار دے دیا (یعنی نعمتِ قرآن اعلیٰ ہے اور نعمتِ دنیا ادنیٰ۔ جو شخص نعمتِ دنیا کو نعمتِ قرآن پر ترجیح دے اس نے ادنیٰ کو اعلیٰ اور اعلیٰ کو ادنیٰ بنا دیا)

بغوی نے لکھا ہے کہ حدیث لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْاٰنِ کا مطلب سفیان بن عُیینہ نے یہ بیان کیا ہے کہ جو شخص قرآن کی نعمت پا کر (ساری دنیا کی دولت سے) بے نیاز نہ ہو جائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

بخاری اور بیہقی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے اور امام احمد و ابوداؤد، و ابن حبان و حاکم نے حضرت سعدؓ کی روایت سے اور ابوداؤد ابولبابہ کی وساطت سے عبدالمنذر کی روایت سے اور حاکم نے حضرت ابن عباسؓ و حضرت عائشہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی فاجر کی نعمت پر رشک نہ کرو اللہ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو (کبھی) نہیں مرے گا۔ بغوی کی روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں، کسی فاجر پر (اس کی) نعمت کی وجہ سے رشک نہ کرو تم کو نہیں معلوم کہ مرنے کے بعد اس کو کیا پیش آئے گا اللہ کے ہاں اس کا قاتل موجود ہے جو (کبھی) نہیں مرے گا۔ وہب بن منبہ کو جب اس حدیث کی اطلاع پہنچی تو انہوں نے ابوداؤد اعور کو بھیج کر دریافت کرایا کہ نہ مرنے والے قاتل کا کیا مطلب ہے۔ عبداللہ بن مریم نے کہا، اس سے مراد ہے دوزخ۔ امام احمد، مسلم، ترمذی، ابن ماجہ اور بغوی نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

اپنے سے نیچے والے کو دیکھو اوپر والے کو نہ دیکھو اللہ کی جو نعمت تم کو حاصل ہے اس کو حقیر نہ سمجھنے کے لئے یہی (تدبیر) زیادہ مناسب ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ اور کافروں کا کچھ غم نہ کیجئے کہ یہ ایمان نہیں لائے یا یہ مطلب ہے کہ تم کو جو کافروں کی طرح دنیا نہیں ملی اس کی وجہ سے کافر کی نعمت پر کچھ رنج نہ کرو۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ اور مسلمانوں پر شفقت رکھیے۔ یعنی مؤمنوں سے نرمی کیجئے ان کے ساتھ رحم کا برتاؤ رکھیے۔

وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾ اور (کافروں سے) کہہ دو کہ میں واضح طور پر (تم کو اللہ کی نافرمانی اور عذاب سے) ڈرانے والا ہوں کھول کھول کر واضح دلائل کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ تم ایمان نہ لائے تو اللہ کا عذاب تم پر آجائے گا۔

كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿۹۰﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿۹۱﴾ (ایسا ہی عذاب) جیسا عذاب ہم نے ان لوگوں پر نازل کیا جنہوں نے حصے کر رکھے تھے یعنی آسمانی کتاب کے مختلف اجزاء قرار دیئے تھے (بعض حصوں کو مانتے تھے اور بعض کو نہیں مانتے تھے تم پر بھی نازل کریں گے)۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ اَلْمُقْتَسِمِيْنَ سے مراد ہیں یہودی اور عیسائی۔ طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا آیت كَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ (میں مُقْتَسِمِيْنَ) سے مراد کیا ہے فرمایا، یہودی اور عیسائی۔ سائل نے دریافت کیا عِضِيْنَ کا کیا مطلب ہے فرمایا، بعض حصہ پر ایمان لائے بعض کا انکار کر دیا۔

عضین عِضَةٌ کی جمع ہے عضة کا معنی ہے ٹکڑا، ایک پارہ (قاموس) عِضَةٌ کی اصل عِضْوَةٌ تھی۔ عَضَيَ الشَّاةَ اُس نے بکری کے اعضاء جدا جدا کر دیئے۔ یہود و نصاریٰ نے بھی قرآن کے دو ٹکڑے کر دیئے تھے ایک کو حق اور دوسرے کو باطل کہتے تھے۔ جس کو حق کہتے تھے اس کے متعلق کہتے تھے یہ توریت و انجیل کے موافق ہے ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں اور جس حصہ کو باطل قرار دیتے تھے اس کے متعلق کہتے تھے، یہ توریت و انجیل کے خلاف ہے اس لئے غلط ہے یہ بھی کہا گیا ہے کہ بعض اہلِ کتاب بطورِ استہزاء کہتے تھے سورۂ بقرہ میری ہے، دوسرا کہتا تھا آلِ عمران میری ہے۔

مجاہد نے کہا، المُقْتَسِمِین سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور قرآن سے مراد وہ (عیسائی مذہب کی) کی کتابیں ہیں جو اہلِ کتاب پڑھتے تھے یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی کتاب کو پہچان تو لیا تھا (یعنی اقرار تو کرتے تھے) مگر اس کو چھوڑ دیا تھا۔

بعض علماء نے کہا المُقْتَسِمِین سے مراد ہیں قرآن کے متعلق مختلف خیالات رکھنے والے کافر کوئی قرآن کو جادو کہتا تھا کوئی شاعری کوئی کہانت اور کوئی داستانِ پارینہ۔

بعض علماء کا قول ہے کہ اِقْتِسَام سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق ان کے اقوال بٹے ہوئے تھے کوئی آپ کو جادوگر کہتا تھا، کوئی شاعر، کوئی کاہن۔

مقاتل کی روایت ہے کہ حج کے زمانہ میں ولید بن مغیرہ نے سولہ آدمی مکہ کی گھاٹیوں، مختلف راستوں اور موریوں پر اس غرض سے مقرر کر دیئے تھے کہ جو کوئی باہر سے محمد ﷺ کے پاس آئے اس سے کہہ دیں کہ تم اس کے فریب میں نہ آجانا مقرر کردہ لوگوں میں سے کچھ لوگ تو کہیں یہ شخص دیوانہ ہے، کچھ کہیں کاہن ہے، کچھ شاعر کہیں۔ خود ولید کعبہ کے دروازے پر جا کر بیٹھ گیا تھا جب اس سے دریافت کیا گیا کہ کچھ لوگ ساحر، کچھ شاعر، کچھ مجنون کہتے ہیں تمہارا کیا فیصلہ ہے، ولید نے کہا یہ سب باتیں ٹھیک ہیں سب لوگ سچ کہتے ہیں۔

اب اگر مُقْتَسِمِین سے مراد یہودی لئے جائیں تو اللہ کی طرف سے جو عذاب ان پر آیا وہ بنی قریظہ کے قتل اور بنی نضیر

کے ملک بدر کئے جانے کی صورت میں نمودار ہوا اور اگر مُقتسِمین سے مراد قریش (ولید کے مقرر کئے ہوئے اشخاص) ہوں تو بدر کی شکست کی شکل میں ان پر اللہ کا عذاب آیا، بعض اہل تفسیر کے نزدیک مُقتسِمین سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے حضرت صالحؑ کو رات میں قتل کر دینے کا مشورہ کیا تھا اور اس پر قسمیں کھائی تھیں (اس صورت میں المُقتسِمین کا ترجمہ ہوگا، قسمیں کھانے والے)

بعض اہلِ لغت نے لکھا ہے کہ عِضِیْن عِضَۃٌ کی جمع ہے اور عِضَۃٌ کی اصل عِضْھَۃٌ تھی جیسے شَفَۃٌ اصل میں شَفْھَۃٌ تھا عِضْھَۃٌ جھوٹ اور بہتان کو کہتے ہیں صاحبِ قاموس نے عِضَۃٌ کا معنی کذب لکھا ہے حدیثِ بیعت میں آیا ہے کہ اِیَّاکُمْ وَالْعِضَۃَ بہتان تراشی سے بچو۔ زمخشری نے کہا کہ عِضَۃٌ اصل میں عِضْھَۃٌ بروزن فِعْلَۃٌ تھا اور عِضْھَۃٌ کا معنی ہے بہتان۔ کذا فی النہایۃ للجزری۔

بعض اہلِ لغت کا قول ہے کہ اَلْعِضَۃُ کا معنی ہے جادو صاحبِ قاموس نے لکھا ہے کہ العضون بمعنی جادو یہ عِضْھَۃٌ کی جمع ہے۔

ایک حدیث میں آیا ہے لَعَنَ اللّٰہُ الْعَاضِھَۃَ وَالْمُسْتَعْضِھَۃَ جادو کرنے والی اور جادو کرانے والی پر اللہ کی لعنت (النہایۃ) یہ بھی ممکن ہے کہ کَمَا اَنْزَلْنَا کا تعلق وَلَقَدْ اٰتَیْنٰکَ سے ہو اور اٰتَیْنَا کا معنی ہو اَنْزَلْنَا اور اَنْزَلْنَا عَلَی الْمُقْتَسِمِیْنَ سے مراد (عذاب نازل کرنا نہ ہو بلکہ) توریت وانجیل نازل کرنا ہو۔ مطلب اس طرح ہوگا ہم نے آپ پر سبع مثانی نازل کیں جیسے یہود و نصاریٰ پر توریت وانجیل اُتاری۔

اس صورت میں آیت لَا تَمُدَّنَّ سے آخر آیت تک جملہ معترضہ ہوگی۔ اور اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِیْنَ المُقتَسِمِین کی صفت ہوگی۔ لیکن اگر المُقتَسِمِین سے مراد وہ لوگ ہوں جنہوں نے صالحؑ کو قتل کرنے کا باہم مشورہ کیا تھا تو اَلّذین جعلوا مبتدا ہوگا اور آئندہ آیت خبر۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹۲﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾ پس قسم ہے آپ کے رب کی (یعنی ہم کو اپنی ذات کی) کہ ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور بازپرس کریں گے۔ اعمال میں گناہ بھی داخل ہیں اور کفر بھی اور قرآن کی تکذیب بھی اور اس کو جادو قرار دینا بھی سوال کرنے سے مراد یہ ہے کہ ہم ان سے بازپرس کریں گے اور ان کو ان کے کئے کی سزا بھی دیں گے۔

بغوی نے محمد بن اسماعیل بخاریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ متعدد علماء کے نزدیک عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ سے مراد ہے لا الٰہ الا اللہ (یعنی لا الٰہ الا اللہ کی ہم ان سے بازپرس کریں گے)

ترمذی، ابن جریر، ابن ابی حاتم، اور ابن مردویہ نے حضرت انسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اس آیت کے ذیل میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم ان سے بازپرس کریں گے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کے متعلق۔

مسلم نے حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (پل) صراط سے کسی بندہ کے قدم اس وقت تک نہیں ہٹیں گے (یعنی کوئی شخص اس وقت تک پل صراط سے پار نہیں ہوگا) جب تک اس سے چار باتیں نہ پوچھ لی جائیں گی۔ اس وقت سوال کیا جائے گا عمر کے متعلق کہ کس کام میں ختم کی اور (سوال ہرگا) جسم کے متعلق کہ کس کام میں اس کو پرانا کیا (یعنی جسمانی طاقتیں کس کس کام میں صرف کیں) اور (سوال ہوگا) علم کے متعلق کہ علم کے بعد کیا عمل کیا اور (سوال ہوگا) مال کے متعلق کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ ترمذی اور ابن مردویہ نے حدیث اسی طرح حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کی ہے۔

اصبہانی نے ترغیب میں اور طبرانی نے (الاوسط میں) حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، علم (سکھانے) میں باہم خیر خواہی سے کام لو، کوئی کسی سے علم پوشیدہ نہ رکھے، علم میں خیانت کرنا مال میں خیانت کرنے

سے زیادہ سخت ہے۔ اللہ اس کی بھی تم سے ضرور باز پُرس کرے گا۔

ابو نعیم نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، بندہ جو قدم بھی (کسی مقصد کے لئے) اٹھاتا ہے اللہ اس مقصد کی اس سے ضرور باز پُرس کرے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو شخص لوگوں کی امامت کرے اس کو اللہ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور یہ جان لینا چاہئے کہ وہ (مقتدیوں کا) ذمہ دار ہے۔ اور اس ذمہ داری کے متعلق اس سے باز پُرس ہو گی اگر اس نے امامت اچھی (طرح، صحیح) کی ہو گی تو اس کو پیچھے والوں کے ثواب کے برابر ثواب ملے گا اور اگر کچھ کمی ہو گی (یعنی نماز میں کچھ نقص ہوا ہو گا) تو اس کا گناہ بھی امام پر پڑے گا۔ ابو نعیم نے حلیہ میں اور ابن ابی حاتم نے حضرت معاذ بن جبلؓ کی روایت سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، معاذ مؤمن سے قیامت کے دن اس کے تمام کاموں کی باز پُرس ہو گی یہاں تک کہ آنکھوں میں سُرمہ (لگانے) کے متعلق بھی سوال کیا جائے گا۔

بیہقی اور ابن ابی الدنیا نے حسن کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جو بندہ کوئی خطبہ دیتا ہے اللہ اس سے اس خطبہ اور خطبہ کی اصل مراد کے متعلق ضرور باز پُرس کرے گا۔ یہ حدیث مرسل ہے (حسن بصریؒ تابعی ہیں صحابی کا نام روایت میں نہیں ہے)

ابن ابی حاتم نے انفع بن عبداللہ کلاعی کا قول نقل کیا ہے کہ جہنم کے سات پُل ہیں اور صراط ان کے اوپر ہے۔ تمام مخلوق کو پہلے پل پر روک لیا جائے گا حکم ہو گا ان کو ٹھہرا لو، ان سے باز پرس کی جائے گی، یہاں نماز کی حساب فہمی اور باز پرس ہو گی ہلاک ہونے والا ہلاک ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا، دوسرے پل پر پہنچیں گے تو امانت کی بابت سوال ہو گا کہ کیسے ادا کی اور کیسے اس میں خیانت کی یہاں بھی تباہ ہونے والا تباہ ہو جائے گا اور نجات پانے والا نجات پا جائے گا، پھر تیسرے پل پر پہنچیں گے تو رشتہ داری کے متعلق سوال کیا جائے گا کہ سلسلۂ قرابت کو جوڑا یا توڑا۔ یہاں بھی مرنے والا مرے گا اور بچنے والا بچ جائے گا رحم اس روز نیچے کی طرف آویختہ ہو گا اور عرض کرے گا اے اللہ جس نے مجھے ملائے رکھا ہو تو بھی اس کو اپنے سے ملا لے اور جس نے مجھے توڑا ہو تو بھی اس سے قطع تعلق کر لے۔

ابن ماجہ نے حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان نقل کیا ہے حضرت ابو سعیدؓ نے فرمایا میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے قیامت کے دن اللہ بندہ سے سوالات کرے گا یہاں تک کہ فرمائے گا جب تو نے بری بات دیکھی تو اس کا رد کیوں نہیں کیا۔ اس وقت اللہ خود اس کے دل میں صحیح جواب ڈال دے گا۔ بندہ عرض کرے گا، میرے رب میں تجھ سے امید لگائے ہوئے تھا اور لوگوں سے مجھے ڈر تھا (اس لئے خاموش رہا اور اس کام کو دل سے بُرا جانتا رہا)

صحیحین میں حضرت ابن عمرؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک (ذمہ دار) نگراں ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق باز پرس اس سے کی جائے گی حاکم سب لوگوں کا ذمہ دار اور نگراں ہے اس سے اس کی رعیت کی باز پرس کی جائے گی۔ مرد اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے۔ اس سے گھر والوں کے متعلق باز پرس ہو گی عورت اپنے شوہر کے گھر والوں کی اور اس کے بچوں کی ذمہ دار ہو گی اس سے (اس کے حلقۂ اثر مال کے متعلق باز پرس ہو گی۔ غلام (یعنی خادم) اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس سے آقا کے مال کے متعلق باز پرس ہو گی غرض تم میں سے ہر ایک نگراں (یعنی ذمہ دار) ہے اور جس کی نگرانی اس کے سپرد ہے اس کے متعلق اس سے باز پرس ہو گی اس موضوع کی احادیث حضرت انسؓ کی روایت سے ابن حبان، ابو نعیم اور طبرانی نے بھی بیان کی ہیں۔

طبرانی نے الکبیر میں حضرت مقدامؓ کی روایت سے نقل کیا ہے حضرت مقدامؓ نے فرمایا، میں نے خود رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ ﷺ فرما رہے تھے جو شخص بھی کسی قوم پر (مسلط، پیشوا، حاکم، لیڈر وغیرہ) ہو گا قیامت کے دن وہ اس قوم کے آگے آگے جھنڈا اٹھائے ہو گا اور وہ) لوگ اس کے پیچھے ہوں گے۔ قوم کے متعلق اس سے باز پرس کی جائے گی اور قوم والوں سے اس

کی بابت پوچھا جائے گا۔
طبرانی نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو امیر دس آدمیوں کا بھی حاکم ہو گا قیامت کے دن اس سے اس کے ماتحتوں کے متعلق بازپرس ہو گی (سوال کے سلسلہ کی احادیث بکثرت آئی ہیں)
ایک شبہ: آیت لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اور اس کے ہم معنی احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک سے اس کے اعمال کی بازپرس ضرور ہو گی لیکن آیت فَيَوْمَئِذٍ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ سے سوال کی نفی ہوتی ہے بظاہر دونوں میں تضاد ہے۔

ازالہ

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا یہ سوال نہ ہو گا کہ تم نے یہ عمل کیا یا نہیں۔ اللہ کو اس سوال کی ضرورت نہیں اس کو کسی عمل کے کرنے نہ کرنے کا کامل علم ہے بلکہ بازپرس اس بات کی ہو گی کہ تم نے ایسا کیوں کیا۔
بیہقی نے ابو طلحہ کی سند سے بھی حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ قطرب نے اس پر اعتماد کرتے ہوئے کہا ہے کہ سوال کی دو قسمیں ہیں:
(۱) علم حاصل کرنے کے لئے جس کو استفہامیہ سوال کہا جاتا ہے۔
(۲) زجرو توبیخ کے لئے۔ لَا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْبِهٖ میں استفہامیہ سوال کی نفی کی گئی ہے اور لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ میں زجرو توبیخ کے لئے سوال کرنے کی صراحت کی ہے۔ عکرمہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، قیامت کا دن بہت طویل ہو گا جس میں متعدد مواقف راہ اور رو کے جانے کے مقامات ہوں گے بعض مقامات پر اعمال کی بازپرس ہو گی بعض مقامات پر کوئی سوال نہ ہو گا۔ یہی تاویل ان آیات کی ہے جن میں بولنے اور نہ بولنے کا تضاد معلوم ہوتا ہے ایک آیت ہے هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ یہ ایسا دن ہو گا کہ لوگ کچھ نہ بول سکیں گے دوسری آیت ہے يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ قیامت کے دن تم رب کے پاس جھگڑا کرو گے (کذا اخرج الحاکم)
فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ جو آپ کو حکم دیا جا رہا ہے اس کو علی الاعلان بیان کر دیجئے۔
حضرت ابن عباسؓ نے اِصْدَعْ کا ترجمہ کیا ہے ظاہر کر دو اللہ نے اپنے رسول ﷺ کو اظہارِ دعوت کا حکم دیا ہے۔ عبد اللہ بن عبیدہؓ کی روایت میں آیا ہے کہ اس آیت کے نزول سے پہلے رسول اللہ ﷺ اسلام وایمان کی دعوت پوشیدہ طور پر دیا کرتے تھے۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ اور آپ کے ساتھی کھل کر سامنے آ گئے۔ حضرت ابن عباسؓ کا ایک قول یہ بھی آیا ہے کہ اِصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ کا ترجمہ ہے "دعوت جاری رکھو"۔ ضحاک نے ترجمہ کیا "اطلاع دے دو اعلان کر دو"۔ اخفش نے کہا قرآن کے ذریعہ سے حق کو باطل سے جدا کر دو۔ سیبویہ نے کہا جیسا تم کو حکم دیا جا رہا ہے اسی کے موافق فیصلہ کرو۔ لغت میں صَدْعٌ کا معنی ہے الگ الگ کر دینا (پھاڑ دینا) جدا جدا کر دینا۔ فصل کر دینا (لغوی معنی کی مناسبت سے علماء نے مرادی معنی جدا جدا بیان کئے ہیں) وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۴﴾
اور مشرکوں کی طرف کوئی توجہ نہ کرو (یعنی مشرکوں کی پروانہ کرو مترجم) بعض علماء نے کہا آیتِ قتال سے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔
اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿۹۵﴾ یہ لوگ (جو آپ پر) استہزاء کرتے ہیں ان سے نمٹنے کے لئے ہم کافی ہیں یعنی ان کی جڑ اکھاڑ دیں گے ان کو تباہ کر دیں گے۔ بغوی نے لکھا ہے اللہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ تم اللہ کا حکم پکار کر سناؤ۔ اللہ کے سوا کسی سے مت ڈرو۔ تمہارے لئے اللہ کافی ہے مذاق اڑانے والوں اور تم سے ٹھٹھول کرنے والوں کے مقابلے میں بھی اللہ نے تمہاری مدد کی۔ رسول اللہ ﷺ سے استہزاء کرنے والے اور آپ کی ہنسی اڑانے والے قریش کے پندرہ سردار تھے۔ (۱) ولید بن مغیرہ مخزومی یہ سب کا سرگروہ تھا۔ (۲) عاص بن وائل سہمی۔ (۳) اسود بن مطلب بن حارث بن اسد بن عبد العزیٰ رسول

اللہ ﷺ نے اس کو بددعا دی تھی اور فرمایا تھا اے اللہ اس کو اندھا کر دے اس کو لاولد کر دے۔ (۴) اسود بن عبدیغوث بن وہب بن مناف بن زہرہ (۵) حارث بن قیس بن الطلالہ۔ رسول اللہ ﷺ سے استہزاء کرنیوالے کعبہ کا طواف کر رہے ہیں۔ ولید بن مغیرہ آپ کی طرف سے گزرا اتنے میں جبرئیل آ گئے اور رسول اللہ ﷺ کے پہلو کھڑے ہو گئے اور کہا محمد تمہارے نزدیک یہ کیسا ہے رسول اللہ نے جواب دیا برُا بندہ ہے جبرئیل نے کہا آپ کا کام اللہ کی طرف سے پورا کر دیا گیا پھر جبرئیل نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا چنانچہ ایک روز ولید کسی خزاعی آدمی کی طرف سے ہو کر نکلا وہ شخص اپنے تیروں کے پر ٹھیک کر رہا تھا ولید اس وقت یمنی چادر اوڑھے (غرور سے) تہبند زمین میں کھینچتا ہوا چل رہا تھا۔ خزاعی شخص کے تیر کی بوری ولید کے تہبند سے الجھ گئی انتہائی غرور کی وجہ سے نیچے جھک کر بوری کو تہبند سے نکالنا گوارا نہ کیا اور زور سے اپنی پنڈلی کو دے پٹکا۔ بوری سے پنڈلی میں خراش لگ گئی اور اسی خراش سے یہ مر گیا۔ عاص بن وائل بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گزرا اور جبرئیلؑ نے دریافت کیا تھا یہ کیسا آدمی تھا رسول اللہ ﷺ نے جواب دیا تھا بُرا بندہ ہے۔ جبرئیلؑ نے عاص کے پاؤں کے تلووں کی طرف اشارہ کر کے کہا آپ کا کام ہو گیا (اب آپ کو اس کے مقابلے میں کچھ نہیں کرنا پڑے گا) چنانچہ ایک روز عاص تفریح کر کے لئے اونٹنی پر سوار ہو کر اپنے دونوں لڑکوں کو ساتھ لے کر مکہ سے باہر نکلا اور کسی گھاٹی پر جا کر اترا وہاں کپڑے کا کوئی ٹکڑا تھا عاص نے اس پر قدم رکھا کپڑے میں کوئی کانٹا تھا کانٹا اس کے تلوے میں چبھ گیا عاص فوراً چلایا مجھے کسی کیڑے نے ڈس لیا، لوگوں نے تلوے کو دیکھا لیکن ڈھونڈھنے کے بعد کوئی چیز نظر نہ آئی، ٹانگ سوج کر اونٹ کی گردن کی طرح ہو گئی آخر وہیں اسی وقت مر گیا۔

اسود بن مطلب بھی (جبرئیلؑ کی موجودگی میں) رسول اللہ ﷺ کی طرف سے گذرا اور جبرئیل کے سوال وجواب میں حضور ﷺ نے فرمایا تھا یہ برا بندہ ہے اور جبرئیل نے حسب سابق کہا آپ کا کام کر دیا گیا اور اس کی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا تھا چنانچہ اسود نابینا ہو گیا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جبرئیلؑ نے ایک سبز پتہ اسود پر مارا تھا جس سے اس کی نگاہ جاتی رہی اور آنکھوں میں اتنا درد ہوا کہ دیوار سے سر پٹکنے لگا آخر اسی میں مر گیا۔ کلبی کی روایت میں آیا ہے کہ اسود اپنے غلام کے ساتھ کسی درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا ہوا تھا جبرئیل وہاں پہنچ گئے۔ اور اس کا سر پکڑ کر درخت سے ٹکرانے اور منہ پر کانٹے مارنے لگے۔ اسود نے واویلا مچادی اور غلام سے مدد کا خواستگار ہوا۔ غلام نے کہا، مجھے تو اور کوئی نظر نہیں آتا آپ خود ہی یہ حرکت کر رہے ہیں۔ کہنے لگا، مجھے محمدؐ کے رب نے قتل کر دیا' یہ لفظ کہتے کہتے مر گیا۔ اسود بن عبدیغوث بھی گذرا تھا اور جبرئیلؑ کے سوال کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا، یہ بُرا بندہ ہے باوجودیکہ میرے ماموں کا بیٹا ہے جبرئیلؑ نے کہا اب آپ کو (اس کی دفاع کی) کوئی ضرورت نہیں یہ کہتے ہوئے اسود کے پیٹ کی طرف اشارہ کیا تھا جس سے اس کو استسقاء بطن ہو گیا اور مر گیا کلبی کی روایت میں آیا ہے کہ اسود (ایک روز) گھر سے نکلا، باہر لو لگ گئی لو لگنے سے اس کا رنگ (جل کر) کالے حبشی کی طرح ہو گیا گھر کو لوٹا تو گھر والوں نے اسے پہچانا بھی نہیں اور باہر نکال کر دروازہ بند کر لیا اسی حالت میں وہ مر گیا اور مرتے مرتے کہتا رہا، مجھے محمدؐ کے رب نے قتل کیا ہے۔

حارث بن قیس کے متعلق بھی رسول اللہ ﷺ نے جبرئیلؑ سے کہا تھا یہ برا بندہ ہے۔ جبرئیلؑ نے حارث کے سر کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا آپ کا کام کر دیا گا اب آپ کو ضرورت نہیں چنانچہ اس کی ناک سے پیپ کی ریزش ہونے لگی اسی سے مر گیا حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، حارث بن قیس نے نمکین مچھلی کھائی تھی جس سے پیاس کی شدت ہو گئی اور برابر پانی پیتا رہا، آخر پیٹ پھٹ گیا اور مر گیا آیت اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ کا مطلب یہی ہے جو آپ کے ساتھ اور قرآن کے ساتھ استہزاء کرتے تھے ہم نے (ان کے شر سے آپ کو محفوظ رکھا اور) آپ کی طرف سے ان کا کام تمام کر دیا۔

طبرانی، ابو نعیم اور بیہقی نے (دلائل میں) حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ (رسول اللہ ﷺ کی ہنسی بنانے والے) پانچ قریشی سردار تھے ولید بن مغیرہ، عاص بن وائل، عدی بن قیس، اسود بن عبدیغوث او اسود بن مطلب۔ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کو دکھ پہنچانے اور آپ کا مذاق اڑانے میں بہت آگے بڑھ چکے تھے حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں آپ کی طرف سے ان کا کام تمام کر دوں۔ چنانچہ جبرئیلؑ نے ولید کی پنڈلی کی طرف اشارہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کوئی شخص تیر درست کر رہا تھا ولید ادھر سے گذرا اور اس کا کپڑا تیر سے الجھ گیا۔ اس نے غرور کی وجہ سے جھک کر

تیر نہیں نکالا آخر تیر کی بوری کسی رگ میں لگ گئی اور اسی زخم سے وہ مر گیا حضرت جبرئیلؑ نے عاص کے تلوے کی طرف اشارہ کیا تھا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تلوے میں کوئی کانٹا چبھ گیا ٹانگ سوج کر چکی کی طرح ہو گئی اور وہ مر گیا۔ عدی بن قیس کی ناک کی طرف اشارہ کیا ناک سے پیپ بہنے لگی اور اسی سے اس کا انتقال ہو گیا اسود بن عبد یغوث کے سر کی طرف اشارہ کیا تھا ایک روز یہ شخص کسی درخت کی جڑ کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ سر کو درخت سے ٹکرانے اور منہ کو کانٹوں (والی ٹہنی) سے پیٹنے لگا آخر مر گیا اسود بن مطلب کی آنکھوں کی جانب اشارہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ اندھا ہو گیا۔

بزار اور طبرانی نے حضرت انس بن مالکؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کچھ لوگوں کی طرف سے گذرے ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی پشت کی طرف طعن آمیز اشارہ کر کے کہا یہی وہ شخص ہے جو اپنے کو نبی کہتا ہے اس وقت جبرئیلؑ حضور ﷺ کے ساتھ تھے جبرئیلؑ نے ان کی طرف اشارہ کیا جس کی وجہ سے ناخن کے نشان کی طرح ان کے جسموں پر نشان ہو گیا آخر وہ نشان پھوڑا بن گیا اور سڑ گیا اور ایسا سڑ گیا کہ کوئی پاس بھی نہیں جاتا تھا انہیں لوگوں کے متعلق آیت اِنَّا کَفَیۡنٰکَ الۡمُسۡتَہۡزِءِیۡنَ نازل فرمائی۔

الَّذِیۡنَ یَجۡعَلُوۡنَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ ۚ فَسَوۡفَ یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۹۶﴾ جو اللہ کے ساتھ دوسرے معبود (کو شریک) قرار دیتے ہیں یقیناً انکو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا انجام کار کیا ہوا۔

وَ لَقَدۡ نَعۡلَمُ اَنَّکَ یَضِیۡقُ صَدۡرُکَ بِمَا یَقُوۡلُوۡنَ ﴿۹۷﴾ اور ہم یقیناً واقف ہیں کہ ان کے قول سے آپ کے دل کو کوفت ہوتی ہے یعنی آپ کے سینہ میں غصہ کا ابال ہوتا ہے اور آپ اس کو پورا نہیں کر سکتے۔

فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ آپ اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے رہیں۔ یعنی ہر چیز سے دل کو خالی کر کے اللہ کی حمد و تسبیح (اللہ کی پاکی کے) اعتراف و اظہار میں مشغول ہو جایئے اللہ آپ کی کارسازی کرے گا۔ حمد و تسبیح میں مشغول ہونے سے دل کو کوفت اور سینہ کی بندش دور ہو جائے گی اور شدتِ غضب جاتی رہے گی یا یہ مطلب ہے کہ ان کے (مشرکانہ اور کافرانہ) اقوال سے اللہ کے پاک ہونے کا اظہار کیجئے اور اسی کے ساتھ اللہ کا شکر کیجئے کہ اللہ نے حق کا راستہ آپ کو دکھا دیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے (تسبیح و حمد سے مراد لی ہے نماز اور آیت کی تشریح میں) فرمایا آپ اپنے رب کے حکم کے موافق نماز پڑھیئے۔

وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ ﴿۹۸﴾ اور نماز پڑھنے والوں میں رہیں۔ ساجدین سے مراد ہیں تواضع اور اظہار فروتنی کرنے والے۔ ضحاک کے نزدیک نماز پڑھنے والے مراد ہیں۔ امام احمد، ابوداؤد، ابن جریر نے حضرت حذیفہ بن یمانؓ کے بھائی حضرت عبدالعزیز کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کوئی امرِ ثقیل پیش آتا تھا تو آپ (گھبرا کر) نماز کی طرف رجوع کرتے تھے۔

وَ اعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ ﴿٪۹۹﴾ اور وقت موت آنے تک اپنے رب کی عبادت کرتے رہیں۔ یقین سے مراد ہے موت۔ ہر زندہ کے لئے موت کا آنا یقینی ہے یعنی جب تک آپ زندہ ہیں۔ رب کی عبادت میں مشغول رہیں، عبادت کو ترک نہ کریں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کا قول بھی اسی مضمون کا نقل فرمایا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا: اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ وَ الزَّکٰوۃِ مَا دُمۡتُ حَیًّا۔

بغوی وغیرہ نے حضرت جبیر بن نضیرؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے مال جمع کرنے اور تاجر بن جانے کا حکم بذریعۂ وحی نہیں دیا گیا بلکہ میرے پاس تو وحی بھیجی گئی کہ سَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَ کُنۡ مِّنَ السّٰجِدِیۡنَ وَ اعۡبُدۡ رَبَّکَ حَتّٰی یَاۡتِیَکَ الۡیَقِیۡنُ۔ حضرت عمرؓ راوی ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو مینڈھے کی کھال اوڑھے اور اسی کا نطاق باندھے سامنے سے آتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا اس کو دیکھو اللہ نے اس کے دل کو نورانی کر دیا میں نے وہ وقت بھی اس کا دیکھا تھا کہ اس کے ماں باپ اس کو اعلیٰ قسم کی غذا کھلاتے پلاتے تھے۔ ایک جوڑا اس کے بدن پر دو سو درہم کا تھا۔ لیکن اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت نے اس کی یہ حالت کر دی جو تمہارے سامنے ہے۔

(۲۶ ربیع الثانی ۱۲۰۲ھ کو سورۃ الحجر کی تفسیر ختم ہوئی بحمد اللہ)
(۱۹ شعبان ۱۳۸۷ھ کو صبح چار بجے اس سورت کا ترجمہ ختم ہوا)

سُوْرَةُ النَّحْلِ

اس سورۃ کی ۱۲۸ آیات ہیں اور آخری تین آیات کو چھوڑ کر باقی سورت مکّی ہے۔ ابن اسحاق و ابن جریر نے عطاء بن یسارؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اس سورت کے آخر کی تین آیات تو مدینہ میں جنگ اُحد کے بعد نازل ہوئی تھیں باقی سورت مکّہ میں نازل ہوئی۔ جنگِ اُحد میں حضرت حمزہؓ شہید ہو گئے تھے اور کافروں نے آپ کو مُثلہ بھی کیا تھا اور (شدتِ غضب میں) حضور ﷺ نے فرمایا تھا اگر ہم ان پر غالب آئے تو ہم بھی ان کو ایسا مُثلہ کریں گے کہ کسی عرب نے کسی عرب کو نہیں کیا ہو گا۔ اسی پر اللہ نے آیت وَاِنْ عَاقَبْتُمْ نازل فرمائی۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ اللہ کا حکم آپہنچا۔ یعنی قریب آگیا ابن عرفہ نے کہا جس چیز کی (یقینی) توقّع ہو، عرب اس کے لئے کہتے ہیں وہ چیز ہو گئی۔ آیت میں امر الٰہی کے قریبُ الوقوع یا یقینی الوقوع ہونے کی وجہ سے مجازاً ماضی کا صیغہ استعمال کیا جو بات آئندہ یقینی طور پر ہونے والی ہو اور اسکا ہونا لازم ہو اس کو بصیغۂ ماضی بیان کر دیتے ہیں (صیغۂ ماضی سے اشارہ اس امر کی طرف ہوتا ہے کہ یہ کام ضرور ہو گا اور عنقریب ہو گا مترجم) امر اللہ" سے مراد ہے قیامت کا آنا (کلبی وغیرہ) مراد یہ ہے کہ قیامت کا آنا ضروری ہے تم اس کا یقین رکھو اور یہ سمجھو کہ گویا آگئی اس لئے تیاری کرو۔

فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ط اس کے جلد آجانے کی مانگ نہ کرو (وہ تو بہر حال آئے گی اور تمہارے لئے اس کے آنے میں کوئی فائدہ نہ ہو گا اس لئے جلد آنے کی خواہش تمہارے لئے ضرر رساں ہے)

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ جب آیت اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ نازل ہوئی تو بعض کافروں نے کہا یہ شخص کہتا ہے کہ پچھلی گھڑی قریب آگئی اچھا تم (کچھ دنوں کے لئے) اپنے موجودہ مشاغل و اعمال ترک کر دو ہم بھی تو دیکھیں کہ آخر کیا ہونے والا ہے لیکن جب کچھ مدّت تک انتظار کرنے کے بعد بھی کچھ نہ ہوا (اور قیامت نہ آئی) تو کہنے لگے تم جس چیز سے ہم کو ڈرا رہے ہو اسکا تو نام و نشان بھی نہیں پیدا ہوا اس پر آیت اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ نازل ہوئی۔ یہ آیت سن کر کافر خوف زدہ ہو گئے اور کچھ مدّت تک مزید انتظار کیا لیکن طویل انتظار کے بعد بھی جب کچھ نہ ہوا تو کہنے لگے محمد! تم ہم کو ڈراتے ہو اور ہوا کچھ بھی نہیں ہے اس وقت اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ نازل ہوا۔ اس جملہ کے نزول پر رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے اُچھل پڑے اور لوگوں نے اپنے سر اوپر اٹھا کر دیکھا اور خیال کیا کہ قیامت حقیقت میں آہی گئی اس پر (آخری فقرہ) فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوا اس وقت لوگوں کو اطمینان ہوا اور (گھبراہٹ رفع ہوئی)

ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اَتٰٓى اَمْرُ اللّٰهِ نازل ہوا تو صحابہ خوف زدہ ہو گئے اس پر فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ نازل ہوا۔ اِسْتِعْجَال کا معنی ہے وقت سے پہلے کسی چیز کی طلب۔ بغوی نے لکھا ہے کہ جب یہ آیت نازل

ہوئی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (سبّابہ اور وُسطیٰ) سے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، میں اور قیامت ان دونوں کی طرح (متصل) بھیجے گئے ہیں (شاید حضور ﷺ کی یہ مراد ہو کہ میرے بعد قیامت تک اور کوئی پیغمبر نہیں آئے گا اور میری نبوّت کا دور قیامت تک باقی رہے گا۔ مترجم)

ترمذی نے حضرت مستورد بن شدادؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے عین قیامت کے وقت میں ہی بھیجا گیا مگر میں قیامت سے آگے آگیا جیسے یہ (انگلی) اس (انگلی) سے پہلے ہے (اگرچہ دونوں ساتھ ہی ساتھ ہیں) حضور ﷺ نے اپنی دونوں انگلیوں سبّابہ اور وُسطیٰ سے اشارہ کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا۔

بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت قیامت کی علامات میں سے ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس جب (پیام بعثت لے کر) حضرت جبرئیلؑ کو بھیجا گیا اور اثناء راہ میں آپ آسمان والوں کی طرف سے گذرے تو اہلِ سماوات نے کہا، اللہ اکبر قیامت بپا ہوگئی۔

بعض اہلِ تفسیر کا خیال ہے کہ اَمْرُ اللّٰہِ سے مراد ہے سزا اور عذابِ قتل۔ واقعہ یہ ہوا کہ نضر بن حارث نے کہا تھا اے اللہ اگر یہ تیری طرف سے حق ہے تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے پس کافروں نے وقت سے پہلے عذاب کی مانگ کی اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ نضر کو بدر کے دن قتل کیا گیا۔

سُبْحٰنَهٗ میں اللہ کی پاکی کا اظہار کرتا ہوں (جیسی پاکی اس کے لائق ہے مترجم)

وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۞ اور وہ اپنی (صفاتِ قدسیہ میں) ان کے شرک سے بزرگ و بالا ہے یعنی یہ جو خیال کرتے ہیں کہ اللہ کا کوئی شریک ہے اور وہ ان کو اللہ کے عذاب سے بچالے گا اللہ اس سے اعلیٰ اور بالا ہے یا یہ مراد ہے کہ اللہ ان کے شرکیہ بیان سے بالا ہے۔

يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ وہ روح دے کر فرشتوں کو اتارتا ہے۔ روح سے مراد ہے وحی یا قرآن۔ قرآن سے مردہ دل زندہ ہو جاتے ہیں (جیسے روح کے تعلق سے بے جان جسم زندہ ہوتے ہیں)

مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جن پر چاہتا ہے یعنی جن کو رسول بنانا چاہتا ہے۔

اَنْ اَنْذِرُوْٓا اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاتَّقُوْنِ ۞ کہ خبردار کر دو کہ میرے سوا کوئی لائقِ عبادت نہیں سو مجھ سے ڈرتے رہو۔

اَنْذِرُوْا (ثلاثی مزید متعدّی) بتادو، اطلاع دے دو۔ نَذِرْتُ هٰكَذَا (ثلاثی مجرّد لازم) میں نے ایسا جانا، مجھے ایسا علم ہوا۔

اَنْ تفسیر یہ ہے کیونکہ روح سے مراد وحی ہے یعنی ملائکہ کو ہم اپنے منتخب بندوں کے پاس وحی دے کر بھیجتے ہیں کہ لوگوں کو بتادو یا اَنْ مصدریہ ہے اور حرفِ جر محذوف ہے بِاَنْ اَنْذِرُوْا تھا اَنْذِرُوْا کا ترجمہ ڈراؤ، خوف دلاؤ بھی ہو سکتا ہے یعنی مشرکوں اور نافرمانوں کو عذاب سے ڈراؤ اور یہ بتاؤ کہ میرے سوا کوئی اور معبود نہیں لہٰذا مجھ سے ڈرو۔

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ وحی کا تعلق دو چیزوں سے ہے ایک تو توحید پر تنبیہ جو علمی قوّت کے کمال کا انتہائی درجہ ہے دوسرا التقویٰ جو عملی قوّت کا آخری تکمیلی مرتبہ ہے توحید کو ثابت کرنے کے لئے اللہ نے ذیل کی آیات میں اپنی خود مختار، پُر حکمت، مصلحت آگیں خلّاقیت کو بیان کیا ہے اگر کوئی دوسرا شریک ہوتا تو اس میں بھی خلّاقیت اور ایجاد کی قدرت ہوتی اور دو خود مختار کامل قدرت رکھنے والوں میں ٹکراؤ ممکن ہوتا۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا۔ یعنی خاص مقدار، خاص شکل و وضع اور مختلف صفات کے ساتھ اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو نیست سے ہست کیا۔ اس کی ایجاد بتا رہی ہے کہ اس کو بنانے والا واحد، بے مثال، قادرِ مطلق اور حکیمِ کامل ہے۔

تَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ③ اللہ بالا ہے ان کے شرک سے۔ یعنی زمین و آسمان میں سے کسی کو اللہ کا شریک قرار دیا جائے اس سے اللہ بزرگ و برتر ہے یا یہ مطلب ہے کہ اللہ برتر ہے اس بات سے کہ وہ اپنی ہستی یا بقاء ہستی میں زمین و آسمان میں سے کسی چیز کا محتاج ہو زمین و آسمان کو تو خود اپنی تخلیق پر بھی قدرت نہیں ہے۔ اس آیت میں اللہ کے غیر جسمانی ہونے پر تنبیہ ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اللہ نے انسان کو نطفہ سے پیدا کیا یعنی ایسی سیال بے جان بوند سے انسان کو پیدا کیا جس میں نہ حس ہے نہ حرکت نہ وہ اپنی ہیئت و وضع کو محفوظ رکھ سکتی ہے نہ شکل کو۔ (رفتہ رفتہ انسان) جب خوب طاقت ور ہو گیا تو

فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ④ پھر یکدم وہ کھلم کھلا جھگڑنے لگا۔

خَصِیْمٌ تیز زبان جھگڑالو۔ مُبِیْنٌ یعنی نفی قیامت کی دلیل بیان کرنے والا جو بطور دلیل کہتا ہے مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ بوسیدہ ریزہ ریزہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا یا خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ سے مراد ہے خالق سے کھل کر جھگڑا کرنے والا۔

بغوی نے لکھا ہے، اس آیت کا نزول اُبَی بن خلف جمحی کے متعلق ہوا ابن خلف منکرِ قیامت تھا ایک روز وہ ایک بوسیدہ ہڈی لے کر آیا اور بولا کیا تم کہتے ہو کہ خدا اس کو زندہ کرے گا یہ تو بوسیدہ اور ریزہ ریزہ ہو گئی (یہ کیسے زندہ ہو گی) اس کی بابت آیت وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ بھی نازل ہوئی تھی۔

سدی نے آیت اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ کا نزول بھی اسی قصہ کے متعلق بیان کیا ہے (رواہ ابن ابی حاتم) آیت کا نزول کا خواہ خاص شخص کے متعلق ہوا ہو لیکن الفاظ میں عموم ہے (ہر منکرِ قیامت جو دوسری زندگی کا قائل نہ ہو اسی حکم میں داخل ہے) مطلب یہ ہے کہ منکرِ قیامت اتنا نہیں سمجھتا کہ جب اللہ نے بے جان نطفہ سے اس کو پیدا کر دیا تو بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اسکے لئے کیا دشوار ہے۔

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ اور اسی نے چوپایوں کو پیدا کیا ان میں تمہارے جاڑے کا بھی سامان ہے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ اَلْاَنْعَامَ سے مراد ہیں اونٹ، گائے، بھینس، بکری، بھیڑ وغیرہ۔ لَكُمْ تمہارے فائدے کے لئے جس کی تفصیل فِیْهَا دِفْءٌ میں بیان کی ہے گویا لَكُمْ میں اجمالِ منفعت ہے اور اس کے بعد تفصیل کی گئی ہے۔ دِفْءٌ سردی کی شدت کا دور ہو جانا (قاموس) یعنی جانوروں کے بالوں اور اون سے تم سردی کی سختی دور کرتے ہو اونی لباس اور کمبل وغیرہ استعمال کرتے ہو۔ منافع سے دوسرے فائدے مراد ہیں۔ افزائشِ نسل، دودھ، سواری، بار برداری، کھیتی باڑی، خرید و فروخت، وغیرہ۔

وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ⑤ اور انہی سے تم کھاتے بھی ہو گوشت، چربی، گھی، دودھ، پنیر، مکھن، وغیرہ کھاتے ہو۔ عموماً غذاء حیوانی انہی جانوروں سے حاصل کی جاتی ہے اس لئے مِنْهَا کو تَاْكُلُوْنَ سے پہلے ذکر کیا دوسرے جانوروں کا گوشت تو محض لذت یا دوا کی خاطر کھایا جاتا ہے۔

وَلَكُمْ فِیْهَا جَمَالٌ حِیْنَ تُرِیْحُوْنَ وَحِیْنَ تَسْرَحُوْنَ ⑥ اور جب شام کو (جنگل سے جانوروں کو) واپس لاتے ہو اور (صبح کو) چرانے کے لئے لے کر جاتے ہو تو ان سے تمہاری ایک شان بنتی ہے۔ کیونکہ دونوں وقت گھر سے باہر صحن میں ان کے جمع ہونے سے ایک رونق پیدا ہو جاتی ہے۔ دیکھنے والوں کی نظروں میں تمہاری عزت اور ساکھ ظاہر ہوتی ہے۔

وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰی بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِیْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اور (بجائے اس کے کہ سفر میں تم اپنے سامان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا کر چلو) یہ جانور تمہارے سامان کے بوجھ اپنے اوپر لاد کر ایک شہر سے دوسرے شہر تک لے جاتے ہیں کہ بغیر سخت تکلیف اٹھانے کے تم وہاں تک خود پہنچ بھی نہیں سکتے ہو (بوجھ اٹھانے کا تو ذکر ہی

کیا ہے) شِق اور شَق دونوں ہم معنی ہیں جیسے رِطل اور رَطل
اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ⑦ حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحمت والا ہے کہ اس نے ان جانوروں کو تمہارے فائدے کے لئے پیدا کر دیا۔
وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً اور اس نے تمہاری سواری اور شان بنانے کے لئے گھوڑے خچر اور گدھے پیدا کئے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس آیت سے گھوڑے کے گوشت کے حرام یا مکروہ ہونے پر استدلال کیا ہے صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے کہ اللہ نے اس آیت میں اپنی نعمت کا اظہار کیا ہے اور اپنی نعمت کی یاد دہانی کی ہے اور دو فائدوں کی صراحت کی ہے۔ سواری اور زینت اور ظاہر ہے کہ غذائیت سب سے بڑی نعمت ہے اس لئے ممکن نہیں کہ جو اصل منفعت ہے اس کی تو یاد دہانی نہ کی جائے اور نیچے درجے کے فائدوں کا اظہار کیا جائے (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان جانوروں کو فراہمیٔ غذا کے لئے پیدا ہی نہیں کیا گیا ورنہ سواری اور زینت سے پہلے ان سے غذائیت فراہم کرنے اور ان کا گوشت یا دودھ کھانے پینے کا ذکر کیا جاتا)
میں کہتا ہوں، غذائیت تو بھیڑ، بکری، مرغی وغیرہ کے گوشت سے بہترین حاصل ہو جاتی ہے اور اس کا حصول آسان بھی ہے گھوڑے، گدھے وغیرہ کا گوشت نہ اچھا ہوتا ہے نہ اس کا حصول زیادہ سہل ہے، ہاں سواری، بار برداری اور شان بان کے جو فوائد اُن سے وابستہ ہیں وہ دوسرے چھوٹے جانوروں سے حاصل نہیں ہو سکتے اس لئے صاحب ہدایہؒ کا یہ قول غلط ہے کہ گھوڑوں اور گدھوں کا گوشت بطور غذائیت سب سے بڑی منفعت ہے۔ ان جانوروں کا سب سے بڑا فائدہ تو سواری وغیرہ ہی ہے جو دوسرے جانوروں سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ آیت مکی ہے جب کہ گدھے کا گوشت بھی حلال تھا۔ اس کی حرمت تو خیبر کی فتح کے موقع پر ۶ ہجری میں ہوئی (ایسی صورت میں اس آیت سے گھوڑے کے گوشت کی حرمت پر استدلال کیسے کیا جا سکتا ہے) اس مسئلہ کی پوری تشریح آیت اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ کی تفسیر کے ذیل میں سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔)
وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ⑧ اور ایسی ایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تمہیں خبر نہیں ہے۔ (حضرت مفسرؒ نے اس آیت کا تعلق آخرت سے قرار دیتے ہوئے حسب ذیل تفسیری مطلب بیان کیا ہے) یعنی جنت میں مؤمنوں کے لئے اور دوزخ میں کافروں کے لئے ایسی ایسی راحتیں اور تکلیفیں پیدا کی ہیں جن کا تمہیں پتہ بھی نہیں نہ کسی آنکھ نے ان کو دیکھا نہ کسی کان نے سنا نہ کسی شخص کے دل میں ان کا تصور آیا۔
وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ اور سیدھا راستہ اللہ تک پہنچتا ہے (اس ترجمہ پر علی بمعنی الیٰ ہوگا) اور کچھ راستے ٹیڑھے بھی ہیں (جو اللہ تک نہیں پہنچتے۔ مترجم) یعنی سیدھا راستہ جو حق تک پہنچتا ہے (وہ راستہ دکھانا اور بتانا اللہ کے ذمے ہے) اس نے مہربانی اور کرم سے یہ ذمہ داری لی ہے)۔
یا قَصْدُ السَّبِيْلِ سے مراد ہے اللہ تک پہنچنے کا سیدھا راستہ، کہ جو شخص اس راہ پر چلے گا اللہ تک پہنچ جائے گا۔ سَبِيْلٌ قَصْدٌ یا قاصِدٌ سیدھے راستے کو کہتے ہیں۔
جَآئِرٌ کا معنی ہے ٹیڑھا یعنی راہ مستقیم سے یا اللہ کے رُخ سے کٹا ہوا۔ اس کلام کا مقصود صرف راہِ خدا کا بیان ہے۔ مِنْهَا جَآئِرٌ کا جملہ بالعرض ذکر کیا گیا ہے۔ قصدُ السبیل صرف راہِ سنت ہے اور ٹیڑھا راستہ تمام مذاہب کفر اور بدعات وخواہشات نفس کا۔
وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ⑨
اور اگر اللہ (تم سب کو ہدایت کرنا) چاہتا تو تم سب کو ہدایت کر دیتا۔ ہدایت سے مراد اس جگہ منزلِ مقصود پر پہنچا دینا ہے اور عَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ میں مراد ہے راہِ حق دکھانا اور بتانا (راہ مستقیم اللہ نے تمام انسانوں کو بتا دی ہے اپنی کتابیں بھیج دی ہیں اور پیغمبروں کو بھی بھیج دیا ہے لیکن منزلِ مقصود پر پہنچایا کم لوگوں کو ہے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق کم لوگوں کو نصیب ہوئی ہے (مترجم)

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِیْهِ تُسِیْمُوْنَ ﴿۱۰﴾
وہ ایسا ہے جس نے تمہارے واسطے بادل سے پانی برسایا جس سے (کچھ) تم کو پینے کو ملتا ہے اور کچھ حصے سے درخت (پیدا) ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشی (چرنے) چھوڑتے ہو۔
مِنْهُ شَرَابٌ کے لفظ سے معلوم ہو رہا ہے کہ آدمیوں کو پینے کا پانی بارش سے ہی حاصل ہوتا ہے کیونکہ چشموں اور کنوؤں (اور دریاؤں) میں لوٹ پھر کر بارش ہی کا پانی آتا ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے فَسَلَكَهٗ یَنَابِیْعَ۔ دوسری آیت ہے فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ۔ مِنْهُ شَجَرٌ کا یہ مطلب ہے کہ درختوں کی زندگی بھی پانی سے ہے۔ درخت بھی بارش کا پانی پیتے ہیں۔
تُسِیْمُوْنَ کا ترجمہ ہے تم جانوروں کو چراتے ہو۔ سَامَتِ الْمَاشِیَةُ (مجرد) مویشی چرے۔ اَسَامَهَا صَاحِبُهَا (مزید) مالک نے جانوروں کو چرا لیا۔ مصدر سومة سومة کا اصل لغوی معنی ہے "علامت"۔
یُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّیْتُوْنَ وَالنَّخِیْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ
اللہ پانی سے تمہارے لئے کھیتی اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور تمام پھل پیدا کرتا ہے۔
مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ میں مِنْ تبعیضیہ ہے یعنی تمام ممکنہ پھلوں میں سے بعض پیدا کرتا ہے۔ کل پھل تو صرف جنت میں ہوں گے یہاں تو جنت کے پھلوں کی یاد دہانی کے لئے بعض پھل پیدا کئے گئے ہیں۔ مویشیوں سے پہلے ان کی چراگاہوں کا ذکر اور مویشیوں کے بعد کھیتی اور پھلوں کا تذکرہ ترتیب واقعی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ سب سے پہلے درخت ہی حیوانات کی غذا بنتے ہیں اور حیوانات سے پیدا ہونے والی غذا سب سے اعلیٰ غذا ہے۔ پس درختوں کی پیدائش کا ذکر پہلے پھر حیوانات اور ان کی پیداوار کا تذکرہ اور پھر کھیتی کا بیان ہونا مناسب تھا اور ایسا ہی کیا گیا)
اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے صانع کے وجود، علم اور حکمت کا اس میں کھلا ہوا ثبوت ہے۔
لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾ غور کرنے والوں کے لئے۔ ایک دانہ زمین میں گرتا ہے زمین سے کچھ نمی اس میں کھینچ کر آتی ہے پھر دانہ کا بالائی حصہ پھٹ کر اس میں سوئی جیسا تنا نکلتا ہے اور نچلا حصہ پھٹ کر نیچے کی طرف جڑوں کے سوتے نکلتے ہیں پھر یونہی نمو ہوتا رہتا ہے۔ تنا بڑھتا ہے اس میں شاخیں پتیاں، پھول، شگوفے اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ پھول پھل کی بھی ایک خاص فصل ہوتی ہے ہر پھل کا ایک مخصوص موسم ہوتا ہے۔ سفلی طبیعت (یعنی زمین اور پانی کی طبیعت) اور علوی مؤثرات (دھوپ ہوا اور روشنی تاثیر کواکب وغیرہ) ہر طرح کے درختوں کے لئے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں لیکن ہر درخت اپنی جدا جسمانیت، شکل اور طبیعت وخاصیت رکھتا ہے۔ مبادی کا اتحاد اور نتائج کا اختلاف بتا رہا ہے کہ یہ سب کرشمہ سازی کسی فاعلِ مختار کی ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے اور وہی جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ اور اس نے تمہارے فائدے کے لئے رات اور دن سورج اور چاند کو مسخر بنایا۔ یعنی تمہارے منافع کے لئے اس نے رات دن بنائے ہیں۔
وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اور ستارے بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔
بِاَمْرِهٖ میں امر سے مراد ہے ایجاد اور اندازہ مقرر کرنا یا حکم مراد ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ جو لوگ تخلیقِ نبات کو صرف تاثیرِ کواکب سے وابستہ قرار دیتے ہیں اور ستاروں کی حرکات و اوضاع کو مؤثرِ حقیقی جانتے ہیں ان کا خیال غلط ہے اگر ایسا فرض بھی کر لیا جائے تب بھی کیا جواب ہے اس بات کا کہ تمام ستارے اپنی ذات وصفات کے لحاظ سے ممکن ہیں (اور ممکن وہ ہوتا ہے جس کا اپنا وجود بھی اپنا نہیں ہوتا وہ اپنی ذات وصفات میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے) تو لامحالہ ان کا اپنا وجود بھی ایسی ذات کا ممنون کرم ہے جو واجب الوجود ہے اور کسی کا محتاج نہیں اسی نے ممکنات کو نیست سے ہست کیا اگر ذات واجب الوجود آخری درجہ پر نہ مانی جائے تو جانب مبدأ میں تسلسل لازم آئے گا یا پھر گھوم کر لوٹنا پڑے گا اور ہر ممکن بلاواسطہ یا بالواسطہ خود اپنی نفس کی علت ہو جائے گا گویا انکار واجب الوجود سے تسلسل یا دور لازم آجائے گا اور چونکہ تسلسل بھی محال ہے اور دور بھی۔ اس لئے تمام ممکنات

کی ہستی کے لئے ذات واجب الوجود کا ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کائنات سماوی کی تاثیرات ہوں یا عناصر کی انکی حیثیت ایک ضابطہ اور دستور کی ہے اللہ کا ضابطہ اور عادت یہی ہے کہ اس نے بعض نتائج کو بعض اسباب سے وابستہ کر دیا ہے اور اسباب کو علت نتائج بنا دیا ہے خود یہ اسباب نتائج کے موجد نہیں ہیں، اسباب کا اپنا وجود ہی اپنا نہیں خداداد ہے، جو چیز معدوم الذات ہو وہ دوسرے کو وجود کیسے دے سکتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾ بے شک اس میں سمجھ والوں کے لئے بکثرت (توحید و قدرت کی) نشانیاں ہیں۔ سلیم اور سادہ دانش والوں کو ہر چیز میں اللہ کی تخلیق و حکمت کی گونا گوں نشانیاں نظر آتی ہیں یہ واضح نشانیاں ہیں اسی لئے "آیات" بصیغۂ جمع ذکر فرمایا اور اصحاب عقل کے ساتھ آیات فہمی کو وابستہ کیا۔

وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ اور ان چیزوں کو بھی تمہارے لئے اس طور پر پیدا کیا کہ ان کے اقسام مختلف ہیں "الوان" سے اقسام و اصناف مراد ہیں رنگ کے اختلاف سے اکثر صنف بدل جاتی ہے۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾ بلا شبہ نصیحت اندوز لوگوں کے لئے اس میں بڑی نشانی ہے۔ طبیعت، ہیئت اور صورت کا اختلاف دیکھ کر وہ اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ یہ محض ایک صانع حکیم کی کرشمہ سازی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ اور اسی نے سمندر کو تمہاری خدمت پر لگا دیا ہے یعنی ایسا بنایا ہے کہ تم اس سے طرح طرح کے فائدے حاصل کرتے ہو۔ اس میں جہاز اور کشتیاں چلاتے ہو، مچھلیاں پکڑتے ہو اور موتی مونگے حاصل کرتے ہو۔

لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا اس میں سے تازہ تازہ گوشت کھاؤ۔ طَرِیًّا تروتازہ یعنی مچھلیاں، مچھلی میں ہر گوشت سے زیادہ رطوبت ہے اسی لئے مچھلی کا گوشت بہت جلد خراب ہو جاتا ہے چونکہ (لعابیت کی وجہ سے) مچھلی کا گوشت آنتوں سے چسپاں ہو جاتا ہے اس لئے اس کو کھانے کے بعد پیاس زیادہ لگتی ہے۔ گوشت کی گرمی یا خشکی موجب تشنگی نہیں ہوتی۔ اللہ کی عجیب حکمت ہے، تلخ، نمکین اور غلیظ پانی سے ایسی تروتازہ شیریں لطیف چیز اس نے پیدا کی۔

امام مالک و امام ثوریؒ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مچھلی پر شرعاً گوشت کا اطلاق ہوتا ہے اگر کسی نے قسم کھائی کہ گوشت نہیں کھاؤنگا تو مچھلی کھانے سے بھی اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔ احنافؒ کہتے ہیں قسم میں عرف عام کا اعتبار کیا جاتا ہے اور عرف عام میں مچھلی پر گوشت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دیکھو اللہ نے کافروں کو شر الدواب (بدترین چوپایہ) قرار دیا ہے پس اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں چوپایہ پر سوار نہ ہوں گا اور کسی کافر کے اوپر سوار ہو گیا تو کیا اس کی قسم ٹوٹ جائے گی۔

وَتَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا اور اس میں سے (موتیوں کا) گہنا نکالو جسکو تم پہنتے ہو تلبسون (جمع مذکر حاضر کا صیغہ ہے لیکن اس) سے مراد یہ ہے کہ تمہاری عورتیں یہ زیور پہنتی ہیں حِلْیَةً بمعنی زیور، مراد موتی مونگا وغیرہ۔

وَتَرَی الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ اور تم کشتیوں کو دیکھو کہ اس میں پانی کو چیرتی چلی جا رہی ہے۔ مَوَاخِرَ فِیْهِ سمندر میں چلنے والی۔ قتادہ نے ترجمہ کیا ہے "آنے جانے والیاں" ایک جاتی ہے دوسری آتی ہے باوجودیکہ ہوا کی رفتار ایک ہی ہے۔ حسن نے کہا، بھری ہوئی۔ فراء اور اخفش نے کہا، پانی کو اپنے دونوں بازوؤں سے پھاڑنے والیاں۔ "مخر" کا معنی ہے پانی کو پھاڑنا یا کشتی کی رفتار کی آواز۔ ابو عبیدہ نے کہا تیز ہوا چلنے کے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے اس کو مخر کہا جاتا ہے۔ مجاہد نے کہا ہواؤں کی رفتار کے سامنے سے کشتیاں آتی ہیں اور ہواؤں کو پھاڑتی ہیں۔ قاموس میں مخر اور مخور کا معنی بیان کیا گیا ہے کشتی کا چلنا اور ہوا کی رفتار کے سامنے آنا۔ مخرت السفینۃ کا یہی مطلب ہے مخر السابحُ تیرنے والے نے دونوں ہاتھوں سے پانی کو چیرا۔ مواخر کشتیاں وہ ہوتی ہیں جن کی رفتار کی آواز سنی جائے یا وہ کشتیاں جو اپنے سینہ کے زور سے پانی کو چیرتی ہیں یا ایک ہی ہوا سے آنے جانے والی

کشتیاں۔ حدیث میں ہے: اذا اراد احدکم البول فلیتمخر الرّیح ایک اور روایت میں آیا ہے کہ استمخرو الرّیح جب کسی کا پیشاب کرنے کا ارادہ ہو تو ہوا کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھے۔ ہوا کی طرف پُشت کرو۔ گویا حدیث کا مطلب یہ ہوا کہ اپنی پشت ہوا کے مقابل کر دو تاکہ ہوا چھٹ کر دائیں بائیں سے نکل جائے۔

وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ اور تاکہ تم خدا کی دی ہوئی روزی تلاش کرو یعنی جہازوں اور کشتیوں پر سوار ہو کر اللہ کے فضل یعنی وسیع رزق کو تلاش کرو۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ اور تاکہ (ان چیزوں کو اپنا تابع دیکھ کر اور اپنے کام پر لگا ہوا پا کر) تم اللہ کا شکر کرو۔ جو مقام ہلاکت آگیں ہیں انہی کو اللہ نے تحصیلِ معاش کا ذریعہ بنایا ہے یہ اس کا عظیم الشان احسان ہے جس کا شکر ادا کرنا لازم ہے اسی لئے آیت کے آخر میں تشکرون فرمایا۔ میں کہتا ہوں، مذکورہ بالا اشیاء کو دیکھ کر اور ان کے فوائد پر غور کر کے شکر نعمت کے درجہ تک پہنچنا یہ بجائے خود بڑا انعام ہے اس سے دنیا میں مزید نعمت اور آخرت میں ثوابِ عظیم حاصل ہوتا ہے گویا شکر تمام نعمتوں کی تکمیلی درجہ ہے۔

وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ اور اس نے زمین میں پہاڑ رکھ لئے تاکہ تم کو لے کر زمین ڈگمگانے نہ لگے۔

رَوَاسِىَ: ایک جگہ قائم رہنے والے پہاڑ۔ اَلْمَيْدُ: لرزہ، اضطراب۔ پہاڑوں کی تخلیق، زمین بالکل گول تھی ادنیٰ سبب سے اس میں لرزہ آجاتا تھا۔ جب پہاڑوں کو پیدا کر دیا گیا تو ان کا دباؤ مرکزِ ثقل کی طرف پڑا اور زمین کا اِدھر اُدھر ہلنا بند ہو گیا۔ گویا پہاڑوں کی میخیں ٹھونک دی گئیں جو زمین کو حرکت و اضطراب سے روک رہی ہیں۔ بغوی نے لکھا ہے اللہ نے جب زمین کو پیدا کیا تو وہ لرزاں تھی۔ فرشتے کہنے لگے یہ اپنی پُشت پر کسی کو ٹھہرنے نہ دے گی پھر اللہ نے اس میں پہاڑ گاڑ دیئے اور فرشتوں کو معلوم نہ ہوا کہ پہاڑ کس چیز سے بنائے گئے۔ عبد بن حُمید، ابن جریر، ابن المنذر، اور ابن ابی حاتم نے بوساطتِ قتادہ بروایتِ حسین، قیس بن عُبادہ کا قول نقل کیا ہے کہ جب اللہ نے زمین کو پیدا کیا تو وہ (گول ہونے کی وجہ سے) لرزاں تھی فرشتے کہنے لگے یہ تو اپنی پشت پر کسی کو قرار نہیں پکڑنے دے گی لیکن جونہی صبح ہوئی تو (رات بیچ میں) زمین کے اندر پہاڑ قائم ہو گئے اور فرشتوں کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کہاں سے پیدا ہو گئے۔ کہنے لگے، اے ہمارے رب کیا تیری مخلوق میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو ان سے زیادہ سخت ہو، اللہ نے فرمایا، ہاں لوہا ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا لوہے سے بھی سخت تیری کوئی اور مخلوق ہے فرمایا ہاں آگ ہے۔ فرشتوں نے عرض کیا اے رب کیا آگ سے بھی زیادہ سخت کوئی اور چیز ہے فرمایا ہاں پانی ہے فرشتوں نے عرض کیا اے رب کیا تو نے پانی سے بھی زیادہ سخت کوئی اور چیز پیدا کی ہے۔ فرمایا ہاں ہوا ہے فرشتوں نے عرض کیا ہوا سے بھی سخت کوئی چیز تو نے بنائی ہے فرمایا ہاں مرد (ہوا سے زیادہ سخت ہے) عرض کیا کیا تیری کوئی مخلوق مرد سے بھی زیادہ سخت ہے فرمایا عورت ہے۔ انتہیٰ۔

اگر دریافت کیا جائے کہ یہ سوال کہیں جا کر ختم بھی ہو سکتا ہے تو میں اس کے جواب میں کہوں گا، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ اللہ قوی اور بڑی طاقت والا ہے اور تمام ممکنات اس کے مقابلہ میں عاجز بلکہ ہیچ ہیں۔ اللہ کی قوت کا جس پر پَر تو پڑ جاتا ہے وہ چیز دوسروں کے مقابلہ میں قوی ہو جاتی ہے۔ ہاتھی پر قوت کا پَر تو پڑ گیا تو وہ چیونٹی سے قوی ہو گیا لیکن اگر اللہ چاہے تو چیونٹی پر اپنی قوت کا پَر تو ڈال کر ہاتھی سے زیادہ قوی بنا دے، کسی کی قوت و شدّت بہمہ جہات دوسروں سے زائد نہیں بعض اعتبارات سے ہے (ایک چیز دوسری چیز سے ایک اعتبار سے زیادہ قوی ہے اور وہ دوسری چیز پہلی چیز سے کسی دوسرے اعتبار سے قوی ہے بہمہ جہات تو اللہ ہی سب سے قوی ہے)

وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ اور زمین میں دریا اور (حصولِ مقصد کے) راستے بنائے تاکہ تم (اپنے مقصد یا اللہ کی معرفت کے) راستہ پر چلو۔ یعنی اللہ کی معرفت حاصل کرو۔

وَعَلٰمٰتٍ ؕ اور (راستوں پر) اللہ نے کچھ نشانیاں بنائیں۔ درخت، پہاڑ، عمارتیں ستارے وغیرہ علاماتِ راہ ہیں، قافلے ان سے اپنے راستوں کی شناخت کرتے ہیں۔ شرعی اسباب وعلل بھی (احکام کے لئے) راہنما ہیں وجوبِ صلوٰۃ وصوم وزکوٰۃ کے لئے وقت سبب ہے اشیاء ماکولہ ومشروبہ کی حرمت کی علت نشہ ہے طبعی اور عقلی دلائل بھی رہنمائی کرتی ہیں نبض کی تیزی بخار کو ظاہر کرتی ہے اس عالم کا وجود اس کے بنانے والے کی ہستی کو ثابت کر رہا ہے۔ معجزہ پیغمبر کی نبوت کی دلیل ہوتا ہے۔

وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ اور تاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں یعنی رات کی تاریکی میں جنگلوں اور سمندروں میں ستاروں سے راستوں کی شناخت کرتے ہیں۔ "النجم" سے مراد ہے عام ستارے۔ محمد بن کعب نے کہا علامات سے مراد پہاڑ ہیں۔ دن کے وقت پہاڑوں سے راستہ معلوم ہوتا ہے۔ اور رات کے وقت ستاروں سے (کلبی نے کہا سب (علامات) سے مراد ستارے ہیں، کچھ ستارے علامات اور نشانات ہیں اور کچھ ستاروں سے لوگ راستے معلوم کرتے ہیں سدی نے کہا النجم سے مراد ہے ثریا اور بنات النعش اور دونوں فرقد اور جدی ان سے لوگ راہ بھی معلوم کر لیتے ہیں اور جہتِ قبلہ بھی۔ میں کہتا ہوں اس (مرادی) تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہ ستارے قطب شمالی کے قریب ہیں ان کے دائرے چھوٹے ہیں اس لئے اپنی جگہ سے بہت ہی کم حرکت کرتے ہیں۔

يَهْتَدُوْنَ کی فاعلی ضمیر "قریش" کی طرف لوٹ رہی ہے قریش عام طور پر تجارت کے لئے رات کو سفر کرتے تھے اور رات میں چلتے تھے اور ستاروں سے جہتِ سفر کو معلوم کرنے میں بہت مشہور تھے۔ علامات کے لفظ کے بعد "النجم" کا ذکر خصوصیت کو ظاہر کر رہا ہے گویا) مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نجم سے خاص طور پر راستہ کی شناخت کرتے اور راہ پر چلتے ہیں اس لئے ان پر اللہ کا شکر لازم ہے کہ اس نے ستاروں کو ان کے لئے دلیل راہ بنا دیا۔

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ سو کیا جو پیدا کرتا ہے اس کی طرح ہو جائے گا جو پیدا نہیں کرتا مَنْ لَا يَخْلُقُ سے مراد ہیں معبودانِ باطل (خواہ اہل عقل ہوں یا بے عقل) اہلِ عقل کو بے عقل پر تغلیب دے کر (بجائے مَا کے) مَنْ استعمال کیا ہے یا صرف بُت مراد ہیں چونکہ مشرک بتوں کو الٰہ (اپنے معبود) مانتے تھے اور الٰہ کو اہلِ علم ہونا ہی چاہئے (تو گویا مشرکوں کے مفروضے کے مطابق بتوں کے لئے مَنْ کا صیغہ استعمال کیا) اَفَمَنْ میں ہمزہ انکاریہ اور فاء تعقیبیہ ہے یعنی جب روشن وکثیر دلائل سے اللہ علمی کمال اور قدرت کا احاطہ اور حکمت کی ہمہ گیری ثابت ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تنہا اللہ ہی خالق کائنات ہے کوئی دوسرا خالق نہیں ہے یہاں تک کہ کوئی بھی نہ مکھی کو اڑا سکتا ہے نہ روک سکتا ہے اگر مکھی ان بتوں سے کچھ چھین کر لے جائے تو وہ واپس نہیں لے سکتے تو پھر ایسا خلاقِ کل اس چیز کی طرح کیسے ہو سکتا ہے جو خالقت سے بالکل بے بہرہ ہے۔

اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۷﴾ تو کیا (ان مشاہدات برہانی کے بعد بھی) نصیحت پذیر نہیں ہو گے یعنی جب ایسی چیزیں تمہارے سامنے ہیں جو نصیحت اندوزی کی مقتضی ہیں تو پھر عبرت اندوز نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کی گنتی کرو تو گن بھی نہیں سکتے۔ تمام نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا تو ذکر ہی کیا ہے اللہ کی نعمتوں کی کوئی حد ہی نہیں ہے کہ گن سکو لہٰذا اس کے معبود ہونے کا حق بھی محدود نہیں ہے (ہر نعمت اس کو مستحقِ عبادت بنا رہی ہے) پس تم پورا حقِ عبادت تو ادا ہی نہیں کر سکتے یہی کافی ہے کہ تم اپنی عاجزی کا اقرار کرو اور ظاہر باطن ہر طور پر اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔

اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ (تمہارے قصور اور پورے شکر کو ادا کرنے سے عاجزی کو) معاف کرنے والا ہے۔

رَّحِيْمٌ ﴿۱۸﴾ (تم پر) مہربان ہے کہ تمہارے استحقاق کے بغیر اس نے اپنی وسیع نعمتیں تم کو عطا فرمائی ہیں اور تمہارے گناہوں کی پاداش میں اپنے انعامات کا سلسلہ منقطع نہیں کیا اور نہ ناشکری کی سزا تم کو فوراً دی۔

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ﴿۱۹﴾ اور اللہ تمہارے سب پوشیدہ اور ظاہر احوال کو جانتا ہے پوشیدہ احوال سے مراد ہیں عقائد، ارادے، دل کا شکر، کامل طور پر حقوقِ عبدیت کو ادا کرنے سے قاصر رہنے کا علم، غفلت، غرور وغیرہ اور ظاہری احوال سے اچھے برے اعمال مراد ہیں اللہ کے واقف ہونے کے اظہار کا یہ مقصد ہے کہ اللہ تم کو تمہارے اندرونی و بیرونی احوال کی سزا و جزا دے گا۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ﴿۲۰﴾

اور اللہ کے سوا مشرک جن کو پکارتے (یعنی عبادت کرتے) ہیں وہ کوئی چیز نہیں پیدا کرتے بلکہ خود (دوسرے کے ہاتھوں سے) پیدا کئے جاتے ہیں یعنی آسمان و زمین تو بڑی چیزیں ہیں ان کے معبود تو ادنیٰ اور حقیر ترین چیز کے بھی خالق نہیں۔ کوئی چیز پیدا کرنے کی انہیں قدرت ہی نہیں بلکہ خود اپنی ہستی بھی ان کی اپنی نہیں۔ نہ ذات اپنی ہے نہ وجود اپنا بلکہ ان کی ہستی دوسرے کی ممنونِ کرم اور عطا کردہ ہے پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ شریک خدا ہو سکیں اور کیسے جائز ہے کہ ان کو الٰہ قرار دیا جائے۔

ع ۸

أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ وہ (بت) بے جان ہیں زندہ نہیں (ان میں کبھی زندگی پیدا ہی نہیں ہوئی) یا یہ مطلب ہے کہ وہ (معبود) بذاتِ خود مردے ہیں زندہ نہیں ہیں ان کی زندگی خود بخود نہیں بلکہ ایک حی و قیوم کی عطا کردہ ہے۔

وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ ﴿۲۱﴾ اور ان کو خبر ہی نہیں کہ وہ مردے کب اٹھائے جائیں گے۔ یعنی ان کا دوبارہ اٹھایا جانا نہ ان کے اختیار میں ہے نہ ان کے پرستاروں کا دوبارہ زندہ کیا جانا ان کے بس میں ہے نہ اپنا اور نہ اپنے پجاریوں کا زندہ کر کے اٹھایا جانا ان کو معلوم ہے پھر اپنے پرستاروں کو وہ جزا کیسے دے سکتے ہیں اور ان کی پرستش کا کیا فائدہ ہے اور کس طرح وہ معبودیت کے مستحق قرار پا سکتے ہیں۔

إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ ۚ تمہارا معبود ایک معبود ہے یعنی دلائل سے ثابت ہو گیا کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

فَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ قُلُوبُهُم مُّنكِرَةٌ پس جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے دل (اللہ کی اَن گنت نعمتوں کا) انکار کرتے ہیں باوجودیکہ خداداد نعمتیں بالکل ظاہر ہیں بات یہ ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں کو نورِ معرفت سے محروم کر دیا ہے اسی کی وجہ سے وہ کور بصیرت اور نابینا ہو گئے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے فرمایا میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے سنا کہ اللہ نے مخلوق کو تاریکی (کثیف مادیت اور حیوانی جہالت) میں پیدا کیا پھر ان پر اپنا نور (یعنی اس کا ایک چھینٹا) ڈال دیا۔ جس شخص پر نور کا کچھ حصہ (کوئی چھینٹا) پڑ گیا اس کو راستہ مل گیا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور جس پر نہ پڑا وہ بھٹکتا رہا، ہدایت یاب نہ ہوا۔ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ قلم (الٰہی) علم خداوندی پر خشک ہو گیا (یعنی اللہ کے علم میں جس کا ہدایت یاب ہونا تھا وہ ہدایت یاب ہو گیا اور اللہ کے علم میں جس کا گمراہ ہونا تھا وہ گمراہ ہو گیا اس فیصلہ کی تحریر ہو چکی فیصلہ لکھنے والا قلم خشک ہو گیا اب تحریر کردہ فیصلہ میں تغیر ممکن نہیں۔ مترجم) (رواہ احمد والترمذی)

وَهُم مُّسْتَكْبِرُونَ ﴿۲۲﴾ اور وہ (قبولِ حق سے) تکبر کرتے ہیں یعنی اللہ کی عبادت سے غرور کرتے ہیں اللہ کی نعمتوں ہی کا انکار کرتے ہیں اس لئے اللہ کو مستحقِ عبادت نہیں جانتے اور اتباعِ رسول سے بھی غرور کرتے ہیں اگر ان کو اللہ کی نعمتوں کا اقرار ہوتا اور اللہ کو مستحقِ عبادت جانتے تو آخرت پر ایمان رکھتے اور آخرت کی جزا و سزا کو مانتے اور رسول اللہ ﷺ کے اِتباع سے سرتابی نہ کرتے۔

لَا جَرَمَ أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ ضروری بات ہے کہ اللہ ان سب کے پوشیدہ اور ظاہر احوال سے واقف ہے یعنی اللہ کی ربوبیت اور معبودیت سے انکار دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اور اللہ کی عبادت اور اللہ کے رسول کے اِتباع سے تکبر جو وہ ظاہر کرتے ہیں اللہ سب سے واقف ہے۔

اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿۲۳﴾ (اور) یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا چھوٹی سرخ چیونٹی کے برابر غرور (والا) جنت میں نہیں جائے گا۔ اور چھوٹی سرخ چیونٹی کے برابر ایمان (والا) دوزخ میں نہ داخل ہوگا ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہم میں سے بعض لوگ چاہتے ہیں کہ ان کا لباس خوب صورت ہو (اور یہ غرور کی علامت ہے پھر ان کا نتیجہ کیا ہوگا) فرمایا اللہ جمال والا ہے جمال کو پسند کرتا ہے (غرور کپڑوں کی پسندیدگی کا نام نہیں۔ خوش لباسی کی خواہش تکبر نہیں بلکہ) تکبر حق سے تکبر کرنے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے سے ہوتا ہے۔ اس حدیث میں الکبر من بطر الحق آیا ہے جس کا مطلب علماء نے مختلف طور پر بیان کیا ہے۔ نہایہ میں یہ بطر الحق کا یہ معنی ہے کہ اللہ کی توحید اور عبادت کو باطل سمجھے باوجودیکہ اللہ نے اس کو حق قرار دیا ہے۔ بعض نے کہا کہ بطر الحق کا معنی ہے حق کے مقابلہ میں مغرور ہو جانا حق کو حق نہ ماننا۔ بعض نے کہا حق کو قبول نہ کرنے کا نام ہے بطر الحق۔ ان تمام اقوال کا حاصل ایک ہی ہے وہ یہ کہ اللہ کی عبادت کو لازم نہ سمجھے۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کا احسان اور مہربانی نہ قرار دے بلکہ خدا پر اپنا حق سمجھے۔ میں کہتا ہوں حدیث مذکورہ میں جو تکبر کے مقابلہ میں ایمان کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مؤمن اپنے وجود اور تمام کمالات کو خداداد سمجھتا ہے یہاں تک کہ اپنی ذات کو بھی اللہ کی امانت اور عاریت جانتا ہے اس لئے اپنے کمالات پر غرور نہیں کرتا اور کافر اپنی ہستی اور اپنے کمالات کو خود آورده جانتا ہے اور اللہ کو بھول جاتا ہے تصوف میں جو لفظ فنا آتا ہے اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے وجود کو بجائے خود معدوم سمجھے خود اپنی ہستی کو اپنی نہ سمجھے بلکہ اللہ کی طرف سے عطا کردہ ایک عاریت جانے (اور ہر چیز میں ہر کمالِ مادی و علمی میں یہاں تک کہ اپنی وجود و ذات کے لحاظ سے بھی اپنے کو اللہ کا محتاج سمجھے۔ (مترجم)

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۲۴﴾ اور جب ان (منکرینِ آخرت) سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل فرمایا تو انہوں نے جواب دیا (رب نے کچھ نہیں اتارا) یہ تو گزرے ہوئے لوگوں کی لکھی ہوئی (داستانیں) ہیں۔ قبائلِ عرب کو جب پتہ چلا کہ مکہ میں ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے تو انہوں نے ایامِ حج میں تحقیقِ احوال کے لئے کچھ آدمیوں کو مکہ بھیجا۔ یہ نمائندے آئے اور مکہ کی گھاٹیوں میں جو مشرک بیرونی لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے پاس جانے سے روکنے کے لئے معمور تھے ان سے مل کر دریافت کیا کہ اللہ نے کیا کلام اُتارا ہے ان لوگوں نے جواب دیا، یہ اللہ کا بھیجا ہوا کلام نہیں ہے بلکہ وہی حکایتیں ہیں جو پچھلوں نے لکھ دی ہیں۔

سطر لائن کتاب کی ہو یا درختوں کی یا آدمیوں کی سطر کی جمع اسطر و سُطُور اور اسطار آتی ہے اور جمع الجمع اساطیر اور اسطورة ہے۔

لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ نتیجہ اس کہنے کا یہ ہوگا کہ قیامت کے دن اپنے گناہوں کا بھی بوجھ اٹھائیں گے یعنی یہ مشرک ایسا جواب اس لئے دیتے تھے کہ لوگوں کو گمراہ کر دیں اور قیامت کے دن اپنی گمراہی کے گناہوں کا بار پُورا پُورا اپنے اوپر اٹھائیں۔ کیونکہ گمراہ کنی علامت ہے کامل گمراہی کی دوسروں کو گمراہ بنانے سے معلوم ہوتا ہے کہ گمراہ کرنے والوں میں گمراہی جم گئی ہے (اسی وجہ سے تو وہ دوسروں کو بھی گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں)۔

وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ اور ان لوگوں کا بار (گناہ) بھی جن کو گمراہ کرتے ہیں یعنی کچھ گناہ ان لوگوں کا بھی اپنے اوپر اٹھائیں جو ان کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جاتے ہیں۔ کچھ (مِنْ) کہنے کی یہ وجہ ہے کہ گمراہ کرنے والوں کے گمراہ کرنے کی وجہ سے جو لوگ گمراہ ہو جاتے ہیں ان کے کچھ گناہ تو وہ ہوں گے جو گمراہ کرنے والوں کی گمراہ کنی کا نتیجہ ہوں گے اور کچھ اپنے خصوصی گناہ ہوں گے۔ اوّل الذکر گناہوں کا بار گناہ کرنے والوں کے برابر گمراہ کرنے والے پر بھی پڑے گا اور مؤخر الذکر گناہوں کے مجرم صرف گناہ گار ہی ہوں گے گمراہ کنی کو ان میں کوئی دخل نہ ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ گمراہ کرنے والوں کے گناہوں کا کچھ بار گمراہ کرنے والے بھی اٹھائیں گے۔ امام احمد، مسلم، اور اصحابُ السنن نے حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے

بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص ہدایت کی طرف بلائے گا اس کو بھی نیکی کرنے والے کی نیکی کے برابر اجر ملے گا اور نیکی کرنے والے کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی اور جو شخص گمراہی کی طرف بلائے گا اس پر بھی اتنا ہی گناہ ہوگا جتنا گناہ کرنے والے پر اور گناہ کرنے والے کے (ہاں) گناہ میں اس سے کوئی کمی نہیں آئے گی۔

بِغَيْرِ عِلْمٍ بغیر جاننے کے یعنی وہ گمراہ کرتے ہیں بغیر دلیل کے یا یہ مطلب ہے کہ گمراہ ہونے والے نادانستگی کی حالت میں گمراہ ہو جاتے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ گمراہ کرنے والے ان کو گمراہ کر رہے ہیں۔

آیت میں تنبیہ ہے اس امر پر کہ گمراہ ہونے کو نہ جاننا گمراہ ہونے والوں کے لئے کوئی عذر نہیں ہو سکتا ان کے لئے خود حق و باطل میں تمیز کرنا یا تحقیقات کرنا لازم تھا۔ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ ﴿۲۵﴾ قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ

خوب یاد رکھو کہ جس گناہ کو اپنے اوپر لاد رہے ہیں وہ بُرا بوجھ ہے۔ جو لوگ ان سے پہلے ہو گذرے ہیں انہوں نے بڑی بڑی تدبیریں کیں، یعنی اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ فریب کرنے کی بڑی تدبیریں کیں۔

فَأَتَى اللَّهُ بُنْيَانَهُم مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِن فَوْقِهِمْ وَأَتَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُونَ ﴿۲۶﴾ پس اللہ نے ان کا بنا بنایا گھر جڑ (بنیاد) سے ڈھا دیا پھر اوپر سے ان پر چھت آ پڑی اور (علاوہ ناکامی کے) ان پر اللہ کا عذاب ایسی طرح آ گیا کہ ان کو خیال بھی نہ تھا، یعنی ان کی تدبیروں کی جڑیں اکھاڑ دینے کے لئے اللہ کا حکم آ گیا اور ہلاکت آفریں عذاب ایسے راستوں پر اُن پر آ پہنچا جن کا ان کو گمان بھی نہ تھا ان کی تدبیریں ہی اسبابِ ہلاکت بن گئیں جیسے کوئی قوم اپنے بچاؤ اور دشمنوں کو روکنے کے لئے اگر کوئی عمارت بنائے پھر عمارت میں زلزلہ آ جائے بنیادیں ہلنے لگیں اور ستون نیچے گر جائیں اور چھت اوپر سے آ جائے اور سب دب کر مر جائیں یہی حالت ان لوگوں کی ہوئی ان کی تدبیریں خود ان ہی کے لئے تباہ کن ہو گئیں آیت مذکورہ بالا میں کافروں کی حالت کی تصویر کشی بطورِ تمثیل کی گئی ہے (یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی کوئی عمارت انہوں نے بنائی تھی اور وہ ڈھ گئی اور سب اس کے نیچے دب گئے)

ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بغوی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نیز بغوی نے وہب (بن منبہ) کا بیان نقل کیا ہے کہ آیتِ مذکورہ میں نمرود بن کنعان مراد ہے جس نے حضرت ابراہیمؑ سے اللہ کے متعلق مناظرہ کیا تھا اور آسمان کی طرف چڑھنے کے لئے بابل میں ایک اونچی عمارت بنوائی تھی اس عمارت کی بلندی پندرہ ہزار ہاتھ تھی۔ کعب کا اور مقاتل کا قول ہے کہ اس کی بلندی دو فرسخ تھی لیکن تیز آندھی کی وجہ سے وہ عمارت گر کر سمندر میں جا پڑی اور اس کا کچھ حصہ ان لوگوں پر گر پڑا جس کی وجہ سے وہ لوگ ہلاک ہو گئے۔

ثُمَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ يُخْزِيهِمْ پھر قیامت کے دن اللہ ان کو رُسوا کرے گا۔ یعنی ان کو ذلیل کرے گا اور دنیوی عذاب کے علاوہ ان کو رسوائی کے عذاب میں مبتلا کرے گا۔ دوسری آیت میں آیا ہے رَبَّنَا إِنَّكَ مَن تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ

وَيَقُولُ أَيْنَ شُرَكَائِيَ الَّذِينَ كُنتُمْ تُشَاقُّونَ فِيهِمْ اور فرمائے گا (آج) میرے وہ شُرکاء کہاں ہیں جن کی بابت تم (رسولِ خدا اور مسلمانوں کی) مخالفت کرتے تھے۔

قَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ اہلِ علم کہیں گے۔ یعنی انبیاء اور ملائکہ اور مؤمن نعمتِ ہدایت کا شکر ادا کرنے اور مشرکین کی توہین میں اضافہ کرنے اور کافروں کے دکھ پر مسرّت ظاہر کرنے کے لئے کہیں گے۔ اللہ نے قیامت میں ہونے والے واقعہ کو بیان کیا ہے۔ اس میں سننے والوں کے لئے ایک خاص مہربانی کا اظہار ہے۔

إِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوءَ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿۲۷﴾ آج بلاشبہ ذلّت اور عذاب کافروں پر ہو گا۔ اَلْیَوْمَ سے مراد ہے روز قیامت اَلْخِزْیُ ذلّت، توہین۔ اَلسُّوْءُ عذاب۔

الَّذِينَ تَتَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ جن کی جان فرشتوں نے حالتِ کفر پر قبض کی

تھی (یعنی آخر وقت تک کافر تھے) اپنے نفسوں پر ظلم کرنے والے۔ نفسوں پر ظلم کرنے سے مراد کفر کرنا۔ نفس کو دوامی عذاب میں مبتلا کرنے کا سامان کرنا نفس پر ظلم ہے۔

فَأَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْءٍ ط　پھر کافر لوگ صلح کا پیغام ڈالیں گے (اور کہیں گے) ہم تو کوئی بُرا کام نہیں کرتے تھے۔

مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْءٍ ط سَلَمَ کی تشریح ہے اور استسلام سے مراد ہے پیغامِ صلح (ترجمہ میں اسی تفسیر کا لحاظ کیا گیا ہے) یا اَلْقَوُا السَّلَمَ کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت کافر مطیع ہو جائیں گے۔ اطاعت کا اظہار کریں گے سُوْءٍ سے مراد ہے کفر اور سرکشی۔

بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۲۸　(فرشتے کہیں گے) کیوں نہیں (تم بُرے کام کرتے تھے) بے شک اللہ کو تمہارے سب اعمال کی پوری خبر ہے پس وہ تم کو تمہارے اعمال کی پاداش ضرور دے گا۔ انکار سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہوگا عکرمہ نے کہا اس سے مراد وہ کفار ہیں جو بدر کی لڑائی میں مارے گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بَلٰٓى سے آخر تک اللہ کا قول ہو۔ (فرشتوں کا نہ ہو)

فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝۲۹　پس جہنم کے دروازوں میں (سے جہنم میں) داخل ہو جاؤ اور اس میں ہمیشہ کے لئے رہو۔ غرض تکبر کرنے والوں کے لئے جہنم بُرا ٹھکانا ہے۔ یعنی تم میں سے ہر صِنف جہنم میں اس مخصوص دروازہ میں داخل ہو جو اس صِنف کے لئے مقرر کیا گیا ہے بعض علماء نے کہا ابوابِ جہنم سے مراد ہیں عذابِ جہنم کی مختلف قسمیں۔

ضروری توضیح از مترجم

بظاہر خَالِدِيْنَ فِيْهَا، اُدْخُلُوْا کی ضمیر فاعل سے حال ہے اور حال وذوالحال کا زمانہ حسبِ قاعدۂ نحو ایک ہونا چاہئے اور ظاہر ہے کہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت خُلود نہیں ہو سکتا۔ داخل ہونا محدود وقت میں ہوگا اور اندر رہنا ہمیشہ ہوگا اور اس لئے حضرت مفسّر نے خَالِدِيْنَ کی تفسیر میں مُقَدَّرِيْنَ الْخُلُوْدَ فرمایا یعنی خَالِدِيْنَ سے مراد یہ ہے کہ داخلہ کے وقت تمہارے لئے خُلود مقرر کر دیا گیا ہے اور حکم دے دیا گیا ہے کہ دوزخ کے اندر ہمیشہ رہو گے۔ ترجمہ میں مفسّرؒ کی اس توجیہ کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

وَقِيْلَ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا مَاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ط قَالُوْا خَيْرًا ط　اور جو لوگ (گمراہ ہونے اور گمراہ کرنے سے) بچے رہے ان سے کہا گیا کہ تمہارے رب نے کیا نازل کیا تو انہوں نے کہا، بڑی بہتر چیز نازل کی۔ یعنی ایسا کلام نازل کیا جس میں دنیا و دین کی بھلائی ہے۔

لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ط　جن لوگوں نے اس دنیا میں نیک کام (افکار و اعمال) کئے ان کے لئے (اس دنیا میں بھی) بھلائی ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک حَسَنَةٌ سے مراد ہے ثواب کو دس گناہ تک بڑھا دینا ضحاک نے کہا اس سے فتح و نصرت مراد ہے۔ مجاہد نے اچھی روزی مراد لی ہے میں کہتا ہوں حَسَنَةٌ سے مراد ایسی پاکیزہ زندگی ہے جو خالق کی نظر میں بھی پسندیدہ ہو اور دانش مند صحیح ذوق رکھنے والے آدمیوں کی نظر میں بھی یعنی مخلوق کی پرستش نہ کرے صرف اللہ واحد و بے نیاز کی عبادت کرے اور اسی کی معرفت و قرب کا طلب گار ہو، پاکیزہ (حلال) چیزوں کو حلال سمجھے اور گندی (حرام) چیزوں کو حرام جانے کسی کو ناحق دُکھ نہ دے اور ایسے عمل کرے جن کا اچھا پھل اس کو آخرت میں ملے۔

وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ ط　اور بلاشبہ آخرت (کی زندگی) کا گھر دنیا (کی زندگی) کے گھر سے اہلِ تقویٰ کے لئے بہتر ہے دنیوی زندگی میں جو نیک اعمال انہوں نے کئے ہوں گے ان کا اچھا پھل ان کو آخرت میں ملے گا اور ہمیشہ ہمیشہ ان کو اللہ

کی طرف سے عزت حاصل رہے گی۔

وَلَنِعْمَ دَارُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۰ اور بے شک (دارِ آخرت) متقیوں کے لئے بہت اچھا مکان ہے حسن نے کہا "دارُ المتقین" سے مراد دنیا ہے اہلِ تقویٰ یہیں سے آخرت کا سامان لے کر جاتے ہیں۔ اکثر اہلِ تفسیر کے نزدیک "دارالمتقین" سے مراد دارِ آخرت ہے۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ ان کے لئے عدن کی جنتیں ہیں یا آخرت میں ان میں ان کا مسکن جناتِ عدن ہے۔

يَّدْخُلُوْنَهَا تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ ۭ جن کے اندر متقی داخل ہوں گے (اور) جن کے درختوں کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی (اور) جو کچھ اہل جنت چاہیں گے ان کو وہاں ملے گا۔

مَا يَشَآءُوْنَ کا مطلب یہ ہے کہ اقسامِ مرغوبات میں سے جو کچھ چاہیں گے ان کو جنت میں ملے گا فِيْهَا کو مَا يَشَآءُوْنَ سے پہلے ذکر کرنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ انسان کے تمام مرغوبات صرف جنت میں ہی مل سکیں گے (دنیا میں تمام مقاصد کی تکمیل نہیں)۔

كَذٰلِكَ يَجْزِي اللّٰهُ الْمُتَّقِيْنَ ۝۳۱ اسی طرح اللہ متقیوں کو جزا دے گا یعنی جو لوگ شرک اور بد اعمالی سے پرہیز رکھیں گے ان کو اللہ ایسی ہی جزا دے گا جیسی اوپر ذکر کردی گئی۔

الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۳۲

جن کی روح فرشتے اس حالت میں قبض کرتے ہیں کہ وہ (شرک سے) پاک ہوتے ہیں وہ فرشتے ان سے کہتے جاتے ہیں تم پر سلامتی ہو (اللہ تم کو عذاب اور دکھ سے محفوظ رکھے) اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ۔

طیبین یعنی کفر اور بد اعمالی سے پاک ہونے کی حالت میں۔ پہلی آیت میں بیان کیا تھا کہ کافر جب کفر کی وجہ سے اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہوں گے ایسی حالت میں فرشتے ان کی روح قبض کریں گے، ان کے مقابلے میں متقیوں کا ذکر اس آیت میں کیا اور فرمایا متقی پاک زندگی والے ہوں گے اسی پاکیزگی کی حالت میں فرشتے ان کی جانیں قبض کریں گے مجاہد نے طیبین کا معنی بیان کیا پاک قول و عمل والے بعض نے طیبین کا ترجمہ کیا ہے خوش یعنی فرشتوں کی بشارتِ جنت سے خوش ہونے والے یا یہ مطلب ہے کہ چونکہ ان کی کامل توجہ بارگاہِ قدس کی طرف ہوتی ہے اس لئے وہ اپنی روحیں قبض ہونیکی حالت میں خوش ہوتے ہیں

سَلٰمٌ عَلَيْكُم، فرشتوں کا قول ہے۔ بعض کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ فرشتے انؑ کو اللہ کا سلام پہنچاتے ہیں۔

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ یعنی جنت تمہارے اعمال کے سبب تمہارے لئے تیار ہے جب تم اٹھائے جاؤ گے تو فرشتے کہیں گے "سلام علیکم" جنت میں داخل ہو جاؤ یا یہ مطلب ہے کہ مرنے کے وقت فرشتے ان سے "سلام علیکم" کہتے ہیں اور جب قیامت کے دن ان کو اٹھایا جائے گا تو حکم ہوگا جنت میں داخل ہو جاؤ۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ کیا یہ کافر صرف اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ (ان کی روحیں قبض کرنے کو) فرشتے آپہنچیں (اور اس وقت یہ ایمان لائیں) یا اللہ کا حکم (یعنی قیامت یا عذاب مہلک) آجائے (تو ایمان لائیں)۔

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ (جیسے ان کافروں نے شرک و تکذیب کو اختیار کیا) اسی طرح ان سے پہلے لوگوں نے بھی کیا تھا اور جو عذاب ان پر آنا تھا آگیا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۳۳ اور (عذاب دے کر) اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے اوپر ظلم کرتے تھے۔ کہ کفر اور معاصی کا ارتکاب کرتے تھے جو ان کے عذابِ خداوندی میں مبتلا ہونے کا موجب ہوئے۔

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۴

آخر اُن کے اعمالِ بد کی سزائیں ملیں اور جس عذاب (کے بیان) پر وہ ہنستے تھے ان کو اسی نے آگھیرا۔ سَیِّاٰتِ سے پہلے مضاف محذوف ہے یعنی بُرے اعمال کی سزا ان پر آگئی یا سَیِّاٰتِ سے مراد ہیں سزائیں اور مَا عَمِلُوْا سے مراد ہے کفر و معصیت یعنی کفر و معصیت کی سزائیں ان کو ملیں۔ حَاقَ بِهِمْ ان پر نازل ہو گیا یا ان کو گھیر لیا۔ مَا كَانُوْا میں مَا مصدری ہے یعنی استہزاء (کی سزا) نے ان کو گھیر لیا (اس وقت مضاف محذوف ہوگا) یا مَا موصولہ ہے اور اس سے مراد عذاب ہے۔ کفار بطورِ مذاق کہتے تھے لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ ہمارے کہنے پر اللہ ہم کو عذاب کیوں نہیں دیتا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ط اور مشرک کہتے ہیں کہ اگر اللہ کو منظور ہوتا تو اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ ہم کرتے نہ ہمارے باپ دادا اور نہ اس کے (حکم کے) بغیر ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے پھر بعثتِ پیغمبر اور احکامِ تکلیفیہ کا فائدہ ہی کیا ہے، یا یہ کلام سنجیدگی سے کہتے تھے اور مرضی و مشیّت میں ان کے نزدیک کوئی فرق نہ تھا ہر کام چونکہ اللہ کی مشیت سے ہونا مسلّمہ حقیقت ہے اس لئے وہ سمجھے کہ ہمارا اور ہمارے باپ دادا کا شرک کرنا اور حلال کو حرام خود بنالینا بھی اللہ کی مرضی ہے اور ہمارا یہ فعل اللہ کو ناپسند نہیں ہے۔

كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ ان سے پہلے لوگوں نے بھی ایسا ہی کیا تھا۔ شرک کرنے اور حلال کو از خود حرام بنانے کی یہی علّت بیان کی تھی۔

فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۳۵ سو پیغمبروں کا فریضہ تو واضح طور پر اللہ کا پیام پہنچا دینا ہے۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی کام نہیں ہدایت یاب کرنا تو اللہ کے قبضہ میں ہے اور اسی کی مشیّت پر موقوف ہے، البتہ اللہ کی خوشنودی کا راستہ بتا دینا پیغمبروں کا فریضہ ہے اس سے آگے آیاتِ ذیل میں بیان فرمایا ہے کہ پیغمبر بھیجے ہیں اور بعثتِ انبیاء کو ذریعہ ہدایت اور سببِ خلافت قرار دیا ہے جس کو اللہ نے ہدایات یاب بنانا چاہا پیغمبر کی بعثت اس کے لئے سبب ہدایت بن گئی اور جس کو اللہ نے گمراہ بنا دینا چاہا پیغمبر کی بعثت سے اس کی گمراہی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ پیغمبر کی بعثت تو اعلیٰ نفیس غذا کی طرح ہے۔ مناسب مزاج والے کو نفیس غذا طاقت پہنچاتی ہے اور بگڑے ہوئے مزاج والے کے مزاج میں مزید بگاڑ کا سبب بن جاتی ہے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ
اور ہم نے ہر امّت میں یہ پیام پہنچانے کے لئے پیغمبر کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچتے رہو یعنی شیطان کی پیروی نہ کرو۔ وہ طاغوت ہے اللہ کی عبادت سے بہت بڑا طاغی (سرکش)

فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ پس ان میں سے بعض کو تو اللہ نے ہدایت یاب کر دیا جس کو ہدایت یاب کرنا چاہا اس کو پیغمبروں کی رہنمائی سے ایمان کی توفیق دے دی۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ط اور ان میں سے بعض لوگوں کے لئے (بقضاء ازلی حسبِ مشیّتِ الٰہی) گمراہی محقق ہو گئی (مضبوط ہو گئی) اللہ نے ان کو ایمان کی توفیق نہیں دی اور ان کو ہدایت یاب کرنا نہ چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفر کی ہی حالت میں ان کو ہلاک کر دیا ان کی بستیوں کو اُجاڑ دیا ان کے محل ویران ہو گئے اور ان کے (جاگیری) کنویں بغیر مالکوں کے خالی پڑے رہ گئے۔

فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝۳۶ (اے گروہ قریش) ذرا ملک میں چل پھر کر دیکھو کہ پیغمبروں کو جھوٹا قرار دینے والوں کا کیسا (بُرا) انجام ہوا۔ عاد، ثمود، قومِ لوط اور بن والوں (یعنی قوم شعیب) کی بستیاں دیکھو۔ کافروں نے اللہ کی مشیّت اور مرضی کو ایک سمجھ رکھا تھا۔ اس خیال کا ازالہ اس آیت میں کر دیا کیوں کہ ان اقوام کی طرف سے تکذیب کا ارتکاب تو مشیّتِ خدا تھا اب اگر تکذیب ہی میں اس کی مرضی ہوتی تو ان پر عذاب نازل نہ فرماتا۔

اس سے آگے رسول اللہ ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کفارِ قریش پر گمراہی کی مہر اللہ کی طرف سے ثبت ہو چکی ہے آپ اپنے جی کو ہلکان نہ کریں اور ان کو ہدایت یاب بنانے کی حرص نہ کریں۔ فرمایا ہے۔

اِنۡ تَحۡرِصۡ عَلٰی هُدٰىهُمۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَهۡدِیۡ مَنۡ یُّضِلُّ وَمَا لَهُمۡ مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ ﴿۳۷﴾

ان کے راہِ راست پر آنے کی آپ کتنی ہی تمنا کریں اللہ ایسے لوگوں کو ہدایت یاب نہیں کرتا جن کو گمراہ کرنا اس کو مقصود ہوتا ہے اور ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔

یعنی اللہ جس کو گمراہ رکھنا ہی چاہے اس کو پھر ہدایت یاب نہیں کرتا۔ آیت لِمَنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ کا جو مفہوم ہے وہ مَنْ يُّضِلُّ کا مفہوم ہے۔

مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ کا یہ مطلب ہے کہ جن کو خدا ہی گمراہ کر دے اُن کی مدد کرنے والا اور حکم خدا کو نافذ ہونے سے روکنے والا اور اللہ کے مقرر کردہ عذاب کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ محمد اگر آپ ان کو ہدایت یاب بنانے کی کتنی ہی حرص کریں اور ان کو ہدایت کرنے میں کتنی ہی تکلیف اٹھائیں جب ان کو خدا نے ہی گمراہ کر دیا ہے تو آپ کی اس حرص سے اُن کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا اور ان کو ہدایت یافتہ بنانے کی آپ کو قدرت نہ ہو گی، اللہ سب پر غالب اور قوی ہے جس کو وہ گمراہ کر دے اس کو نہ کوئی ہدایت کرنے والا ہے نہ مدد گار کہ عذاب کو دفع کر سکے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابو العالیہ کی روایت سے لکھا ہے کہ ایک مسلمان کا کسی مشرک پر کچھ قرض تھا۔ مسلمان مشرک کے پاس تقاضا کرنے گیا اور اپنے قرض کے متعلق کچھ گفتگو کی اثناء کلام میں یہ بات بھی مسلمان نے کہہ دی کہ مرنے کے بعد مجھے اللہ سے یہ امیدیں ہیں مشرک بولا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کا یقین ہے میں اللہ کی پختہ قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو مر گیا اللہ اس کو دوبارہ زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا اس پر آیتِ ذیل نازل ہوئی۔

وَاَقۡسَمُوۡا بِاللّٰهِ جَهۡدَ اَیۡمَانِهِمۡ ۙ لَا یَبۡعَثُ اللّٰهُ مَنۡ یَّمُوۡتُ ؕ اور انہوں نے اللہ کی پختہ قسمیں کھا کر کہا کہ جو مر جائے گا اللہ اس کو نہیں اٹھائے گا اس جملہ کا عطف وَقَالَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْا پر ہے اور یہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ جس طرح یہ توحید کے منکر ہیں اسی طرح مضبوط قسمیں کھا کر مرنے کے بعد جی اٹھنے کا بھی انکار کرتے ہیں اس کی تردید میں اللہ نے فرمایا۔

بَلٰی وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا وَّلٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۸﴾ کیوں نہیں (اٹھائے گا) اس نے اس کا پختہ وعدہ کر لیا ہے اس پر (وعدہ پورا کرنا) ضروری ہے (کیونکہ دوبارہ زندہ کر کے اٹھانا اس کی حکمت کا تقاضا ہے اور تقاضائے حکمت کے خلاف ہونا ممکن نہیں اور اس کے وعدہ کی خلاف ورزی محال ہے) اس نے (قیامت برپا کرنے کا) وعدہ بہت پختہ کر لیا ہے مگر اکثر لوگ نہیں جانتے (کہ اللہ کے وعدہ کے خلاف ہونا ناممکن ہے) یا یہ مطلب ہے کہ اکثر لوگ قیامت کا یقین نہیں رکھتے کیونکہ وہ نہیں جانتے کے قیامت کا برپا ہونا اللہ کی حکمت کا تقاضا ہے اس کے علاوہ ان کی نظریں کوتاہ ہیں محسوسات کی عادی ہیں۔ غیر معمولی حادثہ کے واقع ہونے کو محال جانتی ہیں۔

لِیُبَیِّنَ لَهُمُ الَّذِیۡ یَخۡتَلِفُوۡنَ فِیۡهِ (وہ قیامت قائم کرے گا) تاکہ ان پر وہ امر (حق) واضح کر دے جس کے متعلق وہ (دنیا میں) اختلاف کرتے تھے۔

لَهُمْ کی ضمیر مرنے والوں کی طرف لوٹ رہی ہے خواہ کافر ہوں یا مؤمن۔

وَلِیَعۡلَمَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اَنَّهُمۡ کَانُوۡا کٰذِبِیۡنَ ﴿۳۹﴾ اور تاکہ (قیامت کے دن) کافر جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے۔

کافر کہتے تھے کہ جو مر گیا اللہ دوبارہ اس کو زندہ کر کے نہیں اٹھائے گا۔

لِيُبَيِّنَ اور لِيَعْلَمَ میں قیامت قائم کرنے کی علت اور حکمت بیان فرمائی ہے حق و باطل اور حق پرست و باطل پرست میں تمیز کر دینا اور ہر فریق کو سزا یا جزا دینا تقاضائے حکمت ہے جس کا ظہور قیامت کے دن ہو گا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لِيُبَيِّنَ کا تعلق آیت وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَسُولًا سے ہو یعنی ہر امت میں ہم نے پیغمبر بھیجا تا کہ پیغمبر وہ امر حق ظاہر کر دے جس کی بابت اس امت میں اختلاف تھا اور لوگوں کو بتادے کہ وہ گمراہی پر ہیں اللہ پر بہتان تراشی اور دروغ بندی کرتے ہیں (اللہ نے ان کو بت پرستی اور حلال کو حرام بنانے کا حکم نہیں دیا)

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾ ہم جس چیز کو پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ع ۵
اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا کافی ہوتا ہے کہ ہو جا پس وہ فوراً ہو جاتی ہے۔

إِذَا أَرَدْنَاهُ یعنی جب ہم کسی چیز کو موجود کرنا چاہتے ہیں خواہ وہ پہلی بار یا دوبارہ۔ اس آیت میں دوسری زندگی کا امکان ثابت کیا گیا ہے۔ خلاصہ بیان یہ ہے کہ اللہ مخلوق کو محض اپنی قدرت سے پیدا کرتا ہے کسی اور چیز پر کسی مخلوق کی ہستی موقوف نہیں ورنہ نتائج و اسباب کا تسلسل کہیں ختم نہ ہو گا اور کسی چیز کا وجود ہی نہ ہو سکے گا پھر کسی چیز کی تخلیق و تکوین سے اللہ کو کوئی تھکان یا تکلیف نہیں ہوتی ورنہ خدا کا عاجز ہونا لازم آئے گا۔ اور عجز تقاضائے الوہیت کے خلاف ہے پس جب کہ کوئی مادہ نہ تھا نہ سابق میں کوئی نظیر اور مثال تھی بلکہ اللہ نے تمام چیزوں (یہاں تک کہ خود مادہ) کو بغیر مادہ اور مثال کے پہلی مرتبہ پیدا کر دیا تو (اب جبکہ ایک مثال موجود ہو چکی ہے) دوبارہ پیدا کرنا ناممکن نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا، میرے بندے نے میری تکذیب کی اور اس کے لئے یہ زیبا نہ تھا اور میرے بندے نے مجھے گالی دی اور یہ اس کے لئے مناسب نہ تھا۔ تکذیب تو یہ کی کہ اس نے کہا اللہ نے جیسا شروع میں مجھے پیدا کر دیا ایسا دوبارہ ہرگز مجھے پیدا نہیں کرے گا۔ حالانکہ ابتدائی تخلیق میرے لئے دوبارہ تخلیق سے آسان نہ تھی اور گالی یہ دی کہ اس نے کہا اللہ نے اپنے لئے اولاد اختیار کر لی ہے حالانکہ میں ایک ہوں، بے نیاز ہوں، نہ میں کسی کا باپ ہوں نہ کسی کا بیٹا، میری مثل کوئی بھی نہیں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں اس کا گالی دینا تو یہ ہے کہ اس نے کہا میری اولاد ہے، حالانکہ میں پاک ہوں بی بی یا اولاد اختیار کرنے سے۔ رواہ البخاری۔

وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا ظُلِمُوا اور جن لوگوں نے اللہ کے واسطے اپنا وطن چھوڑ دیا بعد اس کے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

فِي اللَّهِ، یعنی اللہ کی راہ میں۔ اللہ کے معاملہ میں اللہ (کو ماننے) کی وجہ سے ظُلِمُوا بعد اس کے کہ ان کو سخت دکھ دیئے گئے اور ایذائیں پہنچائی گئیں۔ عبد الرزاق اور ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ اور داؤد بن ہند کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول حضرت ابو جندل بن سہیل کے متعلق ہوا۔ مشرکوں نے مکہ میں آپ کو قید کر رکھا تھا اور دکھ پہنچائے تھے۔ ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے اور عبد بن حمید نے قتادہ کا قول نقل کیا ہے کہ اس آیت کا نزول چند صحابہ کے متعلق ہوا جن پر مکہ والوں نے مظالم کئے تھے اور گھروں سے نکال باہر کر دیا تھا انہی مظلوموں میں سے ایک گروہ ملک حبش کو چلا گیا تھا پھر اللہ نے انکو مدینہ میں ٹھکانا دے دیا مدینہ کو ان کے لئے دار الہجرت بنا دیا اور کچھ مؤمنوں (یعنی مدینہ والوں) کو ان کا مددگار کر دیا۔ وقف لازم

لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۖ وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ أَكْبَرُ ہم ضرور دنیا میں ان کا ٹھکانہ دیں گے اچھی طرح اور آخرت کا اجر تو بہت ہی بڑا ہے اچھے ٹھکانے سے مراد ہے مدینہ۔

بغوی نے لکھا ہے روایت میں آیا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ جب کسی مہاجر کو کچھ عطا فرماتے تھے تو کہتے تھے یہ لے لو اللہ تم کو مبارک کرے یہ چیز تو وہ ہے جس کے دینے کا اللہ نے تم سے دنیا میں وعدہ کیا تھا اور آخرت میں جو تمہارے لئے رکھ چھوڑا ہے وہ بہت بہتر ہے پھر آپ یہی آیت تلاوت فرماتے تھے۔

بعض علماء کے نزدیک آیت کا معنی یہ ہے کہ ہم دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کریں گے بعض نے کہا، دنیا میں بھلائی سے مراد ہے ایمان کی توفیق اور نیکی کی ہدایت۔

لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿۴۱﴾ اگر (کفار) جانتے ہوتے (کہ اللہ ان مہاجروں کو دونوں جہان کی بھلائی عطا فرمائے گا تو ان پر ظلم نہ کرتے انکی تائید کرتے) یا یہ مطلب ہے کہ اگر مہاجروں کو معلوم ہوتا (کہ ہمارے لئے اس دکھ پانے کا یہ اجر ہے) تو وہ اور زیادہ کوشش کرتے اور مزید صبر سے کام لیتے۔

الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿۴۲﴾ وہ ایسے ہیں کہ صبر کرتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

صَبَرُوْا کا مفعول محذوف ہے یعنی کافروں کی طرف سے ایذا پانے اور وطن چھوڑنے اور دوسرے مصائب پر صبر کرتے ہیں۔

یَتَوَکَّلُوْنَ یعنی اپنے تمام معاملات اللہ کے سپرد کردیتے ہیں اور سب سے (دل کا) تعلق توڑ کر اللہ سے اپنا رابطہ جوڑ لیتے ہیں۔ جب کافروں نے رسول اللہ ﷺ کی نبوّت کا انکار کر دیا اور کہنے لگے کوئی آدمی اللہ کا پیغامبر نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے ہماری ہدایت کے لئے کسی فرشتے کو کیوں نہیں بھیجا۔ اس پر آیت کا نزول ہوا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِمْ اور آپ سے پہلے بھی ہم نے (آدمیوں کے پاس) مرد ہی پیغمبر بنا کر بھیجے (ملائکہ کو نہیں بھیجا) ہم ان کے پاس (ملائکہ کے ذریعہ سے) وحی بھیجتے رہے۔

فَاسْأَلُوا أَهْلَ الذِّكْرِ إِن كُنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿۴۳﴾ پس اگر تم نہیں جانتے ہو تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔ یعنی اگر آدمیوں کے پیغمبر ہونے میں تم کو شک ہے تو جن کو کتبِ سابق کا علم ہے یہودی ہوں یا عیسائی ان سے دریافت کرلو کہ اللہ نے بنی اسرائیل کے پاس موسیٰؑ اور عیسیٰؑ وغیرہ کو پیغمبر بنا کر بھیجا تھا اور ان سے پہلے آدمؑ اور نوحؑ وغیرہ کو ان کی امتوں کو ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔

آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ جن لوگوں کو علم نہ ہو ان کو علماء سے دریافت کرنا چاہئے اور اگر بتانے والا ثقہ ہو تو اس کی خبر مفیدِ علم ہوتی ہے اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ (ہم نے مردوں کو پیغمبر بنا کر بھیجا) کھلے معجزات اور کتابوں کے ساتھ۔

وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ اور ہم نے آپ پر بھی ایک نصیحت نامہ (یعنی قرآن مجید) اتارا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے کھول کر اسکا اظہار کر دیں جو (آپ کے ذریعہ سے) ان کے پاس بھیجا گیا ہے "مانزّل" سے مراد ہے ثواب کا وعدہ، عذاب کی وعید، احکام اور مجمل قوانین، بیان (جس کا رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے) قولی بھی ہے عملی بھی اور تقریری بھی اس کو تو بیانِ صریح کہا جاتا ہے بیان کی دوسری قسم غیر صریحی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ نے قیاس کرنے کا حکم دیا ہے (پس مقیس علیہ میں تو صریحی بیان ہوتا ہے اور مقیس میں غیر صریحی)

وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ﴿۴۴﴾ اور تاکہ وہ غور کریں۔ غور کرنے سے مراد ہے رفتارِ عبارت اور اقسامِ دلالت پر غور کرنا اس طرح کہ شارع کی طرف سے کسی بیان کی ضرورت نہ ہو مثلاً آیت فَأْتُوا حَرْثَكُمْ میں لفظ حَرْث بتا رہا ہے کہ اس سے مراد زنانہ شرمگاہ ہے مبرز مراد نہیں ہے کیونکہ مبرز کھیتی (تخم آفرینی) کا مقام نہیں ہے (مبرز میں تخم ریزی ضیاعِ تخم ہے) یا آیت ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ میں قُرُوْٓءٍ سے مراد حیض ہے۔ طُہر مراد نہیں ہے کیونکہ طلاقِ مسنون طہر کے زمانہ میں ہی ہوتی ہے اب اگر جس طہر کے زمانہ میں طلاق دی ہو اس کو پورا طہر محسوب کر لیا جائے تو تین طہر سے مدّت کم ہو جائے گی اور محسوب نہ کیا جائے تو مدّت تین سے بڑھ جائے گی بہر حال پورے تین طہر نہ ہوں گے۔ اس سے ثابت ہوا کہ قروء سے مراد طہر نہیں ہے بلکہ حیض مراد ہے۔

النصف

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰہُ بِہِمُ الْاَرْضَ جو لوگ بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں کیا وہ اس بات سے بے فکر ہیں کہ اللہ ان کو زیر زمین دھنسا دے۔

مشرکوں نے بُری بُری تدبیریں کی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کو شہید کر دینے یا بند رکھنے یا جلاوطن کرنے کے مشورے کئے تھے اور لوگوں کو ایمان سے روکنے کی بھی منصوبہ بندی کی تھی۔

اَوْ یَاْتِیَہُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَیْثُ لَا یَشْعُرُوْنَ ﴿۴۵﴾ یا (اچانک آسمان سے کوئی غیبی) عذاب ان پر ایسے طریقے سے آجائے کہ ان کے گمان میں بھی نہ ہو۔ جیسے قوم لوطؑ اور قوم شعیبؑ پر آیا تھا۔

اَوْ یَاْخُذَہُمْ فِیْ تَقَلُّبِہِمْ فَمَا ہُمْ بِمُعْجِزِیْنَ ﴿۴۶﴾ یا (سفر میں) آتے جاتے اللہ ان کو عذاب میں دھر پکڑے، سو وہ لوگ خدا کو ہرگز نہیں ہرا سکتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے تقلّب کا ترجمہ کیا ہے" اختلاف" اور ابن جریج نے ترجمہ کیا ہے" اقبال وادبار" (دونوں ترجمے ہم معنی ہیں یعنی آمد ورفت)

اَوْ یَاْخُذَہُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ یا گھٹاتے گھٹاتے سب کو پکڑ لے۔ تخوّف کا معنی ہے گھٹانا۔ تخوّفتہٗ میں نے اس کو کم کر دیا تخوّفہ الدہر زمانے نے اس کو جسمانی ومالی نقصان پہنچایا بغوی نے لکھا ہے تخوّف کا یہ معنی قبیلہ بنی ہُذیل کے محاورہ میں آیا ہے گھٹانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو آج کسی کو کل کسی کو پرسوں اللہ ہلاک کر دے اور اسی طرح سب کو ختم کر دے ضحاک اور کلبی نے کہا تخوّف کا معنی خوف ہی ہے میں کہتا ہوں اس صورت میں آیت کا مقصد یہ ہوگا کہ جب دوسرے ہلاک کر دیئے جائیں تو ان کی ہلاکت کو دیکھ کر لوگ خوف زدہ ہو جائیں اور اس خوف کی حالت میں ان پر بھی ہلاکت آجائے یا یہ مطلب ہے کہ پہلے ہلاکت کی نشانیاں ظاہر کر دی جائیں جن سے وہ لوگ خوف زدہ ہو جائیں ان کو ہلاک کر دیا جائے جیسے قوم ثمود کو ہلاک کیا گیا تھا پہلے روز اُن کے چہرے زرد پڑ گئے تھے دوسرے روز سرخ اور تیسرے روز سیاہ ہو گئے اس کے بعد ان کو ہلاک کر دیا گیا۔

فَاِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ ﴿۴۷﴾ پس بلاشبہ تمہارا رب بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ اسی وجہ سے وہ فوراً عذاب میں مبتلا نہیں کرتا اور فوری سزا نہ دینے کی وجہ سے لوگ بے خوف ہو گئے ہیں، حالانکہ یہ بے باکی اور عذاب نہ ہونے کا یقین کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ رحیم ہونے کے باوجود اللہ سخت منتقم بھی ہے اس کا انتقام بہت سخت ہے کسی میں بھی اس کے مقابلے کی طاقت نہیں ہے۔

اَفَاَمِنَ کا عطف آیت وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ اِلَّا رِجَالًا پر ہے اور فاء تعقیب کے لئے ہے یعنی جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لئے آدمیوں کو ہی پیغمبر بنا کر بھیجا تو پھر محمد ﷺ کا انکار اور آپ ﷺ کو مغلوب کرنے کی تدبیریں اور ان بری تدبیروں کے برے نتیجہ سے نڈر ہو جانا بالکل نازیبا اور ناروا ہے، یہ رسول بھی گزشتہ رسولوں کی طرح ہیں جن کی مخالفت گزشتہ امتوں کے لئے تباہ کن ثابت ہو چکی ہے۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ کیا انہوں نے اللہ کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا ہے تو اللہ کی قدرت کاملہ اور ہمہ گیر غلبہ کا ادراک ان کو کیوں نہیں ہوا اور کیوں اس کے عذاب سے نڈر ہو گئے۔

یَتَفَیَّؤُا ظِلٰلُہٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰہِ وَہُمْ دٰخِرُوْنَ ﴿۴۸﴾

جن کے سائے کبھی ایک طرف کو، کبھی دوسری طرف کو جھکتے جاتے ہیں کہ (بالکل) خدا کے حکم کے تابع ہیں اور وہ (چیزیں) بھی عاجز ہیں یعنی کیا انہوں نے ان چیزوں کو نہیں دیکھا جن کے سائے سورج کے چڑھنے اُترنے یا مشرق ومغرب کے اختلاف کی وجہ سے دائیں بائیں یعنی دونوں طرف بحکم الٰہی جھکتے ہیں۔ سُجَّدًا میں سجدہ سے مراد ہے اطاعت اختیاری ہو یا فطری سَجَدَتِ النَّخْلَۃُ کھجور کا درخت سجدہ کرنے لگا۔ یعنی پھلوں کا زیادہ بار پڑنے سے جھک گیا، سَجَدَ الْبَعِیْرُ اونٹ نے اپنے اوپر سوار کرنے کے لئے گردن جھکا دی۔ مطلب یہ ہے کہ سائے اللہ کے ضابطۂ فطرت کے تابع ہیں یا یہ مطلب ہے کہ سجدہ کی

ہیت کی طرح زمین پر گرتے اور چسپاں رہتے ہیں اور سایہ والی چیزیں بھی عاجز بے بس اور اللہ کے حکم کی تابع ہیں۔
وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ اور اللہ ہی کی مطیع ہیں جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چلنے والی چیزیں زمین میں ہیں۔
مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے مراد ہے چاند، سورج، ستارے۔ اور مِنْ دَآبَّةٍ: مَا فِي الْاَرْضِ کا بیان ہے یا مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ دونوں کا بیان مِنْ دَآبَّةٍ ہے یعنی چلنے والی چیزیں آسمانوں میں ہو یا زمین میں۔ دَبِيْبٌ جسمانی حرکت کو کہتے ہیں آسمان ہو یا زمین میں۔
وَالْمَلٰٓئِكَةُ اور فرشتے بھی۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ کا عطف مَا فِي السَّمٰوٰتِ پر ہے کیونکہ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے آسمانی چیزیں مراد ہیں چاند، سورج، ستارے اور مَا فِي الارض سے مراد زمین کی حرکت کرنے والی چیزیں ہیں اور ملائکہ کچھ زمین کے ہیں اور کچھ آسمان کے اور کچھ حاملینِ عرش ہیں جو نہ آسمانی ہیں نہ زمینی اس لئے ملائکہ نہ سماوی جنس سے ہیں نہ ارضی مخلوقات میں سے بلکہ سب سے الگ مخلوق ہیں (اور اگر ملائکہ کو موجوداتِ سماوی وارضی میں شامل مانا جائے تو پھر) ملائکہ کا عطف خصوصیت ظاہر کرنے کے لئے ہوگا جیسے آیت تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ میں رُوح (جبرئیل) کا عطف ملائکہ پر اظہارِ خصوصیت کے لئے ہے اس صورت میں وَالْمَلٰٓئِكَةُ کا ترجمہ ہوگا اور بالخصوص ملائکہ بھی۔
سُجود سے مراد ہے اطاعت وانقیاد (خواہ طبعی تاثیر کی شکل میں ہو یا ارادہ اور قصد کے ساتھ احکامِ تکلیفیہ کی تعمیل کی صورت میں۔ انقیادِ عمومی میں تمام مخلوق کی ارادی اطاعت یہاں تک کہ شرّ الدواب یعنی کفار کا طبعی انقیاد بھی شامل ہے۔ بعض علماء کے نزدیک سجودِ اشیاء سے مراد ہے "ہر چیز میں اللہ کی پُر حکمت صنعت کا ظہور" جو اہلِ عقل کو دعوتِ سجدہ دے رہا ہے میرے نزدیک سجودِ اشیاء سے مراد اطاعتِ شعوری ہے جاندار ہو یا بے جان، نامی ہو یا جامد، ہر چیز ایک خاص زندگی رکھتی ہے اور کوئی چیز بھی شعور سے خالی نہیں خواہ ہم بعض چیزوں کو بیجان اور بے شعور جانتے ہوں ہم کو ان کے باشعور اور زندہ ہونے کا علم نہ ہو مگر اللہ کے نزدیک وہ باشعور اور زندہ ہیں اسی مضمون کی تائید مختلف آیات سے ہو رہی ہے اللہ نے فرمایا وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ۔ قَالَتَا اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ۔ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا۔
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اَطَّتِ السَّمَآءُ وَحُقَّ لَهَا اَنْ تَئِطَّ آسمان (خوف سے) چرچرایا اور چرچرانا (یعنی اللہ سے ڈرنا) ہی اس کے لئے مناسب تھا۔
اس توجیہ پر آیتِ مذکورہ میں کافروں کے علاوہ دوسری مخلوق مراد ہوگی کافر مستثنیٰ ہوں گے۔ اللہ نے سورۂ حج کی آیتِ سجدہ میں وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فرمایا ہے جس سے کافروں کا استثناء ظاہر ہو رہا ہے۔ آئندہ آیت بھی اس تخصیص کو ظاہر کر رہی ہے۔
وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۹﴾ اور (اللہ کی عبادت سے) تکبر نہیں کرتے۔
يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وہ اپنے رب سے ڈرتے ہیں جو کہ ان سے بالادست ہے یعنی غالب اور قاہر ہے اللہ نے دوسری جگہ فرمایا ہے وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ یا یہ مطلب ہے کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں عذاب ان کے اوپر سے نہ نازل ہو جائے۔
وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں یعنی جیسی تعمیل حکم ان کے لئے مناسب ہے وہی کرتے ہیں۔ یہ جملے بتا رہے ہیں کہ لِلّٰهِ يَسْجُدُ سے کفار مستثنیٰ ہیں۔ تکبر نہ کرنا، ڈرنا اور تعمیلِ حکم کرنا تقاضائے کفر کے خلاف ہے۔ ہاں اگر سجود سے عمومی تکوینی اطاعت اور اللہ کی صنعت کا ظہور مراد لیا جائے تو پھر هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ اور يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ اور يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ملائکہ کی صفاتِ خصوصی ہوں گی۔ (عام مخلوق کی صفات نہ ہوں گی)

السجدة ۴
ع ۱۲

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا جو کچھ میں دیکھتا ہوں تم نہیں دیکھتے اور جو کچھ میں سنتا ہوں تم نہیں سنتے۔ آسمان خوب چرچرایا اور اس کو خوب چرچرانا چاہئے ہی تھا قسم ہے اس کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے آسمان میں کہیں بھی چار انگلی کی جگہ ایسی نہیں کہ اس میں کوئی فرشتہ سجدہ میں پیشانی رکھے ہوئے نہ ہو۔ خدا کی قسم جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو کم ہنستے اور زیادہ روتے اور بستروں پر عورتوں سے لذت اندوز نہ ہوتے، اور میدانوں میں نکل کر اللہ کے سامنے چیختے چلاتے (یہ سن کر) حضرت ابوذرؓ بولے کاش میں درخت ہوتا کہ اس کو کاٹ دیا جاتا۔ رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ والبغوی۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ اور اللہ نے فرمایا ہے کہ دو معبود نہ قرار دو بس اللہ ہی ایک معبود ہے یعنی دوئی اُلوہیت کے منافی ہے (دو اللہ ہو ہی نہیں سکتے) آخری آیت دلالت کر رہی ہے کہ اس جگہ وحدانیت کو ثابت کرنا مقصود ہے اُلوہیت کا اثبات مقصود نہیں۔ الوہیت کے لوازم میں سے وحدانیت ہے۔

فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۵۱﴾ پس خصوصیت کے ساتھ مجھ ہی سے ڈرا کرو۔ (اِیَّایَ فعل محذوف کا مفعول ہے اور فَارْهَبُوا کا مفعول محذوف ہے اصل کلام اس طرح تھا اِيَّايَ اِرْهَبُوْا فَارْهَبُوْنِي تکرارِ جملہ تاکیدی حکم کو ظاہر کر رہی ہے)

وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اور اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ یعنی اللہ ہی ہر چیز کا خالق اور مالک ہے اس کی شان میں ظلم کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا (وہ اپنی ملک میں ہر طرح کا تصرّف کر سکتا ہے اس کے لئے کسی قِسم کا تصرّف ظلم نہیں ہو سکتا) ظلم تو دوسرے کی ملک میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا نام ہے بغیر اجازت کے دوسرے کی چیز میں تصرّف جائز نہیں (اپنی ملک میں تصرف تو کسی صورت میں اور کسی بھی حالت میں ظلم ہو ہی نہیں سکتا) فرقہ معتزلہ انسان کو اپنے افعال کا خالق کہتا ہے اس کے مسلک کی تردید اس آیت سے ہوتی ہے۔

وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا ۭ اور اسی کو حق ہے کہ اس کی اطاعت لازمی طور پر اور ہمیشہ کی جائے۔ اس کی اطاعت کا حکم کبھی ساقط نہیں ہو سکتا۔ وہی اللہ واحد ہے اور اسی سے خوف کرنا ضروری ہے۔ فرشتوں کی طرح انسانوں کو بھی ہمیشہ ہر حال میں اسی کی اطاعت کرنی چاہئے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت نہیں۔ رواہ احمد والحاکم بسند صحیح عن عمران والحکیم بن عمرو الغفاری۔

صحیحین اور نسائی اور سنن ابوداؤد میں حضرت علیؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں اطاعت (کا حکم) تو نیکی میں ہے (امر ممنوع کا ارتکاب کسی کے حکم سے درست نہیں) له الدین ذا کلفة کا بھی یہی مطلب ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی مالک نہیں مالک اپنی ملک میں جیسا چاہے تصرّف کر سکتا ہے غیر مالک، مالک کی اجازت کے بغیر تصرف نہیں کر سکتا۔

بعض اہلِ تفسیر نے لکھا ہے کہ اس جگہ دین سے مراد ہے بدلہ یعنی سزا و جزا۔ مطلب یہ ہے کہ دوامی سزا جزا اسی کو زیبا ہے وہی مومنوں کو دوامی ثواب دے گا اور کافروں کو لازوال عذاب۔

بعض نے کہا دین سے مراد عذاب ہے یعنی کافروں کو دوامی عذاب دینے کا اسی کو حق ہے اصل میں واصب بیماری کو کہتے ہیں وصب زیدٌ زید دکھی ہو گیا۔ اللہ نے عذاب کی صفت واصب فرمائی ہے۔ ایک آیت میں فرمایا ہے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ حضرت عائشہؓ نے فرمایا تھا: اَنَا وَصَّبْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ میں نے رسول اللہ کی تیمار داری کی تھی نہایہ میں ہے وصب دوامی دکھ ہونا، توصیب تیمارداری۔ قاموس میں ہے وصب بمعنی مرض اوصبه اللّٰه اس کو اللہ نے بیمار کر دیا وَصَبَ يَصِبُ وُصُوبًا مرض جم گیا۔ لازم ہو گیا اوصب کا بھی یہ معنی آتا ہے وصب علی الامر کسی کی پابندی سے نگرانی کی اور اچھی طرح اس کا انتظام کیا ہے آیت میں دو معبود ماننے والوں کے لئے اللہ کی طرف سے سخت اور دوامی عذاب کی وعید ہے۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَتَّقُوْنَ ﴿۵۲﴾ کیا تم اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو یعنی کسی دوسرے سے نہ ڈرو سوائے اللہ

کے کوئی نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ اور تم کو جو نعمت بھی حاصل ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے نعمت سے مراد ہے صحت، عافیت، دولت، خوش حالی، ارزانی وغیرہ۔

ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ﴿۵۳﴾ پھر جب تم پر (بیماری، ناداری قحط وغیرہ کی کوئی) مصیبت آتی ہے تو عاجزی اور زاری کے ساتھ اللہ ہی کی طرف تم رُجوع کرتے ہو۔ یعنی سوائے اس کے کسی سے دفع مصیبت کے لئے زاری نہیں کرتے جوار اونچی آواز سے دعا کرنا اور فریاد کرنا۔

ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ ﴿۵۴﴾

پھر جب اللہ مصیبت کو تم سے دور کر دیتا ہے تو تم میں سے کچھ لوگ یکدم (اللہ کی عبادت میں) دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں اگر خطاب تمام انسانوں کو مانا جائے مؤمن ہوں یا کافر تو منکم (تم میں کچھ) سے مراد ہو گا فریق کفار اور اگر خطاب صرف کافروں کو قرار دیا جائے تب کافروں میں سے کچھ لوگوں کا مشرک ہو جانا صحیح ہے کیونکہ مصیبت دور ہونے کے بعد کچھ کافر بھی نصیحت پذیر ہو جاتے ہیں۔ دوسری آیت میں آیا ہے: فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ فَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ پھر جب سمندری طوفان سے بچا کر اللہ ان کو خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو ان میں سے کچھ لوگ سیدھی چال اختیار کر لیتے ہیں۔

لِيَكْفُرُوا بِمَا آتَيْنَاهُمْ جس کا حاصل یہ ہے کہ جو نعمتیں ہم نے ان کو دی ہیں ان کی ناشکری کرتے ہیں خصوصاً دفع مصیبت کی نعمت لِيَكْفُرُوا میں لام نتیجہ کا ہے یعنی ان کے شرک کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کی، دوسروں کی عبادت کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے خداداد نعمتوں کا منعم دوسروں کو قرار دے لیا۔

فَتَمَتَّعُوا فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۵۵﴾ خیر (چند روز) عیش اُڑا لو اب جلد ہی خبر ہو جائے گی تَمَتَّعُوا امر کا صیغہ ہے لیکن مراد ڈرانا ہے (حکم دینا مقصود نہیں ہے) فسوف تعلمون سے تہدید کی مزید شدت ہو گئی۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ اور یہ لوگ ہماری دی ہوئی چیزوں میں ان (جھوٹے معبودوں) کا حصہ لگاتے ہیں جن کے متعلق ان کو کچھ علم نہیں۔ یعنی جن معبودوں کا حصہ لگایا جا رہا ہے وہ عبادت کے مستحق ہیں اور نفع یا ضرر پہنچانے والے ہیں یہ کافر ان کو ایسا نہیں خیال کرتے فقط اپنی نادانی کی وجہ سے ان کو معبود اور نفع و نقصان پہنچانے والے کہہ دیتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ کافر ان معبودوں کا حق نہیں سمجھتے یونہی حصہ لگا دیتے ہیں یا مالا یعلمون سے مراد بت ہیں اور یعلمون کا فاعل بت ہیں یعنی بُت بے علم ہیں جماد ہیں اور کافر ایسے پتھروں کا حصہ لگا دیتے ہیں۔ مَارَزَقْنٰهُمْ سے مراد ہے کھیتی، مویشی، پھل مشرک کہا کرتے تھے هٰذَا لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَائِنَا۔

تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿۵۶﴾ خدا کی قسم تم سے تمہاری ان دروغ تراشیوں کی ضرور باز پُرس ہو گی۔ یعنی تم جو ان کو معبود بنا رہے ہو قیامت کے دن اس کی باز پُرس ہو گی تم سے ضرور۔

وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ ۙ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ ﴿۵۷﴾ اور اللہ کے لئے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، سبحان اللہ اور اپنے لئے چاہتی چیز (یعنی بیٹے) بنی خزاعہ اور بنی کنانہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے۔ سبحانہ، تنزیہ ذات ہے یعنی اللہ کو میں نسبت اولاد سے پاک سمجھتا ہوں اور اس کی پاکی کا اقرار کرتا ہوں یا سبحانہ صرف اظہار تعجب کے لئے ہے۔

وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۵۸﴾

اور ان میں سے کسی کو بیٹی ہونے کی خبر دی جاتی ہے تو سارے دن اس کا چہرہ بد رونق رہتا ہے اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا ہے۔

مُسْوَدًّا سیاہ بد رونق یعنی شرم، رنج اور غم کی وجہ سے اس کا چہرہ بد رونق ہو جاتا ہے اور دن بھر بد رونق رہتا ہے باوجودیکہ دن ایسی چیز ہے کہ اس میں خوشی بھی ہوتی ہے اور غم بھی مگر اس پر رنج ہی سوار رہتا ہے کظیم دل میں غم رنج گھٹا ہوا کہ اس کو اندر ہی اندر روکے رکھتا ہے ظاہر نہیں کرتا۔

يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اور جس چیز (لڑکی) کی اس کو اطلاع دی جاتی ہے اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرتا ہے۔ القوم سے مراد ہے اپنے لوگ۔

اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ (تردد میں پڑ جاتا ہے) کہ اس کو ذلت کی حالت میں (اپنے پاس) روکے رکھے یا مٹی میں اس کو زندہ گاڑ دے۔

یَدُسُّ چھپا دے، دفن کر دے۔ بغوی نے لکھا ہے کہ قبیلۂ مضر اور بنی خزاعہ اور بنی تمیم لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا کرتے تھے ایک تو ان کو ناداری کا اندیشہ ہوتا تھا (کہ لڑکیاں تو صرف کھانے پہننے کی ہیں لوٹ مار کر کے کہیں سے کچھ لا نہیں سکتیں) دوسرے یہ کہ (ناداری کو دیکھ کر) غیر کفو کہیں ان سے نکاح کرنے کا لالچ نہ کرنے لگیں عرب کے بعض لوگوں کا دستور تھا کہ جب لڑکی پیدا ہوتی اور وہ اس کو زندہ رکھنا چاہتا تو اس کو اُون کا یا بالوں کا کرتہ پہنا کر جانور چرانے کی خدمت پر لگا دیتا تھا اور اگر اس کو قتل کر دینا چاہتا تو چھ سال کی عمر تک اس کو چھوڑے رکھتا جب وہ چھ سال کی ہو جاتی تو اس کی ماں سے کہتا اس کو بنا سنوار کر تیار کر دے پھر اس کو کہیں جنگل میں لے جاتا وہاں پہلے ایک گہرا گڑھا کھود کر تیار رکھتا۔ جب لڑکی کو لے کر وہاں پہنچتا تو لڑکی سے کہتا دیکھ تو اس گڑھے میں کیا ہے لڑکی دیکھنے کو جونہی جھکتی یہ سنگدل باپ پیچھے سے اس کو دھکا دے دیتا اور اوپر سے مٹی ڈال کر زندہ دفن کر دیتا اور گڑھے کو ہموار کر دیتا۔

فرزدق کے دادا صعصعہ کو اگر کہیں اس کی بُن گُن مل جاتی تو لڑکی کے باپ کے پاس لڑکی کے عوض کچھ اونٹ بھیج دیتا اور اس طرح لڑکی کی گلوخلاصی ہو جاتی فرزدق نے بطور فخر اسی واقعہ کی طرف ذیل کے شعر میں اشارہ کیا ہے۔

میر ادادا وہ تھا جس نے زندہ دفن کرنے والوں کو زندہ دفن کرنے سے روکا اور زندہ در گور ہونے والی کو زندگی عطا کی۔

اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝۵۹ خوب سن لو، ان کی یہ تجویز بہت ہی بُری ہے اللہ جو ہر طرح کی اولاد سے پاک ہے اس کے لئے تو ایسی اولاد تجویز کرتے ہیں جو صنفِ ادنیٰ ہے اور اپنے لئے لڑکوں کو پسند کرتے ہیں دوسری آیت میں اس کو ناانصافی کی تقسیم قرار دیا ہے فرمایا ہے: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى -

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۚ جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کی بُری حالت ہے مرنے کے بعد بقاءِ نسل کے محتاج ہیں اپنی قوتِ بازو بنانے کے لئے لڑکوں کے ضرورت مند ہیں لڑکیاں ہونے کو بُرا جانتے ہیں لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیتے ہیں یہ سب ان کی بری حالت ہے۔ وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى ؕ

اور اللہ کی شان سب سے اونچی ہے وہ واجبُ الوجود ہے ہر چیز سے بے نیاز ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں علم، قدرت، بقاء اور تمام جلالی و جمالی صفات سے متصف ہے مخلوق کی صفات سے پاک ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا مَثَلُ السَّوْءِ دوزخ ہے اور مثل الاعلیٰ لا الہ الا اللہ کی شہادت ہے۔

وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۶۰ اور وہ (سب پر) غالب اور (اس کا ہر کام) پر حکمت ہے۔ یعنی قدرت و حکمت میں یگانہ و بے مثال ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ اگر اللہ لوگوں کی بے جا حرکتوں کے سبب ان کی فوری گرفت کرتا تو زمین پر کسی حس و حرکت کرنے والے کو نہ چھوڑتا۔

مؤاخذہ کرنے سے مراد ہے فوری سزا دینا۔ النّاس سے مراد کفار ہیں۔ لفظ مؤاخذہ اور ظلم اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہے ظلم سے مراد ہے کفر اور معصیت، بیضاوی نے لکھا ہے کہ النّاس سے مراد سب لوگ ہیں (مؤمن ہوں یا کافر) عبارت کی رفتار اسی کی غمازی کر رہی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ سب ہی لوگ یہاں تک کہ انبیاء بھی ظالم قرار پا جائیں گے کیونکہ گروہ انسانی کے اکثر افراد سے چونکہ کفر و معصیت کا صدور ہو رہا ہے اس لئے جماعت کی طرف ظلم کی نسبت کر دی گئی اور جماعت کی طرف نسبت کرنے سے ہر ہر شخص کی طرف نسبت ضروری نہیں۔ (حضرت مفسرؒ نے کہا میں کہتا ہوں) اس صورت

ع ۱۴

میں (ماترک علیہا من دابتہ کے لفظ سے) ظاہر ہوتا ہے اکثر افراد کے ارتکاب جرم کا بدلہ پوری جماعت سے لیا جاتا اور یہ بدلہ قطعاً غلط ہو گا کیونکہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی صریحی نص ہے (مجرم کی سزا میں غیر مجرم کو شریک نہیں کیا جا سکتا)

دابۃ سے مراد ہے گناہ گار دابہ۔ مفسر مدارک نے حضرت ابن عباسؓ کی طرف اس تشریح کی نسبت کی ہے یا دابہ سے مراد ہے جاندار اور رینگنے والا جانور۔ اس صورت میں مؤمنین صالحین مستثنیٰ ہوں گے یعنی نیکوکار مؤمنوں کے علاوہ ہر جاندار کو ہلاک کر دیتا کسی کو نہ چھوڑتا۔ کیونکہ کافروں اور گناہ گاروں کی بے جا حرکتوں پر نیکوں کی پکڑ نہیں ہو سکتی ہاں اگر نیک لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو چھوڑ دیں تو گناہ پر راضی ہونے یا فرض کو ادا نہ کرنے کے سبب ان کو بھی عذاب میں شریک کیا جا سکتا ہے۔ ابن ماجہ اور ترمذی نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لوگ جب کسی بری بات کو دیکھیں اور اس کو نہ بدلیں؟ یعنی بدلنے کی کوشش نہ کریں، تو ہو سکتا ہے کہ اللہ سب کو عموماً اپنے عذاب کی لپیٹ میں لے لے۔ ترمذی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے ابوداؤد نے حضرت جریر بن عبداللہؓ کی روایت سے بھی اسی مضمون کی حدیث نقل کی ہے۔

صالح مؤمنوں کے علاوہ باقی جانداروں کا ظالم اور کافر انسانوں کے ظلم کے بدلہ میں پکڑا جانا ناجائز ہر جانور کی تخلیق انسان کی تخلیق کے تابع ہے جانوروں کی پیدائش آدمیوں کے فائدہ ہی کے لئے ہوئی ہے اللہ نے فرمایا ہے: خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا زمین کی سب چیزیں اللہ نے تمہارے ہی فائدے کے لئے پیدا کی ہیں۔

قتادہ نے اس آیت کی تفسیر کے ذیل میں بیان کیا ہے کہ ایسا حضرت نوحؑ کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی میں جو جاندار چڑھ گئے وہ بچ گئے باقی ہلاک کر دیئے گئے بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے سنا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے ظالم صرف اپنے نفس کو ہی ضرر پہنچاتا ہے (اس کے ظلم کی سزا کسی دوسرے پر نہیں پڑتی) حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کیوں نہیں خدا کی قسم (ضرور ایسا ہوتا ہے) یہاں تک کہ ظالم کے ظلم کی پاداش میں چڑیاں اپنے آشیانوں میں بھوکی مر جاتی ہیں۔

ابن ابی شیبہ، عبد بن حمید، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے (شعب الایمان میں) حضرت ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابنِ آدم کے گناہ کی وجہ سے جُعَل (ایک خاص کیڑا) اپنے سوراخ میں عذاب میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

بعض اہل تفسیر نے آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر کافروں کے آباء واجداد کو ان کے ظلم کی پاداش میں فوراً پکڑ لیتا تو نسل ہی منقطع ہو جاتی ان کی اولاد بھی زندہ نہ بچتی اور زمین پر کوئی باقی نہ رہتا۔ اسی لئے حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے لئے اس وقت تک بددعا نہیں کی جب تک وحی کے ذریعہ سے ان کو معلوم نہ ہو گیا کہ موجودہ کافروں کی نسل بھی کافر ہی پیدا ہو گی۔

وَلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۶۱﴾ لیکن (اپنے حکم کی وجہ سے) ظالموں کو ایک میعادِ معین تک اللہ مہلت دے رہا ہے (یعنی توبہ کے لئے اس نے عذاب ٹال رکھا ہے) پھر جب ان کا وقتِ معین آپہنچے گا اس وقت منٹ بھر نہ پیچھے ہٹ سکیں گے نہ (مقررہ وقت سے) آگے بڑھ سکیں گے (یعنی وقتِ معین سے تھوڑی دیر کی تاخیر بھی نہ ہو گی)۔

وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَتَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿۶۲﴾ اور اللہ کے لئے وہ باتیں تجویز کرتے ہیں جن کو خود اپنے لئے ناپسند کرتے ہیں اور اپنی زبانوں سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں کہ ان کے (یعنی ہمارے) لئے ہر طرح کی بھلائی ہے لازمی بات ہے کہ ان کے لئے دوزخ ہے اور بلاشبہ وہ لوگ سب سے پہلے دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔

مَا يَكْرَهُوْنَ، جو خود پسند نہیں کرتے جیسے لڑکیاں، ریاست اور سرداری میں کسی کی شرکت، حقیر ترین مال میں بھی کسی کا ساجھا وغیرہ۔ الحسنیٰ، یمان نے کہا اَلْحُسْنٰی سے مراد ہے جنت۔ کافر کہتے تھے کہ محمد ﷺ کے قول کے مطابق اگر قیامت ہوئی بھی تو ہمارے لئے جنت ہو گی۔ لَا جَرَمَ کا ترجمہ ہے یقیناً قطعاً بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا

کیوں نہیں۔

میں کہتا ہوں، اس ترجمہ کی بناء اس امر پر ہے کہ لَا جَرَمَ کے لا کو نافیہ قرار دیا جائے اور اس سے گزشتہ خیال کی تردید مقصود ہو پہلے بیان کیا تھا کہ کافروں کا خیال ہے کہ ان کے لئے جنت ہوگی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم دوزخ میں نہیں جائیں گے اللہ نے اس کی تردید فرما دی اور پھر ان کے دوزخی ہونے کی صراحت فرما دی۔

مُفْرَطُوْنَ (اِفراط سے اسم مفعول) قاموس میں ہے دوزخ میں چھوڑے ہوئے گویا دوزخ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے یا سب سے پہلے دوزخ میں بھیجے گئے (ہم نے یہی ترجمہ کیا ہے) مترجم۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے اس کا ترجمہ کیا ہے دوزخ میں ڈال کر بھلا دیئے گئے مقاتل نے کہا دوزخ میں چھوڑ دیئے گئے۔ قتادہ نے کہا دوزخ میں جلد بھیج دیئے گئے فراء نے کہا دوزخ میں سب سے پہلے بھیجے گئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اَنَا فَرَطُكُمْ میں تمہارا پیش رو ہوں گا اور حوض پر سب سے پہلے پہنچوں گا سعید بن جبیرؒ نے ترجمہ کیا وہ (نجات ورحمت سے) دور کر دیئے جائیں گے۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ آپ سے پہلے جو امتیں ہو گذری ہیں ان کے پاس بھی ہم نے رسولوں کو بھیجا تھا سو ان کو بھی شیطان نے ان کے (کفریہ) اعمال خوبصورت (پسندیدہ) بنا کر دکھائے لَهُمْ یعنی اکثر امتوں کو۔ ”اعمال“ سے مراد ہیں کفریہ اعمال، شرک باللہ اور پیغمبروں کی تکذیب شیطان نے اعمالِ کفر کو ان کی نظر میں پسندیدہ بنا دیا اس لئے وہ اپنے برے اعمال پر جمے رہے۔

فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ پس وہی شیطان آج (اس دنیا میں) ان (کفارِ قریش) کا بھی رفیق ہے اور قیامت کے دن ان کے لئے دردناک عذاب ہوگا۔ وَلِيُّهُمْ کی ضمیر کفارِ قریش کی طرف لوٹ رہی ہے کلام کی رفتار کا یہی تقاضا ہے کفارِ قریش کے متعلق کلام کیا جارہا ہے۔ ”ولی“ کا معنی ہے مددگار، رفیق، ساتھی، جو قریش کے برے اعمال کو اچھی شکل میں بنا کر دکھا رہا ہے۔ مسلمانوں کی دشمنی میں ان کا ساتھی اور مددگار ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَلِيُّهُمْ کی ضمیر اُمَم سابقہ کی طرف لوٹائی جائے اور گزشتہ حال کی حکایت قرار دی جائے یعنی شیطان اُمم سابقہ کا اس دنیا میں رفیق تھا اعمالِ کفریہ کو پسندیدہ بنا کر دکھاتا تھا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ اَلْيَوْمَ سے مراد قیامت کا دن ہو اور آنے والے واقعہ کا بیان یعنی قیامت کے دن شیطان ان کافروں کا ساتھی ہوگا اور طوق وزنجیر میں ان کے ساتھ بندھا ہوا ہوگا، یا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے دن بس شیطان ہی ان کا رفیق ہوگا کوئی اور رفیق نہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ شیطان اس روز خود اپنی مدد نہیں کر سکے گا تو ان کی مدد کیا کرے گا۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مضاف محذوف ہو یعنی گزشتہ اقوام جیسے لوگوں کا رفیق یہاں شیطان ہی ہے مطلب یہ کہ کفارِ قریش گزشتہ امتوں کی طرح ہیں اور ان کا رفیق شیطان ہے۔

وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾ اور ہم نے یہ کتاب آپ پر صرف اس لئے نازل کی ہے کہ جن اُمور (دین) میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں آپ عام لوگوں پر اس کو ظاہر فرما دیں اور خاص طور پر ایمان والوں کے لئے ہدایت اور رحمت (بنا کر ہم نے یہ قرآن نازل کیا ہے۔)

اِخْتَلَفُوْا فِيْهِ یعنی توحید۔ اللہ کی صفات، تقدیر، احوالِ قیامت، انسانی افعال (کی تخلیق) اور اللہ کے احکام کے بارے میں لوگوں کے جو مختلف خیالات ہیں۔

وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اور اللہ ہی نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس سے زمین کو اس کے مردہ ہونے کے بعد زندہ کیا۔ الارض سے مراد ہے زمین کا سبزہ، زمین کو زندہ کیا، یعنی اس کو سرسبز اور نامی بنایا۔ ”زمین کی موت“ سے مراد ہے زمین کا خشک ہو جانا، روح نباتی سے خالی ہو جانا۔

اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ﴿۶۵﴾ اس میں ایسے لوگوں کے لئے بڑی دلیل ہے جو سنتے ہیں۔ یعنی غور و فکر کے کانوں سے سننے والوں کے لئے خشک، بے جان زمین کا پانی سے سرسبز و شاداب ہو جانا، امکانِ قیامت کی بڑی دلیل ہے۔

وَاِنَّ لَکُمۡ فِی الۡاَنۡعَامِ لَعِبۡرَۃً ؕ اور (نیز) تمہارے لئے مویشیوں میں بھی غور درکار ہے۔ عبرت سے مراد ہے ایسا غور جو جہالت سے نکال کر علم کی طرف لے جائے۔

نُسۡقِیۡکُمۡ مِّمَّا فِیۡ بُطُوۡنِہٖ مِنۡۢ بَیۡنِ فَرۡثٍ وَّ دَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیۡنَ ﴿۶۶﴾

(دیکھو) ان کے پیٹ میں جو گوبر اور خون (کا مادہ) ہے اس کے درمیان میں سے صاف اور گلے میں آسانی سے اُترنے والا دودھ (بنا کر) ہم تم کو پینے کو دیتے ہیں۔ بُطُوۡنِہٖ میں واحد مذکر کی ضمیر الۡاَنۡعَام کی طرف لوٹ رہی ہے الانعام اسم جمع ہے۔ لفظ کے اعتبار سے مفرد ہے۔ سیبویہ نے اس لفظ کا شمار ان مفرد الفاظ میں کیا ہے جو بروزن اَفعال آتے ہیں جیسے اَخلاق اور اَکباش وغیرہ فراء، ابو عبیدہ اور اخفش کا بھی یہی قول ہے نَعَم اور اَنۡعام دونوں مفرد کے صیغے ہیں۔ مذکر و مؤنث دونوں طرح سے ان کا استعمال آیا ہے جس نے مؤنث استعمال کیا اس نے ان کے جمعیتی معنی کا لحاظ کیا ہے اور جس نے مذکر قرار دیا ہے اس نے لفظ کا لحاظ کیا ہے۔

کسائی نے بطونہٖ کی ضمیر کو مَا کی طرف راجع کیا ہے یعنی اس چیز کے پیٹ کے اندر سے جس کا ذکر اوپر کر دیا گیا۔ مؤرخ نے کہا سب انعام کے پیٹ سے تو دودھ نہیں نکلتا اس لئے بعض مراد ہیں اور بعض ہی کی طرف بطورِ کنایہ ضمیر کا رجوع ہے۔ بعض کے نزدیک جنس انعام مراد ہے اور جنس کی طرف ضمیر راجع ہے۔

فَرۡث وہ گوبر جو اوجھ کے اندر ہو۔ جب باہر آجاتا ہے تو اس کو فرث نہیں کہا جاتا۔ خالصًا سے یہ مراد ہے کہ خون اور گوبر کے اثرات سے خالص ہوتا ہے نہ اس میں خون کا رنگ ہوتا ہے نہ گوبر کی بو۔ باوجودیکہ دودھ کی پیداوار انہی دونوں چیزوں سے ہوتی ہے سَآئِغ حلق میں آسانی سے اتر جانے والا۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا جانور چارہ گھاس کھاتا ہے تو کھایا ہوا چارہ انتڑیوں میں جا کر ٹھہرتا ہے پھر وہاں اس کی پسائی ہوتی ہے پسنے کے بعد اس کا نچلا حصہ تو گوبر ہو جاتا ہے اور بالائی حصہ خون اور درمیانی حصہ دودھ (دونوں کے درمیان دودھ پیدا ہونے کا یہی مطلب ہے) اور یہ سب کام جگر کے زیرِ تسلط ہوتا ہے جگر خون کو رگوں میں بہاتا ہے اور دودھ کو تھنوں میں اور گوبر کو وہیں باقی رکھتا ہے، جہاں وہ ہے۔ بیضاوی نے لکھا ہے شاید حضرت ابن عباسؓ کے کلام کی مراد یہ ہے کہ درمیانی حصہ دودھ کا مادہ ہو جاتا ہے۔ اور بالائی حصہ خون کا مادہ جو بدن کی غذا بنتا ہے اور اگر اس غذا کو جو انتڑیوں میں ہوتی ہے اس کا ہضم شدہ خلاصہ (کیلوس) اپنی طرف کھینچ لیتا اور فضلہ وہیں رہتا ہے جہاں ہوتا ہے (یعنی انتڑیوں میں) پھر کیلوس کو روک کر دوبارہ اس کو ہضم کرتا ہے (جس کے جوہر کو کیموس کہتے ہیں) پھر چار اَخلاط تیار کرتا ہے۔ جن کے اندر مائیت ہوتی ہے پھر جگر کی قوتِ ممیزہ (مائیت کو چھانٹ کر الگ کرنے والی قوت) قدرِ ضرورت سے زیادہ پانی کو اَخلاط سے الگ کر کے گُردوں اور پِتّے اور طحال کی طرف روانہ کر دیتی ہے پھر باقی اَخلاط کو تمام اعضاء کی طرف حسبِ ضرورت تقسیم کر دیتی ہے اس طرح ہر عضو کو قادر، حکیم، علیم کے زیرِ انتظام اس کا حق مل جاتا ہے پھر اگر حیوان مادہ ہے تو چونکہ اس کے مزاج میں بُرودت و رُطوبت کا غلبہ ہوتا ہے اس لئے اس کے اَخلاطِ غذائی ضرورت سے زائد ہوتے ہیں اور زائد حصہ جنین کی پرورش کے لئے رحم کی طرف چلا جاتا ہے اور بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو ماں کے بدن کی غذائی ضرورت سے تمام زائد حصہ یا اس کا کچھ حصہ تھنوں کی طرف چلا جاتا ہے اور سفید شیریں گوشت کے قُرب کی وجہ سے سفید ہو کر دودھ بن جاتا ہے۔ اَخلاط اور دودھ کی پیدائش کیسے ہوتی ہے، کن راستوں سے کس طرح کہاں جا کر یہ ٹھہرتے ہیں، ان کو پیدا کرنے والے اسباب کیا کیا ہیں، مناسب طور پر ہر وقت ان کی حالت کی تبدیلی کون سی قوتوں کی ممنون ہے جو شخص ان امور پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرے گا اس کو صانعِ حکیم کی حکمتِ کاملہ اور قدرتِ تامہ کا اعتراف کرنا پڑے گا اور رحمتِ شاملہ

کو ماننا پڑے گا۔

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ

اور (نیز) کھجور اور انگوروں کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو (حضرت مفسرؒ نے لکھا ہے) نُسْقِيْ فعل محذوف ہے اور ثمرات سے مراد ہے کھجور و انگور کا شیرہ، عرق۔ یعنی ہم تم کو پینے کے لئے شیرۂ کھجور و انگور دیتے ہیں۔ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سے جملہ علیحدہ ہے یا مِنْ ثَمَرٰتِ کا تعلق تَتَّخِذُوْنَ سے ہے (اسی کے موافق ترجمہ کیا گیا ہے) سُکر نشہ آور چیز، یا مصدر ہے بمعنی صفت یعنی شراب۔ قاموس میں ہے سَكِرَ (بے ہوش ہو گیا) ہوش کی ضد ہے۔ سُکر، سُکُر، سَکَر، سَکر، سُکُر ان یہ سب مصدر ہیں۔ سکر بضمّتین شراب اور اس نبیذ کو بھی کہتے ہیں جو کھجوروں اور کشمش سے اور ہر نشہ آور چیز سے بنایا جاتا ہے۔ اور سرکہ اور طعام کو بھی سکر کہا جاتا ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ سُکر وہ ہوتا ہے جو کھجوروں کے عرق سے بنایا جاتا ہے شریک بن عبداللہ نے کہا اس آیت کی وجہ سے سکر کی اباحت ثابت ہو رہی ہے کیونکہ اللہ نے بطورِ احسان و منت نہی سکر تیار کرنے کا ذکر کیا ہے اور حرام چیز کا ذکر بطور احسان نہیں کیا جا سکتا ہماری دلیل یہ ہے کہ سکر کی حرمت پر صحابہؓ کا اجماع ہے۔ رہا آیت کا جواب تو (یہ آیت مکی ہے) اس کا نزول اس وقت ہوا جب ہر طرح کی پینے کی چیز حلال تھی۔ انتہی کلامہ۔

بغوی نے لکھا ہے کچھ لوگوں کا قول ہے کہ سَکر شراب ہے اور رزقِ حسن سرکہ، رُبّ، چھوارے اور کشمش۔ اور یہ حکم تحریم خمر سے پہلے کا ہے (یعنی اس آیت کا نزول حرمتِ شراب سے پہلے ہوا تھا) یہ قول حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ، سعید بن جبیرؒ، حسن اور مجاہد کا ہے۔ بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ سکر وہ پھل ہیں جو حرام کر دیئے گئے اور رزقِ حسن سے مراد حلال پھل ہیں (شاید حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جو عرق یا نبیذ پھلوں کا حرام کر دیا گیا ہے وہ سکر ہے اور جو عرق یا نبیذ حلال رکھا گیا وہ رزقِ حسن ہے، مترجم) ابو عبیدہ نے کہا سکر سے مراد ہے کھانا عرب بولتے ہیں ہذا سکر لک یہ آپ کا کھانا ہے۔ شعبی، سکر سے پینے کی چیز مراد ہے اور رزق حسن سے کھانے کی چیز۔ عوفی نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حبشی زبان میں سکر سرکہ کو کہتے ہیں ضحاک اور نخعی کا قول ہے کہ حبشی زبان میں نشہ آور نبیذ کو سکر کہتے ہیں اور سکر چھواروں اور کشمش کے گاڑھے خیسانیدہ اور پکائے ہوئے عرق کا نام تھا۔ سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ آیت تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا منسوخ ہے انتہی کلام البغوی۔

ایک اور مقام پر بغوی نے لکھا ہے کہ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ شراب کے متعلق چار آیات نازل ہوئی تھیں۔ آیت وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا مکہ میں نازل ہوئی۔ اس کے نزول کے بعد مسلمان شراب پیتے رہے۔ شراب اس زمانہ میں حلال رہی اس کے بعد مدینہ میں آیت يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ نازل ہوئی اس کے کچھ زمانہ کے بعد آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى نازل ہوئی اور سب سے آخر میں سورہ مائدہ والی آیت نازل ہوئی (جس میں شراب کی قطعی ابدی حرمت ہو گئی) چاروں آیات کے نزول کی تفصیل سورۂ بقرہ کی آیت وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ کی تفسیر کے ذیل میں ہم نے ذکر کر دی ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ بلاشبہ اس میں بڑی نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھتے ہیں یعنی آیات میں غور و فکر کرنے کا کام اپنی عقلوں سے لیتے ہیں۔

وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾

اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ تو بعض پہاڑوں میں گھر بنا لے اور بعض درختوں میں بھی اور لوگ جو چھتیں بناتے ہیں ان میں بھی۔ "وحی کرنے" سے مراد ہے الہام کرنا اور دل میں ڈالنا۔ یعرشون سایہ کے گھروں کی چھتیں بناتے ہیں یا عرش سے مراد ہے انگوروں کی ٹٹیاں۔ عرش کا لغوی معنی ہے چھت۔ من الجبال اور من الشجر اور

ممایعرشون میں من تبعیضیہ ہے کیونکہ سب پہاڑوں میں اور سب درختوں میں اور سب چھتوں اور انگوروں کی ٹٹیوں میں شہد کی مکھیوں کے چھتے نہیں لگتے ہیں نہ ہر جگہ چھتا ہوتا ہے بعض پہاڑوں اور بعض درختوں وغیرہ میں بعض جگہ چھتے لگتے ہیں شہد کی مکھی کے چھتے کو مکان کہنے سے اس طرف اشارہ ہے کہ انسانی مکان کی طرح مکھیوں کے چھتوں میں بھی تمام ضروری حصے ہوتے ہیں ان میں بھی متعدد کمرے، چھتیں اور دروازے ہوتے ہیں اور وہ بھی حسنِ صنعت کا ایسا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں کہ سوائے کسی ماہر انجینئر کے اور کوئی انسان بھی نہ ایسا نقشہ بنا سکتا ہے نہ ایسی تعمیر کر سکتا ہے۔

ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِي سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًاؕ　پھر ہر قسم (یعنی ہر ضروری اور مناسب قسم) کے پھلوں کو چوس اور پھر اپنے رب کے راستوں پر چل جو آسان ہیں۔

الثمرات میں الف لام جنسی ہے اور لفظ کل استغراقی نہیں ہے بلکہ ہر مرغوب اور مناسب پھل مراد ہے یعنی ہر قسم کے مناسب پسندیدہ اور میسّر آجانے والے پھلوں کا عرق چوس لے خواہ میٹھے ہوں یا کڑوے۔

سُبُلَ رَبِّکِ یعنی ان راستوں پر چل کر شہد تیار کر جو تیرے رب نے تجھے بتادیئے ہیں اور فطری طور پر تجھے سکھا دیئے ہیں اور جب دور دور کے پھولوں کا رس چوس کر اپنے گھر کو لوٹے تو اپنے رب کے بتائے ہوئے راستوں پر لوٹنا، راستہ نہ بھول جانا یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے بتائے ہوئے ایسے راستوں پر چلنا کہ تیرے پیٹ کے اندر پھلوں اور پھولوں سے چوسا ہوا عرق شہد بن جائے۔

ذُلُلًا یعنی وہ راستے اللہ نے تیرے لئے آسان کر دیئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے حکم کی اطاعت میں لگی رہنا اور حکم کے زیرِ اثر راستوں پر چلنا کہنے والے کہتے ہیں کہ مکھیوں کے سردار تمام مکھیوں کو ساتھ لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پر منتقل ہو جاتے ہیں اور سب مکھیوں کا ایک بادشاہ ہوتا ہے جس کو یعسوب کہا جاتا ہے۔ جب وہ کہیں سے چل دیتا ہے تو سب مکھیاں چل دیتی ہے اور جہاں کہیں وہ رک جاتا ہے تو سب ٹھہر جاتی ہیں۔

يَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ　اس کے پیٹ میں سے ایک پینے کی چیز نکلتی ہے جس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں یعنی سرخ بھی ہوتا ہے سفید بھی زرد بھی اور سبز بھی۔

فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِؕ　کہ اس میں لوگوں کے لئے شفاء ہے۔ مجاہد نے فیہ کی ضمیر قرآن کی طرف راجع کی ہے یعنی قرآن میں لوگوں کے لئے شفا ہے، لیکن آیت کی رفتار بتا رہی ہے کہ شہد کی طرف ضمیر راجع ہے یعنی شہد میں شفاء ہے۔ یعنی بعض امراض کے لئے۔ بعض حالات میں شہد کے اندر شفا ہے شفاءٌ نکرہ ہے، کلام موجب ہے، اس لئے تعمیم فی الجملہ ہے یعنی بعض امراض کے بعض حالات میں شفاء ہے۔

ایک شبہ

بعض حالات میں بعض امراض کے لئے شفاء تو ہر چیز میں ہے یہاں تک کہ زہر میں بھی بعض امراض کے لئے شفاء ہے شہد ہی کی کیا خصوصیت ہے۔

ازالہ

شفاءٌ میں تنوین عظمت کو ظاہر کر رہی ہے یعنی شہد میں اکثر امراض کے لئے شفاء عظیم ہے حضرت ابن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دو شفاؤں کو اختیار کرو۔ شہد اور قرآن (اول میں شفاء جسمانی ہے اور دوسر میں شفاء خلاقی و روحانی) رواہ ابن ماجہ والحاکم بسند صحیح۔ یہ حدیث بتا رہی ہے کہ شہد میں شفا غالب ہے۔

بیضاوی نے لکھا ہے کہ بعض امراض کے لئے تو شہد تنہا شفا ہے اکثر بلغمی امراض میں مفید ہے اور بعض امراض کے علاج میں دوسری دواؤں کے ساتھ ملا کر شہد مفیدِ صحت ہے، ہر معجون کا جزءِ اعظم شہد ہوتا ہے۔

صحیحین میں حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور

عرض کیا میرے بھائی کو اسہال کی شکایت ہے۔ فرمایا شہد پلاؤ۔ حسب الحکم اس شخص نے شہد پلایا (کچھ فائدہ نہ ہوا) وہ پھر خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور عرض کیا حضور میں نے شہد پلایا تھا، شہد سے اور اسہال میں اضافہ ہو گیا۔ فرمایا اللہ سچا ہے اور تیرے بھائی کا پیٹ جھوٹا۔ اس نے جا کر پھر شہد پلایا اور مریض اچھا ہو گیا اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ (پیٹ کے) بعض امراض کے لئے تنہا شہد شفا ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خلوص اور حسنِ نیت سے جو شخص تنہا شہد کا استعمال کرے گا اللہ اس کو شفا دے گا خواہ کوئی مرض ہو۔ کذا قال السیوطی۔

صحیح بات یہ ہے کہ ہر قسم کے شہد کا ہر مرض کے لئے شفا ہونا نہ قرآن میں مذکور ہے نہ حدیث میں۔ ہر فصل کے شہد کی خاصیت جُدا ہوتی ہے کس قسم کے پھلوں اور پھولوں کے عرق سے شہد تیار ہوا ہے اس کا لحاظ بھی موسم کے مطابق ضروری ہے۔ شہد کے علاوہ کوئی شفا بخش دوا ایسی نہیں کہ ہر قسم کے پھلوں اور پھولوں کا خلاصہ کھنچ کر اس میں آگیا ہو ہر دوا کا ایک خاص مزاج اور خاصیت ہے شہد ہی ایک ایسی چیز ہے جو فصل کے اختلاف اور پھلوں پھولوں کے تنوع کے لحاظ سے اپنے اندر مختلف خاصیات رکھتا ہے پس شہد کا ہر مرض کے لئے شفا ہونا بجائے خود صحیح ہے لیکن مرض کی نوعیت کے لحاظ سے شہد کی نوعیت اور جن پھلوں اور پھولوں سے شہد بنا ہو ان کی دریافت لازم ہے پھر شہد کے طریق استعمال اور مقدار استعمال کا بھی بڑا فرق ہے اگر طریق استعمال اور مقدار ضروری کا علم نہ ہو تو اس سے شہد کے شفا بخش ہونے کی نفی نہیں کی جاسکتی ہر شہد ایک کیفیت کا بھی حامل نہیں ہوتا، کسی میں گرمی زیادہ ہوتی ہے کسی میں کم، بعض شہد فالج، لقوہ، اور بڑے بڑے اعصابی امراض میں بہت مفید ہوتے ہیں اور بعض کم مفید اور بعض بالکل فائدہ نہیں دیتے۔ اسہال کو روکنے کے لئے بھی شہد مفید ہوتا ہے اور جاری کرنے کے لئے بھی۔ فاسد مادہ کو باہر نکال کر پھینک دیتا ہے اور فاسد غذائی مادہ کو نکال پھینکنے کے بعد قبض بھی کر دیتا ہے۔ غرض شہد مقوی بھی ہے مفرح بھی، اچھی غذا بھی ہے اور عمدہ دوا بھی۔ جو اور جتنے فوائد شہد کے اندر ہیں وہ دنیا کی کسی چیز کے اندر نہیں ہیں۔ حقیقت میں شہد مجمع الاضداد ہے)

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اس میں بھی ان لوگوں کے لئے (اللہ کی قدرت، حکمت اور وحدانیت والوہیت کی) بڑی دلیل ہے جو غور کرتے ہیں جو شخص مکھیوں کی اس صنعتی مہارت اور عجیب پُر حکمت نظم پر غور کرے گا اس کو صاف نظر آجائے گا کہ یہ سب کار فرمائی اور عجوبہ زائی در پردہ کسی قادر حکیم کی ہے وہی مکھیوں کے دل میں یہ تدبیریں ڈالتا ہے اور ترکیبیں بتاتا ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ یَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَیْ لَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ
شَیْــٴًـا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ ﴿۷۰﴾ ع ۹ اور اللہ ہی نے تم کو پیدا کیا اور وہ ہی تمہاری جانیں قبض کرتا ۱۵
ہے (بچپن میں یا جوانی میں یا متوسط عمر میں یا بڑھاپے میں) اور بعض تم میں سے وہ ہیں جو ناکارہ عمر تک پہنچائے جاتے ہیں جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز سے باخبر ہونے کے بعد پھر بے خبر ہو جاتا ہے بے شک اللہ بڑے علم اور بڑی قدرت والا ہے۔

اَرْذَلِ الْعُمُرِ، بدترین عمر، ناکارہ عمر، انتہائی بڑھاپا۔ قتادہ نے کہا، ارذل عمر نوے سال ہے حضرت علیؓ نے فرمایا پچھتر برس ارذلِ عمر ہے۔ بعض نے اسی برس کی عمر کو ارذلِ عمر کہا ہے، رسول اللہ ﷺ اپنی دعا میں فرماتے تھے اے اللہ! میں بڑی عمر سے تیری پناہ لیتا ہوں، دوسری روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اے اللہ میں تیری پناہ کا طالب ہوں کہ مجھے ارذل عمر تک پہنچایا جائے۔ صحیحین وغیرہ میں بھی ایسی ہی روایت آئی ہے باخبر ہونے کے بعد بے خبر ہو جانے کا یہ مطلب ہے کہ تمام معلومات کو بھول جائے اور بچوں کی طرح نادان اور ضعیف الفہم ہو جائے عکرمہ نے کہا جو قرآن (ہمیشہ) پڑھتا ہے وہ اس حالت پر نہیں پہنچتا۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ قَدِیْرٌ یعنی اللہ لوگوں کی عمروں کی مقداروں سے خوب واقف ہے اور ہر چیز پر قادر ہے پیرِ فرتوت کو کبھی چھوڑ تا اور جوان قوی کی جان قبض کر لیتا ہے اس آیت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگوں کے احوال کا اختلاف و تفاوت اللہ حکیم و علیم کے اندازے کے مطابق اور اس کی مشیت کے موافق ہے طبعی اور خود بخود نہیں ہے اگر طبعی اقتضا ہوتا تو اس حد تک نہ

ہوتا (کہ عالم صغیر ہونے کے بعد آدمی قطعاً بے خبر ہو جائے کہ باوجود بیماری نہ ہونے کے محض ترقی عمر کی وجہ سے بچہ کی طرح ہو جائے اور علم و عمل سے بے خبر ہو جائے)

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں برتری عطا کی ہے۔ کوئی مالدار ہے، مالک ہے، بادشاہ ہے، ہزاروں لاکھوں روپیہ خرچ کرتا ہے کوئی نادار فقیر غلام اور ادنیٰ فوجی ہے۔ ایک روپیہ بھی صرف نہیں کر سکتا۔

فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَآدِّي رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيهِ سَوَآءٌ ۚ

سو وہ اپنے حصہ کا مال اپنے غلاموں کو اس طرح کبھی دینے والے نہیں کہ وہ (مالک و مملوک) سب اس مال میں برابر ہو جائیں۔ یعنی مالداروں اور بادشاہوں کو اللہ نے جو زیادہ مال عطا کیا وہ اپنا زائد مال اپنے غلاموں اور خادموں کو اتنا دینے والے نہیں کہ آقا اور غلام اور بادشاہ و فقیر سب مال میں برابر ہو جائیں۔

اس آیت سے مشرکوں کے شرک کی تردید مقصود ہے مشرک اللہ کے ساتھ مخلوق کی الوہیت و معبودیت میں شریک قرار دیتے تھے باوجودیکہ ان کے فرضی معبود کسی چیز میں اللہ کے شریک نہیں بن سکتے تھے اللہ خالق ہے اور اس کے سوا ہر چیز مخلوق، اللہ مالک ہے اور ہر چیز اس کی مملوک، اللہ حاکم ہے اور ہر چیز اس کی محکوم کوئی مخلوق اس کی ہم جنس نہیں۔ اس کے مشابہ نہیں نہ ذات میں، نہ صفات میں، نہ کسی کیفیت و حالت میں مترجم)۔ مشرک خود تو اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ اپنے مال میں اپنے غلاموں کو مساویانہ شریک کر لیں باوجودیکہ غلام و آقا دونوں ہم جنس ہوتے ہیں اور آقا کے پاس خداداد مال ہوتا ہے اور آقا اپنے غلام کا رازق نہیں ہوتا رزق اس کو بھی خدا دیتا ہے۔

آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کو اللہ زائد رزق عطا فرما دیتا ہے وہ اپنا رزق غلاموں کو نہیں دیتے بلکہ غلام اپنا رزق کھاتے ہیں جو اللہ نے ان کو عطا فرمایا ہے پس اس رزق میں مالک و مملوک سب برابر ہیں، سب خداداد رزق کھاتے ہیں۔

اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُونَ ۝ کیا پھر بھی خدا کی نعمت کا انکار کرتے ہیں کہ اللہ کے شریک قرار دیتے ہیں۔ شرک کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی بعض نعمتوں کا انکار کیا جائے اور ان کو شریکوں کی عطا کردہ قرار دیا جائے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ ایسے واضح دلائل و براہین سے اپنی توحید و الوہیت کو ثابت کر رہا ہے اور یہ دلائلِ توحید اللہ کی نعمت ہیں تو کیا یہ اللہ کی نعمت کے منکر ہیں۔ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ

اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً اور اللہ ہی نے تم میں سے (یعنی تمہاری جنس میں سے) تمہارے لئے تمہاری بیبیاں بنائیں اور بیبیوں سے تم کو بیٹے پوتے عنایت کئے۔ تمہاری جنس سے تمہاری بیبیاں بنائیں تاکہ تم کو ان سے اُنس خاطر حاصل ہو اور تمہاری اولاد تمہاری جنس کی ہی ہو (یعنی آدمی ہو)۔

بعض علماء نے جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ اللہ نے حضرت حوا کو حضرت آدمؑ سے پیدا کیا پھر باقی تمام عورتوں کو مردوں اور عورتوں کے نطفہ سے بنایا۔

حَفَدَةً اولاد کی اولاد اور تیز دست خادم۔ صاحبِ قاموس نے لکھا ہے حَفَدَ ماضی یَحْفِدُ (مضارع) حفداً اور حفداناً (مصدر) کام میں تیزی کی سبکدستی سے کام کیا۔ اِحْتَفَدَ (باب اِفتعال) کا بھی یہی معنی ہے حَفَدَ کا معنی خَدَمَ بھی ہے (خدمت کی) حفدۃ، حافِد کی جمع ہے خادم کارگزار۔ حفدۃ اور حفید اولاد، اولاد کی اولاد، خسر اور لڑکیاں۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ اور نخعی نے فرمایا (آیت میں) حفدۃ سے مراد ہیں داماد دوسری روایت میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول آیا ہے کہ حفدۃ سے مراد ہے خسر۔ اس قول پر آیت کا یہ مطلب ہو گا کہ اللہ نے تمہاری بیبیوں سے تم کو نرمادہ اولاد عطا کی اور ان کے نکاح کر دینے سے خسر کا داماد تمہارے لئے مقرر کئے۔ عکرمہ، حسن اور ضحاک نے کہا آیت میں خادم مراد ہیں۔ مجاہد نے کہا کارگذار کارندے مراد

ہیں عطانے کہا وہ اولاد مراد ہے جو مددگار اور خادم ہوتی ہے۔ میں کہتا ہوں ان تمام اقوال کی بناء پر آیت میں حَفَدَۃً سے مراد ہیں بیٹے اور بَنِیْنَ پر حَفَدَۃً کا عطف وصفی تغائر کی وجہ سے کیا گیا (بَنِیْنَ میں نسبی حالت اور حفدۃ میں خدمت کی حالت ملحوظ رکھی گئی) بیضاوی نے متعدد توجیہات میں سے ایک توجیہ (حسبِ مذکورہ بالا) لکھی ہے۔

مقاتل اور کلبی نے کہا بَنِیْن سے چھوٹے بچے اور حفدۃ سے بڑی اولاد مراد ہے جو چھوٹے بچوں کی خدمت کرتی اور ان کی مدد کرتی ہے قتادہ نے کہا وہ اولاد مراد ہے جو تمہاری خدمت اور کام کاج کرتی ہے۔ مجاہد اور سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ حفدۃ سے مراد اولاد کی اولاد ہے۔ عوفی کی روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے کہ اپنی بیوی کے بچے مراد ہیں جو پہلے شوہر سے ہوں۔ میں کہتا ہوں شاید حفدۃ کہنے کی وجہ تسمیہ اس صورت میں یہ ہو کہ (حفدۃ لغت میں خادموں کو کہتے ہیں اور) بیوی کے بچوں سے آدمی وہ کام لیتا ہے جو اپنی اولاد سے نہیں لیتا اس لئے بیوی کے بچوں کو حفدۃ کہا گیا۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ مجملہ دوسرے معانی کے آیت میں ایک مرادی معنی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حفدۃ سے مراد ہیں بیٹیاں گھروں کے اندر بیٹیاں ہی زیادہ کام کاج کرتی ہیں۔

وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۭ اور تم کو اچھی اچھی چیزیں کھانے پینے کو دیں۔ طَیِّبٰتِ لذیذ چیزیں یا حلال چیزیں۔ مِنْ تبعیضیہ ہے، دنیا کی نعمتیں، آخرت کی نعمتوں کا نمونہ ہیں یہاں کل نعمتیں موجود نہیں ہیں۔

اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ ﴿۷۲﴾ کیا پھر بھی وہ بے بنیاد بات کو مانتے رہیں گے اور اللہ کی نعمت کی ناشکری کرتے رہیں گے۔ یعنی بتوں کو نفع رساں سمجھتے رہیں گے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی نسبت بتوں کی طرف کرتے رہے گے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے ارشاد فرمایا میرا اور کافر جن وانس کا ایک عظیم واقعہ (یعنی عجیب معاملہ) ہے پیدا میں کرتا ہوں پوجا دوسروں کی کی جاتی ہے رزق میں دیتا ہوں شکر دوسروں کا کیا جاتا ہے۔ بعض علماء کا قول ہے کہ "باطل" سے مراد ہے بحیرہ، سائبہ اور وصیلہ کی از خود باغواء شیطانی تحریم (یہ تینوں قسمیں بحار اونٹوں یا سانڈھوں کی عرب میں ہوتی تھیں۔ بعض کا گوشت کھانا اور سواری لینا اور بوجھ لادنا مشرکوں نے حرام کر رکھا تھا) یعنی بحیرہ وغیرہ کی حرمت کا تو یہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں اور اللہ کے حلال پاکیزہ رزق کی حلت کا انکار کرتے ہیں۔ بعض نے کہا باطل شیطان ہے اور اللہ کی نعمت رسول اللہ ﷺ کی ذات مبارک۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ﴿۷۳﴾ اور اللہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی عبادت کرتے رہیں گے جو ان کو نہ آسمان میں سے رزق پہنچانے کا اختیار رکھتی ہیں اور نہ زمین میں سے اور نہ کسی قسم کی قدرت رکھتی ہیں۔ آسمان سے رزق یعنی بارش اور زمین سے رزق یعنی سبزی (غلہ، پھل، ترکاری وغیرہ) اخفش کے نزدیک شَیْـئًا بدل ہے اور رِزْقًا مبدل منہ اور رزق سے مراد ہے مرزوق (کھانے پینے پہننے کی چیز) یعنی وہ کسی چیز کے مالک نہیں نہ قلیل کے نہ کثیر کے، ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں۔ فراء نے رِزْقًا کو مفعول مطلق کہا ہے اور شَیْـئًا کو مفعول بہ۔

لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ، کا یہ مطلب ہے کہ مالک بننے کی بتوں میں طاقت ہی نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ بتوں کو کسی قسم کی بھی طاقت حاصل نہیں ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ کی ضمیر راجع کی جائے کافروں کی طرف یعنی کافروں میں باوجود زندہ ہونے کے مالک بننے کی طاقت نہیں ہے اور بت تو بے جان پتھر ہیں ان میں طاقت کیسے ہو سکتی ہے۔

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۴﴾ پس تم اللہ کی مثالیں مت گھڑو۔ اللہ بلاشبہ (اشیاء کی حقیقت اور ضرب امثال کو) خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

اللہ کی مثال بیان کرنے کی ممانعت اس وجہ سے کی کہ ضربُ المثل نام ہے ایک حال کو دوسرے حال سے تشبیہ دینے کا اور اللہ کی ذات وصفات کا کسی کو (کامل) علم نہیں نہ کوئی یہ جانتا ہے کہ کون کون سی صفات کا اطلاق اللہ پر ہونا درست ہے اور کن

کن صفات کے ساتھ اللہ کا متصف ہونا محال ہے ایسی حالت میں اللہ کو کسی چیز پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے غائب کو حاضر کے سانچے میں ڈھالنا کس طرح زیبا ہے۔ کوئی علتِ جامع اور وصفِ مشترک موجود نہیں ہے اللّٰہُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ حقائقِ اشیاء سے واقف ہے اور تم ناواقف ہو یا یہ مطلب ہے کہ تم جو اللہ کی مثالیں بیان کرتے ہو اور قیاس چلاتے ہو اللہ کو اس کی غلطی کا علم ہے وہ جانتا ہے کہ تمہاری تمثیلات فاسد ہیں اور تم کو اس کا علم نہیں اگر تم کو اپنے قول کی غلطی کا علم ہوتا تو تمثیلات بیان کرنے کی جرأت ہی نہ کرتے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ اللہ ایک مثال بیان کرتا ہے (فرض کرو) ایک شخص تو غلام ہے جو کسی کا مملوک ہے خود کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔

اللہ نے یہ مثال اپنی ذات اور دوسرے باطل معبودوں (کا فرق واضح کرنے) کے لئے بیان کی ہے۔ مملوکًا سے مراد یہ ہے کہ وہ بندہ آزاد نہیں۔ یوں تو سبھی لوگ آزاد ہوں یا غلام، اللہ کے بندے ہیں لایقدر علٰی شیئٍ کہنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ غلام مکاتب نہیں ہے اور نہ اس کو لین دین کی آقا کی طرف سے اجازت دی گئی ہے (مکاتب اس غلام کو کہتے ہیں جس نے آقا سے معاہدہ کر لیا ہو کہ اتنا روپیہ کما کر جب میں تم کو دے دوں گا تو آزاد ہو جاؤں گا اور آقا نے اس معاہدہ کو تسلیم کر لیا ہو)۔

وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ یُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا ؕ هَلْ یَسْتَوٗنَ ؕ
اور ایک شخص وہ ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے خوب روزی دے رکھی ہے سو وہ اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ (جس طرح اور جتنا چاہتا ہے) خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں آپس میں برابر ہو سکتے ہیں۔

اللہ نے اس مثال میں باطل معبودوں کو اس غلام سے تشبیہ دی جو بے بس اور ہر قسم کا تصرف کرنے سے عاجز ہے کچھ بھی اس کو اختیار نہیں۔ اور اپنی ذات کو آزاد مالدار سخی آدمی سے تمثیل دی جو جیسا اور جتنا چاہتا ہے صرف کرتا ہے ظاہر ہے کہ صرف سے اس کو کوئی نہیں روک سکتا اور پوشیدہ خرچ سے کوئی مانع نہیں ہو سکتا۔ اس تمثیل سے شرک کے باطل ہونے پر استدلال کیا ہے کیونکہ جن بتوں کو اللہ کی الوہیت میں شریک قرار دیا جاتا تھا وہ تو بے اختیار غلام سے زیادہ عاجز ہیں اور اللہ ہر آزاد، غنی سخی سے زیادہ مالکِ مال اور عطا کنندہ اور قوی و مختار ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ۝۷۵ ساری تعریفیں اللہ کے لائق ہیں۔ (اور یہ لوگ اس کے منکر ہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتے ہی نہیں ہیں، یعنی اللہ ہی تمام نعمتوں کا عطا کرنے والا ہے لہٰذا وہی ہر ستائش کا مستحق ہے اس کے سوا اور کوئی نعمت دینے والا نہیں اس لئے کوئی دوسرا قابلِ ستائش نہیں۔ معبودیت کا استحقاق تو بجائے خود رہا۔

اکثر لوگ چونکہ جانتے نہیں نادانی کی وجہ سے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو دوسروں کی طرف سے منسوب کر دیتے ہیں اور غلط انتساب کی وجہ سے باطل معبودوں کی عبادت کرتے ہیں۔ بعض اہلِ تفسیر کا خیال ہے کہ عبدًا مملوکًا کافر کی مثال ہے اللہ نے اس کو توفیق ہی نہیں دی کہ کوئی بھلائی کر سکے یا راہِ خدا میں کچھ صرف کرے۔ ہر نقطہ خیر سے عاجز ہے اور مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا مؤمن کی مثال ہے جو اللہ کی راہ میں جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

ابن جریج نے عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ عبدِ مملوک سے مراد ابو جہل ہے اور مَنْ رَّزَقْنٰهُ سے مراد حضرت ابو بکر صدیقؓ ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُهُمَاۤ اَبْكَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰى شَیْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَیْنَمَا یُوَجِّهْهُّ لَا یَاْتِ بِخَیْرٍ ؕ
اور اللہ ایک (اور) مثال بیان کرتا ہے دو آدمی ہیں ایک تو ان میں گونگا جو کوئی کام نہیں کر سکتا اپنے سرپرست کے لئے وبالِ جان ہے، اس کو جہاں بھی بھیجتا ہے کوئی کام ٹھیک کر کے نہیں لاتا۔

اَبْكَمُ پیدائشی گونگا جو نہ کچھ سمجھتا ہے نہ بول سکتا ہے لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ کم فہمی کی وجہ سے وہ نہ کسی صنعت پر قادر ہے نہ کسی کام کی تدبیر پر۔ كَلٌّ بار ہے، وبال ہے مَوْلٰىهُ یعنی اپنے سرپرست کے لئے (آقا مراد نہیں ہے) لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ یعنی کسی معمولی کام کو بھی ٹھیک کر کے نہیں لاتا یہ تشبیہ بتوں کی ہے جو نہ سنتے ہیں نہ دیکھتے ہیں نہ کچھ سمجھتے ہیں پوجنے والوں پر خواہ مخواہ کا بار ہیں، پجاری خود ان کو اٹھاتے اور رکھتے ہیں اور سب بے سود۔ بت ان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔

هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۷۶﴾ کیا یہ شخص اور ایسا شخص باہم برابر ہو سکتے ہیں جو اچھی باتوں کی تعلیم دیتا ہو اور خود بھی سیدھے راستہ پر چلتا ہو۔ یعنی جو شخص سلیم الطبع اور سمجھدار ہو خوب رواں سلیس گفتگو کر سکتا ہو، ہر کام ٹھیک اور پورا پورا کرتا ہو، لوگوں کو تمام اچھی باتیں سکھاتا ہو۔ غرض یہ کہ عدل (جو عفت، شجاعت اور حکمت کا مجموعہ ہے) کی تعلیم دیتا ہو اس گونگے، ناکارہ، بے وقوف کی طرح ہو سکتا ہے۔ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ صراط مستقیم پر ہونے کا یہ معنی ہے کہ ہر مقصد کو سیدھے راستے پر چل کر حاصل کر لیتا ہو۔ مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے اللہ نے اپنی ذات کی تمثیل دی ہے بعض علماء نے کہا اس سے رسول اللہ ﷺ کی ذات مراد ہے۔ عطاء نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ابکم سے کافر اور مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مؤمن مراد ہے۔ یہ تمثیل کافر و مؤمن کی ہے۔ عطاء نے اس آیت کے (سبب نزول) کے ذیل میں بیان کیا کہ ابکم سے مراد اُبَی بن خلف ہے اور مَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ سے مراد حضرت حمزہؓ، حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عثمان بن مظعونؓ ہیں مقاتل نے کہا قبیلہ ربیعہ کا ایک شخص تھا جس کا نام ہاشم بن عمرو بن حارث تھا یہ رسول اللہ ﷺ کا سخت دشمن تھا اور بہت ہی شریر تھا اسی کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔ ابن جریر نے حضرت ابن عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ آیت ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا ایک قریشی آدمی اور اسکے غلام کے متعلق نازل ہوئی اور آیت رجلین احد ہما ابکم حضرت عثمانؓ اور ان کے کافر غلام اُسید بن ابو العیص کے متعلق نازل ہوئی۔ اُسید کو اسلام سے سخت نفرت تھی خود بھی کافر تھا اور دوسروں کو بھی اسلام سے اور ہر بھلائی، حسن سلوک اور خیر خیرات سے روکتا تھا۔ ۱۰ ع ۱۶

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اور آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ یعنی ان سے واقف اللہ ہی ہے بغیر اس کے بتائے ہوئے کسی کو معلوم نہیں ہو سکتیں۔ غیب و شہادت کے معنی کی تشریح ہم نے سورۂ جن میں ذکر کی ہے۔

وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اور قیامت کا معاملہ بس پلک جھپکنے کی طرح ہے بلکہ اس سے بھی جلدی۔ یعنی وقوع قیامت کی سرعت اور سہولت پلک جھپکنے کی طرح ہے۔ قاموس میں لمح کا معنی نظر جھپکنا بیان کیا گیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ قیامت بس ایسی ہے جیسے بجلی نظر کو جھپک لے۔ بیضاوی نے لکھا ہے کہ لمح کا معنی ہے نظر کا حدقہ، چشم کے بالائی حصہ سے نچلے حصہ کی طرف لوٹنا۔ پلک جھپکنے سے کم وقت کو ظاہر کرنے کے لئے عرفِ عام میں کوئی لفظ نہیں اس لئے قیامت کے جلد اور بسہولت آجانے کی تشبیہ پلک جھپکنے سے دی گئی۔ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ کا یہ مطلب ہے کہ وقوع قیامت اس سے بھی جلدی ہے اللہ ساری مخلوق کو یکدم زندہ کر کے اٹھا دے گا کُنْ کہتے ہی ہر چیز موجود ہو جائے گی دم کی کوئی مدت نہیں بیان کی جا سکتی۔ بغوی نے لکھا ہے اس آیت کا نزول منکرین کے متعلق ہوا جو قیامت کے منکر تھے اور قیامت کا مذاق اڑاتے ہوئے جلد سے جلد آجانے کے خواہش مند تھے۔

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾ بلا شبہ اللہ ہر چیز پر قابو رکھتا ہے۔ دنیا میں اس نے مخلوق کو رفتہ رفتہ زندگی عطا فرمائی اور قیامت کے دن سب کو یکدم زندہ کر دے گا دیکھو یہ اس کی قدرت ہی کا کرشمہ ہے کہ۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ ۙ اللہ نے ہی تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹ سے ایسی حالت میں نکالا کہ تم (بے جان جمادات کی طرح) کچھ بھی نہیں جانتے اور اسی نے تم کو کان دیئے اور آنکھیں اور دل۔

سمع، سے مراد ہیں اسماع (اسم جنس بمعنی جمع) یعنی اللہ نے تم کو آلاتِ علم عطا کئے اول حواس کے ذریعہ سے تم جزئیات کا علم حاصل کرتے ہو پھر بار بار اور پے در پے احساس کرنے کے بعد تم دل سے اشیاء میں امتیاز کرتے ہو اشیاء مشترکہ کے اشتراک اور جُدا جُدا چیزوں کے اختلاف کو جان لیتے ہو، اس طرح تم کو کچھ بدیہی علوم حاصل ہو جاتے ہیں۔ اور ان بدیہی علوم پر غور کرنے کے بعد تم کو نظری اور فکری علوم حاصل کرنے کی قدرت پیدا ہو جاتی ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۷۸﴾ تاکہ تم شکر کرو۔ یعنی آلاتِ علم اس لئے عطا کئے کہ تم اللہ کی نعمتوں کو پہچانو اور شکر ادا کرو۔

اَلَمْ يَرَوْا اِلَى الطَّيْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِيْ جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا يُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ

کیا لوگوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کے نیچے فضا میں مسخر ہو رہے ہیں ان کو اللہ کے سوا (اس خلا میں) کوئی نہیں تھامتا۔

مُسَخَّرٰتٍ یعنی بازو، پَر وغیرہ اڑنے کے آلات، اللہ نے ان کو عطا کئے جن کے ذریعہ سے وہ اللہ کے زیر فرمان اڑتے ہیں۔ جَوِّ السَّمَآءِ آسمان و زمین کی درمیانی ہوا۔ بغوی نے کعب الاحبار کا قول نقل کیا ہے کہ پرندے بارہ میل بلندی تک اڑ سکتے ہیں اس سے اوپر نہیں اڑ سکتے۔ (یعنی مسخر ہونے کا یہ مطلب ہے کہ صرف بارہ میل کی بلندی تک ہی اڑنے کی ان میں طاقت ہے اس سے اونچا اڑنا ان کے لئے ناممکن نہیں)

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۷۹﴾ ایمان لانے والے لوگوں کے لئے اس میں بلاشبہ (اللہ کی قدرت، حکمت اور الوہیت کی) بڑی نشانیاں ہیں یعنی اللہ نے پرندوں کی پیدائش ہی ایسی کی ہے کہ وہ ہوا میں اڑتے ہیں ان کے جسم بھاری ہوتے ہیں۔ نیچے کچھ سہارا اور ستون نہیں ہوتا۔ اوپر کسی چیز سے بندھے نہیں ہوتے پھر بھی ہوا میں رُکے رہتے ہیں۔ طبعی تقاضا ہے کہ نیچے گر پڑیں بیچ میں کوئی ثقیل مانع بھی نہیں پھر بھی نہیں گرتے، بس اللہ ہی ان کو تھامے رہتا ہے اور کون ایسا کر سکتا ہے ایمان والے اس پر غور کی نگاہ ڈالیں تو انہی کو اس عملِ تسخیر میں خدا کی قدرت نظر آئے گی اور وہ فائدہ اندوز بھی ہوں گے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ

اور اللہ ہی نے تمہارے واسطے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی اور تمہارے واسطے جانوروں کی کھال کے گھر (یعنی چرمی خیمے) بنائے جن کو تم اپنے سفر اور قیام کے زمانے میں ہلکا پھلکا پاتے ہو۔ کھالوں کے گھروں سے مراد ہیں چرمی ڈیرے، خیمے، چھولداریاں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُون اور بالوں سے بنے ہوئے ڈیرے خیمے بھی اس لفظ کے اندر شامل ہوں کیونکہ بال اور اُون کھال کی پیداوار ہے لہٰذا چمڑے ہی کے حکم میں ہے یَوْمَ ظَعْنٍ کوچ کا دن یعنی سفر کا زمانہ۔ یوم اقامت ٹھہرنے یا کہیں اترنے کا وقت۔

وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَآ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِيْنٍ ﴿۸۰﴾ اور ان کے اون اور ان کے روئیں اور ان کے بالوں سے گھر کا سامان اور ایک وقت تک فائدے کی چیزیں بنائیں۔ صُوف (اون) بھیڑوں، دنبوں کا ہوتا ہے اور وبر اونٹوں سے حاصل کیا جاتا ہے اور بال بکری سے۔ اثاث گھر کا سامان، فرش، بستر، چادر، کمبل، لباس، اثاث کا مفرد نہیں آتا۔ اثاث ہر طرح کے مال کو بھی کہتے ہیں کذا فی القاموس۔ "متاع" سامانِ تجارت اِلٰی حین یعنی اس مدت تک جب تک اللہ اس کو باقی رکھنا چاہتا ہے۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا اور تمہارے لئے اللہ ہی نے اپنی پیدا کی ہوئی بعض چیزوں کے سائے بنائے اور تمہارے لئے پہاڑوں میں پناہ کی جگہیں بنائیں۔ یعنی درختوں پہاڑوں اور مکانوں کے سائے بنائے جو دھوپ کی تپش سے بچاتے ہیں اور پہاڑوں میں چھپنے اور محفوظ رہنے کے مقامات مثلاً غار اور غاروں

کے اندر پتھروں کو تراش کر بنائے ہوئے مکان بنائے۔ اَکْنَان کِنٌّ کی جمع ہے کِنّ چھپنے کا مقام۔ مکان وغیرہ۔

وَّ جَعَلَ لَكُمْ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ وَسَرَابِيْلَ تَقِيْكُمْ بَاْسَكُمْ　اور تمہارے لئے (سُوت، اُون، کتان، ریشم وغیرہ کے کچھ) ایسے کُرتے بنائے جو تم کو گرمی سے محفوظ رکھتے ہیں اور (لوہے ریشم وغیرہ کے کچھ) ایسے کرتے بنائے جو لڑائی میں تمہاری حفاظت کرتے ہیں۔

صِرف گرمی سے بچانے کا ذکر کیا مراد سردی گرمی دونوں ہیں ایک ضد کو ذکر کرنے کے بعد دوسرے کا ذکر ضروری نہ تھا۔ (خود ہی سمجھ میں آسکتا تھا اس لئے ذکر نہیں کیا گیا)

كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ۝۸۱　اللہ تعالیٰ اسی طرح (کی) نعمتیں تم کو پوری پوری عطا فرماتا ہے تاکہ تم فرماں بردار رہو۔ یعنی جس طرح اس نے مذکورہ نعمتیں تم کو عطا فرمائی اسی طرح تم پر اپنی نعمتیں پوری کرتا ہے تمہارے ہی لئے اس نے اپنے رسول اللہ ﷺ کو بھیجا اور رسول ﷺ کی تصدیق کے لئے اس کو معجزات عطا کئے اور اپنی کتاب نازل کی اور واضح دلائل قائم کیں اور اسلام کو عزت دی یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ اکثر لوگ فرماں بردار ہو جائیں اور خالص اللہ کی اطاعت کریں۔ عطا خراسانی نے کہا اللہ نے انسانوں کی سمجھ کے موافق قرآن نازل فرمایا۔ (دیکھو پہاڑوں میں پناہ گاہیں پیدا کرنے کا ذکر کیا اور میدان وصحرا جو پہاڑوں سے بڑے ہیں ان کا ذکر نہیں کیا وجہ یہ ہے کہ ان کے چاروں طرف پہاڑ تھے۔ پہاڑ ان کے سامنے تھے اسی طرح اُون، روئیں اور بالوں کے خیموں، ڈیروں کا تذکرہ اس لئے کیا کہ وہ مویشی پالا کرتے تھے ان کے پاس اُون، بال وغیرہ ہی تھے۔ اسی طرح ایک اور آیت میں فرمایا وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ جِبَالٍ فِيْهَا مِنْ بَرَدٍ اللہ تعالیٰ آسمانی پہاڑوں سے اولے اُتارتا ہے ثَلْج (آسمانی برف) کا ذکر نہیں کیا حالانکہ ژالہ باری سے برف باری کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ وہ برف باری سے واقف ہی نہ تھے اسی طرح آیاتِ مذکورہ بالا میں گرمی سے حفاظت کو لباس کا فائدہ قرار دیا ہے سردی کا ذکر نہیں کیا کیونکہ ان لوگوں کو گرمی سے ہی زیادہ واسطہ پڑتا تھا۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝۸۲　پھر بھی یہ لوگ اگر (ایمان سے) منہ پھیریں (تو آپ سے اس کا کوئی مؤاخذہ نہ ہوگا کوئی پروانہ کیجئے) آپ کے ذمّے تو صاف صاف اللہ کا پیام پہنچادینا ہے۔

یعنی اتنے دلائل اور نشاناتِ قدرت کے بعد بھی اگر یہ ایمان سے گریز کریں تو آپ ان کی پرواہ نہ کریں رنجیدہ اور تنگ دل نہ ہوں، آپ کا کام صرف پیام پہنچادینا ہے (ان کے ماننے نہ ماننے سے آپ کا کچھ تعلق نہیں ہے) ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا حضور ﷺ نے اسکے سامنے پڑھا وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ بُيُوْتِكُمْ سَكَنًا اس نے کہا جی ہاں! پھر حضور ﷺ نے پڑھا وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُيُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا يَوْمَ ظَعْنِكُمْ وَيَوْمَ اِقَامَتِكُمْ اعرابی نے کہا جی ہاں، اسکے بعد اگلی آیات پڑھیں اور اعرابی ہر آیت پر کہتا رہا ٹھیک ہے جی ہاں۔ آخر میں جب حضور ﷺ نے پڑھا كَذٰلِكَ يُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ یہ سنتے ہی اعرابی منہ پھیر کر چل دیا اس پر اللہ نے نازل فرمایا فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔

يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۸۳　یہ اللہ کی نعمت کو پہنچانتے تو ہیں پھر انجان ہو جاتے ہیں (منکر ہو جاتے ہیں) اور ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں یعنی اللہ کی نعمتوں کو دیکھ کر ان کا اقرار کرتے ہیں اور ان کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ جانتے ہیں پھر اللہ کی خالص عبادت سے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک بنالیتے ہیں (اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسروں کو مُنعِم سمجھتے ہیں اللہ کو مُنعِم نہیں سمجھتے، یا اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی مُنعِم جانتے ہیں۔ یہ حقیقت میں اللہ کی نعمت کا انکار ہے، مترجم) سدی کے نزدیک اللہ کی نعمت سے رسول اللہ ﷺ کی نبوّت مراد ہے یعنی وہ نبوّتِ محمدیہ کے سبب جانتے پہچانتے ہیں پھر محض ضد و عناد سے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

"ایک شبہ" جس کا وہم کیا جا سکتا تھا۔

مشرک تو پہلے ہی سے منکر تھے اور ثُمَّ یُنْكِرُوْنَ میں ثمّ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اعتراف و اقرار کے بعد وہ منکر ہوئے حالانکہ ایسا نہ تھا۔

ازالۂ شبہ

ثمّ بُعدِ زمان کو ظاہر کرتا ہے لیکن کبھی بُعد مرتبہ کے لئے بھی آتا ہے پہچان لینے کے بعد انکار کرنا عقل سے بہت بعید تھا اس لئے ثمّ کا لفظ استعمال کیا گیا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مجاہد و قتادہ نے کہا اللہ نے اس سورت میں جن نعمتوں کی تفصیل کی ہے کافر ان کو پہچانتے تھے۔ پھر جب ان سے کہا گیا کہ اس بات کی تصدیق بھی کرو ان نعمتوں کو خداداد تسلیم کر کے اللہ کے احکام کی تعمیل کرو تو اس کا انکار کرنے لگے اور کہنے لگے ہم کو تو یہ نعمتیں باپ دادا سے وراثت میں ملی ہیں۔

کلبی نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کی نعمتوں کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے اقرار کیا اور کہا، ہاں، یہ نعمتیں اللہ ہی نے دی ہیں لیکن ہمارے معبودوں کی سفارش سے ملی ہیں۔ عون بن عبد اللہ نے کہا، نعمتوں کے انکار کا مطلب ہے ظاہر اسباب کی طرف نعمتوں کی حقیقی نسبت کر دینا مثلاً کوئی کہتا ہے، اگر فلاں بات ہوتی (یا فلاں شخص یا فلاں تدبیر ہوتی) تو یہ کام ہو جاتا یا یہ کام نہ ہونے پاتا (یہ الفاظ بظاہر مشرکانہ ہیں جن کی ممانعت ہے، مترجم)

اکثر ناشکرے ہیں نعمتوں کے اعتراف کے بعد محض ضد و عناد سے انکار کرتے ہیں اکثر سے مراد یا تو کل کافر ہیں یا اکثر ہی مراد ہیں۔ بعض ناقص العقل ہیں اس لئے حق کو پہچانتے ہی نہیں یا کوتاہ نظر ہیں غور کرتے یا مکلف ہی نہیں ہیں (نابالغ یا مجنوں ہیں) اس لئے ان پر کوئی حجت ہی قائم نہیں ہوئی۔ بہر حال بعض لوگ ناسپاس نہیں ہیں حکم مذکور سے مستثنیٰ ہیں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِينَ كَفَرُوا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ ﴿۸۴﴾

اور جس دن ہر ہر امت میں سے ہر ایک ایک گواہ قائم کریں گے پھر ان کافروں کو اجازت نہ دی جائے گی اور نہ ان سے اللہ کو راضی کرنے کی فرمائش کی جائے گی۔

شَهِيدًا سے مراد پیغمبر ہے جو اپنی امت کے کفر و ایمان کی شہادت دے گا اجازت نہ دی جانے سے مراد ہے عذر پیش کرنے کی اجازت نہ ملنا کیونکہ ان کے پاس کوئی عذر موجود ہی نہ ہوگا یا یہ مطلب ہے کہ بولنے کی اجازت نہیں دی جائے گی بعض نے کہا کہ دنیا میں واپس جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُونَ یعنی ان سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اپنے رب کو راضی کر لو۔ روزِ آخرت تو عمل کا دن ہی نہ ہوگا اور دنیا میں واپس جا کر توبہ و عمل کی اجازت نہ ہوگی غرض یہ کہ ان کے لئے اللہ کی رضامندی کا حصول ناممکن ہوگا۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿۸۵﴾

اور جب ظالم (یعنی کافر) عذاب جہنم کو دیکھیں گے تو وہ عذاب (اندر داخل ہونے کے بعد) ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور نہ (داخل ہونے سے پہلے) ان کو مطلق مہلت دی جائے گی۔

وَإِذَا رَأَى الَّذِينَ أَشْرَكُوا شُرَكَاءَهُمْ قَالُوا رَبَّنَا هَٰؤُلَاءِ شُرَكَاؤُنَا الَّذِينَ كُنَّا نَدْعُو مِنْ دُونِكَ ۚ

اور جب مشرک اپنے (بنائے ہوئے) شریکوں (یعنی بتوں) کو دیکھیں گے تو کہیں گے، وہ ہمارے (مفروضہ بنائے ہوئے) شریک یہی ہیں جن کو ہم تیرے سوا پوجتے تھے۔ یعنی یہ وہی معبود ہیں جن کی عبادت کرتے تھے یا جن کی اطاعت ہم کرتے تھے یہ مشرکوں کی طرف سے اپنی غلطی کا اعتراف ہو گا یا اس درخواست کا یہ مقصد ہو گا کہ ہمارا عذاب آدھا کر دیا جائے۔

فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝ سو وہ (بت) ان (مشرکوں) کی طرف کلام کا رخ کریں گے اور کہیں گے کہ تم قطعاً جھوٹے ہو یعنی اللہ بتوں کو گویا بنادے گا اور کلام کرنے کی قدرت عطا کردے گا اور بت اپنے کلام کا رُخ مشرکوں کی طرف کر کے کہیں گے تم جھوٹے ہو کہ ہم کو اللہ کا شریک کہتے تھے یا اس دعوے میں جھوٹے ہو کہ حقیقت میں تم ہماری پوجا کرتے تھے، واقع میں تم اپنی خواہشات کے پُجاری تھے (تم نے خود ہی اپنی خواہشات کے مطابق ہماری پوجا کی تھی) ہم نے تم کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت نہیں دی تھی دوسری آیت سے اسی مفہوم کی تائید ہوتی ہے فرمایا سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وہ بُت مشرکوں کے معبود ہونے کا انکار کریں گے (اور کہیں گے تم ہماری عبادت نہیں کرتے تھے) یا یہ مطلب ہے کہ تم اس دعویٰ میں جھوٹے ہو کہ ہم نے تم کو اپنی پوجا پر آمادہ کیا تھا اور کفر کی ترغیب دی تھی اور تم پر اپنی عبادت کرانے پر زبردستی کی تھی (ابلیس کہے گا) وَمَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِيْ میری تم پر کوئی زبردستی نہ تھی صرف اتنی بات تھی کہ میں نے تم کو دعوت دی تھی تم نے میری دعوت مان لی۔

وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ ِنالسَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ۝ اور مشرک لوگ اس روز اللہ کے سامنے اطاعت کی باتیں کرنے لگیں گے اور جو کچھ دروغ بندیاں کرتے تھے سب گم ہو جائیں گی یعنی دنیا میں تو اللہ کی اطاعت سے تکبر کرتے تھے مگر قیامت کے دن اطاعت کا اظہار کریں گے اور جو جو دروغ تراشیاں کرتے اور کہتے تھے کہ انکے معبود اللہ کے دربار میں سفارش کردیں گے وہ سب اِفترا پردازیاں بیکار ثابت ہوں گی۔

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ۝

جو لوگ کفر کرتے تھے اور اللہ کی راہ سے روکتے تھے ہم ان کی فساد انگیزی کی پاداش میں سزا پر اور سزا کا اضافہ کردیں گے۔

اللہ کی راہ یعنی اسلام سے لوگوں کو روکتے اور کفر پر آمادہ کرتے تھے۔ عذاب کی زیادتی کا یہ مطلب ہے کہ کفر کی جس سزا کے مستحق ہوں گے اس میں کافر گری اور راہ خدا سے روکنے کا مزید اضافہ ہو جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے عذاباً کی تشریح میں فرمایا، بچھو ہوں گے جن کے ڈنک کھجور کے لمبے درختوں کے برابر ہوں گے۔ ابن مردویہ نے حضرت براء کی روایت سے اسی معنی کی حدیث مرفوع بھی نقل کی ہے۔ سعید بن جبیرؒ نے کہا، سانپ ہوں گے بختی اونٹوں کی طرح اور بچھو ہوں گے خچروں کی مثل جن کے ایک مرتبہ کاٹنے کا اثر چالیس (خریف) سال تک ڈسا ہوا آدمی محسوس کرتا رہے گا۔ حضرت ابن عباسؓ اور مقاتل کا قول ہے عرش کے نیچے سے پگھلے ہوئے تانبے کے پانچ دریا نکلتے ہیں جو آگ کی طرح ہیں، ان دریاؤں میں دن کی مدت کے برابر (ہمیشہ) سزا پاتے رہیں گے بعض نے کہا کہ گرمی کے عذاب سے سردی کے عذاب کی طرف ان کو نکال کر لایا جائے گا سردی کی شدت کی وجہ سے وہ چیخیں گے فریاد کریں گے اور دوزخ کی گرمی میں جانا چاہیں گے۔

فساد انگیزی سے مراد ہے دنیا میں کفر کرنا اور راہ خدا سے روکنا۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ۝

اور جس دن ہم ہر امت میں ایک ایک گواہ جو ان ہی میں کا ہو گا ان کے مقابلہ میں قائم کردیں گے اور ان لوگوں کے مقابلہ میں آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے اور ہم نے آپ پر قرآن اُتارا ہے کہ تمام (دین کی ضروری) باتوں کو بیان کرنے والا ہے اور (خاص) مسلمانوں کے واسطے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور خوش خبری سنانے والا ہے۔ شہید سے مراد ہے ہر امت کا پیغمبر۔ ہر امت کی ہدایت کے لئے اللہ نے انہی کا پیغمبر مبعوث فرمایا۔ ہؤلاء سے مراد ہے امت اسلامیہ۔ تبیاناً یعنی واضح، بلیغ بیان لکل شی یعنی ہر دینی ضروری مسئلہ کا واضح بیان مفصل ہو یا مجمل۔ جس طرح کہ ان آیات میں آیا ہے مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا۔ وَمَنْ يَّتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى۔ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي

الْاَبْصَارِ

هُدًى یعنی گمراہی سے نکال کر سیدھا راستہ دکھانے والا ہے۔ رَحْمَةً یعنی سب لوگوں کے لئے رحمت ہے اگر کوئی اس رحمت سے محروم رہا تو اپنی کوتاہی کی وجہ سے (حضرت مفسرؒ کی یہ تفسیر ہمارے ذکر کئے ہوئے ترجمہ کے خلاف ہے۔ ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ترجمہ سے ماخوذ ہے جس میں قرآن کی ہدایت اور رحمت اور خوش خبری خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے لئے بتایا گیا ہے۔ اور حضرت مفسرؒ نے ہدایت ورحمت کو عمومی قرار دیا ہے اور بشارت کو صرف مسلمانوں کے لئے بتایا ہے۔ واللہ اعلم مترجم)

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ بے شک اللہ عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے عدل کا لفظ مساوات کا مقتضی ہے اللہ نے اسی لئے فرمایا ہے اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا یا اس کے برابر روزے وَاَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ اور یہ کہ عورتوں میں ہر طرح سے برابری رکھو۔ فدیہ اور بدلہ کو عدل اسی وجہ سے کہا جاتا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ عدل کا حکم دیتا یعنی بدلہ میں مساوات رکھنے کا۔ خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ شر اور اللہ حکم دیتا ہے کہ حاکم مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان مساوات کا سلوک کرے کسی ایک کی طرف مائل نہ ہو جائے۔ جو کچھ فیصلہ کرے اللہ کے حکم کے مطابق کرے۔

اگر عدل کا معنی بدلہ دینے میں مساوات لیا جائے گا تو احسان کا یہ مطلب ہو گا کہ خیر کا بدلہ زیادہ اور بہتر بھلائی کی شکل میں دے اور شر کا بدلہ کم شر سے دے۔ خیر کے مقابلہ میں زیادہ بھلائی کرے اور برائی کے مقابلے میں کم برائی۔

(اور اگر عدل سے مراد مدعی اور مدعیٰ علیہ کے درمیان مساوات ہو تو احسان کا مطلب یہ ہو گا کہ اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرے) میں کہتا ہوں، عدل سے مراد استقامت علی الحق بھی ہو سکتی ہے یعنی کج روی اور جور کا مخالف مفہوم بھی مراد ہو سکتا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے عدل، جور (کج روی) کی ضد ہے اور طبیعت کے اندر کسی چیز کے مستقیم ہونے کے خیال کے جماؤ کو بھی کہتے ہیں بعض علماء نے عدل کو بمعنی اعتدال کہا ہے یعنی ہر چیز میں توسط جیسے تعطل (اللہ کا تمام صفات سے خالی ہونا) اور شرک (اللہ کی صفات میں مخلوق کو شریک قرار دینا) کے درمیان توحید (صفاتی) کا درجہ ہے (یعنی اللہ نہ صفات سے خالی ہے نہ اس کی صفات مخلوق میں پائی جاتی ہیں بلکہ وہ اپنی صفات کے لحاظ سے واحد لا شریک ہے) یا جیسے جبر وقدر کے درمیان کسب کا درجہ ہے (بندہ بالکل نہ مجبور ہے نہ اپنے افعال کا خود خالق اور قادر بلکہ کاسب ہے۔ خالق افعال اللہ ہے اور افعال کو کرنے والا بندہ) یا جیسے اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرنے کا درمیانی درجہ کہ نہ عبادت خدا میں اتنا غرق ہو جائے کہ بندوں کے حقوق کی ادائیگی ترک کر دے اور دنیا کو چھوڑ بیٹھے نہ دنیا میں اتنا منہمک ہو جائے کہ اللہ کے حقوق کی ادائیگی چھوڑ دے۔ واجب، نفل کچھ ادا نہ کرے۔ یا جیسے سخاوت کہ بخل وفضول خرچی کے درمیانی درجہ کا نام ہے یا شجاعت کا جو احمقانہ بیجا دلیری اور بزدلی کے درمیانی وصف کا نام ہے یا جیسے عفت کہ پاکدامنی کو کہتے ہیں زنا کاری بے حیائی اور جائز قربت صنفی کے ترک کے درمیان عفت کا درجہ ہے۔ بغوی نے لکھا ہے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا (عدل سے مراد) توحید ہے اور احسان سے مراد اداء فرائض۔ دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ کا قول آیا ہے خالص توحید کا نام احسان ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: احسان یہ ہے کہ تم اپنے رب کی اس طرح عبادت کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو اگر تم اس کو نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھتا ہے (یعنی عبادت میں مشاہدۂ رب کا درجہ حاصل نہ ہو تو کم از کم اتنا تو سمجھتے رہنا ہی چاہئے کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے) رواہ عمر بن الخطاب کذا فی الصحیحین

مقاتل نے کہا، عدل توحید ہے اور لوگوں سے درگذر کرنا احسان ہے بعض علماء نے کہا عدل سے مراد فرض ہے اور احسان سے مراد نفل اگر فرض میں کوئی قصور آجاتا ہے تو نفل سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے (گویا نفل فرض ناقص کو حسین یعنی کامل بنا دینے والی چیز ہے) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا اللہ نہ اس کے صرف کو قبول فرمائے گا نہ عدل کو یعنی نہ نفل کو نہ فرض کو۔

وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ اور (حکم دیتا ہے)

قرابتداروں کو دینے کا اور بے حیائی سے اور بری باتوں سے اور ظلم سے منع کرتا ہے۔

قرابتداروں کو دینے سے مراد ہے حاجت روائی کرنا، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا یعنی کنبہ پروری کرنا۔ فحشاء حد سے بڑھی ہوئی برائی (کھلی برائی) قولی ہو یا فعلی (سخت بری بات سخت، براکام) حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا، الفحشاء یعنی زنا المنکر ہر براکام جس کو شریعت نے برا قرار دیا ہو اور عقل سلیم بھی اس کو برا جانتی ہو۔ البغی تکبر اور ظلم۔ بیضاوی نے لکھا ہے فحشاء سے مراد ہے قوت شہوانیہ کے استعمال میں حد (اعتدال) سے آگے بڑھ جانا جیسے زنا انسانی احوال میں حد سے بڑھی ہوئی شہوانیت یعنی زنا بہت ہی بری حالت ہے منکر قوت غضبیہ کے ہیجان سے مغلوب ہو کر ایسا کام کرنا جو (عقلاً و نقلاً) برا ہے۔ البغی غرور، تکبر لوگوں پر جبر اور زبردستی، سب سے اونچا ہو جانا۔ یہ شیطنت قوت وہمیہ کا کرشمہ ہے انسان کی ہر برائی اور شر انہی تینوں اقسام میں سے کسی نہ کسی قسم کے ذیل میں داخل ہے اسی لئے حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، قرآن مجید میں سب سے زیادہ جامع آیت یہی ہے حضرت ابن مسعودؓ کا یہ قول سعید بن منصور نے الادب میں بخاری میں نے محمد بن منصور اور ابن جریر نے ابن المنذر ابن ابی حاتم اور حاکم نے اور شعب الایمان میں بیہقی نے نقل کیا ہے اور حاکم نے اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ الادب میں بخاری نے اور امام احمد (ابن ابی حاتم و طبرانی و ابن مردویہ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے کہ یہی آیت حضرت عثمان بن مظعونؓ کے مسلمان ہو جانے کا سبب ہوئی۔

بغوی نے لکھا ہے کہ سفیان بن عیینہ نے کہا ظاہر و باطن برابر ہو جانا عدل ہے باطن کا ظاہر سے اچھا ہونا احسان ہے اور ظاہر بہ نسبت باطن کے اچھا ہو تو یہ فحشاء اور منکر ہے۔

يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿٩٠﴾ اللہ تم کو اس لئے نصیحت کر رہا ہے کہ تم نصیحت قبول کرو۔ یعنی امر و نہی (کی پابندی) اور اچھائی برائی میں تمیز کرنے کی نصیحت اللہ تم کو کرتا ہے تاکہ تم اس کو مانو اور اس پر کاربند ہو۔ بیضاوی نے لکھا ہے اگر قرآن میں اس آیت کے سوا کوئی اور آیت ہی نہ ہوتی تب بھی قرآن کو تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّ بُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ کہنا صحیح ہوتا۔

بغوی نے ایوب کا قول نقل کیا ہے کہ عکرمہؓ نے بیان کیا رسول اللہ ﷺ نے جب یہ آیت ولید کو سنائی تو ولید بولا بھتیجے ذرا اس کو دوبارہ پڑھو۔ حضور ﷺ نے دوبارہ تلاوت فرمائی ولید کہنے لگا خدا کی قسم اس میں عجیب شیرینی اور ایک خاص حسن ہے (یہ کھجور کے درخت کی طرح ہے) اس کا بالائی حصہ (یعنی ظاہر) ثمر آفریں اور نچلا حصہ (یعنی باطن) خوشوں سے بھرا ہوا ہے یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا اور تم اللہ کے عہد کو پورا کرو جبکہ تم اس عہد کو (خصوصاً یا عموماً) اپنے ذمے لے لو اور قسموں کو مضبوط کرنے کے بعد توڑو اور تم تو خود (اپنی قسموں) پر اللہ کو گواہ بنا چکے ہو۔ عہد پختہ اقرار۔ ابن جریر نے حضرت بریدہؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ یہ آیت رسول اللہ ﷺ کے بیعت لینے اور رسول اللہ ﷺ نے بیعت کرنے کے متعلق نازل ہوئی بغوی نے لکھا ہے عہد اس جگہ بمعنی قسم ہے شعبی نے کہا (اس جگہ) عہد بمعنی قسم ہے اور اس کو توڑنے کا کفارہ قسم کا کفارہ ہے الایمان یعنی بیعت کے عہد یا عام قسمیں بعد توکیدہا یعنی اللہ کا نام لے کر قسموں کو پختہ کرنے کے بعد کفیلا یعنی بیعت کا گواہ۔ کفیل جس چیز کی کفالت کرتا ہے اس کی نگرانی رکھتا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿٩١﴾ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے یقیناً واقف ہے یعنی عہد پورا کرو یا توڑو اللہ سب سے واقف ہے مجاہد نے کہا، اس آیت کا نزول حلف جاہلیت کے متعلق ہوا (یعنی اسلام کے دور سے پہلے جو لوگ باہم محالفے کرتے تھے اس کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی) اس کے بعد آیت ذیل میں عہد شکنی کی مثال دے کر سمجھایا ہے فرمایا ہے۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ط اور تم (مکہ کی) اس (بیوقوف) عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد ریزہ ریزہ کر کے نوچ ڈالا۔

غَزْل بٹنا، کاتنا، مضبوط کرنا، اِنکاث نِکث کی جمع ہے ریزہ ریزہ سارے بَل کھلے ہوئے۔

ابن ابی حاتم نے ابو بکر بن ابی حفص کا بیان نقل کیا ہے کہ (مکّہ کی ایک عورت) سعیدہ اسدیہ پاگل تھی بال اور کھجور کی چھال کے ریشے جمع کرتی تھی اسی کے حق میں یہ آیت نازل ہوئی بغوی نے لکھا ہے کہ کلبی اور مقاتل نے کہا کہ ربطہ بنت عمر بن سعد بن کعب بن زید بن مناۃ بن تمیم ایک الھڑ بیوقوف عورت تھی۔ اس کا لقب جعر تھا۔ اس کے دماغ میں کچھ خرابی تھی اس نے ایک چرخہ ہاتھ بھر کا اور اس میں ایک میخ انگل بھر کی اور دُومڑ کہ بہت بڑا بنا رکھا تھا (روز) وہ اون روئیں اور بالوں کی کتائی کرتی تھی اور اپنی باندیوں سے بھی کتواتی تھی سب مل کر دوپہر تک کاتتی تھیں دوپہر کو وہ سب کا کاتا ہوا دھاگہ کھول ڈالتی تھی (اور ریزہ ریزہ کر دیتی تھی) یہی اس کا روزانہ کا معمول تھا۔ اس پس منظر میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ عورت جو کاتنے کا کام برابر کرتی تھی کاتنا ترک نہیں کرتی تھی اور کاتنے کے بعد کتے ہوئے سُوت کو توڑنے سے باز نہیں رہتی تھی تم اس کی طرح نہ ہو جاؤ یا تو عہد ہی نہ کرو اور کرو تو اس کو پورا بھی کرو۔ ہر مرتبہ معاہدہ کر کے اس کو نہ توڑو۔

تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ

(کہ اس طرح) تم بھی اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بنانے لگو۔ محض اس وجہ سے کہ ایک گروہ دوسرے گروہ سے بڑھ جائے۔ "دَخَل" بگاڑ، دھوکہ، فریب، خیانت۔ "دَخَل" لغوی (ساخت کے) اعتبار سے اس چیز کو کہتے جس کو کسی دوسری چیز کے اندر اس کو خراب کرنے اور بگاڑنے کے لئے داخل کیا جائے۔ بعض علماء نے کہا دَخَل اور دَغَل یہ ہے کہ ظاہر میں تو وفا عہد کرے اور باطن میں اس کو توڑ دے۔ اَرْبٰی تعدادِ افرادی اور مال میں زیادہ۔ مجاہد نے کہا (دورِ جاہلیت میں) عرب کا دستور تھا کہ ایک قبیلہ یا ایک جماعت دوسری جماعت سے باہمی امداد کا تقسیم معاہدہ کر لیتی تھی (یعنی ایک جماعت دوسری جماعت کی حلیف ہو جاتی تھی) دونوں کا معاہدہ بحلف ہو جاتا تھا) لیکن ان دونوں قبیلوں میں سے کسی کو اپنے حلیفوں کی دشمن جماعت زیادہ طاقت ور یا مالدار نظر آتی تھی تو اپنے حلیفوں سے غداری کر کے حلیفوں کے دشمنوں سے جا کر مل جاتے تھے اور ان سے محالفہ کر لیتے تھے۔ مجاہد کی تشریح کی بناء پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کمزوروں سے عہد شکنی کر کے طاقتوروں سے تم معاہدے کر لیتے ہو۔ محض اس لئے کہ تم کو غلبہ اور طاقت حاصل ہو جائے ایسا نہیں کرنا چاہئے۔

یا آیت کا یہ مطلب ہے کہ تم اپنی قسموں کو فساد کا ذریعہ صرف اس وجہ سے بنا لیتے ہو کہ تمہارا ایک گروہ دوسرے ہم معاہدہ گروہ سے تعداد اور مال میں زیادہ ہوتا ہے اس لئے طاقت ور گروہ کو معاہدہ شکنی کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی جس طرح قریش نے حدیبیہ کے مقام پر مسلمانوں سے دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی جماعت سے قریش کی تعداد زیادہ ہے اور مالی طاقت بھی بڑھ کر ہے اس لئے دو ہی سال میں معاہدہ توڑ دیا۔

اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

پس اس سے اللہ تمہاری آزمائش کرتا ہے اور جن چیزوں میں تم اختلاف کرتے رہے قیامت کے دن ان سب کو تمہارے سامنے عملاً ظاہر کر دے گا۔

یعنی ایک جماعت کو دوسری جماعت سے بڑا اور برتر کر کے اللہ جانچ کرتا ہے کہ یہ جماعتیں اللہ سے کئے ہوئے عہد اور رسول اللہ ﷺ کی بیعت کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہتی ہے یا مؤمنوں کی قلّت اور قریش کی کثرت و شوکت دیکھ کر توڑ دیتی ہیں۔ اور دنیا میں کئے ہوئے اختلافی اُمور کا فیصلہ جب قیامت کے دن اللہ کرے گا اور ہر ایک اعمال کا بدلہ دے گا تو جن لوگوں نے عہد کو پورا کیا ہوگا ان کو ثواب اور جن لوگوں نے وعدہ شکنی کی ہوگی۔ ان کو عذاب دے کر حقیقت کو ظاہر کر دے گا۔

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَلَتُسْـَٔــلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اگر اللہ کو منظور ہوتا تو سب کو ایک ہی طریقہ کا بنا دیتا لیکن (اس کی مشیّت ہے) وہ جس کو چاہتا ہے بے راہ کر دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے راہ پر ڈال دیتا ہے اور (قیامت کے دن) تم

سے تمہارے اعمال کی ضرور باز پُرس ہو گی۔

ایک ہی طریقہ کا بنا دینے کا مطلب یہ ہے کہ سب کو اسلام پر متفق کر دیتا اور سب وفا عہد کرنے والے ہو جاتے آپس میں اختلاف نہ رہتا۔ بے راہ کر دینے کا یہ مطلب ہے کہ اس کو بے مدد چھوڑ دیتا۔ مدد نہ کرتا اور راہ پر ڈالنے کا معنی یہ ہے کہ اس کو ایمان و خیر کی توفیق دے دیتا۔ ہر شخص سے باز پرس لاجواب بنانے اور سزا و جزا دینے کے لئے ہو گی۔

وَلَا تَتَّخِذُوٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوٓءَ بِمَا صَدَدْتُّمْ عَنْ سَبِيلِ اللّٰهِ ۚ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿۹۴﴾

اور تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ مت بناؤ۔ کہیں (اس کو دیکھ کر کسی اور کا) قدم جمنے کے بعد نہ پھسل جائے اور اللہ کی راہ سے روکنے کی وجہ سے پھر تم کو تکلیف بھگتنا پڑ جائے اور (آخرت میں) تمہارے لئے بڑا عذاب ہو جائے۔

دُخَل' فساد' دھوکہ۔ یعنی قسموں کو فریب دہی اور فساد انگیزی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ لوگ تمہارے معاہدات پر اعتماد کر لیں اور تمہاری طرف سے مطمئن ہو جائیں اور تم ان کو فریب دے کر قسمیں اور معاہدے توڑ دو۔

قدم جمنے کے بعد پھسل جانے کا مطلب یہ ہے کہ بے خوف اور مطمئن ہو جانے کے بعد تم ہلاک ہو جاؤ۔ عرب کا محاورہ ہے کہ عافیت کے بعد اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے یا سلامتی کے بعد کسی گڑھے میں گر پڑتا ہے تو کہتے ہیں اس کا قدم پھسل گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی بیعت اسلام کی شاہراہ تھی۔ بیعت پر قائم رہنا اور اس کو نہ توڑنا راہِ اسلام پر برابر چلتے رہنے اور استقامت رکھنے کا نام تھا اور بیعت توڑ دینا لغزشِ قدم تھی تکلیف کا مزہ چکھنے سے مراد ہے دنیا میں تکلیف بھگتنا، اور عذابِ عظیم سے مراد ہے آخرت کا بڑا عذاب۔

وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۭ اور تم لوگ عہدِ خداوندی (اور بیعتِ رسول) کے عوض (دنیا کا) تھوڑا سا فائدہ مت حاصل کرو۔ یعنی اللہ سے کیا ہوا عہد اور رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر کی ہوئی بیعت اور معاہدات اس لالچ میں نہ توڑ دو کہ دنیا کا کچھ مال تم کو مل جائے۔

اِنَّمَا عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۹۵﴾ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ

جو کچھ (دُنیوی اور اُخروی نعمتیں) اللہ کے پاس ہیں وہ (اس دنیا سے جس کے تم طلب گار ہو) تمہارے لئے بدرجہا بہتر ہے اگر تم سمجھو جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہے گا یعنی جو کچھ دنیوی مال و متاع تمہارے پاس ہے وہ فنا ہو جائے گا اور اللہ کی رحمت کے خزانے کبھی فنا نہیں ہوں گے۔ یہ جملہ لَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللّٰهِ کی علت ہے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص اپنی دنیا کو پسند کرتا ہے وہ اپنی آخرت کو نقصان پہنچاتا ہے اور جو آخرت کو پسند کرتا ہے وہ اپنی دنیا کا ضرر کرتا ہے تم باقی رہنے والی چیز کو فنا ہونے والی (دنیا) پر ترجیح دو (آخرت کو پسند کرو دنیا کی پروا مت کرو) رواہ الحاکم بسند صحیح و احمد۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوٓا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۹۶﴾

اور جو لوگ ثابت قدم ہیں ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ہم ان کا اجر ان کو ضرور دیں گے۔ یعنی جن لوگوں نے بیماری افلاس، کفار کی ایذا، پابندی احکام کی مشقت اور جہاد میں ڈٹے رہنے کی مصیبتوں پر صبر کیا اللہ ان کے صبر کا انکو ثواب عطا فرمائے گا اور اتنا ثواب دے گا کہ ان کے اعمال کے مقررہ اجر سے بہت اچھا ہو گا ہر نیکی کو سات سو گنا تک بڑھا دے گا اور اس سے بھی زیادہ جتنی اللہ کی مشیت ہو گی بعض علماء نے کہا اَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ سے مراد فرائض اور مستحبات ہیں۔ ممنوعات اور مباحات سے فرائض و مستحبات بہر حال بدرجہا بہتر ہوتے ہیں۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ

جو شخص کوئی نیک کام کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ صاحبِ ایمان ہو تو ہم اس شخص کو (دنیا میں) بالُطف زندگی عطا کریں گے۔

وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ أَجْرَهُمْ بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝۹۷ اور آخرت میں ان کے اچھے کاموں کے عوض ان کا اجر عطا کریں گے۔

وَهُوَ مُؤْمِنٌ بشرطیکہ وہ مؤمن ہو، ایمان کی شرط اس لئے لگائی کہ کافر کسی ثواب کے مستحق نہیں خواہ کیسے ہی اچھے اعمال کریں زیادہ سے زیادہ عذاب کی تخفیف کی امید کی جاسکتی ہے کیونکہ اللہ کے نزدیک ثواب کا مدار خلوص اور حسنِ نیت پر ہے (یعنی محض خوشنودی خدا کے لئے ہونا ضروری ہے) اور کافروں کی نیکیوں میں یہ چیز مفقود ہے۔

حیاتِ طیبہ سے مراد سعید بن جبیرؒ کے نزدیک رزقِ حلال ہے اور حسن کے نزدیک قناعت ہے مقاتل بن حیان نے کہا طاعت میں زندگی گزارنا حیاتِ طیبہ ہے۔ ابوبکر وراق نے کہا طاعت کی شیرینی پاکیزہ زندگی ہے بیضاوی نے کہا، پاکیزہ زندگی گزارنے والا اگر مالدار اور فراخ حال ہے تو ظاہر ہے اس کی دُنیوی زندگی پاکیزہ ہوگی اور اگر تنگدست ہے تو ظاہر ہے کہ قناعت کرے گا۔ تقسیمِ خداوندی پر راضی ہوگا اور آخرت میں اجرِ عظیم ملنے کا امیدوار ہوگا اس طرح اس کی زندگی خوش عیشی کے ساتھ گزرے گی۔ کافر کی زندگی اس کے برعکس ہوتی ہے۔ تنگدست ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی زندگی تلخ ہوتی ہے اور مالدار ہے تب بھی اس کو موجودہ دولت کے زوال کا اندیشہ رہتا ہے اور ہر وقت حرص میں گرفتار رہتا ہے اور اس کی وجہ سے خوش عیش زندگی اطمینان کے ساتھ نہیں گزار سکتا۔ میں کہتا ہوں آیت إِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا کا بھی یہی مطلب ہے۔ میں کہتا ہوں، بندے کو جب اللہ سے محبت ہوتی ہے تو جو کچھ محبوب کی طرف سے اس کو پہنچتا ہے، تلخی ہو یا شیرینی وہ سب سے لذّت اندوز ہوتا ہے۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا ہے، محبوب کی طرف سے جو دکھ پہنچتا ہے وہ محبوب کی طرف سے ملنے والے سکھ سے زیادہ لذیذ ہوتا ہے۔ دکھ تو صرف رضاء محبوب ہوتی ہے اور سکھ میں کچھ ذاتی مقصد بھی ہوتا ہے اور خالص رضاء محبوب زیادہ لذت آفریں ہوتی ہے اور محبّ کو محبوب کی مرضی ہی سب سے پیاری ہوتی ہے۔ شیخ عارف رومی قدس سرّہٗ نے فرمایا:

عاشقم بر لطف و بر قہرت بجد ۔۔۔ اے عجم من عاشقم بر ہر دو ضد

ناخوش از وے خوش بود در جانِ من ۔۔۔ جاں فدائے یار جاں رنجانِ من

میں کہتا ہوں، حیاتِ طیبہ کی تشریح میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے اپنے دوستوں کے حق میں فرمایا ہے لَهُمُ الْبُشْرَىٰ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ان کے لئے دنیوی زندگی میں بشارت ہے۔ اس آیت کی تفسیر سورۂ یونس میں گزر چکی ہے جب مؤمن کو اس زندگی میں اللہ کی خوشنودی کے حصول اور بارگاہِ قدس میں مرتبۂ قُرب پر پہنچنے اور درجات بلند ہونے کی بشارت مل جاتی ہے تو دنیا میں ہی اس کو وہ نعمت و راحت مل جاتی ہے جس کی جنت کے اندر ملنے کی اس کو امید ہوتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، اللہ اہلِ جنت سے فرمائے گا کیا تم راضی ہو گئے جنتی عرض کریں گے (اے ہمارے رب) راضی نہ ہونے کی وجہ بھی کیا ہو سکتی ہے تو نے تو ہم کو وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں جو کسی شخص کو نہیں دیں۔ اللہ فرمائے گا کیا ان نعمتوں سے بھی بڑی نعمت تم کو دوں۔ پھر فرمائے گا (وہ سب سے اعلیٰ نعمت یہ ہے کہ) میں تم کو اپنی خوشنودی عطا کرتا ہوں آئندہ کبھی میں تم سے ناراض نہیں ہوں گا۔ یہ حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے صحیحین میں مذکور ہے۔ اور حضرت جابرؓ کی روایت سے طبرانی نے الاوسط میں بھی ایسی ہی حدیث بیان کی ہے۔ اسی حدیث کے مضمون کو پڑھ کر ایک عارف نے کہا ہے:

امروز چوں جمال تو بے پردہ ظاہر است ۔۔۔ دَر حیرتم کو وعدۂ فردا برائے چیست

شیخ محمد عابد مجددیؒ فرماتے تھے، جو لذت و راحت دنیا میں اہلِ فقر کو حاصل ہے اگر بادشاہوں اور امیروں کو اس کا علم ہو جاتا تو وہ اہلِ فقر پر رشک کرنے لگتے اور جل جاتے۔

ایک شبہ

اگر دنیا میں حسب بیان مذکور لذت وراحت کی وہ حالت حاصل ہو جاتی ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے تو پھر ایمان کہاں جاتا۔ دنیا میں تو خوف و امید دونوں ایمان کے لوازم میں سے ہیں۔ (ایمان بیم و رجاء کی درمیانی حالت کا نام ہے)

ازالہ

حالت مذکورہ تو نتیجہ ہے اُنس و محبت کا۔ یہ خوف کے خلاف نہیں۔ کیونکہ خوف ہوتا ہے اللہ کی عظمت و کبریائی کو دیکھ کر۔ مؤمن کے دل سے خوف کبھی دور نہیں ہوتا۔ وہ انبیاء جن کو اللہ کی خوشنودی حاصل ہونے کا یقین ہوتا ہے۔ اور اپنے حسن خاتمہ میں کوئی شک نہیں ہوتا ان کو دوسروں کے مقابلے میں اللہ کی عظمت و بزرگی کا زیادہ مشاہدہ ہوتا ہے، اس لئے دوسرے مؤمنوں کے مقابلے میں ان کو اللہ کا خوف بھی زیادہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا میں تم لوگوں سے زیادہ اللہ کو جانتا اور تم سے زیادہ اللہ کا خوف رکھتا ہوں۔ صحابہؓ کو قطعی وحی کے ذریعے سے حصول رضا خداوندی اور داخلۂ جنت کی بشارت دے دی گی تھی، اللہ نے صحابہ کرامؓ کے متعلق فرمایا ہے۔ لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ اس قطعی بشارت کے باوجود وہ کامل طور پر اللہ سے ڈرتے تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کی یہ حالت تھی تو صحابہؓ کے بعد جن مؤمنوں کو کشف ظنی کے طور پر بشارت دے دی جاتی ہے، ان کا تاثر بشارت، خوف کے خلاف کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ حیات طیبہ سے مراد ایسی زندگی ہو جو بہر حال خیر و برکات سے پُر ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کا ہر کام خیر ہی خیر ہے۔ سوائے مؤمن کے اور کسی کو یہ بات حاصل نہیں۔ مؤمن پر اگر راحت آتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے اور یہ اس کے لئے خیر بن جاتا ہے اگر اس پر کوئی بدحالی اور دکھ آتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے اور یہ صبر اس کے لئے خیر ہو جاتا ہے۔ رواہ احمد فی المسند و مسلم فی الصحیح عن صہیبؓ و احمد و ابن حبان عن انسؓ و البیہقی بسند صحیح عن سعید۔

مجاہد و قتادہ کے نزدیک حیات طیبہ سے جنت کی زندگی مراد ہے۔ عوف نے حسن بصریؒ کی طرف بھی اس قول کی نسبت کی ہے۔ حسن نے فرمایا جنت کے علاوہ دنیا میں کسی کی زندگی طیب نہیں ہوتی۔

اوّل الذکر تفسیر (یعنی دنیا میں پاکیزہ زندگی مراد لینا) ظاہر ہے کلام کی رفتار سے یہی ظاہر ہو رہا ہے۔

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۹۸﴾ جب آپ قرآن پڑھیں تو شیطان مردود سے بچنے کے لئے اللہ کی پناہ طلب کریں یعنی جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کریں تو شروع کرنے سے پہلے اللہ سے پناہ کی دعا کریں تاکہ شیطان مردود قرأت میں وسوسہ نہ پیدا کر سکے اور تلاوت میں کوئی غیر لفظ شامل نہ کرے۔ کیونکہ شیطان کی عادت ہے کہ اللہ نے جو بھی پیغمبر یا نبی بھیجا اور اس نے اللہ کا کلام پڑھا تو شیطان نے اس کی قرأت میں مداخلت ضرور کی۔ اس آیت میں قرأت کرنے سے مراد ہے ارادۂ قرأت کرنا۔ ایجاز کلام کے لئے ارادہ کی تعبیر فعل سے کی۔ اس سے اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ جو شخص عبادت کا ارادہ کر لے تو اس کے بعد عبادت ضرور کرے (ایسا نہ ہو کہ ارادہ کر لے اور عبادت نہ کرے) نخعی اور ابن سیرین نے ظاہر لفظ کو دیکھ کر (یعنی اِذَا قَرَاْتَ کا ظاہری مطلب لے کر صراحت کی ہے۔ کہ تلاوت کرنے کے بعد اعوذ باللہ پڑھی جائے۔ اسکے علاوہ تاخیر تعوذ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عبادت اَقْرَبُ اِلَی الْاِجَابَت ہو جائے گی ویسے شیطان کے شر سے اللہ کی پناہ کی طلب تو ہمیشہ ہی کرنا چاہئے۔ (آغاز قرأت پر ہی موقوف نہیں ہے)

صحیح روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ قرأت سے پہلے دعا کرتے (یعنی اعوذ باللہ پڑھا کرتے) تھے جمہور سلف و خلف کا اسی پر اجماع ہے۔ لیکن جمہور کے نزدیک قرأت سے پہلے تعوذ سنت ہے اور عطاء نے اسی آیت کو استدلال میں پیش کرتے ہوئے واجب ہونے کی صراحت کی ہے کیونکہ اِسْتَعِذْ امر کا صیغہ ہے اور امر کا حقیقی مفہوم وجوب ہے۔ اور یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ اعوذ باللہ پڑھنے کا حکم شیطانی وسوسہ کو دفع کرنے کے لئے دیا گیا ہے اور مسنون ہونے کی علامت ہے (اگر اغواء شیطانی کا اندیشہ نہ ہو تو ترک تعوذ جائز ہے) یہ دلیل کمزور ہے وجوب تعوذ اس کے باوجود بھی ہو سکتا ہے۔

جمہور علماء تعوّذ کے واجب ہونے کے قائل نہیں کیونکہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے قرات سے پہلے تعوّذ کو ترک کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہور کے نزدیک بعض وقت ترک تعوذ جائز ہے اگر بعض وقت تعوّذ کو ترک کرنا رسول اللہ ﷺ کے عمل سے ثابت نہ ہوتا تو علماء بھی ترکِ تعوّذ کو جائز نہ قرار دیتے۔ بکثرت احادیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعوذ پڑھے بغیر بھی قرآن کی تلاوت فرمائی۔ صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ آخری تہائی رات کو اُٹھ بیٹھے اور سورۂ آلِ عمران کی آخرت دس آیات اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ سے پڑھیں پھر کھڑے ہو کر وضو کیا الیٰ آخرہ۔ صحیح مسلم میں آیا ہے کہ حضرت انسؓ نے بیان کیا ہم ایک روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے اچانک آپ کو غفلت سی ہو گئی پھر کچھ دیر کے بعد مسکراتے ہوئے سر اٹھایا ہم نے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! حضور ﷺ کے مسکرانے کی کیا وجہ ہے فرمایا، ابھی مجھ پر ایک سورت اتری ہے اس کے بعد آپ نے تلاوت کی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ۔ فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔ اِنَّ شَانِئَکَ ھُوَ الْاَبْتَرُ۔

مسئلہ: کیا نماز کے اندر ہر رکعت میں قرأت سے پہلے اعوذ پڑھنا چاہئے۔ یہ مسئلہ اختلافی ہے۔ امام ابو حنیفہ اور امام احمد قائل ہیں کہ نماز کی صرف پہلی رکعت میں قرأت سے پہلے اعوذ پڑھی جائے امام شافعی ہر رکعت میں تعوّذ کے قائل ہیں۔ شیخ ابن حجر نے لکھا ہے کہ حسن اور عطاء اور ابن سیرین کے نزدیک ہر رکعت میں اعوذ پڑھنی مستحب ہے۔ امام مالک نے کہا فرض نماز میں تعوّذ نہ کیا جائے۔ بیضاوی نے امام شافعیؒ کے قول کی تائید میں یہ دلیل پیش کی ہے کہ جو حکم کسی شرط پر مرتب ہو قیاس کا تقاضا ہے کہ تکرارِ شرط سے تکرارِ حکم ہو گی پس جب بھی کسی رکعت میں کوئی شخص قرأت کرے گا اعوذ پڑھنا ہو گی۔ خواہ پہلی رکعت ہو یا دوسری۔ امام مالکؒ نے اپنے مسلک کے ثبوت میں حضرت انسؓ کی روایت پیش کی ہے کہ حضرت انسؓ نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی اور حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، اور حضرت عثمانؓ، کے پیچھے بھی اور سب جہری قرأت سورۂ فاتحہ سے شروع کرتے تھے۔ صحیحین کی دوسری روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے کہ یہ حضرات نماز کو الحمد للہ ربّ العٰلمین سے شروع کرتے تھے۔

ہم اس کے جواب میں کہتے ہیں جہراً اعوذ نہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ پوشیدہ چپکے سے بھی نہ پڑھی ہو، ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت میں ثناء (سبحانک اللھم) پڑھنے کے بعد اعوذ پڑھا کرتے تھے پہلی رکعت کے علاوہ کسی دوسری رکعت میں اعوذ پڑھنا کسی روایت میں نہیں آیا۔ ابن السنی اور ابن ماجہ نے حضرت جبیر بن مطعمؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز میں داخل ہو جاتے تھے تو تین بار اللہ اکبر کبیراً اور تین بار الحمد للہ کثیراً اور تین بار سبحان اللہ بکرۃً واَصیلاً کہنے کے بعد اعوذ باللّٰہ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھتے تھے۔ امام احمد اور امام ابن حبان اور ابو داؤد کی روایت میں من الشیطن الرجیم کے بعد مِنْ نفخہٖ ونفثہٖ وَھَمْزِہٖ کے الفاظ بھی آئے ہیں (میں اللہ کی پناہ لیتا ہوں شیطان مردود سے اس کی پھونک سے اور اس کے دم کرنے سے اور اس کے وسوسہ سے) حاکم نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

امام احمد اور حاکم اور اہل السنن نے حضرت ابو سعید خدریؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات میں نماز کو کھڑے ہوتے تھے تو تکبیر کے بعد سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَ بِحَمْدِکَ وَ تَبَارَکَ اسْمُکَ وَ تَعَالٰی جَدُّکَ وَلَا اِلٰہَ غَیْرُکَ پھر تین بار لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اور تین بار اللہ اکبر کہنے کے بعد پڑھتے اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ مِنْ نَفْخِہٖ وَنَفْثِہٖ وَ ھَمْزِہٖ امام احمد نے حضرت ابو امامہؓ کی روایت سے بھی یہی حدیث نقل کی ہے اس روایت میں اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ آیا ہے مگر اس کی اسناد میں بعض راویوں کے نام ذکر نہیں کئے گئے ہیں۔

ابن ماجہ اور ابن خزیمہ نے حضرت ابن مسعودؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پڑھتے تھے، اَللّٰھُمَّ انی اعوذبک من الشیطان الرجیم من ھمزہ ونفخہ و نفثہ حاکم اور بیہقی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں، جب نماز میں داخل ہوتے تھے، حضرت انسؓ کی روایت سے دار قطنی نے بھی ایسا ہی لکھا ہے اس اسناد میں ایک راوی حسین بن علی بن اسود ہے، اس

کے متعلق اہلِ علم نے کلام کیا ہے۔ مراسیل ابوداؤد میں حسن بصری کا قول (بغیر صحابی کے) آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان الفاظ کے ساتھ تعوّذ کرتے تھے اعوذ باللہ من الشّیطٰن الرّجیم۔

فائدہ

صاحب ہدایہؒ نے لکھا ہے اَسْتَعِیْذُ بِاللّٰہِ کہنا افضل ہے اس لفظ سے آیت کے لفظ اِسْتَعِذْ کی موافقت ہو جاتی ہے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ کہنا بھی اسی کے قریب ہے۔

میں کہتا ہوں، ماہر اہلِ تجوید اور فقہاء کے نزدیک اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم آیا ہے، دوسرے الفاظ نہیں آئے۔ ثعلبی اور واحدی نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے اعوذ باللّٰہ السّمیع العلیم من الشّیطٰن الرّجیم پڑھی، حضور ﷺ نے فرمایا اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم پڑھو، مجھے جبرئیلؑ نے قلم سے یعنی لوحِ محفوظ سے (نقل کر کے) ایسا ہی پڑھایا ہے۔

ابو عمر درانی نے التّیسیر میں لکھا ہے میں نے بعینہٖ یہی لفظ (اعوذ) پڑھا اور اسی کو لیا اور قرآن کی تلاوت شروع کرتے وقت (یعنی نماز سے باہر) جہر کے ساتھ یہی لفظ پڑھا جاتا ہے، اہلِ تجوید میں کسی کی قرأت اس کے خلاف مجھے معلوم نہیں اور پاروں وغیرہ کے شروع میں اسی کو پڑھنا اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک ہے۔ نصِ قرآنی کی تعمیل اور سنّت کا اتباع اسی سے ہوتا ہے۔

امام القُرّاء حمزہ صرف سورۂ فاتحہ کے شروع میں اعوذ کو جہر سے پڑھتے تھے باقی قرآن میں پوشیدہ پڑھتے تھے خلف کی روایت یہی ہے لیکن خلاد نے حمزہ کا مسلک یہ نقل کیا ہے کہ آپ کے نزدیک جہر و اِخفاء دونوں درست ہیں جہر سے پڑھے یا اخفا سے دونوں کا اختیار ہے۔ باقی قرّاء کا کوئی قول جہر و اخفا کے متعلق منقول نہیں۔

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ یقیناً شیطان کا قابو ان لوگوں پر نہیں جو ایمان دار ہیں اور اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ کیونکہ اللہ پر بھروسہ رکھنے والے مؤمن احکامِ شیطانی پر نہیں چلتے اللہ ان کی حفاظت کرتا ہے ہاں کبھی غفلت کی حالت میں بعض معمولی حقیر وسوسے ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ ان وسوسوں کو قبول بھی کر لیتے ہیں اسی لئے ان کو تعوّذ کا حکم دیا گیا۔

آیتِ بالا میں تعوّذ کا حکم دیا تھا جس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید شیطان کو اہلِ ایمان پر تسلّط حاصل ہے اس خیال کی نفی اس آیت میں کر دی، کذا قال البیضاویؒ۔ میں کہتا ہوں یہ آیت گزشتہ آیت کی علّت بھی ہو سکتی ہے مؤمن اللہ سے اِستعاذہ اس لئے کرتے ہیں کہ انکا بھروسہ اپنے رب پر ہی ہوتا ہے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اپنے آپ کو اسی کی پناہ میں دے دیتے ہیں اللہ کی طرف رُجوع اور اسی پر بھروسہ رکھنا مؤمنِ مخلص کا خصوصی وصف ہے جو ہر مؤمن کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے زبان سے تعوّذ کرنے کا حکم تو سنّتِ دعا کی تکمیل کے لئے ہے تاکہ ظاہر بھی باطن کے موافق ہو جائے اور شیطان سے پوری پوری اَمان حاصل ہو جائے۔

۱۳ ع ۱۱ ۱۹ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ ع شیطان کا تسلّط تو صرف ان لوگوں پر ہے جو اس سے رفاقت کرتے ہیں اور ان لوگوں پر ہے جو اللہ کا کسی کو ساجھی قرار دیتے ہیں۔ یعنی جو شیطان کے دوست ہیں اس کی اطاعت کرتے ہیں باوجودیکہ شیطان کو تسلّط حاصل نہیں ہے لیکن وہ خود شیطان کو اپنے اوپر مسلّط کر لیتے ہیں ہماری اس تفسیر کی رو سے اس آیت میں اور آیت مَا كَانَ لِيَ عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّآ اَنْ دَعَوْتُكُمْ میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

هُمْ بِهٖ میں بِهٖ کی ضمیر "اللہ" کی طرف راجع ہے یعنی اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک قرار دیتے ہیں یا شیطان کی طرف راجع ہے یعنی شیطان کی وجہ سے اس کے اغوا کے سبب شرک کرتے ہیں۔

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾

اور جب ہم ایک آیت کو بدل کر دوسری آیت کو اس کی جگہ رکھ دیتے ہیں) اور اللہ جو حکم بھیجتا ہے اسکو وہی خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ از خود تراش لیتے ہیں (اور اللہ پر دروغ بندی کرتے ہیں آپ مفتری نہیں ہیں بلکہ ان میں سے اکثر جاہل ہیں۔ تبدیلِ آیت سے مراد کسی آیت کی تلاوت کو منسوخ کرنا ہے یا کسی حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم دینا:

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنَزِّلُ کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جو کچھ نازل کرتا ہے وہی خوب جانتا ہے کہ پہلی آیت اس سے قبل ضرور مبنی بر مصلحت تھی لیکن اس کا اب باقی رکھنا غلط ہے یا اس سے پہلے وہ حکم بگاڑ کا سبب بن گیا تھا اس لئے اس کو بدل کر ایسا حکم نازل کر دیا جو اصلاحِ خلق کرنے والا ہے خلاصہ یہ کہ لوگوں کے لئے کب اور کون سا حکم مناسب ہے اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے۔

مُفْتَرٍ (اللہ پر) دروغ بندی کرنے والا۔ بغوی نے لکھا ہے مشرکوں نے کہا محمدؐ اپنے ساتھیوں سے مذاق کرتے ہیں۔ آج ایک حکم دیتے ہیں اور کل اس کی ممانعت کر دیتے ہیں، یہ از خود تراش کر اللہ پر دروغ بندی کر دیتے ہیں۔

اَکْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ یعنی اکثر کافر احکام کی مصلحت نہیں جانتے یا یہ مطلب ہے کہ اکثر کافر اہلِ علم و تمیز نہیں ہیں اگر ان کو امتیاز ہوتا تو پہچان لیتے کہ قرآن ایسا کلام نہیں کہ کوئی انسان خود بنا سکے اور محمدؐ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ ان کو دروغ باف اور بہتان تراش کہا جا سکے۔

تبارک اللہ ماوحیٌ بمکتسبٍ　　ولا نبیٌّ علی غیبٍ بمتّھمٖ

اللہ بزرگ ہے۔ کوئی وحی دماغی تراشیدہ نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی نبی ایسا ہوتا ہے کہ وحی کے معاملہ میں اس پر الزام لگایا جا سکے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۰۲﴾

آپ کہہ دیجئے کہ اس کو جبرئیلؑ میرے رب کی طرف سے حکمت کے مطابق لے کر آئے ہیں تا کہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوش خبری (کا ذریعہ) ہو جائے۔ "روح القدس" سے مراد جبرئیلؑ ہیں قدس کا معنی ہے پاکی یعنی پاکی والی روح۔ نزلہ تنزیل مصدر، تنزیل کا معنی تدریجاً تھوڑا تھوڑا نازل کرنا۔ یہ لفظ تنبیہ کر رہا ہے کہ قرآن کا مصالح کے مطابق تدریجی نزول تبدیل کا مقتضی ہے (اگر بعض احکام کو بدلنا نہ ہوتا تو یکدم سب قرآن نازل کر دیا جاتا) الحق حکمت کاملہ۔ لِیُثَبِّتَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یعنی تدریجاً اس لئے نزول ہوا کہ جو لوگ اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں مزید استحکام ہو جائے اور ناسخ کو سننے کے بعد جب وہ غور کریں اور سمجھیں کہ حکمت و مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ پچھلا حکم اس وقت منسوخ کر کے یہ نیا حکم نازل کر دیا جائے تو ان کے عقائد میں مزید پختگی پیدا ہو جائے اور اطمینانِ قلب حاصل ہو جائے۔

یا یہ مطلب ہے کہ ناسخ کو نازل کر کے ایمانداروں کی جانچ کرنی مقصود ہے جب وہ قدیم حکم کی جگہ جدید حکم کو برحق یقین کر لیں اور سمجھ جائیں کہ اللہ حکمت والا ہے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں تو اس سے ان کو مزید استحکامِ ایمانی حاصل ہو جائے۔ لِلْمُسْلِمِیْنَ مسلمین سے مراد ہیں فرماں بردار۔ مطیع حکم صرف مسلمانوں کے لئے ہدایت و بشارت کا ذریعہ قرار دینے سے در پردہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ غیر مسلموں کے لئے یہ باعثِ ہدایت و بشارت نہیں ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا یُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ　　اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو یہ کلام آدمی سکھا جاتا ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ بغوی نے لکھا ہے، جس شخص کے متعلق وہ قرآن سکھا جانے کی جھوٹی نسبت کرتے تھے وہ کون آدمی تھا، اس کی تعیین میں علماء کا اختلاف ہے' ابن جریر نے مسند میں ضعیف سند سے حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ مکہ میں ایک عیسائی عجمی غلام تھا جو لوہار تھا اس کا نام بلعام تھا رسول اللہ ﷺ اس کے پاس آتے جاتے تھے مشرکوں نے آپ کو بلعام کے پاس آتا جاتا دیکھ کر کہا ان کو بلعام سکھا دیتا ہے۔ عکرمہؒ نے کہا بنی مغیرہ کا ایک غلام

تھا جس کا نام یعیش تھا وہ کتابیں پڑھتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس کو قرآن سکھاتے تھے قریش کہنے لگے ان کو یعیش سکھا دیتا ہے۔ فراء نے کہا حویطب بن عبدالعزیٰ کا ایک غلام تھا جس کی زبان عجمی تھی اس کا نام عائش تھا۔ مشرک کہنے لگے یہ عائش سے سیکھ لیتے ہیں۔ آخر میں عائش مسلمان ہو گیا تھا اور اسلام میں پختہ رہا۔ ابن اسحاق نے بیان کیا رسول اللہ مروہ پہاڑ کے قریب ایک رومی عیسائی غلام کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اس کا نام جبر تھا جبر بنی الحضرم قبیلہ میں سے کسی کا غلام تھا، اور کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ عبداللہ بن مسلم حضرمی کا بیان ہے ہمارے دو غلام تھے جو یمن کے تھے۔ ایک کا نام یسار اور دوسرے کا نام جبر تھا۔ یسار کی کنیت ابو فکیہہ تھی۔ دونوں مکہ میں تلواریں بنایا کرتے تھے اور توریت وانجیل پڑھا کرتے تھے۔ کبھی کبھی رسول اللہ ﷺ ان کی طرف سے گزرتے اور وہ (انجیل یا توریت) پڑھتے ہوتے تو حضور ﷺ ٹھہر کر سننے لگتے۔ ابن ابی حاتم نے حصین بن عبداللہ کے طریق سے ایسا ہی بیان کیا ہے ضحاک کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب کفار دکھ دیتے تو آپ ان دونوں غلاموں کے پاس جا کر بیٹھ جاتے۔ اور ان کے کلام سے کچھ سکھ محسوس کرتے۔ مشرک کہنے لگے محمدؐ انہی دونوں سے سیکھ لیتے ہیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ نے مشرکوں کی تکذیب کرتے ہوئے فرمایا۔

لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ ﴿١٠٣﴾

جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ صاف عربی زبان ہے قاموس میں ہے لَحَدَ اِلَيْهِ اس کی طرف مائل ہوا اِلْتَحَدَ کا بھی یہی معنی ہے اَلْحَدَ کا معنی بھی "مائل ہوا، مڑا ہے" جس کی طرف مائل ہوتے ہیں یعنی اشارہ کرتے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ وہ لوگ اپنے قول کی سچائی اور استقامت سے موڑ کر اس شخص کی طرف پھیر دیتے ہیں۔

اَعْجَمِيٌّ صاف عربی نہ بولنے والا۔ قاموس میں ہے لفظ "اعجم" قوم اور شخص دونوں کی صفت میں آتا ہے اَعْجَم اور اعجمی گونگا اور وہ شخص جو صاف (عربی) نہ بول سکے۔ عجمی عجم کا رہنے والا جو جنس عجم سے ہو خواہ فصیح البیان ہو، غیر عرب کو عجم کہتے ہیں۔ بعض محققین لغت کا قول ہے کہ عجمہ کا معنی لیانت کے معنی کے مقابل ہے یعنی صاف زبان میں بات نہ کرنا۔ اِعجام کا معنی ہے ابہام۔ اِسْتَعْجَمَتِ الدَّارُ گھر گونگا ہو گیا یعنی سب گھر والے مر گئے کوئی جواب دینے والا بھی باقی نہیں رہا۔

ھٰذا، یعنی یہ قرآن مبین، واصف، صاف، فصیح۔ کافروں کی بہتان تراشی کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے جس کی تقریر دو طرح سے ہو سکتی ہے (۱) وہ شخص جس کی طرف قرآن کی نسبت کی جاتی ہے اس کی بولی عجمی ہے جس کو نہ رسول اللہ ﷺ سمجھتے ہیں نہ تم لوگ سمجھتے ہو اور قرآن کی زبان عربی فصیح ہے جس کو تم لوگ سمجھتے ہو پھر یہ قرآن اس شخص کا بتایا ہوا کیسے ہو سکتا ہے۔ (۲) قرآن کے معانی معجزہ ہیں اور معانی کی طرح الفاظ کی ترکیب بھی معجزہ ہے وہ عجمی شخص توریت اور انجیل پڑھتا ہے توریت وانجیل کے معانی سے قرآن کے معانی مطابقت ضرور رکھتے ہیں، لیکن ان معانی کو معجز عربی عبارت میں ادا کرنا بھی تو معجزہ ہے جو کسی انسان کی قدرت میں نہیں ہے آیت فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ میں جو دعوت مقابلہ دی گئی ہے اس کے مقابلہ سے سب کا عاجز رہنا خود بتا رہا ہے کہ قرآن کا مقابلہ بشری طاقت سے باہر ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ آسمانی کتابوں کے علوم حاصل کرنا اتنا آسان نہیں جب تک کوئی ماہر اور قابل معلّم نہ ہو جو تمام علوم سماویہ میں پوری دستگاہ رکھتا ہو اور ایک طویل مدّت تک درس نہ دیتا رہے اس وقت تک ان علوم کا حصول ناممکن ہے۔ ایک معمولی غلام جو آسمانی علوم کا خود ہی ماہر نہ ہو کچھ شُدبُد رکھتا ہو اور اس کی زبان بھی عجمی ہو اس کے پاس کبھی کبھی کسی عربی شخص کا آنا جانا کس طرح عربی شخص کو علوم سماویہ کا اس حد تک ماہر بنا سکتا ہے کہ وہ عربی زبان میں تمام کتابوں کے علوم کو اعجازی طور پر منتقل کر دے جبکہ استاد کی زبان سے شاگرد واقف بھی نہ ہو۔

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿١٠٤﴾

جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں رکھتے (اور ان کو اللہ کی طرف سے نازل شدہ نہیں مانتے) یقیناً اللہ ان کو کبھی راہ پر نہیں لائے گا اور ان کے لئے دردناک سزا ہو گی یعنی راہ حق پر نہیں لائے گا نجات اور جنت کا راستہ نہیں دکھائے گا اور آخرت میں ان کو دکھ

کی سزا دی جائے گی۔

اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

بس جھوٹ تراشنے والے تو یہی لوگ ہیں جو اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی لوگ پورے جھوٹے ہیں یعنی حقیقت میں یہی جھوٹے ہیں ایمان لانے والے جھوٹے نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دور میں تمام صحابہؓ سچے اور عادل تھے یا یہ مطلب ہے کہ کامل جھوٹے اور پورے پورے کاذب یہی لوگ ہیں کیونکہ ظہورِ معجزات کے بعد اللہ کے معصوم نبی اور اللہ کی آیات کا انکار اور اللہ کے رسول ﷺ پر تہمت تراشی سب سے بڑا جھوٹ ہے یا هُمُ الْكٰذِبُوْنَ سے یہ مراد ہے کہ یہ لوگ جھوٹ بولنے کے عادی ہیں ان کو جھوٹ سے کوئی چیز نہیں روک سکتی نہ شرافت، نہ دین یا یہ مطلب ہے کہ یہ لوگ جو آپ ﷺ کو مُفتری قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوئی آدمی آپ کو سکھا جاتا ہے اس قول میں یہ ہی جھوٹے ہیں اِنَّمَا يَفْتَرِي الخ جملہ فعلیہ ہے جو بتا رہا ہے کہ افترا کرنے والے صرف یہی لوگ ہیں اور اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ جملہ اسمیہ ہے جو بتا رہا ہے کہ جھوٹ بولنا ان کی عادتِ لازمہ ہے۔ بغوی نے اپنی سند سے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن حرادؓ نے فرمایا، میں نے عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ کیا مؤمن زنا کر سکتا ہے۔ فرمایا کبھی ایسا ہو سکتا ہے میں نے عرض کیا کیا مؤمن چوری کر سکتا ہے فرمایا کبھی ایسا ہو سکتا ہے میں نے عرض کیا کیا مؤمن جھوٹ بول سکتا ہے۔ فرمایا نہیں۔ اللہ نے فرما دیا ہے اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ

امام احمد نے حضرت ابو امامہؓ کی روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سوائے خیانت اور جھوٹ کے مؤمن کی سرشت میں تمام (اچھی بری) باتیں ہو سکتی ہیں۔ بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث بیان کی ہے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور امام مالکؒ نے مرسلاً بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کیا مؤمن ڈرپوک ہو سکتا ہے۔ فرمایا ہاں، عرض کیا گیا کیا مؤمن بخیل ہو سکتا ہے، فرمایا ہاں، پوچھا گیا کیا مؤمن بڑا جھوٹا ہو سکتا ہے، فرمایا نہیں۔ میں کہتا ہوں ان احادیث میں جو مؤمن کا ذکر آیا ہے بظاہر اس سے مراد وہ مؤمن ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں موجود تھے (ورنہ بعد کے زمانہ میں تو بکثرت مؤمن جھوٹے تھے اور اب بھی ہیں) اسی لئے تمام صحابہؓ کے سچے اور عادل ہونے پر علماء کا اجماع ہے اور یہی وجہ ہے کہ کسی صحابی کی روایت قابلِ جرح نہیں ہے (بشرطیکہ صحابہؓ تک روایت کا سلسلہ غیر مجروح ہو) یا احادیث میں جس مؤمن کا ذکر کیا ہے اس سے مراد کامل مؤمن ہے یعنی صوفی صافی عارفِ خدا فانی فی اللہ باقی باللہ۔

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

جو لوگ ایمان لانے کے بعد (لوٹ کر) اللہ کے (یعنی اس کی ذات، صفات یا قیامت و نبوّت کے) ساتھ کفر کرنے لگیں اور جی کھول کر (دل کی خوشی کے ساتھ) کفر کریں تو ان پر اللہ کا غضب ہو گا اور ان کو بڑے دکھ کی سزا ہو گی ہاں جو لوگ کفر کرنے پر مجبور کئے گئے ہیں اور ان کا دل ایمان پر مطمئن ہو (اور زبان سے کلماتِ کفر مجبوری کہہ گزریں) وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔

بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس آیت کا نزول عمار بن یاسرؓ کے حق میں ہوا۔ مشرکوں نے عمارؓ کو ان کے باپ یاسرؓ کو ان کی ماں سمیہؓ کو اور صہیب کو بلال و خبیب و سالم کو پکڑ کر سخت ترین جسمانی دکھ دیئے حضرت سمیہؓ کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ دیا گیا (ایک ٹانگ ایک اونٹ سے دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے) اور شرم گاہ میں نیزہ ڈال کر چیرہ دیا گیا۔ حضرت یاسرؓ کو بھی قتل کر دیا گیا اسلام میں سب سے اول یہی دونوں شہید ہوئے۔ عمار نے بمجبوری وہ بات زبان سے نکال دی جو مشرک چاہتے تھے۔ قتادہ نے کہا بنی مغیرہ نے عمارؓ کو پکڑ کر چاہِ میمون میں غوطے دیئے اور کہا محمد ﷺ کا انکار کر حضرت عمارؓ نے وہی بات کہہ دی جو مشرک چاہتے تھے۔ مگر آپ کا دل اس بات سے نفرت کرتا تھا دل کو انکارِ رسالت گوارا نہ تھا۔ کسی نے جا کر رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دے دی کہ عمارؓ کافر ہو گیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا ہرگز نہیں، عمارؓ کے اندر تو چوٹی سے قدم تک ایمان بھرا ہوا

ہے اس کے خون اور گوشت میں ایمان سرایت کر گیا ہے۔ آخر حضرت عمارؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں روتے ہوئے حاضر ہوئے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کیا بات ہے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ بات بُری ہے، میں نے آپ کو بُرا کہہ دیا اور (انکار کے طور پر) آپ کا ذکر کیا فرمایا اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت تم کو محسوس ہو رہی تھی۔ عرض کیا دل تو ایمان پر مطمئن تھا۔ یہ سن کر حضور ﷺ نے عمارؓ کے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا اگر وہ دوبارہ تمہارے ساتھ ایسی حرکت کریں تو تم دوبارہ (بھی یہی کفریہ الفاظ) لوٹا سکتے ہو۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ ثعلبی اور واحدی نے بھی اسی طرح یہ واقعہ بیان کیا ہے۔

ابن ابی حاتم نے بیان کیا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کو ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو مشرکوں نے بلالؓ، خبیبؓ اور عمارؓ کو پکڑ لیا۔ عمارؓ نے تقیہ کر کے وہ بات کہہ دی جو مشرکوں کو پسند تھی پھر جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو واقعہ بیان کر دیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا (کلماتِ کفر) کہنے کے وقت تمہارے دل کی کیا حالت تھی۔ عرض کیا، دل تو آپ کے قول پر مطمئن تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بغوی نے لکھا ہے کہ ابن ابی حاتم نے مجاہد کا قول بیان کیا ہے کہ اس آیت کا نزول مکہ کے چند مسلمانوں کے حق میں ہوا تھا بعض صحابہؓ نے (مدینہ سے) ان کو لکھا تھا کہ مکہ چھوڑ آؤ۔ جب تک ہجرت کر کے ہمارے پاس نہ آجاؤ گے ہم تم کو اپنے میں شمار نہیں کریں گے۔ اس تحریر پر وہ لوگ مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چل دیئے راستہ میں انکو قریش نے پکڑ لیا اور سخت دکھ دیئے۔ مجبوراً بنفرتِ خاطر ناگواری کے ساتھ کلماتِ کفر کہہ دیئے۔

بغوی نے لکھا ہے کہ مقاتل نے بیان کیا کہ عامر بن حضرمی کے غلام جبر کے حق میں اس آیت کا نزول ہوا۔ ان کے آقا نے ان پر زبردستی کی تھی مجبوراً جبر نے کلماتِ کفر کہہ دیئے تھے۔ بغوی نے لکھا ہے پھر جبر کا آقا بھی مسلمان ہو گیا اور اسلام میں پختہ رہا اور جبر کو ساتھ لے کر اس نے بھی مدینہ کو ہجرت کر لی۔

ایمان پر دل کے مطمئن ہونے کا یہ مطلب ہے کہ عقیدہ میں کوئی تغیر نہیں آیا۔ دل ایمان پر قائم رہا یہ جملہ بتا رہا ہے کہ دل سے سچا جاننا ایمان کا رکنِ ضروری ہے (خالی شہادت ایمان بغیر دلی عقیدہ کے اللہ کے نزدیک ناقابلِ اعتبار ہے)

کفر کے لئے سینہ کے کشادہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ دل نے کفر کو پسند کر لیا اور بخوشی کفر کو قبول کر لیا۔

اکراہ کی تحقیق

کسی کو ایسے کام پر آمادہ کرنا جس کو وہ دل سے گوارا نہ کرتا ہو اکراہ ہے اکراہ کی دو صورتیں ہیں (۱) کسی کو کسی ناگوار کام کے کرنے پر اس طرح آمادہ کرنا کہ اگر وہ انکار کرلے تو اس کو اذیت اور دکھ اٹھانا پڑ جائے لیکن یہ ایذا اور دکھ اس کو بے اختیار نہ بنادے۔ مثلاً انکار کی صورت میں مارنا قید کر دینا۔ ظاہر ہے کہ پٹنے اور قید ہو جانے کے بعد بھی مضروب اور قیدی بے اختیار نہیں ہو جاتا صرف جسمانی اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ (۲) انکار کی صورت میں مجبور آدمی اپنے اختیار کا مالک ہی نہ رہے مثلاً ہاتھ پاؤں کاٹنا یا قتل کر دینا۔ ان دونوں صورتوں میں اکراہ کا حکم اس وقت جاری ہوگا کہ مجبور کرنے والا اس اذیت دینے پر قدرت رکھتا ہو جس کی دھمکی دے رہا ہے اور جس کو مجبور کیا جا رہا ہو اس کا بھی غالب خیال ہو کہ اگر میں انکار کر دوں گا تو اس شخص کی طرف سے مجھے یہ دکھ پہنچ جائے گا۔ آیت میں اکراہ کی اوّل صورت مراد نہیں ہے ایسے اکراہ کا اثر تو صرف خرید و فروخت، اقرار قرض، کسی جائیداد کے ٹھیکہ کے لین دین وغیرہ پر ہی پڑتا ہے اس صورت میں جب خوفِ اذیت نہ رہے اور ایذا رساں طاقت سے آزادی مل جائے تو مجبوری کی حالت میں جو عقد، اقرار، ٹھیکہ وغیرہ کا لین دین کیا ہو اس کو فسخ کر دینا جائز ہے چاہے قائم رکھے چاہے منسوخ کر دے۔ تجارت، لین دین، وغیرہ ایسے عقود ہیں، جن کے لئے فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ اللہ نے فرمایا ہے اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ اکراہ کی شکل میں مجبور شخص کی رضامندی نہیں ہوتی اس لئے جبر ختم ہونے کے بعد اس کو اختیار ہے چاہے معاملے کو فسخ کر دے چاہے قائم رکھے۔ اگر قیمت پر بخوشی قبضہ کر لیا تو بیع کو نافذ قرار دیا جائے گا قبول قیمت علامتِ رضامندی ہے۔

آیت مذکورہ میں اکراہ کی دوسری قسم مراد ہے علماء کا اجماع ہے کہ جس شخص کو کفر پر مجبور کیا گیا ہو اور وہ بے بس ہو جائے تو ظاہری طور پر کفر اختیار کر لینا جائز ہے۔ بشرطیکہ دل میں اطمینانِ ایمانی ہو۔ حضرت عمارؓ کے متعلق اس آیت کا نزول اس مسئلے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔ حضرت عمارؓ کو کافر نہیں قرار دیا گیا ایسے ظاہری کافر کا نکاح بھی فسخ نہیں ہو گا لیکن اگر کلمۂ کفر زبان پر لانے سے انکار کر دے اور جان کی قربانی دے دے تو افضل ہے جیسے حضرت عمارؓ کے والدین نے کیا۔ حضرت خبیبؓ، حضرت زید بن دثنہؓ اور حضرت عبداللہ بن طارقؓ نے بھی مرتد ہونا پسند نہیں کیا اور شہادت کو اختیار کر لیا اصحاب سیر نے سریۂ رجیع کے بیان میں لکھا ہے کہ حضرت خبیبؓ کو جب قتل کیا جانے لگا تو آپ نے قتل سے پہلے دو رکعت نماز پڑھی۔ بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ خبیبؓ ہی نے سب سے پہلے قتل کے وقت دو۲ رکعت پڑھنے کا طریقہ قائم کیا۔ جب آپ نماز پڑھ چکے تو آپ کو ایک تختہ سے باندھ دیا پھر مدینہ کی طرف منہ کر دیا اور بندش مضبوط کر دی پھر کہنے لگے اسلام سے لوٹ جاؤ ہم تم کو چھوڑ دیں گے۔ حضرت خبیبؓ نے فرمایا خدا کی قسم مجھے یہ بھی پسند نہیں کہ اسلام سے مُرتد ہونے کی شرط پر مجھے ساری دنیا کی دولت مل جائے کافر کہنے لگے اب تو چاہتے ہو گے کہ محمدؐ میری جگہ ہوتے اور میں اپنے گھر بیٹھا چین کرتا۔ حضرت خبیبؓ نے فرمایا نہیں خدا کی قسم مجھے تو یہ بھی پسند نہیں کہ محمد ﷺ کے کوئی کانٹا چبھ جائے اور میں گھر میں آرام سے بیٹھ رہوں کافر برابر کہتے رہے خبیبؓ اسلام سے لوٹ جاؤ حضرت خبیبؓ نے فرمایا، نہیں میں کبھی اسلام سے نہیں پھرنے کا۔ کہنے لگے اگر اسلام سے نہ پھرو گے تو ہم تم کو قتل کر دیں گے بولے اللہ کی راہ میں مارا جانا ایک حقیر چیز ہے۔

بخاری نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ حضرت خبیبؓ نے شہادت سے پہلے چند اشعار پڑھے تھے جن میں سے دو شعر یہ تھے:

"اگر مسلمان ہونے کی حالت میں مارا جاؤں تو مجھے پرواہ نہیں کہ کس بَل سے اللہ کی راہ میں زمین پر گرتا ہوں میرا یہ قتل ہونا اللہ کی خوشنودی کے لئے ہے اگر اللہ چاہے گا تو پارہ پارہ میں جسم کے جوڑ جوڑ میں برکت عطا فرمائے گا"۔

ابن عقبہ کا بیان ہے کہ حضرت خبیبؓ اور حضرت زیدؓ دونوں ایک ہی دن شہید کئے گئے اور جس روز ان کی شہادت ہوئی اسی روز لوگوں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ فرما رہے تھے وعلیکما السّلام۔

ابن ابی شیبہ نے حسن بصری کی مرسل روایت سے بیان کیا ہے اور عبدالرزاق نے اپنی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ مُسیلمۂ کذاب نے دو مسلمانوں کو گرفتار کر لیا اور ایک سے کہا محمد ﷺ کے متعلق تیرا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں مسیلمہ نے کہا، میرے متعلق تیرا کیا خیال ہے اس نے جواب دیا آپ بھی مسیلمہ نے دوسرے سے پوچھا محمد ﷺ کے متعلق تو کیا کہتا ہے، اس نے جواب دیا وہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں۔ مسیلمہ نے پوچھا: میرے متعلق تو کیا کہتا ہے اس نے جواب دیا میں بہرا ہوں۔ مسیلمہ نے یہی بات تین بار دُہرائی اور اس شخص نے بھی یہی جواب دُہرا دیا۔ آخر مسیلمہ نے اس کو قتل کر دیا رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع پہنچی تو اوّل شخص کے متعلق فرمایا اس نے اللہ کی دی ہوئی اجازت کو اختیار کر لیا اور دوسرے نے بلند آواز سے اعلانِ حق کیا اس کو مبارک ہو۔

مسئلہ: اگر کسی مسلمان کا مال تلف کرنے پر کسی کو مجبور کیا جائے تو اس کا مال تلف کرنا اس کے لئے جائز ہے ضرورت کے وقت غیر کا مال مباح ہو جاتا ہے جیسے سخت بھوک کے وقت کسی کا مال کھا لینا جائز ہے۔ لیکن صاحبِ مال مجبور کرنے والے سے اپنے مال کا تاوان وصول کرے گا کیونکہ مجبور شخص تو اس جابر کا آلۂ کار ہے اور جس صورت میں آلۂ کار بننا درست ہے اس میں تاوان آلۂ کار بنانے والے سے لیا جاتا ہے۔

مسئلہ: اگر شراب پینے یا مردار کو کھانے پر مجبور کیا جائے تو ایسا کر لینا باتفاقِ علماء جائز ہے۔ لیکن کیا نہ کھانا اور جان دے دینا جائز ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک حرام ہو کھا پی لینا واجب ہے انکار کر کے جان دے دینا جائز نہیں۔ جیسے حلال چیز (یعنی پرائی حلال چیز کو) جان بچانے کے لئے کھا پی لینا واجب ہے ویسے ہی شراب اور مُردار کا حکم ہے۔ اگر کھانے پینے سے انکار کر کے

جان دے دے گا تو گناہ گار ہو گا اور بلا ضرورت اپنی جان کھو دینے میں اس جابر کا مددگار مانا جائے گا۔ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر کھانے پینے سے انکار کر کے جان دے دے گا تو گناہ گار نہ ہو گا۔ امام شافعیؒ کا بھی صحیح ترین قول یہی ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں شراب پینے کی اجازت اور رخصت ہے، اباحت نہیں ہے۔ شراب مباح نہیں ہو جاتی۔ اب اگر اس نے عزیمت کو اختیار کیا، اور شراب کی حرمت پر قائم رہ کر جان دے دی) تو گناہ گار نہیں ہو سکتا۔ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا یہ رخصت نہیں اباحت ہے اضطرار کی حالت میں مردار بھی ذبیحہ کی طرح حلال ہو جاتا ہے۔ آیت میں حالتِ اضطرار مستثنیٰ ہے فرمایا ہے اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ استثناء کر کے حالتِ اضطرار کو عدمِ اضطرار کی حالت سے حکم میں علیحدہ کر لیا گیا ہے (اور ظاہر ہے کہ عدمِ اضطرار کی حالت میں حرمت کا حکم ہے تو اضطرار کی حالت میں اباحت ہو گی، رخصت نہ ہو گی) ہاں اگر غیر کا مال کھانے پر مجبور کیا گیا اور انکار کرنے کی صورت میں مارا گیا تو باتفاقِ علماء ماجور ہو گا، کیونکہ غیر کے مال کی حرمت ہر حال میں قائم ہے (کھا لینے کی صرف رخصت ہے) یہاں سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اکراہ سے خطاب نہیں بدلا کرتا کہ ایک ہی چیز ایک مرتبہ مباح اور فرض ہو جائے اور پھر کبھی وہی چیز حرام ہو جائے اسی لئے امام ابو حنیفہؒ نے ایک عام ضابطہ قائم کر دیا ہے کہ جس تصرّف کا حکم الفاظ پر جاری ہوتا ہو دل کی رضا پر موقوف نہ ہو وہ حکم اس وقت بھی مرتّب ہو گا جب وہ تصرّف جبر کی حالت میں کیا جائے۔ اس قسم کے تصرّفات (جو الفاظ پر مبنی ہوں اور ان میں دل کی رضامندی ضروری نہیں) دس ہیں۔ نکاح، طلاق، طلاق سے رجوع، ایلاء، ظہار، غلام کی آزادی، قصاص کی معافی، قسم، نذر (ان سب کے احکام صرف زبان سے کہنے سے نافذ ہو جائیں گے، زبانی ایجاب و قبول سے نکاح ہو جائے گا۔ زبان سے لفظ طلاق کہہ دینے سے طلاق ہو جائے گی۔ صرف زبان سے آزاد کرنے سے غلام آزاد ہو جائے گا وغیرہ وغیرہ، ان احکام کے مرتّب ہونے کے لئے دل کی رضامندی ضروری نہیں پس کسی نے جبراً اگر طلاق یا نکاح میں ایجاب و قبول یا معافی یا قسم وغیرہ کے الفاظ کہلوا لئے تو احکام مرتّب ہو جائیں گے) شعبی، نخعی اور ثوری کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک کوئی جبری تصرّف جاری نہیں ہو سکتا جبر سے احکام مرتّب نہیں ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا آپ فرما رہے تھے اغلاق و جبر کی صورت میں نہ طلاق ہے نہ باندی غلام کی آزادی۔ رواہ احمد وابوداؤد وابن ماجہ، الحاکم وابن الجوزی، ابو یعلی، والبیہقی من طریق صفیۃ بن عثمان عن شیبہ۔ اس سلسلے کو حاکم نے صحیح کہا ہے لیکن اس سند میں ایک راوی محمد بن عبیدہ مکی ہے جس کو ابو حاتم رازی نے ضعیف کہا ہے۔

ابن جوزی نے لکھا ہے کہ قتادہ نے کہا اغلاق کا معنی ہے اکراہ (جبر کرنا) یہ لفظ اَغْلَقْتُ الْبَابَ سے ماخوذ ہے۔ گویا مجبور آدمی کو جابر کی مرضی کے خلاف کرنے سے بند کر دیا جاتا ہے۔ بعض علماء نے اغلاق کا ترجمہ شدّتِ غصہ کیا ہے۔ سنن ابوداؤد میں یہ ترجمہ آیا ہے اور امام احمد نے بھی اس لفظ کی یہی تشریح کی ہے لیکن یہ تشریح اچھی نہیں ہے۔ ابن اسید نے اس کو پسند نہیں کیا ہے اور صراحت کی ہے اگر اغلاق کا ترجمہ غضب کیا جائے گا تو کوئی اطلاق ہی نہیں پڑے گی کیونکہ ہر شخص سخت غصہ کی حالت میں ہی طلاق دیتا ہے۔ حسن بصریؒ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ نے تمہارے لئے بھول چوک کو معاف کر دیا اور اس کو بھی جس پر تم کو مجبور کیا گیا ہو۔ رواہ ابن الجوزی، اس حدیث سے اصل مدعا کا ثبوت نہیں ہوتا کیونکہ اس حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو گناہ کا کام جبراً کسی سے کرا لیا گیا ہو اللہ اس کا مواخذہ نہیں کرے گا یہ مطلب نہیں کہ دنیوی احکام بھی مرتّب نہ ہوں گے۔ اسی حدیث کی ہم معنیٰ وہ حدیث بھی ہے جو طبرانی نے از روایتِ ثوبان نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میری امت سے بھول چوک (کی سزا) اٹھا لی گئی ہے اور وہ کام بھی جس پر لوگوں کو مجبور کیا گیا ہو حضرت ابو درداءؓ کی روایت سے بھی ایسا ہی آیا ہے لیکن حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ ان دونوں حدیثوں کی سند میں ضُعف ہے اس مضمون کی حدیث مختلف روایات سے ابن ماجہ، ابن حبان، دار قطنی، بیہقی اور حاکم وغیرہ نے بحوالہ اوزاعی بانتساب ابن عباسؓ بیان کی ہیں لیکن اہلِ روایت نے ان روایات کو منکر قرار دیا ہے حضرت ابوذرؓ کی روایت سے بھی یہ حدیث ابن ماجہ نے بیان کی ہے اس کے سلسلہ میں شہر بن حوشب واقع ہے اور سند میں انقطاع ہے لیکن اگر حدیث کو صحیح مان لیا جائے تب بھی امام شافعیؒ وغیرہ کا اس سے استدلال غلط ہے۔

بھول چوک اٹھالیے جانے کا یہ معنی تو ہر گز نہیں کہ بھول چوک واقع نہ ہو گی، یہ تو واقعہ کے خلاف ہے اس لئے تین ہی معنی ہو سکتے ہیں۔

(۱) بھول چوک کا مؤاخذۂ اُخروی اٹھالیا گیا ہے یعنی اللہ نے بھول چوک کی سزا معاف کر دی ہے یہی مطلب صحیح ہے (۲) بھول چوک کا عمومی مطلب اٹھالیا گیا ہے (نہ حکم دینا بھول چوک پر مرتب ہوتا ہے نہ آخرت کا حکم یعنی سزا) یہ مطلب غلط ہے عمومِ حکم کسی لفظ سے نہیں معلوم ہوتا۔ مقتضیٰ النص میں عموم نہیں ہوتا۔ (۳) احکامِ دنیا اٹھالئے گئے ہیں یہ مطلب اجماع کے خلاف ہے۔ بالاتفاق حکمِ آخرت یعنی مؤاخذہ کا اٹھایا جانا اس جگہ مراد ہے اس لئے حکمِ دنیا مع حکمِ آخرت کے مراد نہیں ہو سکتا ورنہ عمومِ مقتضیٰ لازم آئیگا کذا قال ابنُ ہمام۔

ابن جوزی نے شافعیہ کے مسلک کی تائید میں حضرت عمرؓ کا ایک فیصلہ نقل کیا ہے عہدِ فاروقی میں کوئی شخص کسی پہاڑ پر چڑھ گیا اس کی بیوی اور بلندی پر جا بیٹھی بیوی نے کہا یا تو مجھے تین طلاقیں دے دے ورنہ میں اوپر سے پتھر لڑھکا کر تجھے قتل کر دوں گی اس شخص نے عورت کو ہر چند اللہ اور اسلام کا واسطہ دیا اور اللہ سے ڈرایا لیکن وہ نہ مانی۔ مجبوراً اس شخص نے تین طلاقیں دے دیں پھر حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا آپ نے فرمایا لوٹ کر اپنی بیوی کے پاس چلا جا۔ یہ طلاق نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہؒ نے بھی اپنے مسلک کی تائید میں چند احادیث نقل کی ہیں جن میں سے ایک حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت سے آئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تین چیزیں ہیں جن میں سنجید گی تو سنجید گی ہی ہے اور ان میں مذاق بھی سنجید گی (کا حکم رکھتی) ہے نکاح، طلاق، رَجعت، رواہ ابو داؤد والترمذی وابن ماجہ واحمد والحاکم والدار قطنی۔ ترمذی نے اس کو حسن اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔

ابن جوزیؒ نے کہا اس کی سند میں ایک راوی عطاء بن عجلان ہے جو متروک الحدیث ہے حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے، ابن جوزی سے غلطی ہو گئی انہوں نے عطاء کو عطاء بن عجلان سمجھ لیا حالانکہ عطاء بن عجلان نہیں عطاء بن ابی رباح ہے (جو قوی راوی ہے) ابو داؤد کی روایت میں اس کی صراحت آئی ہے اور حاکم نے بھی اس کی صراحت کی ہے لیکن اس کی سند میں ایک شخص عبدالرحمٰن بن جبیر آیا ہے اور اس شخص کے متعلق اختلاف ہے نسائی نے اس کو منکر الحدیث کہا ہے اور دوسرے علماء نے اس کو ثقہ قرار دیا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے ہم اس حدیث کو حسن کہتے ہیں۔

......ایک شبہ......

تصرّفِ شرعی کے لئے صاحبِ تصرّف کا با اختیار ہونا ضروری ہے اگر بطورِ ہزل (یعنی مذاق کے طور پر) کوئی طلاق دے دے تو اس کا یہ کلام بھی اپنے اختیار سے ہی ہوتا ہے البتہ وہ کلام کے حکم (یعنی طلاق پر) راضی نہیں ہوتا مگر رضاءِ قلب کو وقوعِ طلاق میں کوئی دخل نہیں ہے لہٰذا وہ شخص جس نے اپنے اختیار سے بطورِ ہزل طلاق دے دی ہو اس کی طلاق واقع ہو جائے گی لیکن اکراہ میں تو متکلم کا اختیار نہیں ہوتا اس سے سرزد ہونے والی طلاق کو ہزل کی طلاق سے کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے۔

......ازالہ......

ہم کہتے ہیں جس شخص پر جبر کیا گیا وہ بھی تو با اختیار ہوتا ہے اس کا کلام بھی اختیار ہی کے ساتھ ہوتا ہے اور کامل اختیار کے ساتھ ہوتا ہے اور ہزل کے طور پر طلاق دینے والے کی طرح وہ بھی حکمِ کلام (یعنی طلاق) کو پسند نہیں کرتا وہ خوب واقف ہوتا ہے کہ جبر کرنے والے کی مخالفت بھی تکلیف دہ ہے اور وقوعِ طلاق بھی دکھ دینے والا ہے مگر دونوں میں آسان مصیبت کو وہ جان کر اختیار کرتا ہے لہٰذا مکرَہ (مجبور) کی طلاق کا واقع ہونا ضروری ہے۔

ابن ہمام نے لکھا ہے، نفی حکم طلاق میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں جب حضرت حذیفہؓ اور ان کے والد سے کفار نے قسم لے لی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے دونوں حضرات سے فرمایا ہم کافروں کی طرف سے لئے ہوئے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ان کے خلاف مدد چاہیں گے۔ اس حدیث میں حضور ﷺ نے بتادیا کہ قسم اپنی خوشی سے کھائی جائے یا کسی کے جبر سے دونوں برابر ہیں محض لفظ پر جو حکم مرتّب ہوتا ہے اس کی نفی میں اکراہ کو کوئی دخل نہیں (اختیار سے اس لفظ کا صُدور ہو یا اکراہ سے دونوں برابر ہیں) بیع کی حالت اس سے جُدا ہے بیع کی صحت کا تعلق الفاظ یا قائم مقام الفاظ سے ضرور ہے مگر دل سے رضامندی ضروری ہے اور اکراہ کی صورت میں یہ رضامندی نہیں ہوتی۔ امام ابو حنیفہؒ کے قول کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جس کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں (حضور ﷺ نے فرمایا) ہر طلاق نافذ ہے سوائے پاگل، مغلوبُ العقل کی طلاق کے۔ ترمذی نے کہا، ہم کو یہ حدیث صرف عکرمہ بن خالد کی وساطت سے بروایت ابو ہریرہؓ معلوم ہوئی ہے عطاء بن عجلان از عکرمہ کی روایت سے بھی یہ حدیث آئی ہے مگر عطاء ضعیف اور منکر الحدیث ہے (اس لئے عطاء کی وساطت سے اس حدیث کی روایت ناقابلِ اعتبار ہے)

امام شافعیؒ کے قول کی تائید میں صفوان بن اصم کی روایت کردہ حدیث بھی آئی ہے صفوان نے ایک صحابی کی روایت سے بیان کیا کہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ سو رہا تھا بیوی یکدم اُٹھی اور چھری لے کر مرد کے سینہ پر بیٹھ گئی اور چھری اس کے حلق پر رکھ کر بولی مجھے طلاق دے دے ورنہ تجھے ذبح کردوں گی۔ مرد نے اس کو اللہ کا واسطہ دیا مگر وہ نہ مانی، آخر مرد نے اس کو تین طلاقیں دے دیں اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ عرض کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا طلاق میں قیلولہ نہیں۔

ابن جوزی کا بیان ہے کہ بخاری نے کہا طلاقِ مکرہ کے بارے میں صفوان بن اسم کی روایت کردہ حدیث منکر ہے اس کو نہیں مانا جائے گا۔

ابن ہمام نے حضرت عمرؓ کا قول نقل کیا ہے کہ چار مسئلے مبہم ناقابلِ حل ہیں جن کی کوئی واپسی نہیں نکاح، طلاق، غلاموں کی آزادی اور صدقہ (یعنی ان چاروں میں اکراہ اور جبر سے بھی حکم مرتّب ہو جاتا ہے)

میں کہتا ہوں، بظاہر امام ابو حنیفہؒ کا استدلال قوی ہے اور اگر احادیث میں تعارض تسلیم بھی کر لیا جائے تو قیاس کی طرف رجوع لازم ہے اور قیاس چاہتا ہے کہ (مکرہ کی) طلاق، عتاق وغیرہ کا وقوع ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾

یہ (ایمان کے بعد کفر یا وعید) اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے دنیوی زندگی کو اخروی زندگی پر ترجیح دے رکھی ہے اور یہ (سبب بھی ہے) کہ اللہ ان لوگوں کو راہ پر نہیں لاتا۔ جو (اس کے علم میں) کافر ہیں یعنی ایسا راستہ نہیں بتاتا کہ وہ ایمان پر جم جائیں اور نہ ان کو کج روی سے بچاتا ہے۔ اللہ نے اس آیت میں کافروں کے کفر کے دو سبب بیان فرمائے۔ ایک ظاہری دوسرا حقیقی ظاہری سبب تو یہ تھا کہ انہوں نے خود کفر کو پسند کر رکھا تھا اور آیاتِ الٰہی میں غور نہیں کرتے تھے اور حقیقی سبب یہ تھا کہ اللہ ان کو ہدایت یاب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے اعمال جبر اور قدر کے درمیان ہیں (نہ انسان بالکل قادر ہے نہ محض مجبور اور بے اختیار)

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾

یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے اور یہ ہی لوگ (انجام سے) بالکل غافل ہیں۔

دلوں پر مہر لگنے کی وجہ سے حق کو حق نہیں جانتے اور کانوں پر مہر لگنے کی وجہ سے حق کو گوشِ قبول سے نہیں سنتے اور آنکھوں پر مہر لگنے کی وجہ سے چشمِ عبرت اندوز سے آیاتِ خداوندی کو نہیں دیکھتے پس یہ بالکل غافل ہیں کہ صانعِ عالم کی طرف سے غافل ہیں باوجودیکہ جانور اور بے عقل پتھر بھی اپنے بنانے والے سے بے خبر نہیں ہیں۔

لَاجَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾ (اس لئے) لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ ہی لوگ گھاٹے میں رہیں گے کیونکہ انہوں نے اپنی زندگیاں بالکل بے کار کھو دیں ایسے کاموں میں عمروں کو ضائع کیا جو دوامی عذاب میں ان کو لے جائیں گے اور کوئی ایسا عمل نہیں کیا جو عذاب سے بچا سکے، اور منزل کامیابی تک پہنچا سکے۔ برخلاف گناہ گار مسلمانوں کے یہ بھی اپنی زندگیوں کا بیشتر حصہ نفسانی خواہشات اور گناہوں میں برباد کرتے ہیں لیکن انہوں نے چونکہ توحید کا دامن پکڑ لیا ہے اس لئے کبھی نہ کبھی عذاب الٰہی سے ان کو نجات مل جائے گی اور توحید کا عقیدہ ان کو جنت میں لے جائے گا۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَصَبَرُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ پھر بیشک آپکا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے مبتلائے کفر ہونے کے بعد (ایمان لاکر) ہجرت کی پھر جہاد کیا اور (ایمان پر) قائم رہے تو آپ کا رب ان اعمال کے بعد ان کی بڑی مغفرت کرنے والا اور (ان پر) بڑی رحمت کرنے والا ہے۔

چونکہ مسلمانوں کے اور کفر پر قائم رہنے والوں کے حالات میں بڑا بُعد تھا اس لے لفظ ثم استعمال کیا۔ فُتِنُوْا یعنی ان کو اسلام سے روکا گیا اور بڑے بڑے دکھ دیئے گئے ابن سعد نے طبقاتِ کُبریٰ میں عمر بن حاکم کی روایت سے لکھا ہے کہ حضرت عمّار بن یاسرؓ کو ایسے سخت دکھ دیئے جاتے تھے کہ وہ بالکل بدحواس ہو جاتے تھے اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں (اور کیا کریں) حضرت صہیبؓ، حضرت ابوفکیہہؓ، حضرت بلالؓ، حضرت عمار بن فہیرہؓ اور کچھ دوسرے مسلمانوں کی بھی یہی حالت تھی اور ایسے ایسے سخت دکھ ان کو دیئے جاتے تھے کہ وہ حواس باختہ ہو جاتے تھے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہیں (اور کیا کریں) انہی حضرات کے متعلق اس آیت کا نزول ہوا۔

بغوی نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول ابو جہل کے رضاعی بھائی عیاش بن ابی ربیعہؓ، ابو جندل بن سہیل بن عمروؓ، ولیدؓ بن ولید بن مغیرہؓ، سلمہ بن ہشامؓ اور عبید اللہ بن اُسید ثقفیؓ کے متعلق ہوا مشرکوں نے ان کو سخت اذیتیں دی تھیں، انہوں نے مشرکوں کی ایذا سے بچنے کے لئے کچھ ایسے الفاظ کہہ دیئے جو مشرک کہلوانا چاہتے تھے۔ پھر مکہ چھوڑ کر مدینہ کو چلے گئے۔

پھر انہوں اور جہاد کیا یعنی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہو کر کافروں سے لڑے اور صبر کیا یعنی ایمان، طاعتِ الٰہی، جہاد اور برداشتِ مصائب پر ثابت قدم رہے اور گناہوں سے اپنے آپ کو روکے رکھا۔ (صبر کے بعد اگر علیٰ لفظ آتا ہے تو جم جانے اور ثابت قدم رہنے کا معنی ہوتا ہے اور اگر صبر کے بعد عَنْ آتا ہے تو بچنے، گریز کرنے اور باز رہنے کا معنی ہوتا ہے اور چونکہ آیت میں صَبَرُوْا کے بعد علیٰ ہے نہ عَنْ اس لئے دونوں معنی ہو سکتے ہیں، اس لئے تفسیر میں ثابت قدم رہنے اور گناہوں سے باز رہنے کے الفاظ سے مرادی مطلب بیان کیا گیا ہے۔ (مترجم)

حسن بصریؒ اور عکرمہ نے کہا اس آیت کا نزول عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کے متعلق ہوا عبد اللہ رسول اللہ ﷺ کا کاتب تھا پھر مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا اور کافروں سے جا ملا، فتح مکہ کے دن رسول اللہ ﷺ نے اس کو قتل کر دینے کا حکم دے دیا عبد اللہ چونکہ حضرت عثمان بن عفانؓ کا اخیانی بھائی تھا اس لئے اس نے حضرت عثمانؓ سے پناہ کی درخواست کی حضرت عثمانؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس کی سفارش کر دی اور حضور ﷺ نے اس کو پناہ دے دی (اور قتل کا حکم واپس لے لیا) اس کے بعد عبد اللہ پکا مسلمان ہو گیا اور اس کی اسلامی حالت بہت اچھی رہی۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ابن عامر کی قرأت میں فَتَنُوْا آیا ہے، یعنی کافر ہونے اور مسلمانوں کو دکھ پہنچانے کے بعد ایمان لاکر انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا (اس صورت میں) اس آیت کا نزول عامر حضرمی اور ان کے غلام جبر کے متعلق قرار دیا جائے گا جبر مسلمان ہو گئے تھے۔ عامر ان کو طرح طرح کے دکھ دیتے تھے، یہاں تک کہ جبر (بظاہر) مرتد ہو گئے تھے کچھ مدت کے بعد عامر خود مسلمان اور پختہ مسلمان ہو گئے اور جبر کو جن کو زبردستی مرتد بنایا گیا تھا ساتھ لے کر ہجرت کر کے مدینہ میں آگئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہ کر کافروں سے جہاد کیا اور مصائب پر صبر کیا۔

مِنۡ بَعۡدِهَا یعنی ہجرت، جہاد اور صبر کے بعد۔ پچھلے گناہوں کو اللہ معاف کرنے والا، اور آئندہ دنیا و آخرت میں ان کے اعمال کے موافق نعمت و راحت عطا کرنے والا ہے۔

مکرر اِنَّ رَبَّکَ کا ذکر محض لفظی تاکید ہے۔

یَوۡمَ تَاۡتِیۡ کُلُّ نَفۡسٍ تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا وَ تُوَفّٰی کُلُّ نَفۡسٍ مَّا عَمِلَتۡ وَ هُمۡ لَا یُظۡلَمُوۡنَ ﴿۱۱۱﴾

جس روز ہر شخص اپنی ہی طرف داری میں بات کریگا اور ہر شخص کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

یَوۡمَ کا تعلق رَحِیۡمٌ سے ہے یعنی اس روز اللہ تم پر مہربان ہوگا جس روز، یا اُذۡکُرۡ محذوف سے تعلق ہے یعنی یاد کرو اس دن کو جس دن.......

تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا یعنی ہر شخص کو اپنی ہی پڑی ہوگی ہر شخص کو اپنے ہی بچاؤ کی فکر اور کوشش ہوگی، دوسرے کا خیال بھی نہ ہوگا۔ کافر کہے گا اے ہمارے مالک! انہوں نے ہم کو گمراہ کیا تھا، اے ہمارے مالک ہم نے اپنے سرداروں اور بڑوں کا کہا مانا، ہم اپنے رب کی قسم کھا کر کہتے ہیں جو معبودِ برحق ہے کہ ہم (خود) مشرک نہیں تھے۔ ہم کو دوبارہ دنیا میں لوٹادے ہم نیک عمل کریں گے مؤمن کہے گا اے رب میں تجھ سے اپنی جان کی امان مانگتا ہوں مجھے کافر لوگوں کے ساتھ شامل نہ کر دینا۔

ابن جریر نے اپنی تفسیر میں حضرت معاذؓ کی روایت سے لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا۔ قیامت کے دن جہنم کو کہاں سے لایا جائے گا۔ فرمایا: ساتویں زمین سے لایا جائے گا اس کی ایک ہزار سال کی مسافت پر رہ جائے گی تو ایک سانس کھینچے گی جس کی وجہ سے ہر مقرب فرشتہ اور ہر نبی مُرسل دو زانو بیٹھ کر عرض کرے گا، اے میرے مالک! میری جان (بچادے)

بغوی نے لکھا ہے، حضرت عمر بن خطابؓ نے کعب احبارؒ سے فرمایا (کچھ آخرت کا تذکرہ کرکے) ہمارے اندر (اللہ کا) خوف پیدا کردو۔ کعب احبارؒ نے عرض کیا: امیر المؤمنین! اگر ستر پیغمبروں کے برابر عمل کرکے آپ قیامت کا دن پائیں گے تب بھی قیامت آپ پر بار بار ایسے حالات لائے گی کہ اس وقت آپ کو اپنی جان کے علاوہ کسی دوسرے کا خیال ہی نہیں رہے گا جہنم ایک ایسا دم کھینچے گی کہ ہر مقرب فرشتہ اور ہر برگزیدہ نبی دو زانو بیٹھ جائے گا یہاں تک کہ حضرت ابراہیمؑ بھی کہہ اٹھیں گے میں تجھ سے صرف اپنی جان کی امان مانگتا ہوں اس کی تصدیق اللہ کی بھیجی ہوئی آیت میں موجود ہے ارشاد فرمایا ہے یَوۡمَ تَاۡتِیۡ کُلُّ نَفۡسٍ تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا۔

عکرمہ نے اس آیت کے ذیل میں حضرت ابن عباسؓ کا بیان نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا قیامت کے دن لوگوں میں باہم جھگڑا برابر ہوتا رہے گا یہاں تک کہ رُوح اور بدن میں بھی باہم جھگڑا ہوگا، روح کہے گی اے میرے رب! نہ میرے ہاتھ تھے جن سے میں پکڑتی نہ میرے پاؤں تھے جن سے میں چلتی نہ میری آنکھ تھی کہ میں دیکھتی (جو کچھ بد اعمالی ہے وہ اس بدن کی ہے) بدن کہے گا تو نے مجھے لکڑی کی طرح (بے حس، بے شعور، بے جان) پیدا کیا تھا میرے ہاتھ نہ تھے کہ میں پکڑتا میرے پاؤں نہ تھے کہ میں ان سے چلتا نہ میری آنکھیں تھیں کہ ان سے دیکھتا۔ جب یہ میرے اندر نور کی شعاع کی طرح آئی تو میری زبان بولنے لگی میری آنکھ بینا ہوگئی اور میرے پاؤں رواں ہوگئے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: اللہ نے روح اور جسم کو اس طرح بنایا ہے جیسے ایک اندھا اور ایک اپاہج کسی کے باغ میں پہنچ گئے باغ میں درختوں پر پھل لگے ہوئے تھے، اندھا تو پھلوں کو دیکھ ہی نہ سکتا تھا اور اپاہج (دیکھتا تو تھا) پھلوں تک پہنچ نہ سکتا تھا آخر اندھے نے اپاہج کو اپنے اوپر سوار کر لیا اس طرح دونوں نے پھل حاصل کر لئے (اور دونوں چوری کے مجرم قرار پائے) روح اور بدن بھی دونوں اسی طرح عذاب میں پکڑے جائیں گے۔

تُجَادِلُ عَنۡ نَّفۡسِهَا میں نفس سے مراد ذات ہے۔ عینِ شئی اور ذاتِ شئی کو نفسِ شئی کہا جاتا ہے اور جو عین اور ذات نہ ہو اس کو غیر کہتے ہیں یعنی ہر شخص اپنی ذات کی طرف سے دفاع کرے گا۔

لَا یُظۡلَمُوۡنَ کا یہ مطلب ہے کہ کسی کا ثواب کم نہیں کیا جائے گا، کسی کی حق تلفی نہیں کی جائے گی۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ

اور اللہ ایک بستی والوں کی حالت عجیب بیان فرماتا ہے کہ وہ بڑے امن اور اطمینان سے رہتے تھے ان کے کھانے کی چیزیں بڑی فراغت سے ہر طرف سے ان کے پاس پہنچا کرتی تھیں۔ پس انہوں نے اللہ کی نعمتوں کی ناقدری کی۔ یعنی اللہ نے ایک بستی کو جس کے اوصاف مندرجۂ آیات تھے۔ ہر اس قوم کو مثال کے طور پر بیان فرمایا جس کو اللہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا، پھر بجائے شکر کرنے کے وہ مغرور ہو گئے اور کفر کرنے لگے۔ آخر اللہ نے ان کو عذاب میں گرفتار کر دیا۔ قَرْيَةً سے مراد ایک مفروضہ بستی ہے جس کو بطورِ مثال ذکر کیا گیا ہے اور ممکن ہے کوئی ایسی بستی گذری ہو جس کا ذکر اللہ نے مکہ کی تشبیہ دینے کے لئے کیا ہے تاکہ اہلِ مکہ کو ان کے بُرے انجام کا تذکرہ پڑھ کر عبرت حاصل ہو۔

بغوی نے لکھا ہے قَرْيَةً سے مراد مکہ ہی ہے۔ اس تفسیر پر مکہ کا ذکر دوسری بستیوں کو سبق سکھانے کے لئے ہوگا۔[۱]

اٰمِنَةً امن چین سے، نہ ڈاکوؤں کا خوف نہ کسی کے حملے کا اندیشہ۔

مُّطْمَئِنَّةً: اپنی جگہ برقرار سکون سے رہنے والے تنگ دستی یا دشمن کے خوف کی وجہ سے ترکِ سکونت نہ کرنے والے۔ عام عرب آبادی کو ہر وقت دشمنوں کے حملے کا خطرہ لگا رہتا تھا اور غذائی اشیاء کی بھی کمی تھی اس لئے بہت زیادہ خانہ بدوش رہتے تھے۔ لیکن مکہ والوں کی یہ کیفیت نہ تھی ان کو کھانے پینے کی رسد مِنْ كُلِّ مَكَانٍ ہر طرف اور ہر جگہ سے پہنچتی تھی خشکی کے راستہ سے بھی اور سمندر کے ذریعہ سے بھی۔

فَكَفَرَتْ اس بستی نے یعنی اس کے باشندوں نے ناشکری کی۔

بِاَنْعُمِ اللّٰهِ اللہ کی نعمتوں کی۔ اَنْعُم نعمت کی جمع ہے یا نُعْم کی جیسے دِرْعٌ کی جمع اَدْرُعٌ اور بُؤْسٌ کی جمع اَبْؤُسٌ آتی ہے۔

فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ اس پر اللہ نے ان کو ان کے حرکات کے سبب ایک محیط قحط اور خوف کا مزہ چکھایا۔

مزہ چکھانے سے مراد ہے بھوک اور خوف کے ضرر کے اثر کا محسوس کرانا اور لباس سے مراد ہے وہ اثر جو بھوک اور خوف کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے یعنی لاغری اور رنگ کا تغیر۔

بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ سے مراد ہے کفر اور ناشکری۔

بغوی نے لکھا ہے اہلِ مکہ سات برس تک کال میں مبتلا رہے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے تمام عرب نے مکہ کو کھانے پینے کا سامان بھیجنا بند کر دیا ہر طرف سے رسد کی بندش ہو گئی اور اس قدر فاقوں کی نوبت آ گئی کہ لوگوں نے جلی ہوئی ہڈیوں مردار جانور مُردہ کتے اور علز یعنی اونٹوں کے اون اور خون کا پکا ہوا مخلوط قوام تک کھا لیا فاقوں کی وجہ سے نظر کی یہ حالت ہو گئی کہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا اس حالت سے مجبور ہو کر سردارانِ مکہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا دشمنی تو مردوں سے ہے عورتوں اور بچوں کا کیا قصور ہے آخر رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو غلہ کی رسد پہنچانے کی اجازت دے دی اور عرب مکہ کو خوردنی جنس بھیجنے لگے۔ اہلِ مکہ اس زمانہ میں مشرک تھے۔

میں کہتا ہوں، یہ سورت تو مکی ہے اور مکہ والوں پر جو ہفت سالہ قحط پڑا اور رسول اللہ ﷺ کے فوجی دستوں کے حملہ کرنے کا خوف ہوا وہ ہجرت کے بعد ہوا، لامحالہ ان آیات کو یا تو مدنی تسلیم کیا جائے گا یا قَرْيَةً سے مراد مکہ نہ ہوگا کوئی اور بستی ہوگی جس کا ذکر اللہ نے بطورِ تمثیل کیا ہے تاکہ اس کی بدانجامی کو سن کر اہلِ مکہ کو بھی خوف پیدا ہو اور چونکہ اہلِ مکہ اس ذکر کے بعد بھی

---

[۱] سلیم بن عمر کا بیان ہے میں ام المومنین حضرت حفصہؓ کے ساتھ تھا۔ آپ مکہ سے نکل کر مدینہ کو جا رہی تھیں راستہ میں اطلاع ملی کہ حضرت عثمانؓ شہید کر دیئے گئے آپ فوراً لوٹ پڑیں اور فرمایا تم بھی میرے ساتھ لوٹ آؤ قسم ہے اس کی جس کے قبضے میں میری جان ہے یہ وہی بستی ہے جس کا ذکر اللہ نے آیت قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً میں کیا ہے۔ اِزالۃُ الخفاء۔

عبرت اندوز نہیں ہوئے اس لئے ان کا بھی وہی نتیجہ ہوا جو مذکورہ بستی والوں کا ہوا تھا۔

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور ان کے پاس انہیں میں کا ایک رسول (اللہ کی طرف سے) آیا سو اس رسول کو انہوں نے جھوٹا بتایا آخر اللہ کے عذاب نے ان کو آپکڑا جب کہ وہ بالکل ہی ظلم پر کمر باندھنے لگے۔

اللہ نے قریہ کے ذکر کے بعد اہلِ مکہ کے ذکر کی طرف کلام کا رُخ پھیر دیا ہُمْ ضمیر اہلِ مکہ کی طرف راجع ہے اور رسول اللہ ﷺ سے مراد محمد ﷺ ہیں اور عذاب سے مراد ہے سخت کال یا بدر کا واقعہ۔

یہ آیت خود دلالت کر رہی ہے کہ اس کا نزول ہجرت کے بعد ہوا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ کفرت کی ضمیر سے حال ہو اور رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ سے وہ پیغمبر مراد ہو جو اہلِ قریہ کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۪ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾

سو جو چیزیں اللہ نے تم کو حلال پاک دی ہیں انکو کھاؤ اور اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرو اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

كُلُوْا اسے مسلمانوں کو خطاب ہے جن کو اللہ نے کفر سے نکالا اور اسلام کی ہدایت کی۔

نِعْمَتَ اللّٰهِ سے مراد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور دوسری دنیوی نعمتیں ہیں جو اللہ نے مؤمنوں کو عطا فرمائی ہیں۔ پہلے اللہ نے کفر پر توبیخ کی اور ایک ناشکری قوم کی مثال دے کر ان کا نتیجۂ بد اور ان پر عذاب نازل ہونے کا ذکر کیا تاکہ مشرک اعمالِ جاہلیت سے کنارہ کش ہو جائیں اور باطل مذاہب چھوڑ کر ایمان لے آئیں۔ اس آیت میں اہلِ ایمان کو خطاب کر کے حلال چیزوں کو کھانے اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔

بعض علماء نے کہا جن لوگوں کو سابق آیت میں خطاب کیا تھا انہیں کو اس آیت میں بھی خطاب کیا ہے۔ پہلی آیت جو کفر پر زجر کی تھی اس آیت میں نعمت کا شکر ادا کرنے اور حلال چیزوں کو کھانے کا حکم دیا۔ کفّار کا دعویٰ تھا کہ ہم صرف اللہ واحد کی عبادت کرتے ہیں اور بُتوں کی پوجا تو صرف اس لئے کرتے ہیں کہ یہ اللہ سے ہماری شفاعت کریں گے (اس آیت کے آخری جملہ میں تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو تو اس کی نعمت کا شکر ادا کرو اور جو چیز اس نے حلال اور پاکیزہ قرار دی ہے اس کو کھاؤ اور جس چیز کو کھانے کی اس نے ممانعت کی ہے اس کو نہ کھاؤ)

اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱۶﴾

تم پر تو صرف مردار کو حرام کیا ہے اور خون کو خنزیر کے گوشت (وغیرہ) کو اور اس چیز کو جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لئے نامزد کر دی گئی ہو اس حکم کے بعد اگر کوئی بہت ہی سخت مجبور ہو بشرطیکہ طالبِ لذت نہ ہو اور نہ حدِّ (ضرورت) سے آگے بڑھنے والا ہو (اور اس حالت میں ان چیزوں میں سے کچھ کھالے) تو اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے اور جن چیزوں کے بارے میں محض تمہارا جھوٹا زبانی دعویٰ ہے ان کی نسبت یوں مت کہو کہ فلاں چیز حلال ہے اور فلاں چیز حرام ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ پر جھوٹی تہمت باندھو گے بلاشبہ جو لوگ اللہ پر خود تراشیدہ دروغ بندی کرتے ہیں وہ فلاح نہ پائیں گے۔

کفّار از خود بعض چیزوں کو حلال اور بعض کو حرام کہتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے مَا فِيْ بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا یہ پیٹ کے اندر کے بچے صرف ہمارے مَردوں کے لئے حلال ہیں یا بحیرہ اور سائبہ (جیسے بجاروں اور سانڈوں) کو حرام قرار دیتے تھے۔

اللہ نے صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ باقی تمام درندے، کیڑے مکوڑے حلال کر دیئے ہیں بلکہ یہ حصر اضافی ہے یعنی کافروں نے جن چیزوں کو از خود حرام بنا رکھا ہے وہ خدا کی حرام کردہ نہیں ہیں اللہ نے تو صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں۔ چونکہ حصر اضافی ہے اس لئے صحیح احادیث سے ان چیزوں کے علاوہ دوسری چیزوں کی جو حُرمت ثابت ہے وہ قرآنی عبارت کے خلاف نہیں ہے اس کی پوری تفصیل سورۂ مائدہ میں گزر چکی ہے۔[1]

اَلْکَذِبَ: لَا تَقُوْلُوْا کا مفعول ہے یعنی تم جو اپنی زبانوں سے جھوٹ کہتے ہو اور کسی کو از خود حلال اور کسی کو حرام بناتے ہو اس کی حلّت و حرمت کو اللہ پر مت باندھو اور اس کی تحریم و تحلیل کو اللہ کا حکم مت قرار دو اور صرف اپنی زبانوں سے اشیاء کی حُرمت و حلّت کا فیصلہ بغیر دلیل کے نہ کرو۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۱۷ (دنیا میں ان کے لئے یہ) چند روزہ عیش ہے اور (آخرت میں) دردناک سزا ہے۔ یعنی جس عیش کے لئے یہ افترا بندی کرتے ہیں وہ بہت ہی حقیر اور زوال پذیر ہے۔ عنقریب فنا ہو جائے گا اور اس افترا بندی کی سزا مرنے کے بعد بڑی دردناک ہو گی۔

وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۸

اور صرف یہودیوں پر ہم نے وہ چیزیں حرام کر دی تھیں۔ جن کا بیان ہم آپ سے اس سے پہلے کر چکے ہیں اور ہم نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر زیادتی کیا کرتے تھے سورۂ انعام میں پہلے اللہ بیان کر چکا تھا وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ ظُفُرٍ الخ

مَا ظَلَمْنٰهُمْ یعنی بعض حلال چیزوں کو یہودیوں کے لئے ہم نے حرام کر کے ان پر زیادتی نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر زیادتی کی تھی اس کی سزا میں ان کے لئے بعض حلال چیزیں حرام کر دی گئی تھیں۔

آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ کسی چیز کی حُرمت کبھی تو اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے کرنے میں ضرر اور نہ کرنے میں فائدہ ہوتا ہے اور کبھی محض سزا کے طور پر بھی حلال چیزوں کو حرام کر دیا جاتا ہے۔ ۱۵

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْٓا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۱۹ ع ۹ ۲۱

پھر آپ کا رب ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے نادانی کے سبب گناہ کر لیا ہو پھر اس کے بعد توبہ کر کے اعمال درست کر لئے ہوں بلاشبہ توبہ کے بعد آپ کا رب (ان کو) معاف کر دینے والا بڑا مہربان ہے۔

عَمِلُوا السُّوْٓءَ بدی کفر ہو یا گناہ۔ بِجَهَالَةٍ نہ جاننے کے سبب یا جہالت کی حالت میں یعنی اللہ کو اور اس کے عذاب کو نہ جاننے کی حالت میں اور نتیجہ پر غور نہ کرنے کے سبب محض خواہشِ نفس کے زیر اثر کوئی گناہ کر لیا ہو۔ لَغَفُوْرٌ اس گناہ کو معاف کر دینے والا ہے۔ رَّحِيْمٌ بڑا مہربان ہے توبہ کرنے اور اللہ کی طرف رجوع ہو جانے کا ثواب عطا فرمائے گا۔

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝۱۲۰ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ۭ اِجْتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۱۲۱

بے شک ابراہیمؑ بڑے مقتدا تھے۔ اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار تھے۔ بالکل ایک طرف کے (یعنی اللہ کی طرف کے) ہو رہے تھے شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے اللہ نے ان کو منتخب کر لیا تھا اور ان کو سیدھے راستے پر ڈال دیا تھا۔

---

[1] حضرت ابو النضرہ نے فرمایا، میں نے جب سورۂ نحل کی آیت وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ پڑھی ہے اس وقت سے آج تک (کسی چیز کی حُرمت و حلّت کا) فتویٰ دینے سے ڈرتا ہوں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا آئندہ لوگ (از خود) کہیں گے کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے اور اس کی ممانعت کی ہے اور اللہ فرمائے گا تو جھوٹا ہے یا بعض لوگ کہیں گے اس کو اللہ نے حلال کر دیا ہے اور اس کو حرام کر دیا ہے اور اللہ اس سے فرمائے گا تو نے جھوٹ کہا۔ ازالۃ الخفاء (از مفسرؒ)

امّت کے معانی صاحب قاموس نے حسب ذیل بیان کئے ہیں وہ شخص جس میں ہر طرح کی اچھائی اور خوبی ہو۔ وہ شخص جو حق پر ہو اور تمام مذاہب (باطل) کا مخالف ہو، چستی، طاعت، عالم وغیرہ۔ حضرت ابراہیمؑ کے اندر اتنے فضائل اور محاسن جمع تھے جو متعدد اشخاص میں بھی پائے جائے دشوار ہیں، آپ سب لوگوں کے مقتدا تھے، حق پر قائم تھے، تمام باطل مذاہب کے مخالف تھے، (اللہ کی فرماں برداری میں) مجسّم نشاط و طاعت تھے اللہ اور اسکے احکام کو جانتے تھے۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا حضرت ابراہیمؑ معلم خیر تھے دنیا کے لوگ آپ کی اقتدا (کا دعویٰ) کرتے ہیں۔

اُمّ کا معنی ہے قصد کرنا اُمَّةٌ بروزن فُعْلَةٌ بمعنی اسم مفعول ہے یعنی مقصودِ کل۔ مجاہد نے کہا تنہا آپ ہی مؤمن تھے باقی سب لوگ کافر تھے۔

قَانِتًا یعنی اللہ کے فرماں بردار، احکام خداوندی پر قائم، حَنِیْفًا باطل سے پھر جانے والے، حق کی جانب مڑنے والے، بعض علماء نے حنیف کا ترجمہ کیا، دین اسلام پر قائم رہنے والے بعض نے ترجمہ کیا ہے مخلص۔ لَمْ یَکُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ قریش کا دعویٰ تھا کہ ہم ابراہیمؑ کے دین پر ہیں اللہ نے اس دعویٰ کی تردید کر دی کہ ابراہیمؑ مشرک نہ تھے (اور تم مشرک ہو) صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ سے مراد ہے دین اسلام اور اللہ کی طرف آنے کی دعوت۔

وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ اور ہم نے ان کو دنیا میں بھی خوبیاں دی تھیں۔

حَسَنَةً سے مراد ہے پیغمبری اور خالص دوستی۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا حسنہ سے مراد خلّت (خالص دوستی) ہے ہر شخص اپنے خلیل کو ان اسرار سے واقف کرتا ہے جو محبّ یا محبوب سے تعلق رکھتے ہیں اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اور اپنی آل کے لئے اسی طرح کی رحمت نازل ہونے کی درخواست کی تھی جو حضرت ابراہیمؑ اور ان کی آل پر نازل کی گئی تھی آپ نے دعا کی تھی اللّٰھمّ صل علیٰ محمّد وعلیٰ آل محمّد کما صلّیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ ال ابراھیم۔

علّامہ مفسّرؒ کی زبانِ قلم سے حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کی تعریف

رسول اللہ ﷺ خالص محبوبیت کے مرتبہ پر فائز تھے۔ خُلّت کا درجہ خالص محبوبیت کے درجہ سے نیچا ہے مقامِ خلّت محبوبیتِ خالصہ کے راستہ میں واقع ہے اس لئے حضور مقامِ خلّت پر نہیں ٹھہرے نہ ٹھہرنے کی اجازت تھی لیکن آپ کی خواہش تھی کہ مقامِ خلّت میں بھی کچھ استقرار کریں اور استقرار کی اجازت مل نہیں سکی اس لئے اللہ نے حضور ﷺ کے متبعین میں سے ایک ہزار سال کے بعد ایک شخص کو مقامِ خلّت میں استقرار عطا فرمادیا۔ تابع کا کمال متبوع کے کمال کا جز ہوتا ہے اور جز کل میں داخل ہوتا ہے پس حضرت مجدّدؒ کا کمال یعنی مقامِ خلّت میں استقرار رسول اللہ ﷺ کے کمالِ محبوبیت کا ہی ایک حصہ تھا اور حضور ﷺ کے اتباع ہی سے حضرت مجدّدؒ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا۔ کسی گورنر، کمانڈر یا شاہی ملازم کا کسی قلعہ کو سر کرنا یا کسی شہر پر قبضہ کر لینا اسی وجہ سے ہوتا ہے کہ اس فاتح کا تعلق مرکزِ سلطانی سے ہوتا ہے اور ملازم کی فتح یابی اور قبضہ سلطانِ معظّم کی کامیابی اور فتح ہوتی ہے پس حضرت مجدّدؒ کو مقامِ خلّت پر فائز کرنا اور استقرار عطا کرنا حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کو ہی مقامِ خلّت پر فائز کرنا ہے۔

وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۲۲ اور وہ آخرت میں بھی اچھے لوگوں میں ہوں گے "صالحین" سے مراد ہیں انبیاء معصومین۔ صلاح کی تکمیل بغیر عصمت (یعنی تمام گناہوں سے بچنے کی منجانب اللہ توفیق) کے نہیں ہوتی اور عصمت کا تقاضا ہے کہ آخرت میں ہر نیکی کا ثواب بغیر کمی کے پورا پورا ملے اور یہ خصوصیت صرف اہلِ عصمت ہی کی ہے کہ ہر نیکی کا پورا پورا ثواب حاصل ہو کیونکہ کسی صغیرہ یا کبیرہ کا ارتکاب کرنے سے توازنِ اعمال کے وقت نیکیوں کے وزن میں کچھ کمی آ جانے کا احتمال ہے اس لئے اگر رحمتِ خداوندی شاملِ حال نہ ہو تو غیر معصوم کی نیکی کا ثواب مقابلہ گناہ کے وقت کچھ کم ہو سکتا ہے ہاں اگر کوئی گناہ ہی نہ ہو تو خِفّتِ حسنات کا کوئی احتمال ہی نہیں ہے گویا یہ آیت جواب ہے اس دعا کا جو حضرت ابراہیمؑ نے

کی تھی اور کہا تھا اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ۔

ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۲۳﴾

پھر ہم نے آپ کے پاس وحی بھیجی کہ آپ ابراہیمؑ کے طریقہ پر چلیں جو اللہ ہی کی طرف یکسو ہو گئے تھے اور شرک کرنے والوں میں سے نہیں تھے۔

یعنی توحید میں نرمی کے ساتھ اللہ کی طرف لوگوں کو بلانے میں پے درپے دلیلیں پیش کرنے میں ہر شخص سے اس کی سمجھ کے مطابق مناظرہ کرنے میں، قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے میں، دین ابراہیمی کے اصول وشرائع اختیار کرنے میں ابراہیمؑ کے طریقے پر چلو۔ یہ تمام چیزیں وہ نعمتیں تھیں جو اللہ نے ابراہیمؑ کو عطا فرمائی تھیں اور حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کیا تھا اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا۔ طریق ابراہیمؑ کی پیروی میں یہ تمام اُمور داخل ہیں۔

فائدہ

رسول اللہ ﷺ کو ملت ابراہیمؑ پر چلنے کا حکم دیا کیونکہ حضور ﷺ مرتبۂ خلت پر پہنچنے کے بڑے مشتاق تھے اور آپکو حضرت ابراہیمؑ سے بہت زیادہ محبت تھی آیت قَدْ نَرٰی تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِی السَّمَآءِ اس محبت پر دلالت کر رہی ہے۔

مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ یہ جملہ دوبارہ ذکر کرنے سے یہودیوں اور اہل مکہ اور عیسائیوں کی تردید مقصود ہے کیونکہ یہ سب ملت ابراہیمی پر چلنے کے مدعی تھے (مگران کے مسلک شرک آمیز تھے)

اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَیَحْكُمُ بَیْنَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ فِیْمَا كَانُوْا فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۲۴﴾

ہفتہ (کے دن کی تعظیم وعبادت اور حرمت کا پاس) تو صرف ان لوگوں پر فرض کیا گیا تھا جنہوں نے اس میں خلاف کیا تھا اور آپ کا رب قیامت کے دن ان کے درمیان اس بات کا فیصلہ کردے گا جس میں وہ اختلاف کرتے تھے۔

جُعِلَ السَّبْتُ یعنی ہفتہ کے دن کی تعظیم اور دنیا کے تمام مشاغل کی حرمت اور محض عبادت لازم کر دی گئی تھی۔

اِخْتَلَفُوْا فِیْهِ یعنی سنیچر کے معاملہ میں انہوں نے اپنے پیغمبر کی مخالفت کی یہی کا بیان ہے بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰؑ نے حکم دیا تھا کہ ہر سات دن میں ایک روز یعنی جمعہ کے دن کوئی کام اور پیشہ نہ کریں صرف عبادت کیا کریں چھ دن اپنے پیشے کیا کریں۔ بنی اسرائیل نے کہا ہم تو (عبادت کے لئے مخصوص) وہ دن چاہتے ہیں جس روز اللہ سارے عالم کی پیدائش سے فارغ ہو گیا تھا یعنی سنیچر کا دن۔ اللہ نے سنیچر کا دن مقرر کر دیا اور سختی کر دی (کہ ان کے پابند رہیں) پھر حضرت عیسیٰؑ نے بنی اسرائیل کے سامنے جمعہ کے دن کو پیش کیا (یعنی جمعہ کا دن عیسائیوں کے لئے مقرر کیا) کہنے لگے، ہم کو تو یہ بات پسند نہیں کہ ہماری عید کے بعد ہی ان (یہودیوں) کی عید ہو جائے۔ غرض عیسائیوں نے (عبادت کے لئے) اتوار کا دن پسند کر لیا آخر اللہ نے جمعہ کا دن اس امت کو دے دیا اور اس امت نے عطاء الٰہی کو قبول کر لیا اور اللہ نے امت اسلامیہ کو اس دن کی برکات بھی عطا فرما دیں۔

شیخین نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہم (دنیا میں) پیچھے ہیں قیامت کے دن آگے ہوں گے باوجود اس کے کہ ان کو کتاب ہم سے پہلے دی گئی اور ہم کو ان کے پیچھے پھر یہ ان کا دن تھا جو ان پر فرض کیا گیا تھا یعنی جمعہ کا دن پر انہوں نے اس کی مخالفت کی لیکن اللہ نے ہم کو اس کی ہدایت کر دی سب لوگ اس روز عبادت میں ہمارے پیچھے ہیں یہودیوں کے لئے کل کا دن ہے (یعنی سنیچر) اور عیسائیوں کے کل کے بعد کا دن (یعنی اتوار)

بغوی کی روایت میں اس حدیث کے آخر میں اتنا زائد ہے کہ اللہ نے فرمایا ہے اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِیْنَ اخْتَلَفُوْا فِیْهِ۔

مسلم نے حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت حذیفہؓ کی روایت سے یہ حدیث نقل کی ہے، جس کے آخر میں الفاظ ہیں ہم دنیا والوں سے پیچھے ہیں اور قیامت کے دن اوّل ہوں گے ہمارا فیصلہ اور لوگوں سے پہلے کر دیا جائے گا۔

بعض علماء نے آیت کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اللہ نے سنیچر کے دن کی تعظیم اور حُرمت صرف ان لوگوں کے لئے لازم کی تھی جنہوں نے اس کے سلسلے میں اختلاف کیا تھا یعنی یہودیوں پر سنیچر کی تعظیم لازم کی تھی مگر لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ بعض لوگوں نے کہا سنیچر کا دن سب سے بڑی عظمت کا دن ہے۔ اللہ تمام چیزوں کو پیدا کر کے جمعہ کے دن فارغ ہو گیا اور سنیچر کے دن آرام کیا۔

بعض لوگوں نے کہا اتوار کا دن سب سے زیادہ عظمت والا ہے۔ اللہ نے اسی روز مخلوق کو پیدا کرنے کا افتتاح کیا تھا۔ غرض یہ کہ اللہ نے ان کے لئے جمعہ کی تعظیم فرض کی تھی، مگر خدا کے فرض کردہ دن کے علاوہ انہوں نے دوسرے ایّام کی تعظیم کو اختیار کیا۔

بعض اہلِ تفسیر نے آیتِ مذکورہ کا یہ مطلب بیان کیا کہ اللہ نے سنیچر کے دن کو لعنت اور صورت بگاڑ دینے کا سبب بنا دیا ان لوگوں کے لئے جنہوں نے اس کے حکم کی مخالفت کی یعنی یہودیوں کے لئے لعنت اور ان کی صُورتیں مسخ ہو جانے کا سبب سنیچر کا دن ہوا بعض یہودیوں نے سنیچر کے دن مچھلی کا شکار حلال بنا لیا تھا اور کچھ دوسرے لوگ اس کو حرام کہتے تھے۔

لَيَحْكُمُ بَيْنَهُمْ یعنی اختلاف کے مطابق سزا و جزا دے گا ہر فریق کو وہی بدلہ دے گا جس کا وہ مستحق ہو گا۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ

آپ اپنے رب کی راہ کی طرف علم کی باتوں اور اچھی نصیحتوں کے ذریعہ سے بُلائیں اور (اگر بحث آ پڑے تو) ان کے ساتھ اچھی طرح بحث کریں (کہ تنگ مزاجی اور سخت کلامی نہ ہو) یعنی اے محمدؐ! آپ لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں اَلْحِكْمَةُ سے مراد قرآن مجید ہے۔ قرآن ایک محکم، مضبوط، اٹل کلام ہے جس پر کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی (گویا حِكْمَةٌ بمعنی محکم کے ہے اور اس سے مراد قرآن ہے) اور اَلْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ سے مراد معارضہ ہے مُعارضہ ایسی دلیل کو کہتے ہیں جس سے حق واضح ہو جائے اور شبہات دُور ہو جائیں۔ اس کا حسن یہ ہے کہ دلیل کے ساتھ ترہیب اور ترغیب بھی ہو (یعنی نہ ماننے پر سخت عذاب کا ڈراوا اور ماننے کے بعد بہترین نتیجہ کی بشارت) بعض علماء نے کہا کہ مَوعظتِ حسنہ سے مراد ایسا نرم کلام ہے جس میں دُرشتی اور چڑچڑاپن نہ ہو۔

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ یعنی بہت اچھے عمدہ طریقہ سے ان سے مناظرہ کرو اور اس طرح بحث کرو کہ اس میں نفس کی تیزی اور شیطانی وسوسہ کو دخل نہ ہو چڑچڑاپن اور غلبۂ نفسانی کی خواہش نہ ہو بلکہ محض لوجہ اللہ ہو، اور اللہ کا بول بالا کرنا مقصود ہو۔

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ آپ کا رب خوب جانتا ہے اس شخص کو جو اس کے راستہ میں گم ہوا اور وہی راہِ حق پر چلنے والوں کو بھی خوب جانتا ہے۔

یعنی آپ کا فریضہ تو صرف تبلیغ اور دعوت ہے حصولِ ہدایت اور سزا و جزا کا علم اللہ کو ہے اس کی ذمہ داری آپ کو نہیں جو کوئی گمراہ ہو یا ہدایت یافتہ سب سے واقف اللہ ہے اور وہی ہر ایک کو جزا و سزا دینے والا ہے حاکم نے حضرت جابر بن عبد اللہؓ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ اُحد کے روز جب لوگ میدان جنگ سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کو نہ پایا، ایک شخص نے کہا میں نے فلاں چٹان کے پاس ان کو دیکھا تھا وہ کہہ رہے تھے میں اللہ کا اور اللہ کے رسول ﷺ کا شیر ہوں اے اللہ! میں تیرے سامنے اس بات سے بیزاری کا اظہار کرتا ہوں جس کو یہ لوگ (یعنی ابو سفیان وغیرہ) لائے ہیں اور ان لوگوں یعنی مسلمانوں نے جو شکست کھائی ہے ان کی طرف سے میں عُذر خواہ ہوں (اس شخص سے اطلاع پا کر) رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہؓ کی طرف آئے اور آپ کی لاش کو دیکھ کر رو دیئے اور جب آپ کے کان، ناک کٹے اور صورت بگڑی ہوئی پائی تو چیخ پڑے اور فرمایا کیا

اس کو ڈھانکنے کے لئے کوئی کپڑا نہیں ہے ایک انصاری نے اپنا کپڑا حضرت حمزہؓ پر ڈال دیا اور اس کے بھائی نے ایک اور کپڑا بھی حضرت حمزہؓ پر ڈال دیا حضور ﷺ نے فرمایا جابرؓ یہ کپڑا تیرے باپ کے لئے ہے (ان کو نعش پر ڈال دو) رسول اللہ ﷺ نے اس وقت یہ بھی فرمایا تجھ پر اللہ کی رحمت ہو، میں جس طرح تجھے جانتا تھا تو ویسا ہی بڑا نیکوکار اور کنبہ پرور تھا اگر صفیہ رنجیدہ نہ ہوتی یا یہ فرمایا اگر ہماری عورتوں کو رنج نہ ہوتا تو میں تجھے (یونہی) ایسی حالت میں چھوڑ دیتا کہ تیرا حشر درندوں کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں سے قیامت کے دن ہوتا یعنی بغیر دفن یونہی چھوڑ دیتا کہ درندے اور پرندے کھا جائیں اور قیامت کے دن اللہ تجھ کو درندوں اور پرندوں کے پیٹ سے اٹھاتا پھر فرمایا، تم کو بشارت ہو مجھے جبرئیلؑ نے آکر اطلاع دی ہے کہ ساتوں آسمانوں والوں میں حمزہؓ کے متعلق یہ الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں حمزہ بن عبد المطلب اسدُ اللہ، اسدُ رسولِ اللہ ﷺ (اللہ کا شیر اور اللہ کے رسول کا شیر) اس کے بعد اگر آئندہ کسی مقام پر اللہ نے قریش پر مجھے فتح یاب کیا تو تیری بجائے ان کے ستّر آدمیوں کے ناک کان کاٹوں گا جب رسول اللہ ﷺ کا یہ رنج اور غصہ مسلمانوں نے دیکھا تو انہوں نے بھی کہا اگر ہم کو بھی کسی روز اللہ نے ان پر فتح عنایت کی تو ہم بھی ان کے ستّر آدمیوں کی اس طرح شکلیں بگاڑ دیں گے کہ کسی عرب نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔

ابن سعد اور بزار اور ابن المنذر اور بیہقی اور حاکم نے بیان کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا رسول اللہ ﷺ وہیں کھڑے تھے کہ حضرت جبرئیلؑ نے سورۂ نحل کی آخری آیات لے کر اترے۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ﴿۱۲۶﴾

اور اگر بدلہ لو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا ہے اور اگر صبر کرو تو صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔

کسی برائی کے بدلے کو عقوبت اور عقاب کہا جاتا ہے اس کو عقوبت (برا بدلہ) کہنا محض لفظی مناسبت کی وجہ سے ہے جیسے جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا میں بدی کے بدلہ کو بھی برائی کہا گیا ہے حالانکہ برائی کی سزا برائی نہیں ہوتی مطلب یہ ہے کہ برائی کی سزا حدِ جرم کے برابر دے سکتے ہو اس سے تجاوز نہ کرو۔

صبر کرنے سے مراد ہے انتقام نہ لینا اور بدلہ لینے سے رُک جانا۔

لَهُوَ خَيْرٌ یعنی انتقام سے صبر بہتر ہے اِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا میں تو در پردہ عفو کی ترغیب ہے اور لَئِنْ صَبَرْتُمْ میں تاکید کے ساتھ صبر کرنے کی صراحت ہے لِلصّٰبِرِیْنَ میں لفظ صَابِرِیْنَ کو ذکر کرنے سے اللہ کی طرف سے فی الجملہ ان لوگوں کی تعریف ہے جو مصائب اور شدائد پر صبر کرتے ہیں۔

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُونَ ﴿۱۲۷﴾

اور آپ صبر کیجئے اور آپ کا صبر کرنا خاص خدا کی توفیق سے ہے اور ان پر غم نہ کیجئے اور جو کچھ وہ تدبیر کرتے ہیں ان سے دل تنگ نہ ہوجیئے۔

چونکہ رسول اللہ ﷺ کا علم اور اللہ پر اعتماد سب سے زیادہ تھا اس لئے خصوصیت کے ساتھ آپ کو اس آیت میں خطاب فرمایا۔

وَاصْبِرْ یعنی کفّار کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس پر صبر کرو۔ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ یعنی اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے ہی آپ کا صبر ہو سکتا ہے۔

وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ اور ان پر یعنی کافروں پر یا مؤمنوں پر اور مؤمنوں کو پہنچی ہوئی اذیّت پر رنج نہ کرو۔

وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ یعنی کافر جو مؤمنوں کے خلاف مکّاریاں کرتے ہیں آپ ان کی پروانہ کریں، آپ کو ان پر فتح دینا اور ان کو سزا دینا ہمارا ذمّہ ہے۔

ضَيْقٍ اور ضِيْقٍ (سینہ کی تنگی، گھٹن، غم) دونوں ہم معنی ہیں ابو عمرو نے کہا ضَیق غم ضِیق شدّت ابو عبیدہ نے کہا ضَیق

کھانے پینے اور مسکن کی کمی۔ ضیق دل کی گھٹن، کبیدگی غم۔ ابوقتیبہ نے کہا ضَیْق ضَیِّق کا مخفف ہے جیسے مَیْنٌ مَیِّنٌ کا اور لَیْن لَیِّن کا اس قول پر ضَیْقٌ صفت کا صیغہ ہو گا یعنی تنگ امر۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ اللہ ایسے لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے جو (گناہوں سے) بچتے ہیں اور ان کے ساتھ ہوتا ہے جو نیک کردار ہوتے ہیں۔ ع ۱۶/۹/۲۲

اِتَّقَوْا یعنی گناہوں سے پرہیز رکھتے ہیں مُحْسِنُوْنَ یعنی نیک کردار ہیں۔ یا اِتَّقَوْا سے مراد ہے وہ لوگ جو اللہ کے حکم کی تعظیم کرتے ہیں اور اس سے ڈرتے ہیں اور مُحْسِنُوْنَ یعنی نیک کردار ہیں یا اِتَّقَوْا سے مراد ہیں وہ لوگ جو اللہ کے حکم کی تعظیم کرتے ہیں۔ اور اس سے ڈرتے ہیں اور مُحْسِنُوْنَ سے مراد ہیں وہ لوگ جو مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں یا اِتَّقَوْا سے مراد ہیں وہ لوگ جو بدلہ لینے میں زیادتی کرنے سے بچتے ہیں اور مُحْسِنُوْنَ سے مراد ہیں وہ لوگ جو دوسروں کو معاف کرتے ہیں۔

اللہ کے ساتھ ہونے سے مراد ہے اللہ کی رفاقت، دوستی مہربانی اور مدد و نصرت کا ساتھ ہونا یا معیتِ ذاتیہ مراد ہے جو بے کیف ہے اس کی کوئی کیفیت نہ سمجھی جاسکتی ہے نہ بیان کی جاسکتی ہے۔

ابن سعد وغیرہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے جو حدیث بیان کی ہے جس کا ذکر اوپر کر دیا گیا ہے اسی حدیث میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنی قسم کا کفارہ دے دیا اور جو ارادہ کیا تھا اس سے باز رہے اور صبر کیا۔

ابن المنذر، طبرانی اور بیہقی نے بھی حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کی طرح حضرت ابن عباسؓ کی روایت سے حدیث مذکورہ بیان کی ہے اور شانِ نزول کے سلسلے میں ایسی ہی حدیث سورت کے آغاز میں ہم نے ابن اسحاق، ابن جریر اور عطاء کے حوالہ سے ذکر کر دی ہے۔

عبداللہ بن امام احمد نے زوائد المسند میں اور نسائی اور ابن المنذر اور ابن حبان اور ضیاء اور ترمذی نے بیان کیا ہے اور ترمذی نے اس کو حسن قرار دیا ہے کہ حضرت اُبی بن کعبؓ نے فرمایا اُحد کی جنگ میں ۶۴ انصار اور چھ مہاجر کام آئے۔ مہاجرین شہداء میں حضرت حمزہؓ بھی شامل تھے ان سب کو کافروں نے مُثلہ کیا (یعنی سب شہیدوں کے ناک کان بھی کاٹ لئے تھے) انصار نے کہا اگر ہم کو کسی روز ایسا موقع ہاتھ لگا تو ہم بھی ان کی حالت قابلِ رحم بنا دیں گے (یعنی ہم بھی مُثلہ کر دیں گے کہ جو لاشوں کو دیکھے گا اس کو ان کی ذلیل خستہ حالت دیکھ کر رحم آئے گا) کچھ مدت کے بعد جب مکہ فتح ہوا تو اللہ نے آیت وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَیْرٌ لِّلصّٰبِرِیْنَ نازل فرمادی۔ اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہم بدلہ نہ لیں گے صبر کریں گے۔ چار آدمیوں کے علاوہ باقی سب سے ہاتھ روک لو، کسی کو قتل نہ کرو)

بغوی نے لکھا ہے کہ یہ آیت شہداء اُحد کے متعلق نازل ہوئی۔ مسلمانوں نے جب دیکھا کہ مشرکوں نے ہمارے شہدائے کے پیٹ چاک کئے اور بہت ہی بُرے طریقہ سے لاشوں کے ناک کان کاٹے ہیں ہر شہید کو مُثلہ کر دیا گیا ہے صرف حنظلہ بن ابو عامر راہب کو مُثلہ نہیں کیا تھا کیونکہ حضرت حنظلہ کا باپ ابو عامر (جس کو رسول اللہ ﷺ نے راہب کے بجائے فاسق فرمایا تھا) اس روز ابوسفیان کے ساتھ تھا اسی وجہ سے حنظلہ کو مُثلہ کرنے سے انہوں نے چھوڑ دیا تھا تو کہا اگر اللہ نے ہم کو ان پر غالب کر دیا تو جو حرکت انہوں نے کی ہے ہم اس سے بھی زیادہ کریں گے ایسا مُثلہ کریں گے کہ کسی عرب نے کسی کو نہ کیا ہو گا، اس وقت رسول اللہ ﷺ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی لاش کے پاس کھڑے تھے مشرکوں نے آپ کے کان ناک اور آلاتِ مردانہ کاٹ لئے تھے اور پیٹ چاک کر دیا تھا، ہندہ بنت عتبہ (زوجۂ ابوسفیان) نے آپ کے جگر کا ایک ٹکڑا چبا ڈالا تھا اور اس کو نگل گئی مگر وہ پیٹ میں رک نہ سکا اور اس نے اگل دیا۔ رسول اللہ ﷺ کو جب یہ اطلاع ملی تو آپ نے فرمایا سنو! اگر وہ کھالیتی تو آگ میں کبھی داخل نہ ہوتی حمزہؓ کو اللہ نے یہ عزت عطا فرمادی ہے کہ ان کا کوئی حصہ دوزخ میں نہیں جائے گا رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کی جو یہ حالت دیکھی تو ایسا منظر آنکھوں کے سامنے آیا کہ اس سے زیادہ دل خراش منظر کبھی نہیں دیکھا تھا فرمایا: ابو السائب: آپ پر اللہ کی رحمت ہو، مجھے معلوم ہے کہ آپ بڑے نیک کردار اور صلۂ رحمی کرنے والے تھے اگر آپ کے بعد رہنے

والوں کے رنجیدہ ہونے کا خیال نہ ہوتا تو مجھے اس بات سے خوشی ہوتی کہ آپ کو یونہی (بے گور و کفن) چھوڑ دوں تاکہ قیامت کے دن آپ کا حشر متعدد (درندوں اور پرندوں کی) گروہوں کے اندر سے ہو خدا کی قسم اگر اللہ نے مجھے ان پر فتح عنایت کی تو آپ کی جگہ میں ان کے ستر آدمیوں کو ضرور ضرور مثلہ کروں گا، اس پر اللہ نے آیات مذکورہ نازل فرمائیں اور نزول آیات کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا ہم (انتقام نہیں لیں گے بلکہ) صبر کریں گے چنانچہ آپ اپنے ارادہ سے باز آ گئے اور قسم کا کفارہ ادا کر دیا۔

فائدہ: حضرت اُبَی بن کعب کی مذکورہ بالا روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کا نزول فتح مکہ کے وقت ہوا۔ حضرت ابوہریرہؓ حضرت ابن عباسؓ، اور عطاء بن یسارؒ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اُحد کے موقع پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ابن الحصار نے دونوں متضاد روایتوں میں ایک صورت جامعہ اس طرح بیان کی ہے کہ ان آیات کا نزول اول مکہ میں پھر اُحد میں پھر فتح کے بعد یادداشت کے طور پر ہوا۔ بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباسؓ اور ضحاک نے فرمایا، اس آیت کا حکم سورۂ برأت کے نزول سے پہلے تھا جب کہ حضور ﷺ کو پہلے آغاز قتال سے منع کیا گیا تھا اور لڑنے والوں سے لڑنے کا حکم دیا تھا لیکن اللہ نے اسلام کو غالب کر دیا اور سورۂ برأت نازل ہو گئی اور عمومی جہاد کا حکم دے دیا گیا تو یہ آیت منسوخ کر دی گئی۔ نخعی، ثوری، سدی، مجاہد اور ابن سیرین کے نزدیک یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں ہوئی جن لوگوں نے ظلم کیا ہو ان کے ظلم کے مطابق انتقام لینے کا حکم اس آیت میں دیا گیا ہے یہی اس کی شان نزول ہے ظالم نے جتنا ظلم کیا ہو اس سے زیادہ انتقام لینا جائز نہیں بقدر ظلم بدلہ لیا جا سکتا ہے اور معاف کر دینا بہتر ہے۔

مسئلہ: باتفاق علماء مثلہ کرنا ناجائز ہے ابن اسحاق نے حضرت سمرۃ بن جندبؓ کا بیان نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ (تقریر فرمانے کے لئے) جس مقام پر بھی کھڑے ہوئے جب تک اسی جگہ صدقہ (خیر خیرات زکوٰۃ) دینے کا حکم نہیں دے دیا اور مثلہ کرنے کی ممانعت نہ کر دی وہاں سے نہ ہٹے۔

مثلہ کرنے کی ممانعت بکثرت احادیث میں آئی ہے۔

سورۂ نحل کی تفسیر ۲ رجب ۱۲۰۲ھ کو ختم ہوئی۔ الحمد للہ کہ سورۂ نحل کی تفسیر کا ترجمہ ۱۶ رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ کو بعونہ تعالیٰ ختم ہوا

رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ اَنْ اَشْکُرَ نِعْمَتَکَ

تمت